سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) نمبر ۱۸۲

تنقیدِ شعر العجم

تالیف

پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب

(نظرِ ثانی اور اضافۂ مزید کے ساتھ)

شایع کردہ

انجمنِ ترقی اُردو (ہند)، دہلی

تنقیدِ شعرالعجم

عبّاس مروزی سے کمال اسمٰعیل تک

جس میں

شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کے مشہور تذکرے "شعرالعجم"
کے تاریخی بیانات پر تحقیق کی روشنی میں نقد و تبصرہ کیا گیا!



فہرست مضامین

اِنتساب

میں اس تنقید کو اپنے شفیق محترم مولوی
محمد شفیع ایم۔اے، سابق پرنسپل اورنٹیل کالج
و پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی لاہور،
کے نام پر
اپنے قیام لاہور کی یادگار میں دِلی شکریے کے ساتھ
معنون کرتا ہوں۔

محمود شیرانی



پیش کلام

"تنقیدِ شعرالعجم" جسے اب کتابی صورت میں طبع کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، اکتوبر ۱۹۲۲ء سے جوری ۱۹۲۶ء تک، انجمنِ ترقی، اُردو، کے سہ ماہی رسالے "اُردو" (اورنگ آباد) میں قسط وار نکل چکی تھی اُس وقت سے اب تک اس کی طباعت کے واسطے احباب کے تقاضے ہوتے رہے، لیکن راقم کو اپنے فرائضِ منصبی سے اس قدر فرصت میسر نہ ہوئی کہ اس کی طرف توجہ کی جاتی۔ اب یہ اقساط، نظرِ ثانی کے بعد کتابی صورت میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ کمال اسمٰعیل پر تنقید کا مسودہ پُرانے کاغذات میں سے نکل آیا، اُس کو بھی اضافہ کر دیا ہے۔

گزشتہ چند سال سے ایران میں ادبِ قدیم کا دورِ احیا ہوا۔ پُرانے اساتذہ سے متعلق ایرانیوں کی تحقیقات بھی، تنقید کے اکثر نتائج سے ہمنوا ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ راقم نے تنقید میں جو طریقہ اختیار کیا تھا، بالکل صحیح تھا۔

میں نہایت وثوق سے عرض کرتا ہوں کہ تنقیدِ ہذا مولانا شبلی مرحوم کی فضیلتِ علمی کی منقصت نہیں ہے بلکہ محض احتجاج ہے، اُس مُروجہ روش کے خلاف جس میں ہمارے مصنفین تحقیق کی جگہ تقلید سے اور عقل کی جگہ نقل سے کام لیتے ہیں۔ ہم تاریخی واقعات اور سوانح وحالات لکھتے وقت اس قدر تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ اُن کو نقد ونظر کی کسوٹی پر پرکھ لیں اور اُن کی صحت ودُرستی کے متعلق اپنا اطمینان کر لیں، میں اُن بزرگوں کے ساتھ بھی اتفاق

تنقیدِ شعر العجم

علامہ شبلی مرحوم زمانۂ حال کے اُن چند مستند اہلِ علم میں سے ہیں جن کا وجود مسلمانوں کے لیے ہمیشہ مایۂ ناز رہے گا اس کی متعدد تصنیفات نے آسمانِ علم پر اُن کو آفتاب سا کر چمکا یا ہے۔

مرحوم کا شمار ان خوش نصیب مصنفین میں کیا جا سکتا ہے جن کے فرزندانِ روحانی نے اُن کے دورانِ حیات میں قرار واقعی قدر و منزلت حاصل کر لی ہے جس کے حقیقت میں وہ مستحق ہیں۔

مرحوم نے تاریخ نگاری کی بُنیاد ایسے زمانے میں ڈالی جب فنِ تاریخ کا شوق ہمارے دل سے محو ہو چکا تھا، اُردو زبان تاریخی کتابوں سے بالکل تہی مایہ تھی اور ملک کا مذاق نہایت پستی کی حالت میں تھا۔ ایسے جمود کے وقت میں ان کے قلم نے اس فن کے احیا میں وہ زبردست اور قابلِ قدر خدمت کی جو صدیوں تک یادگار رہے گی۔

تاریخ میں ان کی وسعتِ معلومات کا اندازہ مرحوم کی ان متعدد اور مختلف الموضوع تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے جو اُردو ادبیات کی چیدہ اور منتخب کتابوں میں مانی جاتی ہیں۔

فارسی نظم کی تاریخ میں اُردو زبان کی بے بضاعتی محسوس کر کے علامہ نے

نہیں کرتا جو شعر العجم کو حُسن و عشق کا صحیفہ کہ کر اس کے تاریخی پہلو کی اہمیت کو گھٹانا اور تنقید کی ضرورت کو اس سے ہٹانا چاہتے ہیں۔

تنقید، میرے لیے ایک علمی مشغلے کا سامان تھی اور میں اس میں پوری دِلچسپی لیتا رہا، لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ پنجاب یونیورسٹی نے اسے ایم۔اے کے نصاب سے خارج کر دیا ہے تو مجھے بڑا رنج ہُوا اور میں نے تنقید کا سلسلہ ختم کر دیا۔

تنقید کے دوراں میں میں نے صرف تخریبی پہلو پر نظر رکھی ہے بلکہ حسبِ اجازتِ وقت تعمیری کام بھی کیا ہے یوں تو ہر شاعر کے حال میں کم و بیش اس کا پر تو موجود ہے لیکن انوری، نظامی، اور عطار کے تذکرے میں بہت نمایاں ہے۔

اس تنقید کا مقصد ناظرین کے واسطے ہر قسم کی اطلاع فراہم کرنا نہیں ہے بلکہ شعر العجم کے نظری مواقع پر روشنی ڈالنا ہے، یہی نقطۂ نظر خیّام کے حالات میں بھی کارفرما ہے جو میرے فاضل دوست ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی کے قلم کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب بحالتِ موجودہ اپنے مضمون کی طباعت کے حق میں نہ تھے، لیکن یہ اطلاع مجھ کو ایسے وقت ملی جب کہ تمام کتاب لکھی جا کر مطبع میں پہنچ چکی تھی۔ مجھے اُن کی خواہش کی تعمیل نہ کرنے کا افسوس ہے۔

محمود شیرانی

بہت سے غیر تاریخی افسانوں نے شعر العجم میں قابلِ عزت جگہ پائی ہے کیسی اغلاط جنھیں تذکرہ نگاروں نے اپنی اپنی تصنیف میں دُہرا کر ہماری ادبیات میں عام طور پر زباں زد کر دیا ہے شعر العجم کے صفحات پر بھی موجود ہیں۔ ایک شاعر کے ابیات دوسرے شاعر کے نام سے بھی بعض اوقات درج ہوئے ہیں۔ اکثر اوقات ایک مورخ یا محقق کو اپنے اجتہاد کے استعمال کی بھی ضرورت ہوتی ہے لیکن مولانا نے ضروری مواقع پر بھی اس کے استعمال سے احتراز کیا ہے، جب کسی واقعہ کی نسبت دو مختلف روایتیں آ گئی ہیں شبلی اس حوش علق حاکم کی طرح جو مدعی اور مدعا علیہ دونوں کے حوش کرنے کی بے سود کوشش میں مصروف ہو "تم بھی سچے اور تم بھی سچے" کہہ کر بغیر کسی جرح و تعدیل کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ روایات بڑے بوڑھوں کی باقیات الصالحات ہیں ان کے متعلق ردّ و قدح کرنا یا ان کو غلط ثابت کرنا ہماری شانِ اخلاق کے خلاف ہے۔

کے تو اگر دید زاہد جام صہبا بشکند
مے پود زنگم حبابے گر بدریا لشکند

کتابت کی غلطیاں ایک اچھی تعداد میں موجود ہیں، اگرچہ فرماتے ہیں "صحیف غلطیاں تو اس قدر ہیں کہ سب کا احصا کروں تو ایک اور کتاب تیار ہو جائے اس لیے موٹی موٹی غلطیاں لکھ دی ہیں۔"
ص ۲ و ۳ آخر کتاب۔

اس عذر اور آخر میں غلط نامے کے باوجود کتاب میں موٹی موٹی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں

جو جو اطلاعات آسانی سے مولانا شبلی کی دسترس میں آسکیں انہیں پر قناعت کی۔ زیادہ تحقیق اور تلاش سے کام نہیں لیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اس

شعر العجم تصنیف کی۔ اس موضوع پر اب تک فارسی اور اُردو میں جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں شعر العجم ان میں بغیر کسی استثنا کے بہترین تالیف مانی جاسکتی ہی ملک نے بھی اُس کی قدر کرنے میں حوصلے سے کام لیا۔ چنانچہ اس وقت تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

ذیل کی سطور میں میرا روئے سخن اسی کتاب کی طرف ہو اور صرف ان بیانات سے بحث کی جائے گی جن کے متعلق مجھے مولانا شبلی سے بعض تاریخی یا تنقیدی نوعیت پر اختلاف ہو۔ میرا تبصرہ ممکن ہو کہ آیندہ بھی جاری رہے بسر دست اس کی پہلی جلد کا مطالعہ شروع کرتا ہوں شعر العجم کے نام سے جہاں جہاں حوالے دیے گئے ہیں وہ اسی جلد سے تصور کیے جائیں، اس کتاب کا جو نسخہ میرے زیر نظر ہے وہ مطبع مفید عام علی گڑھ ۱۹۰۹ء کا مطبوعہ ہی۔

شعر العجم کے مطالعے کے بعد میری ذاتی رائے یہ قائم ہوئی ہو کہ علامۂ شبلی اس تصنیف کے دوران میں مورخانہ و محققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی حد تک غافل رہے ہیں، رطب و یابس جو کچھ اُن کے مطالعے میں آجاتا ہو بشرطیکہ دلچسپ ہو حوالۂ قلم کر دیتے ہیں۔ بعض وقت دیکھا جاتا ہو کہ مولانا اپنے پچھلے بیانات کی آگے جاکر خود ہی تردید کر جاتے ہیں۔ پہلے کچھ رائے قائم کی بعد میں جاکر کوئی اور نظریہ قائم کر لیا ممکن ہو کہ شبلی تاریخ اسلام میں بہتر نظر رکھتے ہوں لیکن شعرائے عجم کے حالات میں اُن کے طاقت ور قلم نے بہت لغزشیں کی ہیں اس خاص دائرے میں اُن کی معلوماتِ تاریخی نہایت محدود ہی اور نہ تمام سلسلۂ شعرا، ان کے دواوین اور آثار پر کافی غور ہی ہر دتاریخ جو فن تاریخ کا ایک شاندار اور وقیع پہلو ہی اس پر اوّل تو پوری توجہ نہیں کی اور صرورتاً کہیں ایسا کیا بھی تو غلطیوں سے خالی نہیں بعض متاخرین کو متقدمین کا پہلو نشین بنا دیا اور بعض متاخرین کو متقدمین کا ہم بزم کر دیا ہی۔

اور مسعود رازی کے ایک ایک واقعے کے متعلق اتفاقیہ حوالۂ قلم کر دیے ہیں لیکن مولانا نے ان سے کچھ استفادہ نہیں کیا اور نہ ذیل کتاب میں کہیں حوالہ دیا اس لیے لباب کی طرح اس کتاب کا نام بھی محض آرایش و نمایش کے لیے داخل کر لیا گیا ہے۔

دیکھا جاتا ہے کہ فہرست میں پروفیسر براؤن کی "تاریخ ادبیات ایران"[1] کا نام درج نہیں ہوا حالانکہ براؤن کے اقتباسات میں علامہ نے خواجہ زادہ عباس مروزی سے متعلق جسے ابو العباس لکھا گیا ہے اور جو اکثر محققین کے نزدیک فارسی شاعری کا آدم ہے، فرمایا ہے:-

'ابو العباس مروزی کے اشعار جن کا ذکر آگے چل کر کہیں آئے گا اگر روایتاً ثابت بھی ہوں تو وہ ایک اتفاقیہ تفریح خاطر تھی جو سلسلۂ تاریخ کی کوئی کڑی نہیں بن سکتی" شعر العجم ص ۱۶

عباس مروزی کے وہ اشعار حسبِ ذیل ہیں ۔

اے رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرقدین گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین

مر خلافت را تو شایستہ چو مردم دیدہ را دین یزداں را تو بایستہ چو رخ را ہر دو عین

کس برین منوال پیش از من چنین شعرے نگفت مر زبان پارسی را ہست تا ایں نوع بین

لیک ازاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت گیرد از مدح و ثنائے حضرت تو زیب و زین

[1] براؤن کی تاریخ اس موضوع پر سب سے اعلیٰ تصنیف ہے جو میری نظر سے گزری ہے۔ مولانا شبلی نے اس سے استفادہ بھی کیا ہے، ہمارے زمانے کی اس بہترین تصنیف کے لیے شبلی کی رائے قابل دید ہے۔ فرماتے ہیں ۔

"بلا مبالغہ اور بلا تصنع کہتا ہوں کہ براؤن کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا نہایت عامیانہ اور سوقیانہ ہے"

حصّہ شعرالعجم کے لیے (جو اس مضمون کے دوران میں میرے زیرِ نظر ہی) مجمع الفصحا اور تذکرۂ دولت شاہ پر زیادہ اعتماد کیا ہی، ان تصنیفات میں ہر قسم کا رطب و یابس نظر آتا ہی میرے خیال میں لباب الالباب محمد عوفی، بزم آرا، یا مخزن الغرائب زیادہ مفید ہوتیں، پچھلی دونوں کتابوں سے مولانا واقف نہیں معلوم ہوتے البتہ لباب الالباب کا نام فہرستِ کتب میں سب سے اوّل ہی، جسے لب اللباب عوفی یزدی (کذا) کے نام سے یاد کیا ہی۔ (شعرالعجم ص ۴)

لیکن مولانا کی فہرست میں اس کا ادخال زیادہ تر ایک اعزازی حیثیت رکھتا ہی کیونکہ آخر جلد میں غالباً انھیں اعتراف ہی کہ یہ کتاب ان کی نظر سے نہیں گزری۔ فرماتے ہیں ۔

"لب اللباب عوفی کی پہلی جلد کتاب کی تصنیف کے بعد چھپ[1] کر یورپ سے آئی تو اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا" ص ۲ آخر جلد اول

اس سے میں یہی سمجھتا ہوں کہ اس وقت تک لباب الالباب مولانا کی نظر افروز نہیں ہوئی تھی پھر فہرست میں اس کے شامل کیے جانے کے کیا معنی؟

میں دیکھتا ہوں کہ فہرست میں ابوالفضل بیہقی کی تاریخ آلِ عرب میں کا نام بھی درج ہی جس کے ساتھ یہ نوٹ ہی ۔

"مصنف مسعود بن سلطان محمد (کذا) غزنوی کے زمانے میں تھا مصنف شعرائے عصر کا تذکرہ کیا ہی" ص ۴

اب جو شخص تاریخِ بیہقی سے واقف ہی وہ جان سکتا ہی کہ مصنف نے شعرائے عصر کے ذکر کرنے میں خاص التزام سے کام نہیں لیا۔ چند فقرے ابوحنیفہ اسکاف زینبی علوی

---

[1] لباب الالباب محمد عوفی سنہ ۱۹۰۶ء میں پروفیسر براؤن نے شائع کی اور شعرالعجم سنہ ۱۹۰۹ء میں طبع ہوئی ۔

اسی زمانے میں ہوئی یعقوب صفار کا ایک کمسن بچہ ایک دن اخروٹوں سے کھیل رہا تھا، ایک اخروٹ لڑھکتے لڑھکتے ایک گڑھے میں جا گرا بچے کی زبان سے بیساختہ یہ مصرعہ نکلا ع

غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو

یعقوب بھی موجود تھا اس کو بچے کی زبان سے یہ موزوں کلام بہت پسند آیا لیکن چونکہ اس وقت تک اس بحر میں اشعار نہیں کہے جاتے تھے شعرا کو بلا کر کہا کہ یہ کیا بحر ہے انھوں نے کہا ہزج ہے پھر تین مصرعے اور لگا کر رباعی کر دیا اور دوبیتی نام رکھا، مدت تک یہی نام رہا پھر دوبیتی کی بجائے رباعی کہنے لگے لیکن یہ تعجب ہے کہ عربی زبان میں آج بھی دوبیتی کہتے ہیں جس سے اہلِ عرب کی ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔" شعر العجم ص ۲۱و۲۲

یہ قصہ غالباً مولانا نے دولت شاہ سمرقندی سے نقل کیا ہے لیکن یہ یاد رہے کہ دولت شاہ سمرقندی ایک نہایت ضعیف راوی ہے اس سے بہتر اطلاع قدر بلگرامی نے قواعد العروض میں دی ہے۔

المعجم فی معاییر اشعار العجم میں شمس الدین محمد بن قیس جو ساتویں صدی ہجری کے ربع اول کے مصنف ہیں لکھتے ہیں کہ متقدمینِ شعرائے عجم میں ایک شاعر نے (میرا خیال ہے کہ وہ رودکی تھا) اخرم اور اخرب کے اجتماع سے یہ وزن نکالا جس کو وزنِ رباعی کہا جاتا ہے یہ ایک ایسا مقبول وزن ہے کہ طبائعِ سلیم اکثر اس کی شائق ہیں اس کے استخراج کا باعث یہ کہا جاتا ہے کہ ایک روز عید کے دن غزنین کی تفریح گاہ میں وہ گشت کر رہا تھا اس نے دیکھا کہ کچھ لڑکے کھیل میں مشغول ہیں اور اور ان کے گرد تماشائیوں کا ہجوم ہے یہ بھی وہاں جا کر کھڑا ہو گیا ان میں ایک لڑکا جس کی عمر دس پندرہ سال سے زائد نہ ہوگی اخروٹوں سے کھیل رہا تھا اسی اثنا

ان اشعار کے متعلق مولانا اس لیے متشکک ہیں کہ (Kasmtiaaiiy) اور پروفیسر براؤن ان کو تسلیم نہیں کرتے لیکن صفحہ ۱۸ پر مولانا اپنے گزشتہ بیانات فراموش کرکے فرماتے ہیں -

"اتفاق سے ہمارے پر کہ مامون الرشید ایک مدت تک خراسان میں رہا تھا اور غالباً فارسی سے حرف آشنا ہو گیا تھا عباس مروزی نے ایک قصیدہ فارسی میں لکھا اور مامون الرشید نے اس کے صلے میں ہزار دینار سالانہ مقرر کر دیے"۔ ص ۱۸ شعر العجم -

اس روایت کا پہلا ناقل محمد عوفی ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ صرف ایک ہزار دینار صلے میں دیے گئے، سالانہ کا ذکر نہیں کرتا، جب یہ واقعہ علامہ کے نزدیک روایتاً ثابت نہیں تو اس کے استعمال کی زحمت کیوں گوارا کی آگے چل کر فرماتے ہیں -

"اس سے پہلے اگر برائے نام کچھ پتا چلتا ہے تو ابوحفص حکیم سعدی کا شعر ہے جو پہلی صدی ہجری میں موجود تھا" ص ۱۸ شعر العجم

ابوحفص بن احوص سغدی اسعد سمرقند کا رہنے والا فن موسیقی میں استاد کامل تھا، ابونصر فارابی نے اپنی تصنیفات میں اس کا ذکر کیا ہے، موسیقار سے ملتا جلتا ایک ساز جس کا نام "شہرود" تھا اس نے ایجاد کیا، فارابی نے اس ساز کی شکل اپنی تصنیف میں بیان کی ہے۔ ابوحفص بقول صاحب "خزانۂ عامرہ" وصاحب المعجم فی معاییر اشعار العجم سنہ ۳۰۰ھ میں گزرا ہے۔ ابوحفص فارسی فرہنگ نگاروں کا ابو البشر مانا جاسکتا ہے اس کی فرہنگ کا ذکر فرہنگِ جہانگیری میں آتا ہے۔

رباعی کی نسبت مجھے علامہ شبلی سے اختلاف ہے، صفاریہ خاندان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں -

"شاعری کے متعلق اس خاندان کا بڑا احسان یہ ہے کہ رباعی کی ایجاد

سعید ترسم

ہمارے نزدیک یہ ایک مصرع مانا جاتا ہے قدما کے نزدیک پورا شعر تھا جس
کو غالباً وہ یوں لکھتے تھے ؎

یک بارہ جبیں جا　　ہل وخو بحو از ماش

حاہل کی "ہ" شامل مصرع اول ہے اس لیے یہ ایک مقعد شعر ہے جس کی
تقطیع ہے مفعول مفاعیلن، مفاعیل فعول یا مثلاً متقدمین کا یہ شعرِ مقعد ؎

دانی کہ دل از تو ہ　　ستو دسیر مرا

متاخرین نے اس شعر کو بھی ایک مصرع مانا اور یوں لکھا ع

دانی کہ دل از تو نشود سیر مرا

جب ہزج اخرب یا اخرم میں ایسے چار شعر جمع ہو گئے اور آخر میں قافیہ
پایا گیا قدما نے چاربیتی نام رکھ لیا لیکن متاخرین نے ان چار اشعار کو چار مصرعے
شمار کیا اس لیے چاربیتی کا نام دوبیتی رکھ دیا۔ محقق طوسی اس کے متعلق مرباعات
ہزج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"و آنچہ ازیں وزن ہا مانند یک مصرع متمم است متاخران استعمال
کمتر کنند و قدما آن شعر بسیار گفتہ اند و ایشان ہر مصرع را قافیہ
آوردہ اند و آن را بیتی می شمردہ مانند رجز مشطور یا بیت ہائے مقعد از
اشعار تازیان کہ آن را مقصی میں خوانند و بدیں سبب ترانہ را قدما چہار
بیت می گرفتہ اند و آن را چہار بیتی خواندہ و شاعری رباعی و در ہر چہار قافیہ
آوردن لازم می شمردہ اند۔ اما نزدیک متاخران چون مربعات این وزنہا
مستقل بیت این اوزان متروک است و ہر بیتی را ازیں ابیات مصرعی
می شمرند و رباعی را دوبیتی می خوانند و مصرع سوم را خصی می خوانند
قافیہ شرط می نہند" معیار الاشعار

میں ایک اخروٹ گڑھے سے باہر گرا اور پھر رجعت کرتا ہوا گڑھے میں جا گرا۔ لڑکا حسین و جمیل ہونے کے علاوہ طبیعت میں موزونیت بھی رکھتا تھا اور اپنی تفعلی اور مسجع گفتگو سے حاضرین کو محظوظ کر رہا تھا اخروٹ کو گڑھے کی طرف رواں دیکھ کر بولا ع

غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو

شاعر نے اس کلمے سے ایک مقبول وزن معلوم کر لیا اور عروضی اصول اس پر استعمال کر کے ترانہ نام رکھا اور بحر ہزج کی فروع میں شامل کر لیا۔ العجم ص ۸۸۔۸۹۔

لیکن ہم اس روایت کا بھی پابند نہیں ہو سکتا اگرچہ میں نے مولانا کے نظریے کی تردید کے لیے اس کو درج کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نظم کی وہ صنف خاص جس کو ہم رباعی کہنے کے عادی ہیں کوئی شخصی ایجاد نہیں بلکہ چہار بیتی کا ارتقائی نتیجہ ہے۔ قدیم الایام میں ایران میں ایک خاص قسم کی نظم جس کو چہار بیتی کہا جاتا تھا رائج تھی اس کے اوزان عربی اوزان سے غالباً مستخرج نہیں بلکہ ایران زاد اور مقامی معلوم ہوتے ہیں۔ قدما ہرج کے مربعات میں ان کا شمار کرتے تھے تعداد میں وہ چار شعر ہوتے تھے اور چاروں شعروں میں قافیہ لازم ضروری سمجھا جاتا تھا متاخرین نے اس میں یہ ترمیم کی کہ اس کے وزن مربع کو مثمن قرار دیا جس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان چار ابیات کی تعداد دو شعروں میں محدود ہو گئی اور چار قافیوں کے بجائے صرف تین قافیے ضروری سمجھے گئے اور مصرع سوم خصی رکھا گیا۔

قدیم چہار بیتی کا کوئی نمونہ اس وقت موجود نہیں لیکن سمجھانے کے لیے اس قدر کافی ہوگا۔ ع

یکبارہ چنیں حامل و خونخوارہ مباش

اب یہ چہار بیتی کی بہت اچھی مثال ہو اس کے چاروں ابیات میں قافیہ
ہو اور آخری تینوں شعر معقد ہیں۔ متقدمین میں جس طرح رودکی اور شہید
کے لیے مشہور ہیں اسی طرح ابوطالب ترانہ کے لیے مشہور ہو۔ فرخی

بیت

از دلآرامی و نغزی چون غزلهای شہید   وز دلآویزی و خوبی چون ترانہ بوطلب

غزنویوں کے عہد تک چہار بیتی کا رواج رہا بعد میں دوبیتی زیادہ رائج ہوئی[1]

قدما کے حالات میں تاریخ نے زیادہ تر بخل و امساک سے کام لیا ہو اس لیے
ان قرنوں کے مشاہیر رجال کے حالات ہم تک بہت قلت کے ساتھ پہنچے ہیں۔
لیکن جو کچھ پہنچے ہیں مؤرخ کا فرض ہو کہ سب کو جمع کرکے صفحۂ قرطاس کے حوالے
کردے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ علامہ شبلی نے بعض موقعوں پر محض سطحی معلومات پر
اکتفا کی ہو۔ مثال میں شہید کا نام پیش کیا جاتا ہو اس کا ذکر صفحات ۲۷ و ۵۳
میں کیا ہو لیکن اس کے حالات کی طرف کوئی اعتنا نہیں کی نہ اس کی وجاہت کو
کما حقہٗ ظاہر کیا۔ ابوالحسن شہید بن الحسین بلخی اپنے عہد کا نہایت زبردست فلسفی
اور حکیم تھا اس کے مناظرات مشہور محمد بن زکریا الرازی سے ہوئے ہیں رازی
نے اس کے جواب میں بعض رسائل بھی لکھے ہیں فن شعر اس کے کمالات کا
ایک کمتر پایہ ہو لیکن اس میدان میں بھی وہ رودکی کا ہمسر شمار کیا جاتا ہو محمد عوفی

---

[1] محترم فاضل علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی قابل قدر تصنیف 'خیام' میں جو ۱۹۳۳ء میں
شائع ہوئی ہو رباعی کے تعلق میں میرے بعض بیانات کی تردید کی ہو اور نئے نظریے سپرد قلم
کیے ہیں۔ تنقید کے ضمن میں ان کا اندراج نامناسب تھا اس لیے میں نے سید صاحب
کے اعتراضات اور اپنے جوابات کو ایک علیحدہ ضمیمہ میں داخل کرکے کتاب کے آخر میں
درج کردیا ہو ناظرین وہاں دیکھ لیں۔

[اس عبارت کا ترجمہ یہ ہو -

(مربعات کے) ان اوزان میں سے ایسے وزن جو ایک مصرع متمن کے مانند ہیں متاخرین میں بغیر مستقل ہیں متقدما نے ان اوزان میں کثرت سے اشعار لکھے ہیں وہ ہر مصرع (یعنی شعر مربع) کے آخر میں قافیہ لاتے ہیں اور اس کو ایک بیت شمار کرتے ہیں۔ رجز مشطور یا عروبوں کے معقد اشعار کی طرح جن کا نصف معین نہیں ہوتا اسی لیے قدما ترانہ کو چار بیت مانتے تھے اور اس کو چار بیتی کے نام سے یاد کرتے تھے اور عربی میں رباعی کہتے اور چاروں شعروں میں قافیہ لانا ضروری سمجھتے تھے لیکن متاخرین میں چونکہ ان کے مربع اوزان استعمال میں نہیں آرہے یہ اوزان متروک ہو چکے ہیں۔ وہ اب ان اشعار کے ہر بیت کو ایک مصرع مانتے ہیں اور رُباعی کو دو بیتی کہتے ہیں اور تیسرے مصرع کو خصی رکھتے ہیں اور اس میں قافیہ کی شرط ضروری نہیں سمجھتے۔]

چہار بیتی کا سب سے قدیم نمونہ مجھ کو ابوشکور کے ہاں ملتا ہو جس کا آفرین نامہ (شاہنامہ کی بحر میں ایک مثنوی) بقول عوفی ۳۳۶ھ میں ختم ہوا تھا۔ ابوشکور کی رباعی کی موجودہ شکل یہ ہو :-

رُباعی

اے گشتہ من از غم فراوان تو پست   شد قامت من ز درد ہجران تو شست
اے شستہ من از فریب دستان تو دست   خود ہیچ کسے بسیرت دستان تو ہست

(لباب الالباب عوفی)

لیکن اگر چہار بیتی کی شکل میں لکھا جائے تو اس کی صورت حسب ذیل ہوگی ؎

اے گشتہ من از غم   فراوان تو پست   شد قامت من زدر   د ہجران تو شست
اے شستہ من از دو   ب دستان تو دست   خود ہیچ کسے بسی   رت دستان تو ہست

حقیقی رودکی کے دھوکے میں ایک خیالی اور سیمیائی رودکی کے باغ کی سیر
میں مصروف ہو گئے۔

شعر العجم میں رودکی کا نام محمد یا جعفر ص ۲۸ دیا ہے جس میں پہلا غلط اور دوسرا صحیح ہے۔ انساب السمعانی میں اس کا پورا نام یوں درج ہے: "اُستاد ابو عبداللہ جعفر بن محمد بن حکیم بن عبدالرحمن ابن آدم السمرقندی" ص ۲۶۲

مولانا شبلی فرماتے ہیں

"رودک بخارا کے ضلع میں جس کو سغد بھی کہتے ہیں ایک گانو کا نام ہے رودکی اسی گانو کی طرف منسوب ہے" شعر العجم ص ۲۸

انساب السمعانی (مطبوعہ یورپ ص ۲۶۲) میں رودک ایک ناحیہ کا نام ہے جس کا صدر مقام سمرقند سے دو فرسنگ کے فاصلے پر واقع ہے رودکی اس کی طرف منسوب ہے۔

رودکی کی نابینائی کے ذکر میں فرماتے ہیں

یورپ اور ایشیا کا یہ عجیب اتفاقی توافق ہے کہ رودکی بھی ہومر کی طرح مادر زاد اندھا تھا" شعر العجم صفحہ ۲۸

بعض یورپین محققین مثلاً ڈاکٹر ایتھ وغیرہم نے اس کی نابینائی سے قطعاً انکار کیا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ رودکی کی نابینائی کے متعلق ہمارے پاس قریب قریب ہمعصر شہادتیں موجود ہیں مثلاً دقیقی اس کی بے بصارتی کی طرف تلمیح کرتا ہوا کہتا ہے۔

اُستاد شہید زندہ بایستی و آں شاعر کور چشم بالستی

اور ابو زراعہ المعمری الجرجانی کہتا ہے۔ ابیات

اگر بدولت با رودکی نہ ہم نامم عجب مکن سخن از رودکی نہ کم دانم
اگر بکوری چشم او بیافت گیتی را زبہر گیتی من کور بود نتوانم
ہزار یک زاں کو یافت از عطای ملوک بمن دہی سخن آید ہزار چندانم

رودکی پر اس کے تقدم کا معترف ہو فرخی نے ایک سے زیادہ موقعے پر اس کے نام کو شہرت دی ہو ؂

شاعرانت چو رودکی و شہید — مطربانت چو سرکش و سرکب

دقیقی اور منوچہری نے بھی اس کے نام کو رودکی کے نام کے ساتھ ضم کیا ہو۔ منوچہری ؂

از حکیمان خراساں کو شہید و رودکی — بوشکور بلخی و بوالفتح بستی ہکذی

وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا ابو محمد عبداللہ کافی رورقی نے اپنی کتاب حماسۃ الظرفا میں شہید کے بعض عربی اشعار درج کیے ہیں جن میں سے لباب الالباب میں عوفی نے تین شعر نقل کیے ہیں۔ ابن ندیم یاقوت اور ابو منصور الثعالبی سب اس کا ذکر کرتے ہیں۔ فلسفہ اخلاق اور الم پرستی شہید کی شاعری کے امتیازی جوہر ہیں۔

اب میں رودکی کے حالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

رودکی

یہ مشہور آفاق شاعر آدم الشعرا مانا جاتا ہو اس لیے خیال کیا جاتا ہو کہ علامہ نے اس کے واقعات قلمبند کرنے میں زیادہ تحقیق اور تلاش سے کام لیا ہوگا اور ظاہری ٹیپ ٹاپ سے تو ایسا ہی خیال گزرتا ہو۔ لیکن میں ناظرین کو آغاز داستاں ہی میں اطلاع دیے دیتا ہوں کہ شعر العجم میں رودکی کا افسانہ ایک دل فریب اور دل کش سراب کے منظر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ بقول آتش ؂

سحر رحر میں ڈال کے سحر دل چلے

مولانا لکھنے بیٹھے تھے رودکی کی داستان لیکن درمیاں میں اُن کے سمند قلم نے اس قدر مد لگامیاں کیں کہ صراطِ مقصود سے بھٹک کر کہیں کے کہیں جا نکلے اور

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش — بیافتہ است بتوزیع از ین و آمد
شگفتش آمد و شادی فزود و کبر گرفت — ز رشک فخر بگفت ایں شعر خوش اند [51]

یہ فیصلہ کرنا کوئی مشکل امر نہیں کہ ان قصائد میں عنصری والا مصرعہ بیافتہ است بتوزیع اگر صحیح ہو یا مولانا کا مصرع جس میں کلیلہ کا ذکر آتا ہے۔ ازرقی نے جو ابوالفوارس طغان شاہ بن الپ ارسلان محمد بن جغری بیگ داؤد سلجوقی کا مداح ہے اتفاقیہ اس واقعہ کا ذکر ایک قصیدے میں کیا ہے عنصری کا شعر بالا اس کے ذہن میں ہے اور لکھتا ہے ۔ —

حدیث میر خراسان و قصہ توزیع [52] — نگفت رودکی از بہر فخر در اشعار
مرا چہ دادہ مرا ورا ہزار دیناری — شاہ جو ہم کردہ از صغار و کبار

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح عنصری کے ہاں اسی طرح ازرقی کے ہاں کلیلہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ دونوں شاعر توزیع لکھ رہے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ انعام کلیلہ کے صلہ میں نہیں ملا بلکہ مختلف موقعوں پر۔ اگر مزید شہادت کی ضرورت ہو تو خود رودکی کا شعر جو غالباً اس قصے کا بانی مبانی ہے نقل کیا جا سکتا ہے وہو ہذا ۔ —

مرا ز میر خراسانش چہل ہزار درم — وزو فزونی یک پنج میر ماکان بود [53]

یہاں دیکھا جاتا ہے کہ رودکی خود بھی کلیلہ کے قصے کی تائید نہیں کرتا۔

کلیلہ کی نظم کے سلسلے میں فردوسی ابوالفضل بلعمی المتوفی ۳۲۹ھ وزیر امیر نصر المتوفی ۳۳۱ھ کا نام پیش کرتا ہے۔ میں فردوسی کے اشعار بجنسہٖ نقل کرتا ہوں ۔ —

کلیلہ بتازی شد از پہلوی — بدین سان کہ اکنون ہمی بشنوی
بتازی ہمی بود تا گاہ نصر — بدانگہ کہ شد در جہاں شاہ نصر

---

[51] دیوان عنصری صفحہ ۶۶ ممبئی ۱۳۴۲ھ طبع آقا محمد اسد کابلی۔
[52] قسمت کردن رحمے برائے دیگرے و پراگندہ کردن
[53] شعر العجم صفحہ ۳۶ ۱۹۱۶ء۔

لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ وہ مادر زاد نابینا نہیں تھا بلکہ جیسا کہ عینی نے شرح یمینی (صفحہ ۵۲ جلد اوّل مطبوعہ مصر ۱۲۸۶ھ) میں شارح سجاتی کی سند پر لکھا ہے اور سجاتی رشیدی کے سعدنامے کے حوالے سے کہتا ہے کہ آخر عمر میں رودکی کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی گئی تھی کتاب کلیلہ و دمنہ جیسا کہ فردوسی کے بیان سے آیندہ معلوم ہوگا رودکی نے نابینائی کے زمانے میں لکھی تھی اس کتاب کے متعلق مولانا فرماتے ہیں

"لیکن حامدانِ سامانیہ نے شاعری سے اصلی کام لیے چنانچہ رودکی کو کلیلہ و دمنہ کی نظم کی خدمت دی اور اس کے صلے میں چالیس ہزار درہم عطا کیے عنصری ایک قصیدے میں کہتا ہے ؎

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش　　عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور"

شعر العجم صفحہ ۲۹ و ۳۰۔ وله "نصر بن احمد سامانی نے رودکی کو حکم دیا کہ اس کو فارسی میں نظم کر دے۔" شعر العجم صفحہ ۲۶۔

اس عبارت میں علامہ شبلی کو دو مغالطے پیش آئے ہیں یعنی اوّلاً ہمارے تذکرہ نگاروں نے عجیب عجیب اصلاحیں دی ہیں مفتاح التواریخ میں صاحب ہفت اقلیم کی سند پر یوں لکھا ہے ؎

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش　　عطا گرفت بہ نظم کلیلہ و دمنہ

مرآت الخیال میں مطلع بنا لیا گیا ہے ؎

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش　　عطا گرفت ز نظم آورے بکشور خویش[1]

لیکن قصائد عنصری میں رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل شعر یوں تھا ؎

---

[1] صفحہ ۲۱ طبع بمبئی آقا محمد شیرازی۔

اس کی وفات صفر کی دسویں شب ۳۲۹ھ میں واقع ہوئی ابو الفضل کی مدح میں اس قرن میں رودکی کا ایک قصیدہ بہت مشہور تھا اس کا ایک شعر حکیم سوزنی نے صدر جہاں شمس محمد بن عمر بن عبد العزیز مازہ کی تعریف میں یوں تضمین کیا ہے ؎

در مدح تو بصورت تضمین اداکنم　　یک بیت رودکی را در حق بلعمی

"صدر جہاں جہان ہمہ تاریک شب شدست　　از بہر ما سپیدۂ صادق ہمی دمی"

معزی نے غالباً رودکی کے اسی قصیدے سے ایک مصرع یوں باندھا ہے ؎

از رودکی شنیدم سلطان شاعران　　"کاندر جہان بکس مگرو جز بفاطمی"

قولہ "رودکی نہایت پُرگو تھا رشیدی سمرقندی نے اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بتائی ہے چنانچہ کہتا ہے ؎

شعر او را بر شمردم سیزدہ رہ صد ہزار　　ہم فزون آید اگر چونانکہ باید بشمری

میں نے اس کے اشعار تیرہ دفعہ گنے تو ایک لاکھ ٹھہرے اور اچھی طرح گنے جائیں تو اس سے بھی زیادہ نکلیں"۔ شعر العجم صفحہ ۳۲ -

یہ ترجمہ صریحاً اعتراض سے خالی نہیں۔ تیرہ مرتبہ ایک جز گنی جا چکی ہے لیکن ابھی اس کا اچھی طرح گنا جانا باقی ہے بظاہر شاعر کا مطلب تیرہ لاکھ ہے۔

رودکی کی غزلوں کی مثال میں علامہ شبلی نے یہ ابیات انتخاب کیے ہیں -

"ای جان من از آرزوی روی تو برلب　　بنمای یکی روی و بہ بخشای بر این جان

دشوار بہای زرخ و دشوار دہی بوس　　آسان بربای دل و آسان ببری جان

نزدیک من آسانی تو باشد دشوار　　نزدیک تو دشواری من باشد آسان

(شعر العجم صفحہ ۲۷)

بیابانات اصل میں قطران تبریزی کے ایک قصیدے کی تشبیب سے لیے

گرانمایہ بوالفضل دستور اوی — کہ اندر سخن بود گنجور اوی
بفرمود تا پارسی و دری — بگفتند و کوتاہ شد داوری
ازیں پس بدو سیم و رائے آمدش — بدو بر خرد رہنمائے آمدش
ہمی خواستے آشکار و نہاں — کزو یادگاری بود در جہاں
گزارندہ را پیش بنشاندند — ہمہ نامہ بر رودکی خواندند
بپیوست گویا پراگندہ را — بسفت ایں چنیں دُرِّ آگندہ را
ہر آں کو سخن داند آرایش است — چو ابلہ بود جائے بخشایش است
حدیث پراگندہ بپراگند — چو پیوستہ شد مغز جاں آگند

شاہنامہ جلد چہارم ص ۳۵ سنہ ۱۲۷۵ھ بمبئی۔

اس طرح آلِ سامان کی علمی فتوحات کے زریں کارناموں میں سے جس پر مولانا شبلی ان کے اس قدر مدّاح معلوم ہوتے ہیں ایک کارنامہ بالکل نکل گیا یعنی کلیلہ کی نظم امیر نصر کی فرمایش سے نہیں ہوئی بلکہ اس کے روشن خیال وزیر ابوالفضل بلعمی کے حکم سے۔ اسی کی فرمایش سے وہ ابن المقفع کے عربی ترجمے سے فارسی نثر کے قالب میں آئی اور اسی کے ارشاد سے رودکی نے اس کو نظم کا جامہ پہنایا۔

بلعم دیارِ روم میں ایک شہر کا نام ہی جہاں قبیلۂ بنو تمیم کی ایک شاخ آباد ہوگئی تھی اس نسبت کی بنا پر ابوالفضل بلعمی کہلایا۔[1] وہ اپنے زمانے کا بے نظیر شخص تھا علم و فضل عقل و تدبیر میں لاثانی تھا۔ ناصر خسرو اس کے لیے کہتا ہی۔

بوالفضل بلعمی بتوانی شدن بفضل
گر نیستی بہ نسبت بوالفضل بلعمی

[1] انساب السمعانی طبع یورپ

کا یہ فرض ہے کہ دوسروں کے آرا پر ہی اعتماد نہ کرے بلکہ اپنے اجتہاد سے بھی کام لے۔

رودکی اگرچہ غزلیات کے لیے مشہور ہے لیکن افسوس سے کہا جاتا ہے کہ آج وہ کبریت احمر کی طرح نایاب ہیں۔ ذیل میں ایک مطلع اور خمریہ غزل رودکی کی پیش ہیں۔ مطلع

کس فرستاد بسرّ اندر عیار مرا　　که مکن یاد بشعر اندر بسیار مرا

غزل

می آرد شرف آدمی پدید　　آزاده نژاد از درم خرید
می آزاده پدید آرد از بد اصل　　فراوان هنر است اندرین نبید
هر آنگه که خوری می خوش آنگهست　　خاصه چو گل و یاسمن دمید
بسا حصن بلندا که می گشاد　　بسا کره نوزین که بشکنید
بسا دون بخیلا که می بخورد　　کریمی بجهان در پراگنید

رودکی کے قصائد کی نسبت فرماتے ہیں۔

"قصیدے کا جو طریقہ رودکی نے قائم کیا آج تک قائم ہے یعنی ابتدا میں تشبیب یا بہاریہ وغیرہ پھر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز پھر ممدوح کا عدل و انصاف شجاعت و دلیری کا ذکر پھر دعائیہ صنائع شاعری میں ایک صنعت ہے جس کو ترصیع کہتے ہیں یعنی دونوں مصرعوں میں باہم وزن الفاظ لاتے ہیں مثلاً عربی سے

رما در اثر قہر او کند سوف　　ہما در اثر لطف او کسے شمشاد

یہ صنعت رودکی کے تمام قصیدوں میں پائی جاتی ہے۔"

(شعر العجم، صفحہ ۲۸)

یہ ایک ایسا بیان ہے جس کا تسلیم کیا جانا ہماری موجودہ معلومات کی روشنی

گئے ہیں جو امیر ابونصر مملان کی مدح میں ہیں۔ ثبوت میں اسی قصیدے کا یہ شعر کافی ہوگا

سردار بزرگان ملک عالم بونصر سالار امیران ملک گیتی مملان[51]

پانچویں قرن ہجریہ کے ربع دوم میں آذربائیجان میں ایک خاندان جو خاندانِ کرکوسے کہلاتا تھا حکمران تھا۔ حکیم قطران تبریزی العضدی اس خاندان کے دو افراد کا مداح رہا ہے۔ پہلا یہی ابونصر جس کا پورا نام ابونصر محمد بن مسعود بن مملان ہے جو خود بھی مملان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ قطران کے اکثر قصائد اس کی مدح میں ہیں۔ یہ ابونصر غالباً ۴۳۲ھ اور ۴۳۵ھ کے درمیان کسی وقت فوت ہوتا ہے جب سلجوقیوں نے ایران پر اپنا اقتدار قائم کر لیا یہ خاندان ان کا مطیع ہو گیا

قصیدے کی تشبیب کے اشعار غزل کی مثال میں پیش کرنا تسلیم، اجتہاد مانا جا سکتا ہے غزل کی دوسری مثال میں مولانا نے یہ ابیات انتخاب کیے ہیں:-

"مشوش است دلم از کرشمہ سلمے چنانکہ خاطر مجنوں ز طرۂ لیلے
چو گل شکر دہیم در دل شود شکیں جو زیں رشتے تو وارہانی از صفرا
مردہ نرگس تو آب جادوے بابل گشادہ غنچہ تو باب معجز عیسے[52]"

(شعر العجم صفحہ ۳۷)

ان اشعار کو ہم نہیں سمجھ سکتا رودکی سے کیا علاقہ ہو سکتا ہے۔ ایسی صاف شستہ اور ہموار زبان، اس کی ترکیبوں کی کثرت اور اضافات تشبیہی پر لحاظ کرتے ہوئے رودکی کی زبان جو نہیں لگتی۔ باب معجز عیسی، آب جادوے بابل، طرۂ لیلی اور کرشمۂ سلمے، ایسی ترکیبیں ہیں جو رودکی کے عہد میں قطعاً غیر مستعمل ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض تذکروں میں یہ اشعار رودکی کے نام پر مرقوم ہوں لیکن ایک محقق

[51] دیوان رودکی صفحہ ۵۵ طبع ایران ۱۳۱۵ش
[52] دیوان رودکی صفحہ ۱۳ طبع ایران۔

میں بھی ابومنصور وہسوداں کا پورا نام سفرنامے میں یوں دیا گیا ہے: "الامیر اجل سیف الدولہ وشرف الملۃ ابومنصور وہسوداں محمد بن مولیٰ امیر المومنین" (سفرنامۂ ناصر خسرو مؤلفہ مولانا حالی صفحہ ۲۷)

مثال دوم میں یہ اشعار دیے گئے ہیں ؎

"کوہ دیگرگونہ بین گشت زرین شد چمن — آب دیگرسان روش گشت تیرہ شد ہوا
گشت جامش باختہ تا شد چمن پرداختہ — گشت بلبل بی نوا تا بوستان شد بی نوا
بار چون زر جفتہ زرین گیاہ سے عقیق — بیستاں چون زرد چہرۂ بیبین نتا بہائے کا
باد سرد آمد چو آہ عاشقاں ہنگام صبح — بانگ زاغ آمد چو از معشوق پیغام جفا"

(شعر العجم صفحہ ۳۹)

یہ اشعار قطران کے اس قصیدے سے لیے گئے ہیں جس کا مطلع ہے ؎

تا دل من در ہوائے نیکواں شد آشنا — از سرشک دیدہ ام گردوں ہمانا بس تنا

فرہنگِ رشیدی میں یہ مطلع البتہ رودکی کی طرف منسوب ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ اس کا مالک قطران تبریزی ہے اور ابونصر مملان کی تعریف میں ہے چنانچہ یہ شعر ؎

خسرو صافی نسب بونصر مملان آنکہ ہست — جسم او صافی ز ہر عیبی چو جان مصطفیٰ[1]

معرکۂ جنگ کی مثال میں شعر العجم میں رودکی کے نام پر یہ اشعار درج ہیں ؎

'بدانگہی کہ دو لشکر ز روی یک دیگر — گراں کنند رکاب و سبک کنند عناں
ز گرد اسپاں تیرہ شود رخ خورشید — ز بانگ مرداں خیرہ شود دل کیواں
یکے کشیدہ سناں و یکے کشادہ حسام — یکے گشادہ کمند و یکے کشیدہ کماں

(شعر العجم صفحہ ۳۹)

یہ ابیات قطران کی یادگار ہیں۔ قصیدے کا مطلع ہے ؎

---

[1] دیوان رودکی صفحہ ۳ طبع ایران۔

میں قریب قریب دشوار ہے اس لیے کہ آج ہمارے پاس رودکی کا کوئی کامل قصیدہ موجود نہیں جس سے اندازہ لگایا جا سکتا کہ قصائد میں اس کا کیا ڈھنگ تھا تشبیب رائج تھی یا نہیں گریز کا دستور مروّج تھا یا نہیں صنعت ترصیع کی نسبت البتہ کہا جا سکتا ہے کہ رودکی کے ایّام میں اس کی رواج پذیری عام نہیں تھی اگرچہ نامعلوم بھی نہیں تھی فرمایا ہے ۔

" قصیدے میں اگرچہ صرف مدّاحی ہی مدّاحی ہوتی ہے لیکن رودکی نے جا بجا
پھول بھی دکھلائے ہیں ؎

از سعتر مرز اگسترده دیباہا بچیں ۔۔۔ در شکوفہ شاخسار بستہ درّ شاہوار
ما ہوائے اوست گیتی ہر چہ در گیتی نسیم ۔۔۔ بر رس اوست گیتی ہر چہ در عالم بہار
ار میان حجرۂ آں آبی روان ہچوں گلاب ۔۔۔ تا بہائے گل شگفتہ بر کنار جوئبار
بود ہر جا بہر بہشت گاہ بار و نقل و مل ۔۔۔ گلستان در گلستان و میوہ اندر میوہ دار"

(شعر العجم صفحہ ۲۸ و ۲۹)

جس طرح حضرت اسحٰقؑ نے حضرت عیص کے دھوکے میں حضرت یعقوبؑ کو دعا دی تھی یہاں یہی حالت مولانا کی ہے وہ رودکی کے تصوّر میں قطران تبریزی کے باغ کی آبیاری میں مصروف ہو گئے ہیں ۔ مولانا شبلی نے یہ ابیات قطران کے اس قصیدے سے لیے ہیں جو ابو منصور وہسوداں کی مدح میں ہے جیسا کہ اسی قصیدے کے مطلع سے ظاہر ہے ؎

افتخار دہر ابو منصور وہسوداں[ف۱] کہ ہست ۔۔۔ مدگالش را بمیران صد ہزاران افتخار

ابو منصور وہسوداں جو ابو نصر مملان کا جانشین ہے آذربائیجان کا بادشاہ تھا ناصر خسرو علوی بلخی جب سنہ ۴۳۸ھ میں تبریز پہنچا ہے تو آذربائیجان کا بادشاہ ان ایّام

ف۱ دیوان رودکی ص ۲۶ میں "مقصود آنکہ" بجائے "وہسوداں کہ" لکھا گیا ہے جو غلط ہے۔

یارش کفتا ہشت است لیکن این را عست
اسد ایں ماعیست خرم چوں بہشت گر نگار
آں بہشت ایزدی استعاره هشت استعیان
ایں بہشت آں ماید آں بہار این آشکار
آں مکافات ثمار است ایں مکافات مدیح
آں عطاے کردگار است ایں عطا نے شہریار "
(شعر العجم صفحہ ۴۴)

یہ شعر اسی قصیدے کے ہیں جو ابو منصور و امیر دانا کی تعریف میں ہے اور جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

بعض بعض قصیدوں میں ایسی باتوں کا التزام کیا ہے جن کی تقلید کی سے نہیں کی۔ مثلاً ایک قصیدہ میں ۳۲ شعروں کا کہا ہے جس میں صرف مطلع ہی مطلع ہیں پہلا مطلع یہ ہے۔

ندانی در جہاں بے جہاں یار گردانی
دگر یارم نگردانی ندارم بخت گردانی "
(شعر العجم صفحہ ۴)

قبلہ مولانا قطرانی قصائد کے طلسم زار میں کچھ ایسے پھنسے ہیں کہ مخلصی کی صورت اب تک ممکن نہیں ہوئی۔ یہ بتیس مطلع کا قصیدہ حسب معمول ابو نصر مملان کی تعریف میں ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

که تو آں تاج طوفانی و تو شاہ طلالی — به موج بحر عمانی به کعبہ هم مسلمانی
الا ای آنکہ بر دلہا نصرت داد ارزانی — ازو دولت گرانی یافت مدحت گوید ارزانی[1]

---
[1] دیوان رودکی صفحہ ۸۷

من آں کشیدم و آں دیدم از غم ہجراں — کہ ہیچ آدمی نیست دیدہ در دوراں [1]

یہ قصیدہ بھی ابو نصر مملان کی مدح میں ہے چنانچہ یہ شعر ؎

مقام نصر وبہا ناصر ولی بونصر — چراغ لشکر و خورشید مملکت مملاں

اسی قصیدے میں ابو نصر کی اُن لڑائیوں کا بھی ذکر آیا ہے جو اس نے اردبیل اور دارمور میں لڑی ہیں ؎

وعاتق راپس پیکار اردبیل ذلیل — سردش راپس پیکار دارمور عیال

ابو نصر کے ہاتھوں امیر موغان کی شکست کا ذکر بھی اسی قصیدے میں آتا ہے۔ اس کے بعد علامہ یوں رقم طراز ہیں

"قصیدے کے متعلق ہمارا شاعر اسی قدر گریز ہے یعنی تشبیب کہتے کہتے ممدوح کا ذکر اس طرح چھڑ جائے جس طرح بات میں سے بات پیدا ہو جاتی ہے یہ بالکل نہ معلوم ہو کہ بہ قصد و ارادہ ممدوح کی مدح شروع کی ہے رودکی کی اکثر گریزیں اسی قسم کی ہیں مثلاً ایک قصیدے میں ہجران کا حال لکھتے لکھتے کہتا ہے ؎

با دو اورمی کنار باغ پر دیدار کرد — چوں کنار ابراں راکرد دست پادشا"

(شعر العجم صفحہ ۳۹)

میں نہیں کہہ سکتا کہ رودکی کے قصائد ایسے ہی برجستہ ہوتے تھے جس کے شبلی مدعی ہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ رودکی کے محاسن شاعری کا یہ خوبصورت موتی یعنی شعر بالا اصل میں قطران کی ملک ہے جیسا کہ بعد میں آنے والے شعر خسرو صافی نسب بونصر مملان آنکہ ہست الخ سے ظاہر ہوتا ہے اور جس کو میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ اسی گریز کی دوسری مثال میں فرمایا ہے -

"مثلاً باغ کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے ؎

---

[1] دیوان رودکی صفحہ ۵ ۱۲۱۵ھ

متعلق علامہ شبلی فرماتے ہیں۔

"رودکی نے ۳۰۴ھ میں وفات پائی اس کا دیوان ایران میں چھپ گیا ہے"

(شعر العجم صفحہ ۴۴)

اس عبارت میں مولانا کو دو سہو لاحق ہوئے پہلا رودکی کی تاریخ وفات کے متعلق ہے مولانا ایک باکمال اور وسیع النظر مورخ ہیں اس امر کا سب کو اعتراف ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تاریخ وسن جو تاریخی معلومات کا ایک نہایت وسیع اور اہم حصہ ہے اول تو اس کا وہ بہت کم ذکر کرتے ہیں اور اتفاقیہ اگر ذکر کر بھی دیا تو اکثر حالات میں غلط لکھتے ہیں۔ اس تاریخ کے متعلق مجھ کو جو اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ امیر نصر ۳۰۱ھ میں آٹھ سال کی عمر میں تخت نشین ہوتا ہے اس کے جلوس کے تین سال بعد اگر رودکی انتقال کرتا ہے تو اس کی شہرت نصر کے ہاں رسائی اور مدح گوئی سفر ہرات وغیرہ کے لیے جہاں بقول نظامی پورے چار سال نصر نے گزارے ہیں اور اس واقعے کے خود علامہ بھی معترف ہیں (شعر العجم صفحہ ۳۰) کافی وقت نہیں ملتا اس لیے یہ تاریخ ناقابل اعتبار ہے انساب السمعانی میں اس کی وفات ۳۲۹ھ دی گئی ہے جو بالکل صحیح ہے

یہ "دیوان رودکی" رودکی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا اگرچہ ایک قصیدہ[1] اور بعض قطعات رودکی کے بھی اس میں شامل ہیں[2] اس کا نام اگر دیوان قطران تبریزی ہوتا تو موزوں تھا۔ دیوان کے تمام قصائد قطران کے قلم سے نکلے ہیں۔

---

[1] اس قصیدے کا مطلع ہے ۔

مادر مے را بکرد باید قربان — بچہ اورا گرفت و کرد بزندان

یہ قصیدہ تاریخ سیستان مرتبہ ملک الشعرا بہار میں بھی (ص ۳۲۳ تا ۳۱۷) منقول ہے

[2] اس میں اکثر قطعے ایسے ہیں جو تاریخ ابوالفضل بیہقی میں رودکی کے نام لکھے گئے ہیں۔

موسم بہار کے ذکر میں مولانا نے یہ اشعار بھی رودکی کے نام پر درج کیے ہیں ؎

"ہر آنچہ بست میان ارم بہم شداد　　ہر آنچہ کرد بزیر زمیں نہاں قارون
سرشک ابر پراگندہ کرد در بستاں　　نسیم باد پدیدار کرد در ہامون"

(شعرالعجم صفحہ ۴۲)

اس قصیدے کا مطلع ہو ؎

منم غلام خداوند زلف غالیہ گون　　کہ ہست چوں دل من زو نہادوان نگوں

اسی قصیدے میں ذیل کا شعر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہو کہ وہ قطران کی ملک اور ابونصر مملاں کی مدح میں ہو ؎

مکان نصرت و اقبال میر ابونصر آں　　کہ ہست طالع او جفت طالع میموں[۵۱]

موسم بہار کے ذکر میں آیندہ یہ اشعار مذکور ہیں ؎

"ملیحان شتیمون کرد اکنوں سرمکاروں　　کہ گردوں گشت از دیر گرد صحرا گشت ابر پرچوں
اگر خواہی نشان دوں نگہ کن لالہ صحرا　　اگر خواہی نشان گرد سگرا در گردوں"

(شعرالعجم صفحہ ۴۲)

یہ قصیدہ بھی قطران کے تبرکات میں شمار ہونا چاہیے جو غالباً کسی وزیر ابوالفتح کی مدح میں مرقوم ہوا ہو چنانچہ شعر ذیل ؎

چراغ فتح تو ابوالفتح آنکہ یزداں کرد پیدا ہی　　مدبش از جان نوشرواں دلش از فہم افلاطوں[۵۲]

رودکی کے کلام کے اصلی نمونے وہی ہیں جو لغات اسدی تاریخ ابوالفضل بیہقی لباب الالباب محمد عوفی المعجم فی معاییر اشعار العجم معیار الاسعار حدائق السحر فرہنگ جہانگیری و رشیدی میں ملتے ہیں۔ تذکروں میں جو اشعار اس کی طرف منسوب ہیں وہ اس میں شک نہیں رودکی سے بہت کم علاقہ رکھتے ہیں۔ اس کی وفات کے

---

۵۱ دیوان رودکی صفحہ ۶۱　　۵۲ دیوان رودکی صفحہ ۶۶

اس واقعے نے اس کے قلب کو گداز کر دیا ہے، اس کا دل درد سے بھر آیا ہے، وہ شہر کی تباہی اور مرنے والوں کے ماتم میں ذیل کے اشعار اس کے قلم سے تراوش پاتے ہیں ؎

بود شهری در آفاق چشت ار شهیر — نامی و بمال و به نیکوئی و جمال
ز بار و بوش به خلق بود خوشا بوش — ز خلق و مال همه شهر بود مالامال
در او بکام دل بودند هر کسی مشغول — امیر و بنده و سالار و دهقان همال
یکی بمستی ایر و یکی بمدرسه حلق — یکی بمستی نام و یکی بمستی مال
یکی بکو اسپ جام و بسماع غزل — یکی بساحت ... و بر تکاوران
... بود دل ما اسیر آن شیرین گوئی — ... بود دل ما بکوی ... حال
نکار جوئیش ... کرد هر کسی تدبیر — ... جوئیش ماهی ... ستان
بیم چو ان کردل کسی بر آرد قیل — بیم چو ان کر ... بر آرد ... ل
خدا بمردم شهر بر نگست ... — جیان ... آتش ... تال
فرا گشت نشیب و نشیب گشت فراز — ... گشت ... و ... گشت ... ال
دریده گشت ... و ... دریده کرد ... — ... گشت ... ور ... سال
بسا سرای که با ... همی بست ... — ... که تا ... همی ... و ... لال
از آن ... ماند ... آثار — و ران سرای ... کمر گمون اطلال
کسیکه ... بود ... بود ... — ... ...
یکی سوا ... گیسی ... کر ... — یکی سو ... گیسی ... یکی ... سال
همی ندیده ندیدم ... — ... ... و ... سال
کمال دو ... ... کمال بهان — کمی ... که ... کمال [1]

---

[1] دیوان رودکی ص ۶۹ و ۳۰ طبع ایران

قطران الحکیم شرف الزماں قطران عضدی تبریزی شمال مغرب ایران میں پانچویں صدی کے ربع اول کے اختتام پر شعرا کا ایک نیا گروہ پیدا ہوا جس نے مشرقی ایرانی شاعری کے مقابلے میں اپنے لیے نئے میدان تلاش کیے سامانی اور غزنوی شعرا کا مایۂ نشاط زیادہ تر واقعہ نگاری اور سیدھی سادی باتوں کو محض حسن بیان کے ذریعے دل کش بنا دینا تھا، ان کے استعارے اور تشبیہیں اکثر موجودہ اشیا سے تعلق رکھتی تھیں شعر میں عام سلاست غالب تھی اور ان کے معانی نزاکت سے خالی تھے اس شاعری کے مقابلے میں نئے گروہ نے شعر کا دارومدار زیادہ تر تصنع اور صنعت پر رکھا وہمی اور غیر محسوس تشبیہ و استعارات کام میں لائے مضمون بندی میں تکلف اور نزاکت سے کام لیا، موسیقیت کو غیر ضروری فروغ دیا، مبالغہ، تجنیس اور ترکیب آرائی کو شعر کا اصلی زیور بنایا۔ ان میں سب سے مقدم منوچہری دامغانی ہے، قطران تبریزی اور اسدی طوسی ان کے مقلد ہیں اس گروہ کے آخری ... نظامی گنجوی ہیں ان شعرا کے ہاں شاعری گویا خوبصورت الفاظ کے جمع کر دینے کا نام ہے۔ جیسی قطران کی شاعری کا اساسی جوہر ہے روحی ولوالجی حکیم قطران کا معتقد معلوم ہوتا ہے چنانچہ کہتا ہے ؎

مطلع و مقطع قصائد را سوم قرنی و قطران راکم

ایک قصیدے میں جو دیوان میں موجود ہے اور جس کا مطلع ہے ؎

بود محال ترا داشتن امید محال نما لیے کہ ساختہ ہابستہ بر یک حال

شہر تبریز میں زلزلہ آنے کا ذکر ہے، قطران جو انسانی زندگی کے واقعات سے اثر پذیری کو ایک قسم کا ابتذال سمجھ کر کبھی ان کی طرف توجہ مبذول کرنے کا روادار نہیں، اس موقع پر کسی قدر جذبے، اور واقعیت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ زلزلے کا واقعہ ایک عالمگیر تباہی تھی جس میں چالیس ہزار انسان ہلاک ہوئے

نالۂ من نگر شگفت مدار — کو بسو زار زار نالہ زروے
بیند جوئی جیو سیابی مار — از جیو دست در زمانہ بشوے

قبلہ شبلی فرماتے ہیں

"تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ سب سے پہلے جس نے فارسی زبان میں دیوان مرتب کیا وہ رودکی تھا" شعر العجم صفحہ ۲۰

رودکی کا پہلا صاحب دیوان ہونا تمام اساتذہ کے نزدیک مسلّم ہے لیکن بقول نظامی عروضی حنظلہ بادغیسی المتوفی ۲۱۹ھ اس شرف کا زیادہ مستوجب ہے۔ رودکی کے زمانے میں خود رودکی کے اشعار اور اس کے معاصرین کے کلام کو مشاہدہ کرنے سے پایا جاتا ہے کہ فارسی شاعری کا وہ زمانہ جیسا کہ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے ابتدائی زمانہ نہیں تھا بلکہ اس نے قرار واقعی ترقی کر کے تمام ایسے ضروری اور خصوصی خط و خال پیدا کر لیے تھے جن کی رو سے دنیا کی اور زبانوں کی شاعری سے سہولت کے ساتھ تمیز ہو سکتی تھی۔ اس میں وہ تمام جوہر مشاہدے میں آتے ہیں جو مقامی آب و ہوا اور ایرانی نژاد طبائع کی نمایاں خصوصیت ہیں۔ قومی روایات غیر ملکی آب و ہوا کے اثرات نے اس کے عروض اور ان تشبیہات استعارات اور تلمیحات پر ایسا رنگ جما دیا ہے۔ علاوہ بریں فن شعر نے رودکی کے ایام میں وہ عمومیت حاصل کر لی تھی کہ شعرا کثرت سے موجود تھے[1] ان ایام میں صاحب تصنیف ہونا معمولی بات

[1] منوچہری دامغانی بعض شعرائے سامانی کی طرف تلمیح کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

در خراسان بو شعیب و بوذر آن ترک کشی — وان صبور پارسی وان رودکی چنگ زن
وان دو کرگانی دو دو رازی دو دو ولوالجی — شہرہ سحری و سہ کا بدر و سعد بودی معنی
از کہ ارنج و تیج از مردیج از دلیج مار — ہمت نیشاپوری و سہ طوسی و سہ لوکس

اس سے واضح ہوتا ہے کہ شعرا ان ایام میں کثرت سے موجود تھے۔

زلزلہ شب پنجشنبہ سترہ ربیع الاول ۴۳۴ھ کو ایام مسترقہ میں نماز عشا کے بعد آیا تھا شہر کا ایک حصہ بالکل تباہ ہو گیا تھا اور دوسرا سالم رہا ان ایام میں آذربائجان کا بادشاہ ابو نصر مملان تھا۔ حکیم ناصر خسرو بلخی تبریز میں ۴۳۸ھ میں پہنچتا ہے قطران بھی اس سے ملنے آیا تھا حکیم موصوف کہتا ہے "در تبریز قطران نام شاعرے را دیدم شعرے نیک می گفت اما زبان فارسی نیکو نمی دانست پیش من آمد دیوان منجیک و دیوان دقیقی بیاورد و پیش من بخواند و ہر معنی کہ او را مشکل بود از من پرسید با او بگفتم و شرح آں بنوشت و اشعار خود بر من خواند" (سفرنامہ صفحہ ۲۷) بقول شاہد صادق[1] قطران ۴۶۵ھ میں وفات پاتا ہے۔

میرے خیال میں مذکورۂ بالا بیانات کافی شہادت ہیں اس امر کی کہ موجودہ دیوان رودکی کا نہیں ہے بلکہ حکیم قطران تبریزی کا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبلی نے اس معاملے میں مولانا محمد حسین آزاد پر دیباچہ نگار دیوان رودکی کے بیانات پر اعتماد نہیں کیا اور اپنے اجتہاد پر بھروسا کر کے اس فاحش غلطی کے مرتکب ہوئے اگرچہ آزاد بے سخندان فارس ہیں اور دیباچہ نگار نے دیباچۂ دیوان میں کافی ہوشیار کر دیا تھا آزاد گو "تحقیق کے میدان کا مرد نہ ہو" یہاں اس سے چوک نہیں ہو سکتی تھی[2]۔

ذیل میں رودکی کا ایک مرثیہ جو اس کے کسی معاصر نے لکھا ہے نقل کیا جاتا ہے۔

ع رودکی رفت و ماند حکمت اوے — مے بریزد نریزد از مے بوے

شاعرت کو کنوں کہ شاعر رفت — نبود نیز شاعرے چون اوے

خون گشتن آسمان یتیم از غم اوے — راندہ شد مرثیہ گفتن آیین روے

---

[1] مصنف محمد صادق صاحب صبح صادق۔

[2] دیکھو مکاتیب شبلی صفحہ ۲۴۲ مطبوعہ معارف سنہ ۱۹۱۶ء

میرے نزدیک رودکی کی دائمی شہرت کا باعث یہ امر ہو کہ شاہی دربار کے چار ارکان اساسی یعنی دبیر، شاعر، طبیب اور منجم میں شاعر کو سلاطین کی درگاہ میں پہلا روشناس کرنے والا شخص رودکی ہو۔ فارسی میں قصیدہ نگاری جو بارگاہ سلاطین میں شاعر کی رسائی کا بدیہی نتیجہ ہو رودکی سے شروع ہوتی ہو اور اسی بنا رودکی آدم الشعرا اور سلطان الشعرا مانا جاتا ہو۔

رودکی کا فارسی زبان پر کیا احسان ہو؟ اس سوال کا جواب ہم اپنی موجودہ معلومات کی روشنی میں کچھ نہیں دے سکتے اس کا سارا کلام ضائع ہو گیا ہو لیکن ایک امر قابل ذکر ہو، اس کو فارسی زبان پر غیر معمولی عبور تھا کیونکہ اب تک ایک ہزار سال گزر جانے کے باوجود دیکھا جاتا ہو کہ ہماری کتب لغات مشکل اور متدرس الفاظ کی تشریح کے وقت رودکی کا کلام بطور سند پیش کرتی ہیں۔

رودکی کے ہاں خواہ غزل ہو یا قطعہ حقیقت نگاری سب سے نمایاں وصف ہو جو واقعات اس پر گزرتے ہیں نظم میں کہتا جاتا ہو، اس سے بحث نہیں کہ ایسا کرنے میں خود اس کا پردہ فاش ہوتا ہو مثلاً یہ مطلع ملاحظہ ہو ؎

کس فرستاد بسر اندر عیار مرا   کہ مکن یاد بشعر اندر بسیار مرا

اس میں تلمیح ہو اس کی زندگی کے کسی واقعے کی طرف جو خیالی نہیں ہو اور حقیقت میں اس پر گزرا ہو، وہ حقیقت میں زندہ دل اور عشرت دوست تھا اس کی زندگی فارغ البالی خوش حالی اور ثروت کے آغوش میں بسر ہوئی ہو۔ جذبات انسانی کی المناک حقیقت کا ذکر اس کے ہاں کم ہو، زندگی اس کے لیے گلزار ہو، راحت و شادمانی اور بے فکر زندگی کی تلقین اس کے ہاں عام ہو مثلاً ؎

خور بشادی روزگار نوبہار   میگسار اندر تکوک شاہوار

نظیر اکبرآبادی کے ساتھ "دیکھ ڈال" کا وہ جس کو اس کا بھی مقولہ ہو چنانچہ کہتا ہو ؎

تھی۔ ابو الحسن شہید بلخی، خواجہ مرادی، ابو موسیٰ فرالادی، ابو طاہر خسروانی، ابو العباس فضل الربحی، ابو طاہر الطیب المصعبی، ابو المؤید بلخی، طیان مرغزی، دقیقی وغیرہ اس زمانے کے مشاہیر اساتذہ سے ہیں اور ان میں اکثر ملکہ یوں کہیے قریب قریب تمام مناسب تصانیف گزرے ہیں اور تمام اصناف نظم پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اقسام شعر اور عروض فارسی نے ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی تھی رودکی کی کلیلہ و دمنہ، ابو شکور کا آفرین نامہ ۳۳۳ھ ابو المؤید بلخی کی مثنوی یوسف زلیخا اور شاہنامۂ بزرگ (فارسی نثر میں تاریخ عجم پر ایک مبسوط تصنیف تھی) دقیقی کا دیوان اور اس کی داستان گشتاسپ و ارجاسپ جس میں آخر الذکر کے سوا آج سب مفقود ہیں، نمایاں ثبوت ہیں اس امر کی کہ رودکی کے دور میں صاحب تصنیف ہونا کوئی بڑی بات نہیں تھی جب اسدی طوسی اپنی لغتِ فرس پانچویں قرن کے ربع سوم میں لکھنے بیٹھا ہے تو الفاظ کا استعمال بتانے کے لیے اساتذہ کا کلام نقل کرتا ہے ان میں اکثر سامانی دور کے شعرا شامل ہیں اب تاوقتیکہ اس کے پاس ان شعرا کے قصائد اور دواوین موجود نہ ہوتے وہ اپنا لغت تیار نہیں کر سکتا تھا۔

رودکی کی شہرت راقم کے خیال میں اس لحاظ سے نہیں کہ وہ پہلا صاحب دیوان ہے بلکہ اس کے وجوہ کچھ اور ہیں، اوّل تو وہ ایک ایسی غیر معمولی شخصیت کا مالک ہے کہ خواہ وہ کسی ملک اور کسی زمانے میں ہوتا اپنی شہرت کا سکہ معاصرین اور اخلاف کے دلوں پر ضرور جماتا، دوسرے وہ ایک بے نظیر شاعر تھا، ابو سعد الادریسی اسے اوّل درجے کا شاعر مانتا ہے، ابو الفضل بلعمی عرب اور عجم میں لاثانی کہتا ہے[۵] اور منوچہری خراسان کے چار مشہور حکما میں اس کا شمار کرتا ہے۔ ۰

---

[۵] انساب السمعانی صفحہ ۲۶۲ طبع یورپ

جب لالہ کھل جائے تم بھی پیالہ ہاتھ میں لے لو ؎

شگفت لالہ تو ریحان لشکمان کہ ہمی — ربیق لالہ بکف بر بہادہ بہ ریحان

اس کی شاعری کا ایک امتیازی جوہر جو اس کو فارسی شعرائے قدیم وجدید سے ممیز کرتا ہے یہ ہے کہ اس کا معشوق اور مخاطب ہمیشہ صنفِ نازک سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک مقام پر کسی شاہد برقع پوش کو خطاب کر کے کہتا ہے ؎

نقاب اندرون شود خورشید — گر تو بر داری از دو لالہ عیب

کبھی وہ کنیزکِ نیکو کا ذکر کرتا ہے اور کبھی ترکِ نارپستاں کا ؎

مرا کنیزکِ نیکو کہ میل داشت بدو — لشت زیارت او برد او بہ پہناں بود

ہمی خرید و ہمی ریخت بے شمار درم — بہ شہر ہر چہ ہمی ترکِ نارپستاں بود

ایک موقعے پر یارِ مہرباں کی یاد اس کے دل میں گدگدی لیتی ہے ؎

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی — یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

رودکی کی شاعری اپنے گردوپیش کے گزرنے والے واقعات سے غیر متعلق نہیں بلکہ اس کے ہاں اس میں پوری پوری دلچسپی کا اظہار کیا گیا ہے۔ دوستوں کی وفات پر ماتم، ملک کی فتح پر خوشی الغرض اس قسم کے واقعات بھی اس کے ہاں ملتے ہیں جس سے ظاہر ہے کہ اس کی شاعری ما آستا مراج نہیں ہے جس کو انسانی واقعات اور زندگی کی وابستگیوں سے کوئی واسطہ نہ ہو۔

عمر کے آخری دور میں اُس کو مُصیبت آلام اور تلخیوں سے پالا پڑا ہے جس کی جھلک اس کے اشعار میں موجود ہے اُس کا ایک قطعہ جس میں اُس نے اپنے بڑھاپے اور گزشتہ عظمت کی ماتم داری کی ہے سعداں فارس اور شعر العجم میں موجود ہے یہاں میں ایک مختصر سی اسی قسم کی نظم پر کفایت کرتا ہوں ؎

بسا کہ مست درین خانہ بودم و شاداں — چناں کہ جاہ من افزون بدار امیر و ملوک

باخرد مند بے وفا بود ایں بخت — خویشتن خویش را بکوش تو یک لخت
بخور و بدہ کہ پس پشیماں شود — ہر کہ بخورد و بدادار آں کہ بہشت

عمر خیام کی طرح اس کی نصیحت بھی یہی تھی کہ موت کے آنے سے قبل تم دنیا کی نعمتوں سے حظ حاصل کرو۔

توشۂ جان خویش ازو بردار — پیش کاید بمرگ یا آکیش

دنیا کا قدیم سے دستور چلا آتا ہے کہ مردہ زندہ نہیں ہوتا، اور زندہ کی آخری آرام گاہ گورستاں ہے۔

مردہ نشود زندہ زندہ بستوداں شد — آئین جہاں چنیں تا گردوں گرداں شد

دنیا کی بے مہری اور بے وفائی شعرائے فارس کی عام تلقین ہے فردوسی اور نظامی اس کی تکرار سے کبھی نہیں تھکتے رودکی ان خیالات کو سب سے پہلے اشاعت دینے والا ہے۔

مہر مفگن بریں سرائے سپنج — کیں جہاں پاک بازی بیرنج
نیک را افسانہ داری شد — بد او را کمرت سخت بتنج

دنیا خست کے قابل نہیں۔ اس سے نیکی کی توقع محض ایک افسانہ ہے البتہ بدی اس سے سرزد ہوتی رہتی ہے اس لیے اس کی بدیوں کے لیے کمربستہ رہ، تیری زندگی کا مقصد دنیا سے بے پروائی اور شادکامی کا استحصال ہونا چاہیئے ولہٗ

از دلے اندہی مگریں وشادی ماتی آسانی — نہ تیمار جہاں دل را چرا باید کہ بحسانی

اپنے ملک اور زمانے کے عام رواج کے مطابق رودکی شراب خواری کا عادی تھا اس کو صاف اعتراف ہے وہ کہتا ہے، شراب پینا ہر وقت اچھا ہے لیکن فصل گل میں خاص لطف رکھتا ہے۔

ہر آنگہ کہ خوری مے خوش آنگہ است — خاصہ چو گل و یاسمن دمند

اور حسے کا یہ ورں ع چشمۂ حصرساز آب ازلب عام گوہری۔ علی ہذا اول کا یہ ورں ع صفتے است حس اوراکہ لوہم دریابد اور مقصد کا یہ ورں ع امشب آتشیں روئے گرم تر مدحوا یہاست۔

دقیقی

اس شاعر کے متعلق بھی بعض امور میں مجھ کو مولانا سے اختلاف ہے تمہید میں فرماتے ہیں۔

"دقیقی خاص پایۂ تخت کا رہنے والا تھا اس کا اصلی نام منصور بن احمد ہے ابتدائی تربیت امرائے چغانیہ یعنی ابوالمظفر نے کی تھی لیکن جب اس کا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں بلا کر شاہنامہ کی خدمت سپرد کی دقیقی اپنے دو رمار و کا ادارہ کرچکا تھا اس نے یہ خدمت قبول کی اور کم دبیش میں ہزار شعر لکھے بعضوں کا بیان ہے کہ صرف ایک ہزار شعر تھے جو آج شاہنامہ میں شامل ہیں۔" (شعر العجم صفحہ ۴۵)

دقیقی کا اصلی نام ابو منصور محمد بن احمد ہے وہ بخاری نہیں ہے بلکہ طوسی (لباب جلد دوم صفحہ ۱۱)

دقیقی کے اشعار کی تعداد کے متعلق یہاں ہمارے سامنے دو روایتیں ہیں ایک کی رو سے اس نے بیس ہزار ابیات لکھے دوسری روایت کی رو سے ایک ہزار جب ایک مورخ کے سامنے دو روایتیں موجود ہیں تو اس کا یہ بھی فرض ہے کہ کم سے کم اس امر کی تحقیق کرے کہ ان میں کون سی روایت معتبر ہے ان روایات کے قدیم رواۃ میرے خیال میں محمد عوفی اور فردوسی ہیں عوفی ساتویں صدی ہجری کا مصنف ہے جب کہ فردوسی دقیقی کا قریب قریب معاصر ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ

کنوں ہمانم وخانہ ہماں وشہر ہماں   مرا نگوئی کز چہ شدہ است شادی سوگ

رودکی نے متعدد مثنویاں لکھی ہیں کلیلہ و دمنہ کے علاوہ اسی وزن میں اُس نے کوئی اور مثنوی بھی لکھی ہی جس میں کلیلہ کی طرح چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہوں گی مثلاً یہ اشعار ؎

گفت ہنگامے یکے شہزادہ بود   گوہری و پُرہنر آزادہ بود
شد بگرمابہ درون استاد خوشت   بود فربی و کلاں بسیار گوشت
(جہانگیری)

دیگر ؎

آں کریج وشکرش برداشت پاک   وندر آں دستار آں زن بست خاک
پس زن از دکاں فرود آمد چو باد   آں طرزنگش بدست اندر نہاد
شوئے بکشاد آں طرزش خاک دید   کرد زن را بانگ گفتش کاے پلید[1]

بحرِ تقارب کے علاوہ بحرِ ہزج میں بھی کوئی مثنوی اس نے یادگار چھوڑی ہی مثال ؎

بماہ اندر رہی شد راہ شاہی   رسید او تا سرِ مادستاہی

بحرِ خفیف میں بھی ایک مثنوی اس نے لکھی ہی مثال ؎

دور ترہ از قریں دخویش وتبار   سری ساخت بر سرِ کوہسار

رودکی کے زمانے میں دیکھا جاتا ہی کہ فنِ عروض پوری ترقی کر چکا تھا اکثر فارسی بحور اور اوزان میں اس کے ہاں ابیات پائے جاتے ہیں۔ اوزان میں اسکے دور کے بعد جو اضافہ ہوا نہایت حقیر ہی اور یہ یقینی طور پر کہا جاسکتا ہی کہ اوزان ذیل سے جو اس کے عہد کے بعد ترویج پاتے ہیں رودکی ناواقف تھا مثلاً مضارع کا یہ وزن ؎ ملے رایت رسیدت بیاد نظم عالم۔ اور منسرح کا یہ وزن ؎ عشق ہیچ گو ہر بیست گوہر دل کا اوج

---

[1] جہانگیری صفحہ ۱ نولکشور

میں اس واقعے کو صحیح تسلیم کرتا ہوں لیکن تاریخی واقعات میں علامہ شبلی نے اپنی طرف سے جو رنگ آمیزی کی ہو اُس کے لیے یہ عبارت اچھی مثال ہو۔ اس واقعے کے متعلق سب سے قدیم بیان فردوسی کا ہو جو حسبِ ذیل ہو اور خود مولانا بھی اس کو نقل کرتے ہیں ؎

جوانیش را خوے بد یار بود — ابا بد ہمیشہ بہ پیکار بود
یکایک ازو بخت برگشتہ شد — بدست یکے بندہ برکشتہ شد

دیباچۂ قدیم میں کسی قدر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہو۔ لکھا ہو

"دقیقی مردے بود کہ غلاماں را دوست می داشت چوں از شاہنامہ یک چندے نظم آورد اتفاق چناں افتاد کہ غلامی ترک در آں دو سہ روز خریدہ بود باوے لاہی کرد و آں غلام کاردے بر شکم دقیقی زد و بداں زخم او را ہلاک کرد و ایں شاہنامہ ناتمام ماند"

مولانا نے اپنی طرف سے جو جدت آفرینی کی وہ یہ ہو کہ وہ غلام خوش رو تھا، دقیقی کو اس سے عاشقانہ محبت تھی اور اس محبت میں ہوس کا شائبہ تھا۔ اب یہ تاریخ نہیں رہی ناول نویسی ہو گئی۔ قولہ:-

"دقیقی کے زمانے تک فارسی زبان میں عربی الفاظ اس طرح مخلوط تھے کہ دونوں سے مل کر گویا ایک نئی زبان پیدا ہو گئی تھی۔ عباس مروزی کے کل چار شعر ہیں لیکن عربی الفاظ فارسی سے زیادہ ہیں۔ رودکی و شہید بلخی وغیرہ کا کلام بھی اسی کے قریب ہو۔ سب سے پہلے جس نے فارسی زبان کو اس آمیزش سے پاک کر کے مستقل زبان کی حیثیت قائم کی ہو وہ دقیقی ہی ہو۔ اس کے سیکڑوں شعر پڑھتے چلے جاؤ عربی کا ایک لفظ نہیں آتا۔"

(شعر العجم صفحہ ۵)

فردوسی اس معاملۂ خاص میں عوفی کے مقابلے میں زیادہ صحیح معلومات دے سکتا ہو کیونکہ دقیقی کا ہم عصر اور ہم وطن ہونے کے علاوہ اس کے حالات میں دلچسپی بھی لیتا ہو۔ فردوسی نے دقیقی کا ذکر کرتے ہوئے ایک چھوڑ' دو مقام پر اپنا بیان دوہرایا ہو ایک جگہ کہا ہو ؎

زگشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار　　بگفت و سرآمد درار و زگار[۱]

دوسرے موقعے پر خود دقیقی کی زبان سے کہا ہو ؎

زگشتاسپ و ارجاسپ بیتے ہزار　　بگفتم سر آمد مرا روزگار[۲]

فردوسی کی اس تکرار کے باوجود اس موقعے پر مولانا اگرچہ دونوں روایتیں نقل کرتے ہیں لیکن کوئی تنقیدی فیصلہ نہیں دیتے۔

ان روایات کے متعلق ہفت اقلیم کا حوالہ دیا ہو مگر اس کی اصل عبارت یہ ہو۔

"دقیقی بقول اقل بیست ہزار و بقول اکثر ہزار بیت از داستان گشتاسپ درسلک نظم انتظام دادہ بردست غلامی کشتہ گردید" جو صاحب ہفت اقلیم کا مقصد تھا شبلی نے بالکل اس کے برعکس لکھا اور ضعیف روایت کو فروغ دیا۔

نوح بن منصور کا دقیقی شاعر کو شاہنامے کی خدمت پر مامور کرنا جس کے مولانا مدعی ہیں اگرچہ ایک مقبولہ روایت ہو لیکن میں تسلیم نہیں کرتا اس کے متعلق آیندہ لکھا جائے گا۔

قولہٗ "دقیقی کا ایک خوش رو غلام تھا جس سے اس کو عاشقانہ محبت تھی لیکن افسوس ہو کہ اس محبت میں ہوس کا شائبہ تھا غلام نہایت غیور تھا اس نے ننگ کو گوارا نہ کیا اور دقیقی کا خاتمہ کر دیا" (شعرالعجم صفحہ ۴۶)

---

[۱] شاہنامہ صفحہ ۳ جلد اول طبع بمبئی ۱۲۷۶ھ۔ [۲] ابتدائی جلد سوم شاہنامہ

ذیل میں دقیقی کی ایک غزل اسی غرض سے سپردِ قلم کی جاتی ہے ؎

کاش کے اندر جہاں شب نیستے — تا مرا ہجرانِ آں لب نیستے
زخم عقرب نیستے بر جان من — گر مرا زلف معقرب نیستے
ور نبودے کوکبش در زیر لب — مونسم تا روز کوکب نیستے
ور مرکب نیستے از نیکوئی — عالم از عشقش مرکب نیستے
ور مرا بے یار باید زیستن — زندگانی کاش یارب نیستے

عباس مروزی کے اشعار میں عربی الفاظ کی کثرت اس بنا پر ہے کہ متاخرین نے ان کو اصلاح دے کر اپنے رنگ میں رنگ دیا ہے یہ اشعار میں اسی مضمون کی ابتدا میں درج کر آیا ہوں۔ عوفی کے عہد سے پیشتر کا نسخہ اگر دستیاب ہو جائے تو ہم معلوم کر سکیں گے کہ اِن میں اور اُن میں بہت تفاوت ہوگا بلکہ وزن بھی مختلف ہوگا کیونکہ عباس کے عہد میں فارسی زبان میں رمل مثمن میں اشعار رکھے جانا قرین قیاس نہیں صدیوں کے گزر جانے اور ہزاروں زبانوں پر آنے سے ایک شعر یا قطعے کی حیثیت بہت کچھ بدل جاتی ہے دوسرے ہر وقت کے زباں داں قدیم کہاوتوں اور ضرب الامثال کو اپنے عہد کی زباں میں رائج الوقت مذاق کے مطابق نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور شاعر کے اصلی الفاظ کے القا کا کچھ لحاظ نہیں رکھتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زمانے کے انقلاب کے ساتھ ساتھ یہ الفاظ یا اشعار اپنی ہیئت بدلتے بدلتے کچھ کے کچھ ہو جاتے ہیں مثال کے لیے میں بہرام گور کا شعر پیش کرتا ہوں۔ دولت شاہ اس کو ذیل کی شکل میں لکھتا ہے ؎

منم آں پیل دمان و منم آں شیر یلہ — نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ

مصرع آخر بہرام کی معشوقہ دلآرام کی طرف منسوب ہے۔ محمد عوفی لباب الالباب میں یوں لکھتا ہے ؎

میں شبلی کے اس کلیہ کی تائید نہیں کر سکتا کہ دقیقی کے زمانے تک فارسی میں عربی الفاظ اس طرح مخلوط تھے کہ گویا ایک نئی زبان بن گئی تھی یہ اِدعا تاریخ اور قانونِ قدرت دونوں کے خلاف ہے۔ اگر یہ دعویٰ سلجوقی دَور کے لیے کیا جاتا تو صحیح مانا جاتا۔ زبان کا قانون بالکل مختلف ہے وہ کسی شخص کی ملکیت نہیں کہ اس کی تنہا کوشش اس میں انقلاب پیدا کر سکے ہر دَور کی زبان مختلف ہوتی ہے اور ہر شاعر اپنے عہد میں زبانِ وقت کے تتبع کے لیے اگر اس کو شہرت حاصل کرنا ہے منظور ہے اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ اس کی زبان رائج الوقت اور ٹکسالی ہو۔ کیا آج کسی شاعر کے لیے ولی کے عہد کی زبان میں شعر کہہ کر شہرت حاصل کرنا ممکن ہے؟ میرا جواب یہی ہے کہ ناممکن ہے لیکن دقیقی کے بارے میں صورتِ واقعہ بالکل مختلف ہے کیونکہ رودکی شہید فرالاوی۔ ابوشکور خسروانی دقیقی وغیرہ کی زبان میں کوئی فرق نہیں سب اپنے اپنے وقت کی بولیاں بول رہے ہیں اس عہد میں عربی اور فارسی زبانیں الگ تھلگ تھیں عربی الفاظ جو ایک محدود تناسب میں رائج ہو کر قبولیت عام کا خلعت حاصل کر چکے تھے ہر شاعر کے ہاں ملتے ہیں۔ ان میں دقیقی بھی شامل ہے۔ یہ الفاظ زیادہ تر قطعہ غزل اور قصیدے میں ملتے ہیں۔ اس لیے کہ قافیے کی ضرورت سے عربی وغیرہ کی خوشہ چینی اکثر کی جاتی تھی مثنوی میں اس قسم کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی اسی لیے وہ ان کے اثر سے پاک ہے۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے دقیقی کوئی استثنا قائم نہیں کرتا بلکہ قاعدہ۔ چنانچہ تمثیلاً دقیقی کے اشعارِ ذیل ملاحظہ ہوں جو شبلی نے بھی درج کیے ہیں ؎

گویند صبر کن کہ ترا صبر بر دہد — آری دہد ولیک بعمرے دگر دہد
من عمر خویشتن بصبوری گذاشتم — عمرے دگر بباید تا صبر بر دہد
(شعر العجم ج ۱ ص ۱۰۰)

اں میں ہی مضمون کی حیثیت سے ہو۔ عربی تقلید میں خیالات کا تسلسل اس وقت
کی ہر صنف نظم میں عام طور پر موجود ہے اس لیے دقیقی کی غزلوں میں تسلسل کی
موجودگی موجب استعجاب نہیں ہونی چاہیے۔ رودکی کی ایک مختصر غزل اس
سے قبل مرقوم ہو چکی ہے ناظرین دیکھیں گے کہ اس میں تسلسل قائم ہے۔

قولہ :۔ آج جس چیز کو نیچرل شاعری کہتے ہیں فارسی میں غالباً سب سے پہلے
اسی نے اس کی بنیاد قائم کی۔ (شعر العجم صفحہ ۵۲)

ہر قوم کی شاعری کی جب وہ اپنے سفر حیات کے ابتدائی مراحل میں ہوتی
ہے یہی حالت ہوتی ہے یہ دور فارسی شاعری کا ابتدائی دور ہے طبیعتوں میں سادگی
تھی، زبان میں وسعت اور خیالات میں اوج نہیں تھا رنگینی اور تکلف نامعلوم
تھے شاعروں کی موشگافی اور نزاکت آرائی میٹھی نیند سو رہی تھی اس لیے بدیہی
تھا کہ اس عہد کے شعرا زیادہ تر حقیقت نگاری سے کام لیتے اور یہ بات اس عہد
کے ہر شاعر میں پائی جاتی ہے۔ دقیقی بہر حال اس معاملے میں کسی اختراع کا فخر
نہیں رکھتا۔

ہمارے زمانے میں دقیقی کو جو اہمیت دی جاتی ہے اس کی داستان
گشتاسپ و ارجاسپ کی بدولت ہے لیکن ان ایام میں وہ اپنے دیوان کی وجہ
سے زیادہ مشہور تھا۔ ناصر خسرو کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب دیوان
تھا اور قطران تبریزی نے ناصر خسرو سے اس دیوان کی بعض مشکلات حل کی تھیں۔
جب آذربائیجان میں قطران جیسے پائے کا شاعر دیوانِ دقیقی اپنے مطالعے میں
رکھے تو ظاہر ہے کہ دقیقی ایک نہایت غیر معمولی شاعر مانا جاتا ہوگا۔ ادھر لغتِ
فرس اسدی پر سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ رودکی کے بعد جس شاعر
کا کلام اس میں کثرت سے نقل کیا گیا ہے وہ دقیقی ہے۔ عروجی دور تک اس کے

منم آں شیر گلہ منم آں پیل یلہ نام من بہرام گور و کنیتم بوجلہ

ظاہر ہو کہ دولت شاہ کے شعر سے اس شعر کا وزن مختلف ہو لیکن درر غرر تعالبی میں (بقول میرزا محمد بن عبد الوہاب) ابن خرداذبہ کے سند پر یوں مرقوم ہو۔

منم آں شیر شلہ (ژلہ ن) منم آں ببر یلہ منم آں بہرام گور منم آن بوجلہ

اور وزن کی مشکلات رہنمائی کرتی ہیں کہ شعر بالا اصل میں ایک شعر نہیں ہو بلکہ دو شعر ہیں۔

اگرچہ مولانا ابھی گزشتہ بالا عبارت میں دقیقی کے عہد میں عربی فارسی زبانوں کے اختلاط کے قائل ہیں اور دقیقی کو اس اختلاط کا دُور کرنے والا اور فارسی زبان کو اس کی آمیزش سے پاک کرنے والا کہہ رہے ہیں لیکن ذیل میں اپنے نظریے کی تردید میں خود ہی ساعی ہیں اور فرماتے ہیں ۔

"فردوسی کے زمانے تک روزمرہ اور بول چال کی زبان خالص فارسی تھی چنانچہ مثنویوں کی زبان وہی رہی البتہ قصائد میں جس سے لفاظی اور علمی قابلیت کا اظہار بھی مقصود ہوتا تھا عربی الفاظ اور ترکیبیں کثرت سے شامل ہوتی جاتی تھیں" (شعرالعجم صفحہ ۴۳)

میں ان دونوں بیانات کا تخالف اور تضادسیاں کیے بغیر آگے بڑھتا ہوں دقیقی کی غزلوں کی نسبت ارشاد ہوتا ہو ۔

"اس نے بعض غزلیں مسلسل لکھی ہیں اور یہ اس زمانے کے لحاظ سے نئی بات ہوئی" (شعرالعجم صفحہ ۵۲)

فارسی میں موجودہ شاعری عربی تقلید میں رائج ہوئی ہو عربی میں دو اقسام نظم زیادہ رائج تھیں قصیدہ یا قطعہ ۔ ان میں سے صنف اوّل نے فارسی میں زیادہ رواج پایا۔ غزل قصیدہ اور قطعہ میں بلحاظ شکل ظاہر کوئی فرق نہیں اصلی فرق جو

خرد باید آنجا وجود و شجاعت فلک مملکت کے دہد رائگانی (بقیہ)

چند اشعار لغت فرس اسدی سے منقول ہیں ؎

(۱) مہرگان آمد جشن ملک افریدونا آن کجا گاؤ نکو بودش بر مایونا

(۲) اکنوں شگفتہ مے از ترک تاکیں یک چند گاہ ریسپے آہوان سر

(۳) حال گوہر آگینت چو ریپ قبلہ ترسا کمر بمیان زر اندر چاچ بن رود جتا

(۴) یکے صمصام و دعوں کش عدو خوارے جواز دریا
کہ ہر گز سیر ننودے زمعصر واز دل اعدا

(۵) برافروز آذرے ایدوں کہ تیغ بگدر دار نوں
فروغش از بر گردوں کند اجسام را اخگر

ان اشعار سے اوّل تو فردوسی کے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ دقیقی قصیدہ نگاری میں استاد تھا۔ دوسرے اس خیال کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ایرانی شعراء متقدم قصیدے کے میدان میں برخلاف مثنوی کے قافیے یا شکوہ الفاظ کی غرض سے عربی الفاظ مستعار لیتے رہے ہیں۔

قولہ :- "سامانی خاندان ابتدا سے اس بات کا خواہشمند تھا کہ ان کے اسلاف کی داستان نثر سے نظم ہو کر عام زبانوں پر چڑھ جائے لیکن ابھی شاعری نے اس قدر ترقی نہیں کی تھی کہ ایک عظیم الشان تاریخی سلسلہ نثر کے قالب میں آ جائے" شعر العجم ص ۴۵

یہ خیال اصل میں ہفت اقلیم سے ماخوذ ہے اور ہفت اقلیم سے پیشتر اس کا سراغ چلتا ہے۔

ابن اثیر کی اصل عبارت یہ ہے :- ۔

کہ چوں اکلیل سلطنت خراسان و توران بفرق آل سامان مکلل گردید

ہم مشربوں میں اس کی یاد تازہ تھی فرخی کہتا ہو ؎

ناظر از بیرہ مدیح تو دقیقی درگذشت   ز آفرین تو دل آگندہ چناں کز دانہ نار
تا بوقت این زمانہ مردہ را مدت نماند   زین سبب گر بنگری امروز تا روز شمار
ہر گیاہے کز سر گور دقیقی بردمد   گر ببیری ز آفرین تو سخن گوید ہزار

اور عسجدی کہتا ہو ؎

شعر یاد کند روزگار برکیان   دقیقی آنکہ کاستہ شد برو احوال
سحاق ابن براہیم راچہ بہرہ رسد   ز جود برمکیان شعر قافیہ بنوال
بیک دو بیت مدائح خصل داد مرد   صلہ مالک مدار و ممال را زمال

فردوسی کے بیاں سے معلوم ہوتا ہو کہ فنِ قصیدہ میں دقیقی بہتر مانا گیا تھا دقیقی ؎

ستایندۂ شہریاران بدے   بمدح افسر نامداران بدے

اس کا کوئی قصیدہ ہم تک نہیں پہنچا لیکن ذیل میں اُس کا ایک نفیس قطعہ جس میں شاعر نے ملک گیروں اور بادشاہوں کے ضروری اوصاف اور لوازمات گنائے ہیں تاریخ بیہقی سے لے کر نقل کیا جاتا ہو۔

بدو چیز گیرند مر مملکت را   یکے پرنیانی یکے زعفرانی
یکے زر بنام ملک بر نوشتہ   دگر ز آہن آبدادہ یمانی
کرا بویۂ وصلت ملک خیزد   یکے جنبشی بایدش آسمانی
زبانی سخن گوی و دستے گشادہ   دلے ہمش کینہ ہمش مہربانی
کہ ملکت شکاریست کورا نگیرد   عقاب پرندہ نہ شیر ژیانی
دو چیز است کورا ببند اندر آرد   یکے تیغ ہندی دگر زر کانی
بشمشیر باید گرفتن مر اورا   بدینار بستنش پای ار توانی
کرا بخت و شمشیر و دینار باشد   نہ بالاش باید نہ پشت کیانی

معلوم نہیں ہوتی کہ فردوسی اس واقعے کے اخفا کی کوشش کرتا جب کہ یہ امر بھی قرینِ عقل ہو کہ اس کے اظہار سے سلطان محمود کے دربار میں خود فردوسی کی اپنی تصنیف کی قرار واقعی قدر کیے جانے کی توقع ہو سکتی تھی لیکن نوح بن منصور کی شاہنامے کے بارے میں دلچسپی کے سوال کا فیصلہ کرنے سے پیشتر یہ امر مقدم معلوم ہوتا ہو کہ دقیقی کا زمانہ تحقیق کر لیا جائے۔

(۱) محمد عوفی اس کو ابو صالح منصور بن نصر (کذا) (۳۵۰ھ و ۳۶۵ھ) اور نوح بن منصور (۳۶۵ھ و ۳۸۷ھ) کے عہد کا شاعر مانتا ہو دقیقی کے ایک تیسرے ممدوح کا نام ابو سعید محمد مظفر محتاج چغانی دیا ہو عوفی اس قدر اور اضافہ کرتا ہو کہ امیر ابو الحسن علی بن الیاس الآغاجی (والیِ کرمان ۳۱۷ھ و ۳۵۷ھ المتوفی ۳۵۶ھ) اور دقیقی معاصر ہیں۔ ابو سعید محمدؐ مظفر محتاج چغانی کے زمانے سے ہم ناواقف ہیں۔

ایک امیر ابو المظفر چغانی چوں کہ فرخی کا بھی ممدوح ہو اس لیے مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی کا خیال ہو کہ فرخی اور دقیقی کا ممدوح ایک ہی شخص ہو جس کا پورا نام مرزائے موصوف یہ بتاتے ہیں "فخر الدولہ ابو المظفر احمدؐ بن محمدؐ چغانی" (چہار مقالہ ص ۱۶۵ مطبوعہ یورپ) لیکن فرخی کے ممدوح کا نام جیسا کہ آنے والے ابیات سے واضح ہوتا ہو۔ فخر الدولہ ابو المظفر بن احمد محمدؐ چغانی ہو۔ فرخی کے اشعار یہ ہیں ؎

فخر دولت بو المظفر شاہ با پیوستگاں
شادماں و شادخوار و کامراں و کامگار

تا نقش کرد بر سر ہر نقش بر نوشت
مدح ابو المظفر شاہ چغانیاں

بن احمد محمدؐ شاہ جہاں پناہ
آں شہریار کشور گیر و جہاں ستاں

ایک ابو المظفر محمدؐ بن احمدؐ والیِ چغانیاں کا ذکر تاریخ عتبی میں فائق کے حالات

خواستند کہ احوال سلاطین عجم را در سلک نظم انتظام دہند. چوں دراں وقت مرتبۂ نظم عالی نگشتہ بود و ایں شیوہ چندانی شیوع نہ پذیرفتہ ہر آئینہ از حیز قوہ بفعل نمی آمد۔" (دیباچۂ مخطوطہ مملوکۂ پروفیسر آذر)

قولہ - "نوح بن منصور جب ۳۶۶ھ میں تخت نشین ہوا تو پایۂ تخت یعنی بخارا میں بڑے بڑے شعرا موجود تھے ان میں دقیقی خاص پایۂ تخت کا رہنے والا تھا جب اس کا کمال مشہور ہوا تو نوح نے دربار میں بلا کر شاہنامہ کی تصنیف کی خدمت سپرد کی۔ دقیقی اپنے زور بازو کا اندازہ کر چکا تھا اس لیے یہ خدمت قبول کی۔" (شعر العجم صفحہ ۴۵)

سب سے قدیم روایت دقیقی کے شاہنامہ نظم کرنے کے متعلق فردوسی کے ہاں ملتی ہے جو یہ ہے؎

چو از دفتر ایں داستانہا بسے   ہمی خواند خوانندہ بر ہر کسے
جہاں دل نہادہ بریں داستاں   ہماں بخرداں و ہمہ راستاں
جوانے بیامد گشادہ زباں   سخن گوی و خوش طبع و روشن رواں
بنظم آرم ایں نامہ را گفت من   ازو شادماں شد دل انجمن

چونکہ شاہنامے کی داستانوں کا ہر محفل اور مجلس میں قصہ خوانوں کی بدولت چرچا رہتا تھا دقیقی نے اس کی عام ہر دلعزیزی دیکھ کر اس کی نظم کا ارادہ کر لیا اس تجویز کو پسندِ عام کا خلعت ملا۔

یہاں دیکھا جاتا ہے کہ فردوسی مولانا شبلی کے اس عقیدے کی کہ سامانی خاندان ابتدا سے شاہنامے کی نظم کا خواہاں تھا تائید نہیں کرتا اور نہ اس دعوے کی تصدیق کرتا کہ دقیقی نے شاہنامہ نوح بن منصور ۳۶۵ھ و ۳۸۷ھ کے حکم سے شروع کیا تھا۔ نوح نے دقیقی کو اس کام پر اگر واقع میں مامور کیا تھا تو کوئی وجہ

(۲) سابق میں تمام اسناد کا خیال تھا کہ شاہنامہ فردوسی نے ۳۸۹ھ میں سلطان محمود غزنوی کے حکم سے نظم کرنا شروع کیا تھا اور دقیقی چونکہ اکثر مورخین کے نزدیک ۳۶۵ھ میں شاہنامے پر قلم اُٹھاتا ہے اس لیے دونوں شاعروں کی معاصرت کا سوال پیش نہیں آیا۔ لیکن اب جب کہ یہ نظریہ شاہنامے کی شہادت سے غلط ثابت ہو چکا ہے اور ابیات ؎

سی و پنج سال از سرای سپنج ۔۔۔ بسی رنج بردم بامید گنج

اور

چو بر باد دادند رنج مرا ۔۔۔ نبد حاصلی سی و پنج مرا

(یہ ابیات خاتمہ شاہنامہ میں ۴۰۰ھ میں لکھے گئے ہیں) جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود فردوسی ۳۶۵ھ میں اس کام پر مصروف تھا اب یا تو ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ دونوں شاعر معاصر تھے اور دونوں نے ایک ہی وقت بلکہ ایک ہی سال میں شاہنامے پر قلم اُٹھایا لیکن یہ ایک ایسا عقیدہ ہے کہ جس کے لیے کوئی بھی تیار نہیں یا دقیقی کا تقدم مان لیا جائے جس کی تائید فردوسی کے بیان سے ہوتی ہے وہ عام طور پر اس کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتا ہے جس کا صریحی مفہوم یہی ہے کہ دقیقی اُس سے اقدم تھا۔ فردوسی اس کو شاہنامے کا پہلا معمار تسلیم کرتا ہے اور اپنا رہبر اور رہنما بھی مانتا ہے۔ ع

هم او بود گوینده را راهبر

فردوسی کے پاس دقیقی کے شاہنامے کی جو نقل تھی اپنی اصل سے دُور ہو جانے کی بنا پر کثرت سے غلط تھی شاہنامہ ؎

یکی نقل اندرون سست گشتش سخن ۔۔۔ ازو نو نشد روزگار کهن

یعنی بوجہ کثرتِ نقول اُس کے کلام میں اغلاط واقع ہو گئی تھیں۔

(۳) سلطان محمود کے نام فردوسی شاہنامہ معنون کرتے ہوئے گویا ہے کہ میں

کے ذیل میں ملتا ہے جب ابوالمظفر طاہر بن فضل اس ابوالمظفر کو شکست دے کر چغانیان چھین لیتا ہے تو وہ اعانت کی امید میں فائق کے پاس آتا ہے فائق نوح سے اسکی امداد کرتا ہے لیکن اسی اثنا میں طاہر بن فضل بلخ پر حملہ آور ہو کر (۳۷۷ھ میں بقول عوفی) مارا جاتا ہے میرے خیال میں عتبی کا ابوالمظفر محمد بن احمد والی چغانیاں اور فرخی کا فخر الدولہ ابوالمظفر بن احمد محمد والی چغانیاں ایک ہی شخص معلوم ہوتے ہیں فرخی نے اس کا نام بضرورت شعر اس کی ولدیت کے بعد لکھ دیا۔

دقیقی اپنے ممدوح کا نام ایک شعر میں جو لغات اسدی میں ملتا ہے یوں بیان کرتا ہے ؎

ابوسعد آں کہ از گیتی رو برستہ شد دلہا ‖ مظفر آں کہ شمشیرش سر و ار دشمناں پروا

اب صورت یہ قائم ہو گئی ہے کہ علامہ قزوینی کا (الف) فخر الدولہ ابوالمظفر احمد بن محمد ہے فرخی کا (با) ابوالمظفر بن احمد محمد ہے اور عتبی کا (جیم) ابوالمظفر محمد بن احمد ہے (دال) عوفی کا ابوسعید محمد (بن) مظفر (بن) محتاج چغانی ہے اور دقیقی کا (ہا) ابوسعد مظفر ہے۔

الف اور با ایک شخص نہیں اس لیے فرخی اور دقیقی معاصر نہیں ہو سکتے دال اور ہا میں غالباً باپ بیٹے کا تعلق معلوم ہوتا ہے عوفی نے باپ بیٹے کے ناموں میں تخلیط کی ہے دقیقی جب کہ باپ کا مداح ہے عوفی نے بیٹے کا خیال کیا۔ یا یہ کہ وہ بالکل مختلف شخص ہوں بہرحال تاریخ میں ان دونوں اسما کی سراغ رسی نہیں ہو سکتی۔ چغانی خاندان میں ابوبکر محمد بن مظفر کا بیٹا لگتا ہے جو ۳۲۱ھ میں سپہ سالار خراساں تھا عوفی کے پیش کردہ نام میں اور اس میں یہ فرق ہے کہ کنیتوں میں اختلاف ہے اگر ان دونوں شخصوں کو ایک مانا جاتا ہے تو ابوسعد مظفر جس کا نام دقیقی اپنے شعر میں بیان کرتا ہے ابوبکر کا باپ تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن یہ محض قیاس ہے۔

تخت نشین ہوتا ہے اس لیے نوح کی فرمایش کرے، دقیقی کا اس کے لیے وغیرہ جمع کرلے، تیار ہونے اور ہزار شعر لکھنے کے لیے بہت کم وقفہ ملتا ہے۔

ان امور پر نظر کرتے ہوئے میں اس رائے پر قائم ہوتا ہوں کہ نہ نوح نے فرمایش کی اور نہ دقیقی نے ۳۶۵ھ میں شاہنامہ شروع کیا۔ چونکہ ابھی ایام میں فردوسی کو اپنے شاہنامے پر مصروف دیکھا جاتا ہے اس لیے ضروری ہوا کہ دقیقی کا زمانہ نوح کے عہد سے اوپر کی طرف سرکایا جائے اس غرض سے یہ دلائل ناظرین کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔

(۶) دقیقی کا ایک قطعہ ہے ؎

کرا رودکی گفتہ باشد مدیح — امام فنون سخن بود ور

دقیقی مدیح آورد نزد او — چو خرما بود بردہ سوی ہجر

اس قطعے سے جو رودکی کے حالات میں لباب الالباب صفحہ ۶ میں درج ہے پایا جاتا ہے کہ رودکی اور دقیقی ایک ہی شخص کے مدح سرا رہ چکے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ دقیقی اور رودکی ہمعصر ہوں اگر ہمعصر نہ ہوں تو زیادہ تقدم اور تاخر ان میں نہ ہو۔ عتبی نے اپنی تاریخ میں رودکی دقیقی اور خسروانی کا نام اس طرح لیا ہے کہ گویا وہ ایک ہی زمانے میں تھے۔

(۷) دیباچۂ قدیم شاہنامہ دقیقی کو نصر بن احمد ۳۰۱ھ و ۳۳۱ھ کے عہد کا شاعر مانتا ہے۔ دیباچے کی اصل عبارت یہ ہے۔

”و این شاہنامہ بروزگار نصر بن احمد ابوالفضل بلعمی دقیقی (را) کہ شاعر او بود فرمودہ بود کہ نظم آورد۔“

اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں ایک یہ کہ دقیقی اور رودکی معاصر ہیں۔ دوسرے یہ کہ شاہنامہ ابوالفضل بلعمی کے حکم سے دقیقی نے نظم کرنا شروع کیا تھا اس

بیس سال قبل سے اس کتاب پر مشغول تھا لیکن قدرداں سرپرست اور مربّی کے نہ ملنے کی وجہ سے میں ہمیشہ افسردہ خاطر اور غمگیں رہا خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا

[1] ندیدم سرافراز بخشندۂ   بگاہ کیان بر درخشندۂ
همی این سخن بر دل آسان نبود   جز از خامشی هیچ درمان نبود
یکی باغ دیدم سراسر درخت   نشستنگۂ مردم نیک بخت
بجایی نبد ایچ پیدا درش   جز از نام شاهی نبد افسرش
که اندر خور باغ بایستی   اگر نیک بودی بشایستی
سخن را نگه داشتم سال بیست   بدان تا سزاوار این گنج کیست[1]

اس سے میرا مقصد اسی قدر ہے کہ اگر نوح بن منصور کو واقع میں شاہنامے سے کوئی دلچسپی تھی اور دقیقی کو اس کی نظم کی خدمت سپرد کی تھی تو فردوسی کے لیے یہ معاملہ نہایت آسان تھا وہ دقیقی کی آنکھ بند ہوتے ہی سیدھا بخارا کا رخ کرتا اور اپنا جوہرِ کمال دکھا کر دقیقی کا منصب اپنے لیے حاصل کر لیتا اور بیس سال تک گوشۂ گمنامی میں سلطان محمود غزنوی کی تاجپوشی تک نہ پڑا رہتا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوح کو شاہنامے کے معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

(۴) نوح بن منصور ۳۶۵ھ میں جب تخت نشین ہوا نہایت کمسن تھا اور سلطنت کے امور کا کفیل سامانیوں کا مدبّر وزیر ابوالحسن عتبی تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک کم عمر بادشاہ جو سلطنت کے معاملات میں نام کے سوا کوئی دخل نہ رکھتا ہو علمی امور میں ایسے ذوق کا اظہار نہیں کر سکتا جو علم دوستوں میں بھی عمر کی پختگی اور سنجیدگی مذاق پر منحصر ہے۔

(۵) ۳۶۵ھ دقیقی کا سال وفات[2] بھی دیا جاتا ہے اسی سال نوح بن منصور

---

[1] شاہنامہ صفحہ ۱۲ جلد سوم ۱۳۶۲ھ۔ [2] پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحہ ۴۷

"مرو کا رہنے والا تھا ۴۴۹ھ میں انتقال کیا" شعرالعجم صفحہ ۵۵

اس کا پورا نام ابو منصور عمارہ بن محمد المروزی ہے اور آلِ سامان اور آلِ ناصر کے عہد میں گزرا ہے۔ عوفی نے سلطان محمود غزنوی ۳۸۸ھ و ۴۲۱ھ کی مدح میں عمارہ کے یہ ابیات نقل کیے ہیں ؎

اکنوں شاہ نور بود رحمن نور ٭ خورشید مرا اہیل منو واست جہاں
گر بر کران دجلہ کسے نام او برد ٭ آب انگیں ماسہ شود گل گل انگبیں

ظاہر ہے کہ عمارہ کو سلطان کی مدح سرائی کے لیے اس کی مفروضہ وفات سے کم از کم تیئیس چوبیس سال بعد تک زندہ رہنا چاہیے۔ فرماتے ہیں۔

"ان شعرا کے علاوہ اس دور میں اور بہت سے خوش گو اور خوش فکر تھے مثلاً آغجی، طحاری، ابو العباس ربنجی، خبازی، ابو المثل بخاری، طاہر وغیرہ لیکن چونکہ ان کے حالات اور اشعار بہت کم ملتے ہیں اس لیے ہم ان کے نام قلم انداز کرتے ہیں۔" (شعرالعجم صفحہ ۵۶)

جن شعرا کے نام عبارتِ بالا میں ذکر ہوئے ہیں ان میں بعض کی صورتیں ایسی مسخ ہو گئی ہیں کہ ان کی شناخت بالکل دشوار ہو گئی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ مصنوعی ہستیاں قائم ہو گئی ہیں مثلاً ان ناموں کی فہرست میں سب سے پہلا آغجی ہے میں اس آغجی شاعر کی تلاش میں اتنا ہی حیران و پریشاں ہوا جتنا میرے ایک انگریز فارسی خواں دوست ہاتف شاعر کی تلاش میں سرگرداں رہے تھے ان کو یہ وہم ہو گیا تھا کہ ہاتف کسی شاعر کا نام ہے "ہاتف گفت" اور "ہاتف ندا کرد" بار بار قطعاتِ تاریخ میں پڑھ چکے تھے ہاتف ان کے نزدیک بڑا مشہور شاعر تھا جس کو فن تاریخ گوئی میں کمال تھا بڑی تلاش کے بعد دو ایک ہاتف شاعر ان کو مل گئے لیکن انھیں ایسا نہایت مشہور اور تاریخ گوئی میں ید طولیٰ رکھنے والا

طرح نسے سامانیوں کی علمی فتوحات کی فہرست سے یہ کارنامہ بھی جس کے سیدے مولانا شبلی ان کے ثناخواں معلوم ہوتے ہیں خارج ہوا جاتا ہے۔

(۸) امیر نصر بن احمد کا جانشیں امیر نوح بن نصر ۳۳۱ھ اور ۳۴۳ھ ہو چکا تذکرہ نگار دقیقی کو نوح بن منصور ۳۶۵ھ و ۳۸۷ھ کا شاعر مانتے ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ وہ نوح اوّل کو نوحِ ثانی میں خبط کر رہے ہیں بدقسمت نوح ثانی ایک امر میں ضرور خوش قسمت رہا ہے وہ یہ کہ اخلاف نے اس کے اسلاف کے اکثر کارنامے اس کی طرف منتقل کر دیے ہیں۔

(۹) دقیقی کی ایک تاریخ وفات ۳۴۱ھ مجھ کو دو ذرائع سے ملتی ہے پہلی شاہد صادق مصنفہ محمد صادق صاحب صبح صادق، دوسرے سخن داں فارس محمد حسین آزاد ان دونوں کتابوں میں یہی تاریخ وفات ملتی ہے اور مجھ کو اس تاریخ کے قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔

ابو شکور بلخی کے لیے فرماتے ہیں۔

"۳۳۶ھ میں تھا اس کا کلام بہت کم ملتا ہے" شعر العجم صفحہ ۵۴

۳۳۶ھ محمد عوفی نے ابو شکور کی مثنوی آفریں نامہ کی تاریخ اختتام دی ہے لیکن لغت فرس میں ابو شکور کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ۳۳۳ھ میں لکھی گئی تھی چنانچہ یہ شعر ہے ؎

چنیں داستاں کش بگفتا ردیال   ازسی صد و سی و سہ بود سال

ابو شکور کے اشعار لغت فرس، فرہنگ جہانگیری، لباب الالباب اور المعجم فی معاییر اشعار العجم میں ملتے ہیں۔ ہی رباعی سب سے قدیم رباعی جس شاعر کی ملتی ہے وہ ابو شکور ہے۔

عمارہ مروزی کے لیے ارشاد ہوا ہے۔

نے ایک قصیدے میں جو سلطان محمود کی وفات سنہ ۴۲۱ھ اور امیر محمد کی تاجپوشی پر لکھا ہے ان اشعار کو یوں تضمین کیا ہے ؎

شمع داریم و شمع پیش نہیم　　　گر بکشت آں چراغ مارا باد
گر برفت آں ملک ما گزاشت　　　بادشاہے کریم پاک نژاد
سخت خوب آمد ایں دو بیت مرا　　　کہ شنیدم ز شاعرے اُستاد
"بادشاہے نشست فرخ زاد　　　بادشاہے گزشت پاک نژاد
بر گزشتہ ہمہ جہاں غمگیں　　　بر نشستہ ہمہ جہاں دل شاد"

ابو الفضل بیہقی کے ہاں یہی ابیات ایک مرثیہ اور سلطان فرخ زاد کی وفات اور سلطان ابراہیم غزنوی کی تخت نشینی کے موقع پر ایک قطعے میں تضمین ہوئے ہیں وہو ہذا ؎

"بادشاہے برفت فرخ زاد　　　بادشاہے نشست حور نژاد
از برفتہ ہمہ جہاں غمگیں　　　وز نشستہ ہمہ جہاں دل شاد
گر چراغے ز پیش ما برداشت　　　بار شمعے بجائے آں بنہاد"
یافت چوں شہریار ابراہیم　　　ہر کہ گم کرد شاہ فرخ زاد

دوسرا نام طخاری ہے ہم اس کی تلاش میں ناکامیاب رہا چہار مقالہ میں ایک طحاوی اللتہ ملتا ہے لیکن شعر العجم میں دو مقام پر اس کو طخاری لکھا ہے دیکھو صفحہ ۲۶ شعر العجم۔

پانچواں نام طلحہ ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتا کہ شعرائے سامانیہ میں اس کو کیوں شمار کیا گیا۔ طلحہ اس دور کے شاعروں سے دو صدی بعد گزرا ہے اس کا عہد آل سلجوق کے عہد میں محسوب ہونا چاہیے۔ اس شاعر کا ذکر لباب الالباب میں آیا ہے اور عوفی نے اس کا پورا نام یوں دیا ہے "الاجل شہاب الدین ابو الحسن طلحہ المروزی"

شاعر ناتف نہیں ملا۔

بے سود کوشش اور جستجو کے بعد میں اس نتیجے پر آیا ہوں کہ عجمی شاعر عنقا کا ہم برم ہے۔ اگر تاریخ کے میدان میں قیاس دوڑانے کی اجازت ہو سکتی ہے تو میں کہوں گا کہ مولانا شبلی نے اعجمی میں آجمی کی مٹی پلید کی ہے۔ اس شاعر کا پورا نام امیر ابو الحسن علی بن الیاس الآغاجی البخاری ہے۔ وہ نصر سامانی کے عہد سے والی کرمان تھا سینتیس سال کی حکومت کے بعد لشکر نے اس کے مظالم سے تنگ آکر اس کے فرزند الیسع کو امیر بنا لیا ابو الحسن بخارا جا کر ۳۵۶ھ میں وفات پایا ہے آل الیاس کا بانی یہی شخص ہے اس کے فارسی اشعار کا دیوان بقول ثعالبی (تتمہ الیتیمہ) نہایت معروف تھا عوفی نے اس کا ذکر کیا ہے لغات اسدی میں اس کا ایک شعر ملتا ہے لیکن اس کا نام ابو علی الیاس دیا گیا ہے جس طرح کہ تاریخ گزیدہ اور سیاست نامہ میں۔

تیسرا نام ابو العباس ربنجی ہے اس کا پورا نام ابو العباس فضل بن عباس الربنجی ہے ربنجن (بفتح را و کسر با و سکون نون و فتح جیم و سکون نون) سغد سمرقند میں ایک شہر کا نام ہے۔ ربنجنی بڑے پایہ کا شاعر ہے اور رودکی اور ابو شکور کا ہمعصر۔ نصر بن احمد سامانی ۳۰۱ھ و ۳۳۱ھ کی وفات اور اس کے جانشین نوح بن نصر ۳۳۱ و ۳۴۳ھ کے جلوس سلطنت کی تہنیت میں کہتا ہے ؎

بادشاہے گزشت خوب نژاد	بادشاہے نشست فرخ زاد
زاں گزشتہ زمانیاں غمگیں	وزیں نشستہ جہانیاں دل شاد
بنگر اکنوں بچشم عقل و بگو	ہر چہ ما راز ایزد آمد داد
گر چراغے ز پیش ما برداشت	باز شمعے بجائے او بنہاد

یہ اشعار اس قرن اور قرن ما بعد میں بہت مشہور رہے ہیں۔ فرخی شاعر

بلکاتگین کے مارے جانے کے بعد امیر پیری انتخاب کیا جاتا ہے لیکن بہت جلد بعد معزول ہو کر ۳۶۶ھ میں سبکتگین امیر تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں :-

سبکتگین پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کو تسخیر کی نگاہ سے دیکھا اور جے پال کو بار بار شکستیں دیں۔ سامانی دربار سے اس کو ناصر الدین کا خطاب ملا ۳۸۳ھ میں وفات پائی اس کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل جو الپتگین کی دختر کے بطن سے تھا بلخ میں تخت نشین ہوا۔ محمود غزنین میں تھا اس نے بھائی کو لکھا کہ بلخ میں حکومت کیجیے لیکن غزنین میرے قبضے میں رہنے دیجیے" شعر العجم صفحہ ۵۷۔

سبکتگین اور جے پال کے درمیان صرف دو مرتبہ جنگ ہوئی سبکتگین کی وفات ۳۸۳ھ میں ہرگز ہرگز نہیں ہوئی بلکہ باتفاق مورخین اس کے چار سال بعد یعنی شعبان ۳۸۷ھ میں۔ باپ کی وفات کے وقت محمود نیشاپور میں تھا نہ غزنین میں۔ محمود اگر اس وقت غزنین میں ہوتا یا غزنین پر اس کا قبضہ ہوتا تو بھائیوں میں جنگ کی نوبت نہ آتی۔ کیونکہ محمود اور اسمٰعیل کے درمیان غزنین متنازعہ فیہ تھا۔ محمود غزنین کا طالب تھا جو اس وقت اسمٰعیل کے قبضے میں تھا اور وہ اس کے معاوضے میں بلخ یا نیشاپور اسمٰعیل کو دے رہا تھا اسمٰعیل کو یہ تقسیم پسند نہ تھی محمود نے اول اس کے ذرائع استعمال کیے جو برادرانہ خطوط اور نصیحت و فہمائش کی شکل اختیار کیے ہوئے تھے ابو الحارث فریغونی والی گورگان بھی اس معاملے میں واسطہ بنا اس نے بھائیوں میں بالمشافہ ملاقات کی تجویز کی، اسمٰعیل نے اس کو بھی مسترد کر دیا محمود ہرات و بست کے راستے غزنین کے قریب آگیا آخر اسمٰعیل اور محمود میں جنگ ہوئی اور اسمٰعیل ہزیمت پا کر غزنین کے قلعے میں پناہ گزین ہوا[۵۱]۔ محمود نے پھر اس

---

[۵۱] تاریخ یمینی از عتبی۔

طلحہ نے اپنے دوست حکیم محمود ابن علی السائی المروزی کا مرثیہ بھی لکھا ہے۔

دورِ غزنویہ

شبلی فرماتے ہیں :-

"عبد الملک کے بعد جب اس کا بیٹا منصور تخت نشین ہوا تو الپتگین خراسان چھوڑ کر غزنین چلا گیا اور یہاں ۱۶ برس تک حکومت کرکے وفات پائی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحٰق قائم مقام ہوا لیکن چند روز کے بعد مر گیا۔ الپتگین کا ایک غلام سبکتگین تھا اس نے الپتگین کے عہد میں ایسی قابلیت کے جوہر دکھائے کہ ابو اسحٰق کے بعد لوگوں نے سنہ ۳۶۶ھ میں اسی کو غزنین کا حاکم مقرر کر دیا۔" شعر العجم صفحہ ۵۶ و ۵۷

ان بیانات میں دو ایک باتیں قابلِ غور ہیں؛ الپتگین کا غزنین آکر سولہ سال حکومت کرنا معتبر تاریخی روایات کے خلاف ہے۔ حمد اللہ مستوفی اور اس کا مقلد فرشتہ اس بارے میں سند نہیں مانے جا سکتے۔ اصل یہ ہے کہ الپتگین غزنین آنے کے آٹھ ماہ بعد سنہ ۳۵۲ھ میں وفات پاتا ہے سنہ ۳۵۵ھ میں اس کا فرزند اور جانشین ابو اسحٰق فوت ہوتا ہے بلکاتگین[۱] امیر بنا لیا جاتا ہے جس کے عہد میں ترقی کرکے سبکتگین بڑے عہدے پر پہنچتا ہے بلکاتگین کے ساتویں سال میں سلطان محمود کی ولادت ہوتی ہے۔

---

[۱] بلکاتگین کا سکہ ضرب سنہ ۳۵۹ھ پیٹرو گراڈ (روس) میں موجود ہے پروفیسر براؤن اس کو ابو اسحٰق کا بھائی اور الپتگین کا فرزند کہتے ہیں (تاریخ ادبیات ایران جلد اول صفحہ ۲۷۲) بلکاتگین کا ذکر جامع الحکایات محمد عوفی۔ طبقات ناصری شاہد صادق اور منتخب التواریخ حسن بن محمد بن خاکی شیرازی میں ملتا ہے۔ آخری دونوں اسناد کی رو سے بلکاتگین سنہ ۳۶۲ھ ہجری میں مارا جاتا ہے۔

دربار عام میں قصائد پیش کیے تو ایک ایک شاعر کو بیس بیس ہزار اور
زینبی اور عنصری کو پچاس پچاس ہزار درہم عنایت کیے۔"

(شعر العجم صفحہ ۵۸)

مولانا نے یہ واقعہ سلطان محمود کی طرف منسوب کیا ہے اگر فردوسی کی فیاضیاں باپ کے جود و کرم کی فہرست میں شمار کرنا غلطی میں داخل ہیں تو بیان بالاقطعی غلط ہے اس سے میرا مقصد یہ نہیں کہ محمود فیاض نہیں تھا بلکہ یہ مراد ہے کہ اس کا فرزند سلطان مسعود بھی جود و سخا میں اپنے باپ سے کم نہیں تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ سلطان مسعود سے تعلق رکھتا ہے نہ سلطان محمود سے۔

سلطان محمود ۲۳ ربیع الآخر ۴۲۱ھ کو پنجشنبہ کے روز ظہر کے وقت انتقال کرتا ہے اور یہ انعام بروز دوشنبہ ۲۷ یا ۲۸ رمضان ۴۲۲ھ کو جشن مہرگان منانے وقت سلطان مسعود غزنین میں عطا کرتا ہے اس انعام بخشی کے وقت نہ محمود زندہ تھا اور نہ مسعود شہزادہ۔ اس کے متعلق بیہقی کے الفاظ ہیں "شاعران را کہ بیگانہ بودند بیست ہزار درم فرمود و علوی زینبی را پنجاہ ہزار درم بر پیلے بخانہ او بردند و عنصری را ہزار دینار دادند" (بیہقی صفحہ ۳۲۳)

لیکن یہ پیل بار انعام بخشیاں سلطان محمود کی مدعات حسنہ سے تصور ہونی چاہییں اگرچہ میں اپنے قول کی تائید میں تاریخی براہین پیش نہیں کر سکتا کیونکہ محمود کی تمام تاریخیں سوائے ایک آدھ کے برباد ہو گئی ہیں۔ اگر آج ہمارے پاس تاج الفتوح، مقامات ابو نصر مشکانی، تاریخ محمودی از ابو الفضل بیہقی، تاریخ ملا محمد غزنوی اور تاریخ محمود وراق موجود ہوتیں تو ہم محمود کی فیاضی سرپرستی علوم و فنون اور قدردانی شعرا کے واقعات تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے قابل ہو سکتے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ محمود ہاتھی بھر بھر کر انعامات دینے کا عادی تھا

ذرائع نے قلعۂ غزنین (بقول بدایونی چھ ماہ بعد) اسمٰعیل[۱] سے لے لیا۔

سلطان محمود کے علمی کارناموں کے ذکر میں فرماتے ہیں:۔

"غزنین میں اس نے ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا جس کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی تھا جس میں تمام دنیا کے نوادر موجود تھے۔"

شعرالعجم صفحہ ۵۰

یہ روایت فرشتہ کے نام سے منقول ہے لیکن فرشتے کی اصل عبارت یہ ہے۔

"در جوار آں مسجد مدرسۂ ساختہ و بہ نفائس کتب و غرائب نسخ مشحون گردانیدہ دہات بسیار بر مسجد و مدرسہ وقف فرمود" (فرشتہ صفحہ ۳۲ نول کشور)

میں نے جب مولانا کا یہ بیان دیکھا نہایت محظوظ ہوا کہ یہ عجائب خانے اور چڑیا گھر جن کو ہم مغربی بدعت سمجھا کرتے ہیں، ہمارے اسلاف کی ایجاد نکلے لیکن فرشتہ نے میری تمام خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ خدا جانے قبلہ مولانا نے یہ نکتہ آفرینی کیوں کی۔

اسی کتب خانے اور سلطان کی علم دوستی کے متعلق کتاب بحرالفوائد میں جو منتصف قرن ششم ہجری کی فارسی زبان میں ایک تصنیف ہے اور ملک شام میں اتابک ابی سعید ارسلان آبہ بن آق سنقر کے لیے لکھی گئی تھی روایت ذیل مرقوم ہے۔

"سلطان غازی محمود سبکتگین گفت ہمہ مرادہائے جہاں در جہاں یافتم مگر یک آرزو در دلم ماند حوادث دہر ہائے گرسنگان واستن پس فرمود تا دو تیم بود پیش کتب خانہ بساختند چوں وقت درآمدے علما را جمع کردے تا بحث اندر بستے"

شعرا کے حق میں محمود کی شاہانہ فیاضیوں کے ذکر میں فرماتے ہیں۔

ایک موقع پر جب شہزادۂ مسعود خراسان سے غزنین میں آیا اور شعرا نے

---

[۱] اسمٰعیل کے دو درہم راقم کے مجموعۂ سکوکات میں موجود ہیں۔

اگر مراد بجاه اندر است جاہ و مال — مراست این کہ ببینی جمال را بکمال

چودہ ہزار درم صلے میں عطا ہوے تھے۔

سلطان نے ایک مرتبہ کسی نووارد شاعر کو تیس ہزار سونے انعام میں دیے چنانچہ عنصری اس واقعے کا ذکر یوں کرتا ہے ؎

یک عطا سہ ہزار از گہر بشاعر داد — کز آن ہر یک بزر دو چہرہ گو لاغر

نہ شاعر یکہ قدمش زرنج خدمت باد — نہ بیر ہیچ بدرگاہ او گرفتہ گذر

ازین سبب در عالیش مجمع شعراست — اگر تو دلبر شاہ یا تو مختصر

(۱ دیوان عنصری صفحہ ۹۶ بمبئی ۱۳۱۸ھ)

محمود شاعر دوست اور شعر پرست ہونے کے علاوہ خود بھی ایک اعلیٰ پایے کا شاعر تھا۔ بزم آرا میں عنصری کی بیاض سے جو خود عنصری کے قلم کی لکھی ہوئی تھی، محمود کی یہ غزل مرقوم ہے ؎

من گرد دل خویش ہوائے تو تنیدم — با مہر تو پیوستم و از خویش بریدم

دیگر بتاں چوں تو ندیدم ز پی آنک — بت نیست بجائے کہ من آنجا نرسیدم

با من بکنید آں کہ چو او کس نہ گرفتم — نگرفت سر زلف تو ہر چند چخیدم

چوں زلف شدم دست چو بشتافتہ شدم زرے — چوں زلف تو کاویدم و چوں روئے تو دیدم

گفتم کہ یکے بوسہ خریدم بدرم من — لے سے خطا است ایکہ جدا و بخریدیم

محمد عوفی نے شاہی شعرا میں دوسرے نمبر پر اس کا ذکر کیا ہے۔ گلستان نامی ایک کنیز تھی سلطان کو اس کنیز سے دلی محبت تھی جب اس کا انتقال ہوا محمود نے ذیل کا مرثیہ لکھا ؎

تا تو اے ماہ زیر خاک شدی — خاک را بر سپہر فضل آمد

دل جزع کرد گفتم اے دل صبر — این قضا از خدائے عدل آمد

ایسی تلمیحیں موجود ہیں جن میں محمود کے ایسے ہاتھیوں کا ذکر آتا ہے۔ نظامی فرماتے ہیں ؎

مرا سلیبار از تو مقصود نیست کہ پیل تو چون پیل محمود نیست

عضائری ایک موقع پر کہتا ہے ؎

امید دارم کیں بار صد ہزار شام بس بیار دبہ پاے پیل ریال

امیر معزی ؎

ز بہرام اگر شاہ را ولی محمود بہ پیلوار سہ شاعر ہمی شیالی داد
کنون کجاست بیا گو بجود شاہ نگر کہ جود او بصلہ گنج شایگانی داد

شیخ عطار ؎

چو آن گر پیل وارش کم بہ ارزید بہ شاعر فقاعے ہم نہ ارزید
رہی ہمت کہ شاعر داشت آں گاہ کنون سگ کہ چون برگشت از راہ

سلطان محمود شعرا پر چار لاکھ دینار سالانہ صرف کیا کرتا تھا۔ ہر بڑے شاعر کو اس کے دربار میں عزت کے ساتھ جگہ دی جاتی تھی وہ شاعروں کو دیکھ کر مسرور ہوتا تھا فرخی کہتا ہے ؎

تو از دیدار مادح ہم چنان شادان شوی شاہا کہ ہر گز ہیم از اول امق نگشتست دیدن عذرا
طواف شاعران بینم مگر در قصر تو دائم ہمانا قصر تو کعبہ است و گرد قصر تو بطحا

عضائری کو انعام میں ایک ہزار دینار عطا ہوئے اسی اثنا میں باتوں باتوں میں غزال پر کوئی لطیفہ ہوگیا سلطان نے شاعر سے اس لطیفے پر غزل کی فرمایش کی عضائری نے فی البدیہ تعمیل ارشاد کی محمود نے اصلی انعام میں ایک ہزار کا اور اضافہ کر دیا عضائری ؎

ہزار بود ہزار دگر ملک بفزود بیک غزل کہ رہی گفت است در لطیفہ غزال

وشتہ کہتا ہے کہ عضائری کو اس قصیدے کے صلے میں جس کا مطلع ہے ؎

کہ جو رطب و یابس ملا قبول کر لیا۔ نہ اس امر کا خیال رکھا کہ یہ بیان پہلے بیان کے خلاف جاتا ہے یا آیندہ بیان کے مخالف ہوتا ہے میں دیکھتا ہوں کہ مولانا کی تحقیق کا یہ پہلو نہایت کمزور ہے۔

جو پہلی روایت ان کے سامنے آتی ہے اسی کو نہایت فیاض دلی کے ساتھ تسلیم کر لینے کو مستعد ہیں مثلاً عنصری کے ذکر میں فرماتے ہیں:۔

"ایک دفعہ سلطان نے فصد لی رودکی نے برجستہ کہا ؎

آمد آں رگ زن مسیح پرست نیش الماس گوں گرفتہ بدست

طشت زریں و آمد آں خواست بازوئے شہریار را بربست

نیش بگرفت و گفت عز علیک ایں چنیں دست را کہ یارد خست

سر فرو برد و بوسہ بر داد ورنہ ساج ارغوان رخست"

(شعر العجم صفحہ ۶۳)

یہ اشعار اصل میں حکیم شہاب الدین شاہ علی ابی رجا الغزنوی کے ہیں۔ شبلی نے انہیں عنصری کے نام پر لکھا لیکن حضرت کاتب نے عنصری کے بجائے رودکی کا نام پسند کیا چنانچہ اس غلطی بالائے غلطی نے ایک ایسی مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی ہے جس کا جواب یہ شعر ہو سکتا ہے ؎

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا

ابو رجا سلطان بہرام ۵۱۲ھ و ۵۴۷ھ کے عہد کا شاعر ہے اور اس قطعے میں اس نے بہرام شاہ کے فصد لینے کا ایک واقعہ نظم کیا ہے جو یہ ہے کہ بادشاہ کو ایک مرتبہ فصد کھلوانے کی ضرورت پیش آئی اتفاق سے عیسائی فصّاد جو نہایت حسین اور سادہ رو تھا اس نے فصد کھولی اور خون بہنا شروع ہوا بادشاہ نے مذاق میں کہیں اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ ڈال دیا اس نے بُرا مانا اور غصّے کے لہجے میں

اور ناظر اسی کشمکش و پیچ میں رہ جاتا ہے کہ ان متضاد بیانات میں سے کس بیان پر اعتماد کرے اس قسم کی دو ایک مثالیں اوپر گزر چکی ہیں ایک تازہ مثال یہاں گزارش ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"محمودی شعرا اگرچہ بے شمار ہیں لیکن جن ناموروں کو محمود نے دربار میں داخل کر لیا تھا اور جو آسمان سخن کے سبعہ سیارہ تھے یہ ہیں عنصری، فردوسی، اسدی، عسجدی، عضائری[۵]، فرخی، منوچہری۔" شعر العجم صفحہ ۶۰

دوسرے موقع پر ارشاد کیا ہے۔

"محمود کے دربار میں چار سو شعرا تھے جن میں فرخی، عسجدی، عضائری، منوچہری جیسے قادر الکلام بھی شامل ہیں۔" شعر العجم صفحہ ۶۱

یہاں دیکھا جاتا ہے کہ دو مقام پر منوچہری محمود کے شعرا اور ندما میں داخل ہے لیکن منوچہری کے حالات میں فرماتے ہیں:۔

"لیکن منوچہری کے دیوان میں سلطان محمود کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ سلطان محمود کے مرنے کے بعد غزنین میں آیا اور اس لیے فردوسی کا ہم بزم نہیں ہو سکتا۔" (شعر العجم صفحہ ۱۸۷)

ایک محقق کا اولین فرض یہ ہے کہ جو واقعہ بیان کرے اس کی پوری پوری تحقیق اور تفتیش کر لینے کے بعد ایک رائے قائم کر لے اور ہمیشہ کے لیے اسی پر قائم ہو جائے اور اگر آیندہ بھی اس کے اظہار کی ضرورت ہو تو وہی بیان کرے یہ نہیں ہونا چاہیے

---

[۵] اس شاعر کا نام شبلی عام طور پر عضائری لکھتے ہیں لیکن محمد عوفی صاف اس کو عضایری لکھتا ہے اس سے بھی قدیم سند کی ضرورت ہو تو عنصری کا یہ شعر موجود ہے۔

ایا عضایری اے شاعری کہ در دل تو   سحر تو ہر کہ بود جملہ ناقصہ دکمال

(دیوان عنصری صفحہ ۸۶ بمبئی ۱۳۲۰ھ طبع آقا محمد ارکانی) ایک موقع پر مسعود سعد سلمان ہے ع

چون لطف شاہ ناصح بر شاعر عضاری۔ بضرورت شعری لکھا ہے جو مستثنیات میں شمار ہونا چاہیے

گر گوی خطا رفت بہ چوگاں بزنش   ور اسپ غلط کرد بمن بخش اورا

اخیر مصرع دو پہلو رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ گھوڑے نے اگر غلطی کی تو میری خاطر اس کو بخش دیجیے دوسرے یہ کہ گھوڑا اگر غلط رو ہے تو مجھے دے ڈالیے محمود نے اس حسن طلب کے صلے میں گھوڑا عنصری کو دے دیا۔ عنصری نے ایک اور رباعی گھوڑے کی طرف سے معذرت میں لکھی ہے

رفتم بر اسپ تا ز اسپش کشتم   گفتا کہ نخست بشنو ایں عذر بگم
نے گاؤ زمینم کہ جہاں برگیرم   نے چرخ چہارم کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینے کا قصد کیا گھوڑے نے کہا کہ پہلے میرا عذر تو سن لیجیے کچھ میں گنہگار نہیں میں تو نہیں ہوں کہ عالم کا بار اٹھا لوں نہ چوتھا آسمان ہوں کہ آفتاب کو لیے پھروں" شعر العجم صفحہ ۶۴

مولانا کی خوش اعتقادی قابل رشک ہو جاتی ہے جب یہ قصہ سلطان سنجر اور امیر معزی کی طرف بھی ذیل کے الفاظ میں منسوب ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ایک دفعہ سلطان سنجر گیند کھیل رہا تھا اتفاق سے گھوڑے نے شوخی کی اور سنجر گھوڑے سے گر گیا معزی نے برجستہ رباعی پڑھی ہے

شاہا ادبے کن فلک بدخو را   کو چشم رسانید رخ نیکو را
گر گوی خطا کرد بہ چوگاں بزنش   ور اسپ خطا کرد بمن بخش اورا

یعنی اے بادشاہ! آسمان کو ذرا تنبیہ کر دیجیے اس نے آپ کو نظر لگا دی۔ اگر گیند کی خطا ہے تو چوگان سے اس کو ماریے اور گھوڑے کا قصور ہے تو میرے حوالے فرمائیے۔ اخیر کا مصرع دو پہلو رکھتا ہے۔ سنجر نے گھوڑا معزی کو عنایت کیا معزی نے دوبارہ رباعی پیش کی ہے

کہا ادھر اُدھر ہاتھ کیوں مارتے ہو خاموش بیٹھو۔ بہرام شاہ نے معذرت میں کہا
تم جانتے ہو فصد کے وقت ہاتھ میں لٹو رکھنے کا رواج ہے تمھاری زنخداں جو
بالکل گوئے سیمیں کے مشابہ ہے میں نے لٹو سمجھ کر ہاتھ میں لی تھی۔ مولانا نے اس
قطعے کو ادھورا لکھ کر سارا لطف غارت کر دیا۔ انوری کا قطعہ یہ ہے ۔

آمد آں کودک مسیح پرست	نیش الماس گوں گرفتہ بدست
طشت زریں آبدستاں خواست	بار وئے شہریار عالم بست
نیش بگرفت و گفت عز علیہ	ایں چنیں دست را کہ یارد خست
سر فرو برد و بوسہ داد برو	در سر نوک نیش خوں برجست
ایں عجب بیں کہ دیدہ بود بچشم	کز مس تاج ارغواں برجست
بود فصاد ہمچو ماہ تمام	ذقن سادہ اش گرفت بدست
گفت فصاد ایں روا نبود	دست ہر سو زدن چو مردم مست
شاہ گفتا غلط نہ کردستم	ور غلط کردہ ام جوابم ہست
شرط باشد بوقت کردن فصد	گوئے سیمیں گرفتن اندر دست

جب ایک واقعہ دو مختلف شخصوں کی طرف منسوب ہوتا ہے مولانا بغیر کسی تلاش اور تفحص کے وہ قصہ دونوں کے لیے تسلیم کر لیتے ہیں۔ ایسا کرنے میں اگرچہ مولانا نے اپنے اعتقاد کی وسیع المشربی کا ثبوت دے دیا لیکن تنقید کے اہم فرائض قضا کر دیئے۔ اس قسم کی ایک مثال ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں ۔

"ایک دفعہ محمود چوگان کھیلنے میں گھوڑے پر سے گر پڑا اور صدمہ سا زخم
آیا عنصری نے فی البدیہہ کہا ؎

شاہا ادبے کن فلک بد خو را	کآسیب رسانید رخ نیکو را

کیونکہ بعض مقامات پر تصرفات بھی کیے ہیں۔ فرماتے ہیں -

"ابوالمظفر چغانی اُس زمانے میں سلطان محمود کی طرف سے بلخ کا
گورنر تھا اور نہایت فیاض طبع اور قدرداں سخن تھا" شعرالعجم ص۱۵۹

چہار مقالہ میں ابوالمظفر چغانی کا البتہ ذکر ہے لیکن یہ خیال کہ ان ایام میں وہ سلطان محمود کی طرف سے بلخ کا گورنر تھا کہیں ظاہر نہیں کیا۔ چہار مقالہ میں ایسے الفاظ ہیں جن کا مفہوم یہ عبارت ہو سکے۔ ابوالمظفر چغانی کا سلطان کی طرف سے گورنر بلخ مقرر کیا جانا ایک غلط بیان ہے۔ دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں بیان کیا ہے:-

"فرخی مادح امیر کبیر ابوالمظفر بن امیر ناصرالدین ست کہ در روزگار
سلطان محمود سبکتگین والی بلخ بود"

(تذکرۂ دولت شاہ مطبوعۂ یورپ صفحہ ۵۵)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے ابوالمظفر چغانی والیِ چغانیان اور ابوالمظفر نصر برادر سلطان محمود کو ایک ہی شخص قرار دیا ہے چغانیہ ماوراءالنہر میں ایک ولایت کا نام ہے اور فرخی کے ممدوح کا نام ابوالمظفر بن احمد محمد والیِ چغانیان ہے جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے ؎

تا نقش کرد بر سر ہر نقش بر دوست ‍ ‍ ‍ مدح ابوالمظفر شاہ چغانیان
بن احمد محمد شاہ جہاں پناہ ‍ ‍ ‍ آں شہریار کشورگیر و جہاں ستاں

تاریخ یمینی میں اس کو ابوالمظفر محمد بن احمد لکھا گیا ہے فرخی غالباً بصرورت شعر اس کا نام ولدیت کے بعد لایا ہے۔ چغانی خاندان چغانیہ میں امیر نصر متوفی ۳۳۱ھ کے عہد سے حکمراں رہا ہے، سامانیوں کے دور میں سامانیوں کا برائے نام مطیع تھا غزنویوں کے عہد میں یہ خاندان برقرار اور برسر حکومت رہا، آلِ غزنہ سے اس کے

رفتم مر اسپ تا بہ حومش بکشم گفتا کہ نخست بشنو ایں عذر تو ستم

نے گاوِ زمینم کہ جہاں برگیرم نے چرخ چہارمیں کہ خورشید کشم

یعنی میں نے گھوڑے کو سزا دینی چاہی اس نے کہا کہ پہلے میرا عذر تو سُن لیجئے میں کچھ گاوِ زمیں تو نہیں کہ عالم کا بار اٹھاؤں نہ چوتھا آسماں ہوں کہ آفتاب کو لیے پھروں مطلب یہ ہو کہ سلطان سنجر کا بار اُٹھانا گاوِ زمیں اور آفتاب (آسماں[1]) کا کام ہو" شعر العجم صفحہ ۲۱۱

ع خطائے بزرگان گرفتن خطا است

ہمارے پُرانے معتقدات سے ہو لیکن افسوس کہ انھیں غلط اصولوں کی پیروی کا نتیجہ ہو کہ آج ہماری تاریخیں رطب و یابس غث و سمین اور دروغ و راست کا مجموعہ بن رہی ہیں، ہماری جرح و تعدیل کے پُرانے ہتھیار پڑے پڑے زنگ آلود ہوگئے لیکن اس خوش اعتقادی کا روسیاہ حسن ہے ہمیں ان کے استعمال سے روک رکھا ہو۔ اس قسم کے موضوعات سے شبلی نے اگرچہ عنصری کی رونقِ محفل خوب کردی لیکن قصۂ بالا کا اصلی موضوع میرے خیال میں امیر معزی ہو

فرخی

شعر العجم میں فرخی کے باپ کا نام 'قلوغ' (ص ۴۳) دیا گیا ہو حالانکہ چہار مقالہ اور لباب میں صاف جولوغ مرقوم ہو۔ اس شاعر کے حالات شبلی نے جیسا کہ صفحہ ۷۷ کے ایک حاشیے میں کہا ہو چہار مقالۂ نظامی عروضی سے لیے ہیں فرماتے ہیں "گویا میں نے اسی کا لفظی ترجمہ کیا ہو" اگرچہ وہ لفظی نہیں کہا جاسکتا

---

[1] خط ہلالی میں لفظ آسمان میرا اضافہ ہو آفتاب غلط معلوم ہوتا ہو

اور اس سے نہایت خلوص رکھتا تھا۔ ربط زیادہ بڑھا تو محمود کو رشک ہوا یہاں تک کہ فرخی کا دربار میں آنا بند کر دیا فرخی نے متعدد قصیدے معذرت میں لکھے، بالآخر سلطان صاف ہو گیا اور فرخی بدستور دربار میں جانے لگا۔ (شعر العجم صفحہ ٧٨)

یہاں شبلی نے مجمع الفصحا کی روایت کو فروغ دے کر فرخی کو سلطان کا رقیب بنایا ہے۔ اگر مولانا قصائد فرخی کو ذرا زحمت گوارا فرما کر غور سے مطالعہ فرماتے تو اُن کو علم ہو جاتا کہ یہ روایت بالکل ضعیف ہے۔ صرف ایک قصیدہ ہے جس میں شبہ کے لیے گنجایش نکل سکتی ہے باقی تہمت ہے اور قیاس آرائی۔ لباب الالباب اور چہار مقالہ میں فرخی اور ایاز کی محبت کا قصہ آتا ہے۔

ولہٰذا "اس زمانے کے تمدن اور معاشرت پر تعجب ہوتا ہے کہ شعرا محمود کی مدح میں جو قصیدے لکھتے تھے اُن میں علانیہ ایاز کے حسن و عشق کا ذکر کرتے تھے اور محمود اس سے خوش ہوتا تھا فرخی ایک قصیدے میں لکھتا ہے ؎

امیر حکمو ایاز اویماق	دل و باروی خسرو روز پیکار
زنان پارسا از شوق گردند	به کابین کردنی او را خریدار
به رخساره ندّ و دل داد محمود	دل محمود را باری میسدار
خرد او در پیش سلطان سرکشیدار	حد او سلطان غلامان داشت بسیار
اگرچه میر یک تن بود آن جا	نه چندین بد مر او را گرم بازار

(شعر العجم صفحہ ٧٨)

یہ نکتہ شبلیانہ جدت آفرینی کی مثال ہے اس معاملۂ خاص میں مولانا مجمع الفصحا کے رہینِ منت نہیں ہیں بلکہ اپنے ذاتی اجتہاد کے۔ علانیہ ایاز کی حسن و

اچھے مراسم تھے، چنانچہ ابوالقاسم والی چغانیاں سلطان مسعود غزنوی کا داماد تھا جیسا کہ بیہقی (ص ۴۱۶) سے معلوم ہوتا ہے۔ فرخی اپنے ممدوح ابوالمظفر کا ذکر ایک آزاد اور مطلق العنان فرماں روا کی حیثیت سے کرتا ہے جس کو کبھی خسرو کبھی شہریار اور کبھی بادشاہ کے القاب سے یاد کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ بلخ کے گورنر کے لیے ایسے الفاظ کا استعمال ہرگز ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ قولہ

"فرخی کو شعر و شاعری کا بچپن سے ذوق تھا اور اب اس نے اس فن میں کافی ترقی کر لی تھی، شاعری کی قدر دانی کے قصے ہر جگہ مشہور تھے اس لیے اس کو خیال ہوا کہ اس ذریعے سے یہ مشکل حل ہوگی" (شعرالعجم ص ۴۹)

یہ عبارت نظامی عروضی کے چہار مقالے میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ قولہ

"فرخی ہر طرف پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا تھک کر چور ہو گیا اور وہیں زمین پر پڑ کر سو رہا صبح دن چڑھے اٹھا" (شعرالعجم صفحہ ۷۶)

فقرات بالا کے درمیان نظامی کے ہاں یہ عبارت ہے "آخر الامر رباطی ویران بر کنار لشکرگاہ پدید آمد کرہ گاں در آں رباط شدند، فرخی بغایت ماندہ شدہ بود در دہلیز رباط دستار زیر سر نہاد و حالی در خواب شد از غایت مستی و ماندگی کرہ گاں را بشمردند چہل و دو سر بودند، رفتند و احوال با امیر بگفتند، امیر بسیار بخندید و شگفتیہا نمود و گفت مردے مقبل است کار او بالا گیرد، او را و کرہ گاں را نگاہ دارید چوں او بیدار شود مرا بیدار کنید مثال پادشاہ را امتثال کردند۔ دیگر روز بطلوع آفتاب فرخی برخاست" (چہار مقالہ صفحہ ۴۴)

باوجود ایسی قطع و برید کے جس کی کچھ مثالیں اوپر گزری ہیں مولانا مدعی ہیں کہ میں نے چہار مقالہ کا لفظی ترجمہ کیا ہے۔ قولہ

"ایاز جو سلطان محمود کا محبوب خاص تھا، فرخی کا نہایت قدر داں تھا

اس سے ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ شعرا کے لیے محمود کے مدحیہ قصائد میں ایاز کے حسن و معشوقی کا ذکر قریب قریب دشوار تھا۔ فرخی کے جو اشعار انھوں نے اپنے استدلال میں لکھے ہیں اُن سے میں اندازہ کرتا ہوں کہ دیوان فرخی اُن کی نظر سے نہیں گزرا، کیونکہ یہ قصیدہ محمود کی مدح میں نہیں ہے بلکہ خود ایاز کی تعریف میں اور اس وقت لکھا گیا جب محمود دنیا سے انتقال کر چکا ہے اور سلطان مسعود اپنی تخت نشینی کے بعد ایاز کو اس کے حسن خدمات کے صلے میں جس کی تفصیل بھی اسی قصیدے میں درج ہے ایک گراں بہا انعام دیتا ہے قصیدے کا مطلع ہے سے

غم ماندن آن ماہ دیدار | مرا در خوابگہ ریزد ہمی خوار

اور گریز کے وقت شاعر گویا ہے سے

ز دل بر داشت خواہم بار اندہ | چو بر دیدم میر سید یا فتم بار
امیر جنگجو ایاز اویماق | دل و بازوی خسرو روز پیکار

اس کے بعد شاعر سلطان مسعود بن محمود کی فیاضی ایاز کی خدمت کے صلے میں یوں بیان کرتا ہے سے

خداوند جہاں مسعود محمود | کہ او را زیبد ہمی تخت سزاوار
مرا او را از ہمہ میران گرا داد | یکے تشریف چہل خروار دینار
نہ دادہ لیک چندیں پیشتر زر | نہ چندیں و نہ صد چندیں سزاوار
بجائے قدر میر و حشمت شاہ | تو ایں را خوار دار و اندک انگار
بجائے پروخوا ہدخسروا و را | کہ سالاراں بدو گردند سالار
بدو بخشد چو مال خطۂ بست | خراج خطۂ مکران و قصدار
کجا گر دو فرامش آنچہ او کرد | ز بہر خدمت شاہ جہاں دار
میان لشکر عاصی نگہ داشت | وفا و عہد آں خورشید احرار

معشوقی کا ذکر تو کہا محمود ایسا جابر بادشاہ تھا کہ لیسے غلاموں کی طرف کسی کی ذری نگاہ بھر کر دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ابوالفضل بیہقی نے اس قسم کا ایک واقعہ اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے وہ کہتا ہے -

ایک روز سلطان کے ہاں باغ فیروزی میں مجلسِ شراب تھی، امیر یوسف برادر محمود بھی موجود تھا۔شراب کا دَور چل رہا تھا اور غلام دو دو ل کر بوت بہ بوت ساقی گری کر رہے تھے۔ان میں طغرل کی باری بھی آئی۔طغرل اس روز قبائے سُرخ پہنے تھا۔امیر یوسف پر شراب کا پورا اثر ہو چکا تھا۔یوسف کی جب طغرل پر نظر پڑی دیر تک ٹکٹکی باندھے محویت کے عالم میں دیکھتا رہا۔سلطان کو بھائی کی یہ حرکت ناگوار گزری اور کہنے لگا کہ ناداحان نے مرتے وقت عبداللہ دبیر کی معرفت پیغام بھیجا تھا۔میں بیہقی کے الفاظ نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں -

"محمود را از پیغام من بگوے کہ مرا دل بہ یوسف مشغول ست و برائے تو سردم باید کہ وے را نکو ی خویش رآری وچوں فرزندان خویش عزیز داری وانا این عایت دانی کرد استائے توچہ نیکوئی فرمودہ ایم و پنداشتیم کہ با ادب برآمدہ و مینی چناں کہ باید نداشتیم در مجلس شراب در غلامان ما چرا نگاہ می کنی و شرا خوش آید کہ ہیچ کس درمجلس شراب درغلامان تو نگرد و چشمت از دیرباز بریں طغرل بماندہ است واگر حرمت روان پدرم نبودی ترا مالشے سخت تمام رسیدے، ایں یک بار عفو کردم و ایں غلام را بہ تو بخشیدم کہ مارا چنو بسیار است، ہوشیار باش تا ازیں پس چنو نیفتد کہ با محمود چنیں بازیہا نرود۔یوسف متحیر گشت و سرپائے خاست و زمیں بوسہ داد و گفت توبہ کردم و دیگر چنیں خطا نیفتد امیر گفت بنشیں بنشست و آں حدیث فرا برید" (بیہقی صفحہ ۲۴۶)

سنہ ۴۰۱ھ) وزیر اوّل سلطان محمود، المتوفی سنہ ۴۰۴ھ کا نام داخل نہیں ان جلیل القدر اشخاص کے نام کی فرخی کے ممدوحین میں عدم شمولیت ایک قابل تعجب امر ہے فہرست میں اکثر ایسے نام نظر آتے ہیں جو پانچویں قرن کے آغاز کے بعد محمود کے ہاں رسوخ اور شہرت حاصل کرتے ہیں مثلاً امیر یوسف، امیر محمد اور مسعود جو چوتھی صدی کے اختتام پر کسی شمار و قطار میں نہ تھے سنہ ۴۰۱ھ میں امیر یوسف سترہ سال کا تھا اور امیر محمد اور مسعود چودہ چودہ سال کے۔ سنہ ۴۰۸ھ میں امیر محمد والی گورگانان اور امیر مسعود والی ہرات (بقول فرشتہ) بنائے جاتے ہیں ظاہر ہے کہ شعرا اس سن کے بعد ان کی مدح سرائی کرنے لگے ہیں۔

قصائد فرخی کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعر کا تعلق زیادہ تر امیر یعقوب ابن ناصر الدین، امیر ابو احمد محمد اور مسعود سلطان محمود سے رہا ہے لیکن اول الذکر امیر یوسف سے اس کو خاص تعلق تھا بلکہ غزنین کی آمد پر سلطانی دربار میں رسائی حاصل کرنے سے قبل امیر یوسف کے دربار سے واسطہ پیدا کر لیتا ہے۔ اس وقت تک وہ بالکل گم نام اور اجنبی تھا چنانچہ فرخی ؎

چو گشتہ دل کم بودہ مردمی بودم　　طمع آب روان گرم گاہ سوے ہرات
مرا تفضل تو آب داد و راہ نمود　　سوے ستائی چو تو بزرگوار ستات

امیر یوسف کی فیاضیوں نے اسے جلد خوش حال کر دیا فرخی ؎

شکر تو بر من فراوان واجب ست اے شہریار
از فراوانی نہ دانم گفت شکرت کیں کدام
چیست نیکوتر زجاہ از تو رسیدستم بجاہ
چیست شیریں تر زکام از تو رسیدستم بکام

ابھی مدح سرائی کا تعلق قائم بھی نہیں ہوا تھا کہ امیر نے غالباً اس کا ذکر سن کر

بروز روشن از غزنین برون رفت — همی رو ماہیاے تا شب تار
سمارشام را چندان کہ خوانند — کہ دشت از کشتہا شد لپشتہ ہموار
گروہے را اران سیران جنگی — مکشت و مابقی را داد زنہار
خرا و ہر گز کہ کرد دست این گیتی — بجوان شہنامہ و تاریخ اخبار
خدایا ناصر او باش از قدر — سپر را باش از خورشید گرار

فرخی کے حالات میں یہ معلوم کرنا نہایت ضروری ہو کہ سلطان محمود کے دربار میں اس کا تعلق کس زمانے سے ہوا ہو، اس غرض کے لیے سب سے صحیح اطلاع اس کے دیوان سے مل سکتی ہو۔ میں ناظرین کی معیت میں دیوان کا مطالعہ ذیل میں شروع کرتا ہوں ضمناً بعض واقعات تاریخ معاصر پر بھی روشنی ڈالی جائے گی

فرخی کے ہاں اسماے ذیل کی مدح میں قصائد ملتے ہیں —

(۱) سلطان محمود غزنوی (۲) عضد الدولہ ابو یعقوب یوسف بن ناصر الدین سبکتگین برادر سلطان محمود۔ (۳) ابو احمد محمد بن سلطان محمود (۴) سلطان مسعود شہید بن سلطان محمود (۵) خواجہ بزرگ شمس الکفاۃ احمد بن حسن میمندی (۶) خواجہ سید اسعد (۷) خواجہ ابو الفتح علی بن الفضل (۸) خواجہ سید ابوبکر حصیری (۹) خواجہ منصور بن حسن (۱۰) ابو الفتح عبد الرزاق بن احمدؒ (۱۱) عمید منصور ابو الحسن (۱۲) ایاز اویماق (۱۳) ابو بکر عبد اللہ بن یوسف (۱۴) خواجہ ابو سہل وزیر (۱۵) خواجہ عمید سید ابو احمد شمی (۱۶) خواجہ سید بو سہل عراقی وکیل (۱۷) خواجہ بوسہل رئیس الرؤسا احمد بن حسن (۱۸) خواجہ سند ابو سہل عمر کدخداے عضد الدولہ (۱۹) فخر الدولہ ابو المظفر محمد بن احمد چغانی۔

اس فہرست میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہو کہ امیر نصر بن ناصر الدین سپہ سالار خراسان اور خواجہ ابو العباس فضل بن احمد اسفرائنی (۳۸۸ھ و

نے سلطان محمود کے پاس ہدیے میں بھیجا تھا، جیسا کہ گزشتہ سطور میں دیکھا گیا ہے سلطان نے امیر یوسف کو دے دیا۔ یوسف نے اپنے فرزندوں کی طرح اس کی پرورش کی۔ جب جوان ہو گیا ایک نامی گھرانے میں اس کی شادی کر دی اس عروسی کے متعلق یہی کہتا ہے۔

بڑے غیر ضروری تکلف اور تیاریاں کی گئی تھیں جن کو سمجھدار لوگوں نے ناپسند کیا۔

فرخی کا دوسرا ممدوح امیر محمد ہے۔ امیر محمد معلوم ہوتا ہے اپنے خاندان میں سب سے زیادہ علم دوست اور قدر دان علم تھا متعدد کتابیں اسے ازبر تھیں۔ فرخی کئی موقعوں پر اس قسم کی تلمیحیں کرتا ہے۔ چنانچہ ؎

قطب معالی ملک محمد محمود — ناصر علم و معین ملت و مختار
آن کہ ز دعوی فزون نماید معنی — وان کہ ز گفتار بیش دارد کردار
جود و سخا را ازو فزون شدہ قدرت — علم و ادب را بدو فروختہ بازار
اہل ادب را بزرگ دارد و نشگفت — این ز بزرگیش بس بزرگ مپندار
قدر گہر جز گہر شناس نداند — اہل ادب را ادیب داند مقدار
چشم بدان دور باد زان شہ کان شہ — سخت ادب پرور است و علم خریدار

دیگر

پدر از ملک زمین بیشترین یافتہ بہر — پسر از کتب جہان بیشترین کردہ زبر

دیگر

چون بسا را بسر زبان دارد — فقہ و تفسیر و مسند و اخبار

تیسرا شخص جس سے ہمارے شاعر کو دلچسپی رہی ہے، خود سلطان محمود ہے۔ فرخی کے ہاں محمود کی زندگی کے واقعات کے متعلق جو بیانات ملتے ہیں ان میں

خلعت بھیجا۔ فرخی ؎

شاعران را مکان خواستہ اگاہ وپند　　کہ بدیشاں ہمی آرد بدیعی چو گہر
ادمرا خلعت و دینار بوقتے فرمود　　کہ مرا مدحت او گشتہ بود اندر سر

اس سے ظاہر ہو کہ امیر یوسف نے خواہش کرکے فرخی کو اپنے ہاں بلوایا۔

امیر نے ایک مرتبہ گینڈا کمند سے پکڑا اس کے لیے فرخی کہتا ہو ؎

گُرگ تو کے بست گرگ را بکمند　　اے ترا میر گرگ گیر لقب

امیر یوسف اپنے اسراف کی وجہ سے تنگ دست رہتا تھا اس کے متعلق شاعر کہتا ہو ؎

مرا عجم آید اگرچہ مرا دلے ست فراخ　　ز مان دادن و بخشیدن مداں کردار
چنان ملک را باید کہ باشدے ہر روز　　خزانہ پُر درم و پُر سلیح و پُر دینار
چو خرج خویش فزون تر ہمی ز دخل کند　　ز زر و سیم خزانہ تہی بود ناچار

ایک قصیدے میں امیر کے حاجب طغرل کی کتخدائی کا ذکر آتا ہو جو امیر یوسف نے نہایت دھوم دھام سے کی تھی ؎

از پئے حاجب طغرل کہ ز شاہان جہاں　　حاجبے نیست چو او ہیچ کسے را دیگر
بہ پسند دل خویش او را درخواست زنے　　ز تبارے کہ ستودہ است باصل و بگہر
ہرچہ شایست بکرد وآں چہ بایست بداد　　کار او کرد تمام و شغل او بُرد بسر
آں چہ او کرد بتر و تیج یکے بندۂ خویش　　نکند ہیچ شہے از پئے تر و تیج پسر
آں نہالے کہ درین خدمت حاجب بنشاند　　سر بسوق بر آورد و بخندید ز بر
خدمت میر بدل کرد ہمی تا از دل　　خدمت او کند امروز ہر آں کو رز بر
خدمتش بود پسندیدہ بہ نزدیک امیر　　لاجرم میر کلہ داد مر او را و کمر

طغرل ظرافت اور لیاقت میں بے مثل تھا، ترکستان سے ارسلاں خاتون

بُت تھے عزیٰ لات اور منات۔ عزیٰ اور لات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں برباد کر دیے گیے، لیکن منات کو کافر چُرا کر ہندستان لے آئے۔ سومنات اور منات کے ناموں میں اشتراک باہم کی پیچیدہ دشواریوں نے اس روایت کو سلطان کے دربار میں بہت کچھ فروغ دے دیا۔ اسی روایت کے بنا پر صاحب طبقات ناصری سومنات کا نام منات ظاہر کرتا ہے اور فرخی ۔

ملک ہمی بہ تبہ کردن منات شتافت	شتاب او ہمہ از بہر دین بود اکثر
منات و لات و عزّا در مکہ سہ بت بودند	ز دست بُرد بُت آرائے آن زمان آزر
ہمہ جہان ہمی آن ہر سہ را پرستیدند	جز آن کسے کہ نہ بود از خدائے بطر
دو زان پیمبر بشکست و ہر دو را آورد	فگندہ بود ستان پیش کعبہ پائے سپر
منات را زمیان کافران بدزدیدند	بکشتی دگر اندر فگندند ازان کشور
بجایگاہے کز روزگار آدم باز	نہ آن زمین بہ نشست و نہ رفت ہرگز کافر
ز بہر آن بُت بتخانہ بنا کردند	بصد ہزار تماثیل و صد ہزار صور
بتکدہ در بُت را خزانہ کردند	در آن خزانہ بہ صندوق ہائے پیل گہر
گہر خریدند اندر بشہر ہا چندان	کہ سیر گشت ز گوہر فروش گوہر خر
برابر سر بت کلہ فسردہ ہستند	نگار کار بیاقوت و بافتہ بگہر
بزرِ پختہ یکے حر دسا چند اورا	چو کوہ آتش و گوہر برو بجائے شرر
خراج مملکتے تاج و افسرش بودہ است	کمینہ چیز شدے آن تاج بود و آن افسر
پس آنکہ آن را کردند سومنات لقب	لقب کہ دیگر نام اندر او بود مضمر
خبر فگندند اندر جہان کہ از دریا	بتے برآمد زین گونہ و بدین پیکر
بنزد ہمہ خلق ست و کردگار جہان	ضیا دہندۂ شمس ست و نور بخش قمر
بعلم این بود اندر جہان صلاح و فساد	بحکم این بود اندر جہان قضا و قدر

سب سے قدیم فتح قنوج کا ذکر ہے۔ دو قصیدوں میں حملۂ سومنات کا ذکر آتا دو قصیدوں میں مختصراً فتح رے کا ذکر ہے جو محمود کے آخری دوران عمر کا کارنامہ ہم قنوج سے پیشتر کے کارناموں کا فرخی کے ہاں کوئی ذکر نہیں۔ اس لیے وا ہوتا ہے کہ ہمارا شاعر سلطان کے دربار میں سنہ ۴۰۹ھ سے پیشتر جو مہم قنوج کا سال آتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سن کے واقعات اس کے ہاں ملتے ہیں اور قبل کے واقعہ نہیں ملتے یہی وجہ ہے کہ سلطان کے بھائی امیر نصر اور وزیر سابق فضل بن احمد کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں ملتا کیونکہ اس کے آنے کے وقت یہ دونوں جلیل القدر اشخاص غزنین میں موجود نہ تھے۔ فضل بن احمد سنہ ۴۰۴ھ میں ہلاک ہوتا ہے، امیر نصر اگرچہ سنہ ۴۱۲ھ میں وفات پاتے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اکثر اوقات غزنین سے باہر سیستان و خراسان میں رہتے ہیں۔ امیر نصر کے بعد امیر یوسف سپہ سالار خراسان بنایا جاتا ہے۔

فتح سومنات سنہ ۴۱۶ھ جس میں فرخی بھی شامل تھا سلطان محمود کے نمایاں کارناموں میں سے ہے۔ شاعر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود کے دل میں دو آرزوئیں بے حد گدگدی لیتی رہی ہیں۔ پہلی زیارت خانۂ کعبہ دوسری فتح سومنات

۵— خدایگان را اندر جہان دو حاجت بود ہمیشہ این دو ہمی خواست از خدا داور
یکے کہ جائے گہ حج ہندوان بکند دگر کہ حج کند و بوسہ بر دہد بحجر
یکے ازان دو مراد بزرگ حاصل کرد دگر بعون خدائے بزرگ کردہ شمر

ولہٗ

توفیق دہ اورا و بر تا بکند حج چون کرد بہ شادی و بہ پیروزی بازآر

معلوم ہوتا ہے کہ سومنات سے سلطان کی توجہ کسی غیر تاریخی روایت کی بنا پر اپنی طرف اور بھی جذب کر لی تھی۔ وہ روایت یہ تھی کہ مکۂ معظمہ میں تین زبردست

بر حضرت گاہ تو لشکر چناں کہ بار مونٔ ہزار و ہفتصد وارد پیل بدیشمار

دیگر

گفت آں ہزار و ہفتصد و پنجاہ کوہ چیست گفتم ہزار و ہفتصد و پنجاہ پیل شاہ

کابل میں حسب ہدایت ۲۲ شوال ۴۲۲ھ کو سلطان مسعود آیا اور ہاتھیوں کا عائزہ لیا گیا تو اس وقت سولہ سو ستر ہاتھی عمدہ حالت میں موجود تھے اس تعداد میں بیمار اور لاغر جانور شریک نہ تھے۔

فرخی کا اپنا بیان ہو کہ وہ سلطان محمود کے انعامات کی بدولت ایک امیرانہ اور آسودہ زندگی بسر کر رہا ہو وہ کہتا ہے۔

از فضل خداوند و خداوندی سلطان	امروز من از دیدہ بد امساں من از یار
با ضیعت آبادم و با خانۂ آباد	با نعمت بسیارم و با آلت بسیار
ہم با گلۂ اسپم و ہم بارمۂ میش	ہم با صنم چینیم و ہم با بُت تاتار
ساز سفرم ہست و نوائے حضرم ہست	اسپان سبک پائے و ستوراں گراں کار
از بار مرا خیمہ چو کاشانۂ مانی	ور فرش مرا خانہ چو بت خانۂ فرخار
میران و بزرگاں جہاں را حسد آید	زیں نعمت وزیں آلت و زیں کار و زیں بار
محمود بزرگاں شدم از خدمت محمود	خدمت گر محمود چنیں باشد ہموار

سلطان مسعود کے عہد میں خواجۂ بزرگ احمد بن حسن میمندی کو خطاب کر کے کہتا ہے ؎

من بندہ را کہ خدمت من بست سالہ است از مہر خدمت تو پدید آمدہ لسار

اس سے معلوم ہوتا ہو کہ فرخی کو غزنین کے دربار سے تعلق پیدا کیے اس وقت تک تقریباً بیس سال ہو چکے تھے خواجہ احمد حسن میمندی ۴۲۴ھ میں وفات پاتے ہیں اس حساب سے فرخی ۴۰۴ھ میں یا اس کے قریب زمانے میں آیا ہو۔

گروہِ دیگر گفتند ے کہ ایں بُت را ... بہ آسمان برین بود جایگاہ و مقر
کسے نیا ورد ایں را بدیں مقام کہ ایں ... ز آسماں بجودی خود آمدہ است اندر
بدیں بگوید روز و بدیں بگوید شب ... بدین بگوید بحر و بدیں بگوید بر
چو ایں ز دریا سر برزد و بخشک آمد ... سجود کردند ایں را ہمہ مات و شجر
بشیر خویش مر این را بشست گاؤ و کفوا ... بدیں تقرب خواند گاؤ را مادر
رہ ہر سنگی چیدیں ہزار خلق خدائے ... بقول دیو فرو ہشتہ بر خطر لشکر
و یضہ ہر روز آں سنگ را بشستندے ... بہ آب گنگ و بیتر و بہ عفران و شکر
ز بہرشستن آں بت ز گنگ ہر روزے ... دو جام آب رسیدے فزون زدہ ساغر
از آب گنگ چہ گویم کہ چند فرسنگ ست ... بسومنات بداں جایگاہ زلت و مقر
خدائے خواند آں سنگ را ہمی شمناں ... چہ بیہدہ سخن ست ایں کہ خاک تان برسر
بر آن ست کہ مر آن را ہمکہ بار برند
نکرد و اینک باماہمی برد ہمبر

فرخی سلطان کے اور سفروں میں بھی ہمراہ رہا ہے ؂

شنیدہ ام کہ ہمیشہ چناں ندی دریا ... کہ بر دو منزل از آواش گوش گردد کر
ہمی نماید نوبت ہمی نماید ستور ... ہمی برآید موحش برار محور
سہ بار ما تو بدریا سے سیکرانہ شدم ... نہ موج دیدم و نے ہیبت نہ شورۂ شتر

سلطان محمود کی عادت تھی کہ جنگ کے وقت گھمسان کے معرکوں میں فوجوں کا دل بڑھانے کے لیے خود سب سے آگے بڑھتا تھا چنانچہ فرخی ؂

من ملک محمود را دیدستم اندر روز جنگ ... پیش لشکر خویشتن کردہ سپر ہنگام کار

فرخی کے قول سے معلوم ہوتا ہو محمود کے قبضے میں ہاتھیوں کی سب سے زائد تعداد اس کے آخر زمانۂ حیات میں سترہ سو پچاس تھی ؂

نے ہمارے شاعر کے سوانح کو ایسی جولانیوں کا میدان بنالیا۔ اس لیے فردوسی کے واقعہ نگار کو اگر کوئی اصلی شکایت ہے تو واقعات کی قلت اور غیر حاضری کے باعث سے نہیں ہے بلکہ اُن کی افراط اور کثرت تنوع کی بنا پر، کیونکہ متخالف اور متناقض روایات کا سلسلہ اس کو بے حد پریشان کرتا ہے اور وہ شبلی کے ہمزباں ہوکر بول اُٹھتا ہے" ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے"۔ اس لیے اس کا فرض ہے کہ جب وہ فردوسی اساب میں گھسے تو صحیح کو باطل سے حقیقت کو مجاز سے اور تاریخ کو افسانے سے تمیز کرنے کے لیے متقدمین میں سے کوئی نہ کوئی بدرقہ ساتھ لے لے، تن تنہا اس دشوار گزار راستے کو طے کرنے میں بھٹک جانے کا احتمال ہے۔

ان دشواریوں کا احساس کرکے پروفیسر براؤن نے فردوسی کے حالات لکھتے وقت اپنے لیے دو رہبر تجویز کرلیے پہلا نظامی عروضی سمرقندی اور دوسرا دولت شاہ جو اواخر قرن نہم ہجری کا مصنف ہے۔ صورت حالات میں براؤن کا انتخاب قریب قریب مناسب اور موزوں تھا لیکن جب براؤن کی تاریخ ادبیات ایران علامہ شبلی کی نظر سے گزری تو ایک بے محل اور غیر ضروری خفگی کا اظہار فرمایا ایک خط میں جو اپنے دوست مہدی حسن صاحب کے نام گیا، ۵ اپریل ۱۹۰۸ء کو لکھا گیا تھا فرماتے ہیں۔

"ملا مطالعہ کہتا ہوں کہ براؤن کی کتاب دیکھ کر سخت افسوس ہوا بہت عامیانہ اور سوقیانہ ہے۔ برادر اسحاق سے پڑھوا کر بھی سنا جو بھی الٹ پلٹ کر دیکھا فردوسی کی نسبت صرف دو تین صفحے لکھے ہیں جن میں اس کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔ مداں انسا صحیح ہے کہ آپ فردوسی کا درجہ سلوک طبقہ کے برابر بھی نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کسی حیثیت سے یہ کتاب اور

خواجہ ابوبکر حصیری فقیہ سے جو سلطان محمود کے ندیموں میں ایک امیر کبیر تھا فرخی کو بوجہ ہم وطنی خاص رابطہ رہا ہے اس کے مدحیہ قصیدے میں اپنی پچاس سالہ عمر کا بھی ذکر کرتا ہے

خدمت او کن و محروم مشو و شادبزی   من ازیں گونہ بگردیدم سالے پنجاہ

حصیری کا زیادہ عروج محمود کے اواخر ایام میں ہوا، غالباً یہ قصیدہ بھی اسی زمانے کا ہے اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ فرخی ۳۷۰ھ سے کچھ پہلے پیدا ہوا تھا۔

فردوسی

فردوسی کے حالات کے لیے ہمارے پاس قدیم و جدید متعدد ذرائع موجود ہیں لیکن ان میں جو زیادہ اہمیت رکھتے ہیں حسب ذیل ہیں -

(۱) شاہنامہ - اس کتاب میں بعض موقعوں پر شاعر کے حالات مل جاتے ہیں - (۲) دیباچۂ قدیم شاہنامہ - اس دیباچے کی تاریخ تحریر سے ہم ناواقف ہیں قیاساً کہا جاسکتا ہے کہ وہ فردوسی سے دو ایک صدی بعد لکھا گیا ہے لیکن اس کی اہمیت میں کوئی شک نہیں (۳) نظامی عروضی نے منتصف قرن ششم میں اپنا چہار مقالہ لکھا اس میں فردوسی کے حالات بھی مختصراً ملتے ہیں برخلاف دیگر مشاہیر کے فردوسی کے حالات کے متعلق ہر وقت اور ہر زمانے میں تلاش و جستجو رہی اور ہر عصر میں کچھ نہ کچھ لکھا گیا - اس لحاظ سے فردوسی خوش نصیب کہلائے جانے کا مستحق ہے لیکن ایک نقص یہ واقع ہوگیا کہ جہاں دیگر مشاہیر کے حالات سرے سے ملتے ہی نہیں وہاں فردوسی کے متعلق واقعات کا ایک انبار موجود ہوگیا - ہر قسم کی روایات جھوٹی سچی باتوں تاریخ اور افسانے

اپنے فن میں بے حد مفید اور کارآمد ہے اور بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اس وقت تک اس سے بہتر کوئی تصنیف اِس جامعیت کے ساتھ کسی زبان میں موجود نہیں۔ براؤن نے جو دشوار گزار اور کٹھن منزل طے کی ہے شبلی اُس کے مردِ میدان نہیں ہو سکتے۔

لیکن ناظرین کو یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ آخر پروفیسر براؤن نے وہ کون سا قصور کیا تھا جس کے لیے بارگاہِ شبلی سے اس قدر مخذول و معتوب بنائے گئے۔ براؤن نے اپنی تاریخ ادبیات ایران (صفحہ ۱۴۲، طبع سنہ ۱۹۰۶ء) میں فردوسی کے شاہنامے کے متعلق الفاظِ ذیل میں رائے دی ہے -

"اس عظیم الشان نظم کی ادبی وقعت و قابلیت کا نہایت اعلیٰ پیمانے پر اندازہ کرنے میں مشرقی اور مغربی محققین قریب قریب متفق ہیں اس لیے میں بڑے تذبذب اور تردد کا احساس کر کے معترف ہوں کہ میں اس جوش و ہیجان میں شریک ہونے کے ناقابل ہوں۔ میری رائے میں شاہنامہ سبعہ معلقہ کی مساوات بھی نہیں آسکتا۔ اگرچہ یہ مثنوی ممالکِ اسلام میں تمام رزمیہ نظموں کے لیے نمونہ اور مثال بن گئی ہے میرے خیال میں خوبیِ بیان، نزاکتِ جذبات اور حسنِ ادا میں فارسی زبان کی بہترین اخلاقی افسانوی اور عشقیہ نظموں کی ہمردیف نہیں ہو سکتی۔ بے شک ذوق اور وجدان کے معاملوں میں بحث و مباحثہ کرنا خصوصاً ادبیات کے شعبے میں تقریباً بے سود ہے۔ شاہنامہ کی قدر شناسی کے بارے میں غالباً میرا قصور کسی قدر اس قدرتی عجز کی بنا پر بھی ہے جس کی وجہ سے میں بالعموم رزمیہ اشعار کو پسند کرنے سے قاصر ہوں۔ ان خامیوں سے ہم سب واقف ہیں خاص کر موسیقی

شعرائے فارس کے کلام کے برابر نہیں۔ میں مع سود اور ہرجہ کے آپ
سے دام لوں گا۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللہ ۔
شبلی گیارہ اپریل ۱۹۰۸ء"

(جلد دوم، مکاتیب شبلی صفحہ ۲۴۲، معارف پریس اعظم گڑھ)

یورپ کے نہایت مشہور فاضل اور مستند مستشرق کی نسبت جس نے اپنی تمام عمر فارسی ادبیات اور ایران کی خدمت میں وقف کر دی اور اپنی تصنیفات اور تالیفات سے تمام فارسی خواں دنیا کو رہین منت کر دیا ہو جس کی فضیلت اور علم کے تمام ایرانی قائل ہیں۔ ہندوستان کے معروف ادیب کی یہ رائے پڑھ کر میں ایک سناٹے میں آ گیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ رائے کن معنوں پر محمول کی جائے شبلی عالم بے بدل سہی لیکن ان کی یہ تنگ چشمی اور کوتاہ نظری ہمیشہ افسوس کے ساتھ یاد کیے جانے کے قابل ہے۔

اگر تاریخ ادبیات ایران سوقیانہ اور عامیانہ لٹریچر تو میں نہیں کہہ سکتا کہ شعر العجم کو پھر کون سی صف میں جگہ ملے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا کی رائے میں واقفیت اسی درجے تک موجود ہے جس درجے تک ایک شاندار شاعرانہ مبالغے میں ہوتی ہے۔ مولانا شبلی کا مذاق اتنا صحیح ہے کہ سحبانِ فارس مولانا آزاد مرحوم کو براؤن کی تصنیف سے بہتر مانتے ہیں انہیں مہدی حسن صاحب کے نام ایک اور خط میں فرماتے ہیں -

"براؤن کی کھتونی سے کہیں بہتر ہے" (ایضاً، مکاتیب شبلی صفحہ ۲۴۲)

شعر العجم عالم بالا معلوم ہے ۔ شبلی کا اس جوش و ہیجان کے ساتھ براؤن کو اپنے ناوکِ بیداد کا ہدف بنانے میں خدا جانے کیا اسرار ہے۔ براؤن کی تصنیف میرا دل جوش کن مطالعہ رہی ہے اور میں نے اس سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے یہ کتاب

شروع کرتا ہوں۔

فردوسی کے نام کے لیے شبلی فرماتے ہیں

"حسن بن اسحاق بن شرف نام اور فردوسی تخلص ہے دولت شاہ کا لکھنا ہے کہ کہیں کہیں وہ ابیاعلی ابن شرف شاہ بھی لکھا ہے مجالس المومنین میں بعض مورخوں کے حوالے سے اس کے باپ کا نام منصور بن فخرالدین احمد بن مولانا فرخ بیان کیا ہے۔" (شعر العجم صفحہ ۹۳)

خدا جانے مولانا نے صاحب مجالس المومنین کو کیوں کانٹوں میں گھسیٹا۔ قاضی صاحب کے اصلی الفاظ یہ ہیں۔

"و بعضے گفتہ اند کہ او منصور بن فخرالدین احمد ابن مولانا فرخ الفردوسی است۔"

یعنی قاضی صاحب کے نزدیک فردوسی کا نام منصور ہے نہ اُس کے باپ کا۔ فردوسی کے نام کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ تاریخ گزیدہ میں حسن بن علی، دولت شاہ کے ہاں حسن بن اسحاق، دیباچہ بایسنغری میں منصور بن احمد، مجالس المومنین میں منصور بن احمد ہے لیکن اس باب میں سب سے بہتر مدار علیہ دیباچۂ قدیم شاہنامہ ہے جس کا بیان ہے۔

"پدر فردوسی دو فرزند داشت یکے حکیم ابوالقاسم المنصور الفردوسی و یکے مسعود۔"

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

"وطن میں بھی اختلاف ہے چہار مقالے میں ہے کہ طبرستان کی نواحی میں باژ نام ایک گاؤں تھا فردوسی یہیں کا رہنے والا تھا۔"

(شعر العجم صفحہ ۹۳)

ہیں جہاں شاہنامہ کا ایک حصہ بعض کو بالکل محو اور وارفتہ بنا دیتا ہے اور بعض کو بالکل بے تعلق چھوڑ دیتا بلکہ الٹا ناخوش کر دیتا ہے'

مولانا شبلی اور پروفیسر براؤن کے بیانات میں جو فرق ہے اس کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔ براؤن نے سبعہ معلقہ کو ترجیح دیتے ہوئے ساتھ ہی بیک بینی کے ساتھ یہ اقرار بھی کر لیا کہ میں شاہنامے کی حقیقی داد دینے سے معذور ہوں۔ براؤن کا دوسرا قول کہ شاہنامے سے بہتر فارسی زبان میں اور نظمیں بھی ہیں۔ شبلی اس موقعے پر اختصاص کر جائیں تو دوسری بات ہے ورنہ نظامی اور فردوسی کے مقابلے میں انھوں نے صاف نظامی کی افضلیت تسلیم کی ہے۔

ہمارا مشرقی مذاق انتہا پسند واقع ہوا ہے۔ عطریات میں ہم تیز بو والے عطر پسند کرتے ہیں۔ کھانوں میں چٹ پٹی یا کثرت سے شیریں اشیا ہیں مرغوب ہیں۔ لباس میں بھڑک جائز سمجھتے ہیں اسی طرح تاریخ بھی وہی پسند کرتے ہیں جس میں قصے بھی ہوں۔ اس کی کبھی پروا نہیں کرتے کہ یہ افسانے ہیں یا واقعہ۔ شبلی نے ملکی مذاق کی تبعیت میں فردوسی کے حالات قلمبند کرتے وقت اسی قسم کے ذرائع تلاش کیے جو ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق ہوں۔ نظامی عروضی اور دولت شاہ کے علاوہ مولانا کے پاس سب سے بہتر جو سند ہے وہ دیباچۂ بایسنغری ہے۔ اگر براؤن کی تقلید میں پہلے دو مصنفین پر ہی اکتفا کرتے تو شاید مولانا کم ٹھوکریں کھاتے لیکن دیباچۂ بایسنغری اُن کے مذاق کی چیز تھی اس کو دیکھ کر ایسے مفتون ہوئے کہ فردوسی کے حالات میں الف سے لے کر یا تک چند موقعوں کے سوا دیباچہ ہی ان کے پیش نظر رہا اور اس کے زیادہ دلچسپ مقامات کو جن کا زیادہ لغو ہونا بھی ظاہر ہے دل کھول کر نقل کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ شعر العجم میں فردوسی کا تاریخی حصہ قریب قریب ناقابل اعتبار ہے۔ ان چند مراتب کے بعد ہم شعر العجم کا مطالعہ

خاتمۂ شاہنامہ میں آتا ہے اور خاتمہ ۴۰۰ھ میں مرقوم ہوا تھا چنانچہ یہ شعر
ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار — کہ گفتم من ایں نامۂ شہریار
مولانا کا یہ عقیدہ تسلیم کر کے کہ فردوسی کا انتقال اسّی برس کی عمر میں
ہوا۔ اس کا سال ولادت معلوم کرنے کے لیے چار سو میں سے ہشتاد کی
تفریق کرنی ہوگی جس سے سال ولادت ۳۲۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ ۳۸۹ھ
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۳۸۴ھ میں فردوسی اپنی عمر کا اٹھترواں دور طے کر رہا تھا
اس لیے کہ اپنی عمر کے اڑتالیسویں سال جب ۳۷۰ھ ہوگا وہ شاہنامہ شروع
کرتا ہے اڑتالیس اور تیس (مدت شاہنامہ) اٹھتر ہوتے ہیں۔ ۳۸۸ھ میں
(سلطان محمود کی تخت نشینی کا سال) فردوسی چھیاسٹھویں سال میں تھا مارہ
اور چھیاسٹھ اٹھتر ہوتے ہیں جس طرح ۳۸۸ اور مارہ چار سو ہوتے ہیں۔
فردوسی کی ولادت اس لیے ۳۲۲ھ و ۳۲۳ھ کے درمیاں قرار پاتی ہے۔
اس کے بعد شبلی فردوسی کے باپ کا ایک خواب نقل کرتے ہیں جس کی
تاویل سحیب الدین معبّر بیاں کرتا ہے۔ اصل میں اس قصے کا ماخذ دیباچہ
بایسنغری ہے اس سے پیشتر اس کی سُراغ رسانی نہیں کی جا سکتی۔ یہ دیباچہ
۸۲۹ھ میں تصنیف ہوا ہے۔ اس امر میں بھی شک نہیں کہ اس قسم کے قصوں
کا تعلق فردوسی کی حقیقی تاریخ سے بہت کم ہے وہ ایسے زمانے کی یادگار ہیں
جب فردوسی کے متعلق اصلی تاریخ کی غیر حاضری میں افسانے اور قصص شائع
ہونے لگے ہیں۔

قولہ "چونکہ آبائی پیشہ زمیں داری تھا اور جس گاؤں میں سکونت تھی خود
اس کی ملک میں تھا اس لیے معاش کی طرف سے فارغ البال تھا"
(شعر العجم صفحہ ۹۴)

جب ہم چہار مقالے کو اٹھا کر دیکھتے ہیں تو اس میں صاف لکھا ہے :-

"استاد ابوالقاسم فردوسی از دہاقین طوس بود از دیہے کہ آن دیہہ را
باژ خوانند و از ناحیت طبران است"۔ (طبع یورپ صفحہ ۴۷)

اب کہاں طبرستان اور کہاں طبران، علامہ شبلی کو سخت غلط فہمی واقع ہوئی ہے۔ شمالی ایران کا وہ کوہستانی علاقہ جو بحیرۂ خزر پر واقع ہے طبرستان کہلاتا تھا۔ حدود دامغان سے لے کر کوہستان رے تک سب طبرستان میں شامل تھا اور وسیع معنوں میں اس کا اطلاق دارالمرز یعنی گیلان، ماژندران، دیلمان، رستمدار اور جرجان پر ہوتا تھا۔ طبران یا طابران طوس کے ایک شہر کا نام ہے طوس میں دو شہر شامل تھے اور مجموعہ طوس کہلاتا تھا پہلے شہر کا نام طبران اور دوسرے شہر کا نام نوقان تھا۔ ابوالفضل بیہقی کے ہاں طابران کا ذکر آتا ہے

"پس بدیں عزم سوئے طابران طوس برفت"۔ (صفحہ ۵۶۷)

فرماتے ہیں :-

"سنہ ولادت معلوم نہیں البتہ سال وفات ۴۱۱ھ ہے اور چونکہ
عمر کم از کم اسی برس کی تھی جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے ؎

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد   امیدم بیکبارہ برباد شد

اس لیے سال ولادت تقریباً ۳۲۹ھ سمجھنا چاہیے"۔

(شعر العجم صفحہ ۹۳ و ۹۴)

جب چار سو گیارہ سے اسی تفریق ہوئے تو حاصل تفریق ۳۳۱ھ ہے نہ ۳۲۹ھ۔ شعر بالا سے بھلا کون شخص یقین کر سکتا ہے کہ فردوسی نے اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔ کیا اس عمر کے بعد گلزارِ عالم کی ہوا کھانا فردوسی کے لیے ممنوع تھا۔ وہ ابھی عمر ہشتاد تک رہا ہے بلکہ نزدیک ہشتاد کہتا ہے شعر مذکورہ بالا

طوس کا عامل ارسلان خان ہوا چوں کہ شاہنامے کا اب ہر جگہ چرچا
پھیلتا جاتا تھا، سلطان محمود کو بھی خبر ہوئی ارسلان خان کے نام حکم پہنچا
کہ فردوسی کو دربار میں بھیج دو فردوسی نے پہلے تو انکار کیا لیکن
پھر شیخ معشوق کی پیشین گوئی یاد آئی اس لئے راضی ہو گیا"

(شعر العجم صفحہ ۹۵)

اس عبارت میں کئی امور دامنگیر تامل ہیں شبلی اس عامل طوس کا نام یہاں ابومنصور لکھتے ہیں لیکن صفحہ ۱۱۵ پر منصور بن محمد بتاتے ہیں اور اس اختلاف کی کوئی توجیہ بھی بیان نہیں کرتے فردوسی خود اس کا نام نہیں لیتا ٹرنر میکن اپنے شاہنامے کی شرح میں منصور بن محمد لکھتا ہے۔ یہ قول کہ ابومنصور کے بعد ارسلان خان عامل طوس ہوا غلط معلوم ہوتا ہے منصور بن محمد یا ابومنصور یا بہتر گردن فراز (جیسا کہ فردوسی لکھتا ہے) اگر واقع میں عامل طوس تھا تو سنہ ۳۷۰ھ کے قرب و جوار میں جب کہ شاہنامے کی ابتدائی منازل طے ہو رہی تھیں وفات پا چکا ہے ان ایام میں طوس یا خراسان کا آلِ غزنہ سے کوئی علاقہ نہیں تھا اور خراسان ابوعلی سیمجوری حسام الدولہ تاش اور فائق کے حملوں کی جولان گاہ بن رہا تھا اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ منصور بن محمد سیمجوریوں کا کوئی ملازم یا ماتحت ہوگا اسی وجہ سے فردوسی نے اس کا نام جب شاہنامہ سلطان محمود کے نام منسوب کیا شاہنامے سے خارج کر دیا۔ سیمجوریوں اور غزنویوں کی رقابت سب کو معلوم ہے اور خراسان کے لیے ان کی زور آزمائیاں تاریخ میں مسطور ہیں جب میں نے ارسلان خان کا نام پڑھا تو بہت حیران ہوا کہ یہ پٹھانوں کا سا نام غزنوی تاریخ میں کہاں سے نکل آیا۔ دیباچہ بایسنغری میں رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ ارسلان خان ہے لیکن آخری حصہ پھر بھی کھٹکتا رہا۔ کیوں کہ ان ایام میں خان کا استعمال صرف

نظامی کی سند پر عبارت بالا نقل کی گئی ہو لیکن اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں ۔

"فردوسی درآں دیہہ شوکتے تمام داشت چناں کہ بدخل آں ضیاع ازامثال خود بے نیاز بود۔" (چہار مقالہ صفحہ ۴۷)

نظامی فردوسی کو گاؤں کا مقتدر شخص مانتا ہو لیکن مولانا نے وہ گاؤں ہی اس کو عنایت کر دیا۔

فردوسی کی آسودگی اور فارغ البالی کا قصہ میرے خیال میں بے بنیاد معلوم ہوتا ہو اور شاہنامہ میرے اس خیال کا مؤید ہو۔ شاعر کئی موقعوں پر اپنی تنگ دستی کا شاکی ہو۔ چنانچہ سے

(۱) دو دیگر کہ گنجم وفا دار نیست ہمیں رنج را کس خریدار نیست

(شاہنامہ جلد اوّل صفحہ ۲)

(۲) مرا دخل و خورد ار برابر بدے زمانہ مرا چوں برادر بدے

(شاہنامہ جلد چہارم صفحہ ۱۲۷ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

(۳) نماندم نمکسود و ہیزم نہ جو نہ چیزے پدید است تا جو درو

بدیں تیرگی روز و ہول خراج زمیں گشت از برف چوں کوہ عاج

ہمہ کارہا شد سر اندر نشیب مگر دست گیرد حسین قتیب[۱]

میں اندر چنیں روز و چیدیں نیاز بماندیشہ در گشتہ فکرم دراز

اس سے ظاہر ہو کہ شاعر حسین قتیب سے اپنی زمین کا حاصل ادا کرنے کی استدعا کرتا ہو۔

قولہ "فردوسی کے وطن ہی میں شاہنامے کی ابتدا کی اور ابومنصور نے جو طوس کا صوبے دار تھا اس کی سرپرستی کی ابومنصور کے مرنے کے بعد

---

[۱] شاہنامہ جلد سوم صفحہ ۱۱۲ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ۔

دمدی گئی - فردوسی نے ہرات سے واپس جانا چاہا لیکن ساتھ ہی خیال پیدا ہوا کہ شاید اس میں کچھ بھید ہو۔ اتفاق سے عنصری اور بدیع الدین وغیرہ میں شکر رنجی پیدا ہوئی عنصری نے فردوسی کو جو خط لکھا تھا، بدیع الدین ہی کے مشورے سے لکھا تھا اب بدیع الدین نے فردوسی کے پاس قاصد بھیجا کہ فوراً ادھر کا عزم کیجیے عنصری نے جو لکھا جو دغا سے لکھا تھا فردوسی نے خط کے جواب میں لکھ بھیجا کہ میں آتا ہوں۔ یہ اشعار بھی خط میں درج کیے ؎

گوش از سرودتم لبے مژدہ است ۔۔۔ دلم گنج گوہر زباں اژدہاست
چو سعد میراں من عنصری ۔۔۔ گیا چوں کند پیش گلبن سری

(شعر العجم صفحہ ۹۵ و ۹۶)

اس قصے میں رودکی اور عنصری کا نام دیباچۂ بایسنغری میں ہر مقام پر ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے حتیٰ کہ ابیات مذکورۂ بالا کے ایک تیسرے شعر میں جس کو مولانا نے دانستہ ترک کر دیا رودکی کا نام یوں لیا گیا ہے ؎

ز سید النبی ماستد و کودکی ۔۔۔ کہ رائے فردی رند رودکی

یعنی اس سازش میں رودکی اور عنصری دونوں شریک و سہیم ہیں۔ مولانا نے جیسا کہ حاشیے میں ارشاد کرتے ہیں ("دیباچہ نویسوں نے عنصری کے ساتھ رودکی کا نام بھی لکھا ہے لیکن رودکی اس سے پہلے ۳۰۴ھ (کذا) میں مرچکا تھا") اس کا نام خارج کر دیا بعض اوقات کسی روایت کی تصدیق یا تردید اور اس کے ضعف و ثقاہت کی شناخت تاریخی تائید کی غیر حاضری میں اسی قصے میں کل آتی ہے جس سے ایک محقق کو اپنی تحقیق میں بڑی امداد ملتی ہے اس لیے ہر مورخ اپنا فرض جانتا ہے کہ پرانی روایات کو جوں کا توں جیسی اس تک پہنچی ہیں

شاہانِ ترک کے نام سے تعلق رکھتا تھا۔ آخر تاریخ میں رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ ارسلان خان اصل میں ارسلان جاذب ہے جو سلطان محمود کا غلام اور مشہور و معروف جرنل تھا۔ یہ شخص بقول عتبی ۳۸۹ھ میں طوس کا عامل مقرر ہوا۔ ۴۲۷ھ اور ۳۸۹ھ کے درمیان طوس پر خدا جانے کتنے انقلاب آئے ہیں۔ اور کتنے عامل بدلے گئے ہیں۔ محمود کا فردوسی کو دربار میں طلب کرنا قطعاً غلط ہے۔ شیخ محمد معشوق طوسی کا تعلق فردوسی کی روایات میں قدیمی معلوم نہیں ہوتا اور دیباچہ بایسنغری کے عہد سے شروع ہوتا ہے جو زمانہ درویش پرستی کا عنفوان شباب ہے لیکن وہ تاریخی بزرگ ہیں۔ مصنف کشف المحجوب اپنے معاصرین میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔ نفحات الانس (ص ۲۸۳، نول کشور ۱۹۰۵ء) میں جامی انھیں "عقلائے مجانین" میں شمار کرتے ہیں اور شیخ ابوسعید ابوالخیر متولد ۳۵۷ھ متوفی ۴۴۰ھ کا ہمعصر بتاتے ہیں۔ ان بیانات کی رُو سے انھیں فردوسی کا معاصر خورد مانا جا سکتا ہے۔

قولہ "دربار کا میر منشی ربیع الدین (کذا) دبیر تھا اس نے عنصری سے کہا کہ بادشاہ کو مدت سے شاہنامے کی تصنیف کا خیال تھا لیکن دربار کے شعرا میں سے کسی نے اس کی حامی نہیں بھری اب اگر فردوسی سے یہ کام بن آیا تو تمام شعرائے دربار کی آبرو خاک میں مل جائے گی عنصری نے کہا بادشاہ سے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فردوسی کو اُلٹا پھیر دیجیے لیکن اس کی اور تدبیر کرنا چاہیے چنانچہ فردوسی کے پاس ایک قاصد بھیجا کہ یہاں کا قصد بے فائدہ ہے۔ سلطان کو یوں ہی ایک خیال پیدا ہوا تھا جس کی بنا پر آپ کی طلبی کا حکم صادر ہوا لیکن اُس دن سے آج تک پھر کبھی ذکر تک نہیں آیا۔ اس لیے حقیقت واقعہ سے آپ کو اطلاع

طرح کیا جائے سب اس پر طبع آزمائی کریں اگر یہ بھی مصرع لگا سکے
تو شریک صحبت کر لیا جائے ورنہ شرمندہ ہو کر اٹھ جائے گا عنصری
نے ابتدا کی اور کہا ع چوں عارض تو ماہ نباشد روشن
فرخی نے کہا ع مانند رخت گل نبود در گلشن
عسجدی نے کہا ع مژگانت ہمی گذر کند از جوشن
قافیوں میں شن کا التزام تھا اور اس التزام کے ساتھ کوئی شگفتہ
قافیہ باقی نہیں رہا تھا فردوسی نے برجستہ کہا ع
مانند سنان گیو در جنگ پشن
گیو اور پشن کی تلمیح پوچھی فردوسی نے تفصیل بیان کی
اس وقت تو سب نے اس کو شریک صحبت کر لیا لیکن رشک اور
حسد ابنائی قوموں کا خاصہ ہے سب نے سازش کی کہ فردوسی دربار
تک نہ پہنچنے پائے۔
(شعر العجم صفحہ ۱۶ و ۹۷)

اس قصے کا اصلی راوی صاحب دیباچۂ قدیم ہے لیکن اس کے ہاں وہ حصہ جو حسد اور سازش سے تعلق رکھتا ہے غیر حاضر ہے پشن کسی پہلوان کا نام نہیں جیسا کہ مروں اور بستلی کا خیال ہے وہ ایک مقام کا نام ہے جہاں ایرانی لشکر پر تورانیوں نے شب خون مارا تھا شاہنامے میں اس کے متعلق حسب ذیل روایت ہے۔

ایرانی لشکر بسرکردگی طوس جب نودر کاسہ رود کے پاس پہنچ جاتا ہے پہاڑی گھاٹی میں جہاں سے راستہ جاتا ہے تورانیوں نے ناگہانی حملوں سے تحفظ کی خاطر ہیزم کا انبار لگا دیا تھا۔ ایرانی لشکر اس انبار میں آگ لگا کر بحیرت علیم کے علاقے میں گھس جاتا ہے سامنے ایک حاکم نشین قلعہ ہے جس کے حاکم

حوالہ قلم کرتے اور اپنی طرف سے کوئی تغیر و تبدل ترمیم و اضافہ نہ کرتے۔ اس قصے کے راوی نے جس کو تاریخ کے فن سے کوئی دلچسپی معلوم نہیں ہوتی غالباً خاقانی کا یہ شعر ذہن میں رکھ کر کہ ؎

شاعر ساحر منم ملک معانی مراست   ریزه خور خوان من رودکی و عنصری

یہ قیاس مترتب کیا کہ ان دونوں شاعروں کا ایک زمانہ ہے اور فردوسی کی برتری کا سکہ بٹھانے کے لیے اِس لغو قصے کی بنیاد ڈالی حالانکہ رودکی و عنصری میں پوری ایک صدی کا فاصلہ ہے۔ رودکی سنہ ۳۲۹ھ میں وفات پاتا ہے اور عنصری ۴۳۱ھ میں۔ مولانا شبلی کو قصہ پسند آیا لیکن رودکی کا نام تاریخی مشکلات کی بنا پر کھٹکا چنانچہ اُسے قلم زد کر دیا۔ شبلی نے اِس ترمیم سے تنقید کو ان افسانوں کی تردید اور تکذیب سے عاجز کر دیا ہے۔ انھوں نے مرقومۂ بالا دونوں شعروں کو فردوسی کی ٹکسال کا مال لیا۔ آخر اس تیسرے شعر نے کیا قصور کیا تھا وہ بھی اسی مصنف کا ہے جس مصنف کے پہلے دو شعر ہیں۔ فردوسی اپنی خواہش سے غزنیں آیا ہے نہ سلطان محمود کی طلبی پر۔ اِس لیے قصۂ ہذا کی اس کے واقعاتِ زندگی میں کہیں جگہ نہیں ہو سکتی۔ محمود کے دبیروں میں بدیع الدین کسی دبیر کا نام نہیں اور نہ 'الدین' پر ختم ہونے والے نام اس عہد میں رائج تھے ان کا رواج دیر میں ہوتا ہے۔

قولہ "حسن اتفاق سے دربار کے ممتاز شعرا یعنی عنصری و فرخی و عسجدی باغ میں سیر کو آئے تھے اور بادۂ و جام کا دور چل رہا تھا فردوسی اُدھر جا نکلا حریفوں نے اس کو مخل صحبت سمجھ کر روکنا چاہا ایک نے کہا کہ اس کو چھیڑا جائے تو خود تنگ آکر چلا جائے گا۔ عنصری نے کہا یہ تہذیب اور آداب کے خلاف ہے۔ آخر یہ قرار پایا کہ رباعی کا ایک مصرع

تو دانی کہ من روز جنگ پشن   چہ کشتم بدان رزمگاہ گشن

(شاہنامہ جلد دوم صفحہ ۷۷۲ طبع ۱۹۲۵ء)

خلاصہ یہ ہو کہ جنگ پشن ایرانیوں کے لیے ایک ترسناک ہزیمت تھی اور مصرع بالا میں گیو کے نیزہ کے لیے جو ادعا کیا گیا ہو بالکل بے حقیقت ہو میرا خیال ہو کہ یہ مصرع کسی ایسے شخص کے قلم سے نکلا ہو جو بوجہ شہرت محض اس جنگ کے نام سے واقف ہو لیکن اس کی اصلی کیفیت اور ضمنی واقعات سے بالکل بے خبر ہو پشن کے متعلق شاہنامے میں کئی تلمیحیں موجود ہیں یہ ادّعا بھی غلط معلوم ہوتا ہو کہ پشن کے التزام کے ساتھ کوئی اور شگفتہ قافیہ موجود نہیں گشن (بفتح اوّل وثانی بمعنی انبوہ بسیار) پشن سے زیادہ مشہور اور شگفتہ قافیہ موجود ہو اور غزنوی دَور میں ہر شاعر نے اس کا استعمال کیا ہو۔ فردوسی سے

یکے سرو بد سرو گرشن گشن   برو شاخ چون رزمگاہ پشن

اور ان رباعی میں اس قدر گنجایش ہو کہ اسباب اور اوتاد ہم قافیہ ہوسکتے ہیں اسی وجہ سے گشن (جس میں دو سبب خفیف ہیں) اور پشن (جو وتد مجموع ہو) قافیہ بن گئے اگر اس قصے کے ہیرو واقعی عنصری و فرخی ہیں تو اُن کے لیے نہایت آسان تھا کہ ایسی قوافی کو بحر متقارب سالم یا بحر ہزج سالم اور متدارک اور مشہور بحروں میں لاکر جس کے قافیے صرف اسباب پر ختم ہوتے اور اوتاد کا استعمال ناممکن ہوتا فردوسی اور اس کی بے محل مداخلت سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ رکھتے۔ ایسے بڑے پایے کے شعرا سے اس ادنیٰ سے نکتے کی فروگزاشت ناقابلِ معافی ہو۔

فردوسی غزنین میں سلطان محمود کی تخت نشینی کے وقت پہنچتا ہو کیا

کا نام نژاد ہے۔ نژاد دوسرے روز بیژن سے جنگ کر کے فرار ہو جاتا ہے۔ اس کی بیوی اسپنوی گرفتار کر لی جاتی ہے ایرانیوں کی آمد کی اطلاع افراسیاب کو ملتی ہے اور تورانی لشکر بہ سپہ سالاری پیران ویسہ بہت جلد تیار ہو کر مقابلے کے لیے روانہ ہوتا ہے۔ جاسوسوں کے ذریعے سے پیران کو اطلاع ملتی ہے کہ ایرانی شرابیں پی پی کر مست و غافل پڑے ہیں۔ طلایہ اور چوکی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ رات کو پیران مع اپنی تمام فوج کے بقصد شبخون آتا ہے ایرانیوں کو سوتا دیکھ کر حملہ کر دیتا ہے اور قتل عام ایک بڑے وسیع پیمانے پر شروع ہو جاتا ہے۔ گیو اپنے خیمے میں بیدار ہے ہتھیار لگا اور گھوڑے پر سوار ہو کر سپہدار یعنی طوس کے خیمے میں آ کر اس کو بیدار کرتا ہے پھر اپنے باپ گودرز کو جا کر جگاتا ہے ادھر بیژن کو جو مست پڑا تھا ہشیار کرتا ہے اتنے عرصے میں تورانیوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیے تھے صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ تمام ایرانی فوج کٹ چکی تھی اور معدودے چند متنفس بچے تھے الغرض یہی مناسب معلوم ہوا کہ فرار اختیار کیا جائے خیمہ و خرگاہ بار و بنہ چھوڑ کر بھاگے۔ تورانیوں نے تعاقب کیا اور فراریوں نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر جانیں بچائیں۔ یہ حالات ہیں اس بہت مشہور جنگ پشن کے۔ میرا مقصد اس جملۂ معترضہ سے یہ ہے کہ ہم نے جنگ پشن کے حالات دیکھ لیے ہیں اس میں کوئی ایسا موقع نظر نہیں آتا جس میں سان گیو کی کوئی قابل ستائش و تحسین کارگزاری دیکھی جاتی جس کی بنا پر مصرع بالا میں کوئی خوش گوار تلمیح قائم ہوتی یہ چند نفوس جن میں گیو بھی شامل ہے بدشواری تمام اپنی جانیں بچا کر بھاگے ہیں نہ گیو کو اس جنگ میں کسی محیریہ کارنامے کا موقع ملا ہے اور نہ اس نے کبھی اس پر فخر کیا ہے اس کے برخلاف ہومان تورانی جب کہ گیو اور طوس سے میدانِ جنگ میں ایک موقعے پر مناظرے میں مصروف ہے فخریہ کہتا ہے ؎

پورا نام ابوالحسن علی الترمذی ہے عوفی اس کو شعرائے آل سامان میں داخل کرتا ہے
ابوالمظفر طاہر بن الفضل کا مدح بیان کرتا ہے، طاہر ۳۷۷ھ میں وفات پاتا ہے نمبر
ششم حرمی اس شاعر کا کہیں تذکرہ نہیں ملتا عوفی اور نظامی ان سے ناواقف
ہیں۔ نمبر ہشتم ابوبکر اسکاف ترمذی۔ تذکروں میں کہیں ابوبکر اسکاف کا سراغ نہیں
چلتا۔ نفحات الانس میں البتہ جامی ایک بزرگ ابوبکر اسکاف کا ذکر کرتے ہیں
دیباچۂ مایسعری میں ابوبکر اسکاف کے بجائے ابوحنیفہ اسکاف ملتا ہے عوفی نے
شعرائے آل سلجوق میں اس کا شمار کیا ہے اور اس کا زمانہ عہد سلطان سنجر قائم کیا ہے
لیکن عوفی کو اس بارے میں سہو ہوا ہے ابوحنیفہ اسکاف سلطان ابراہیم غزنوی
کا مداح ہے۔ ابوالفضل بیہقی اپنی تاریخ میں اس کی بہت تعریف کرتا ہے وہ فضل و
ادب اور علمیت میں بے مثال تھا شعر اس کی کمترین صفت ہے۔ جب ابوالفضل
سے اس کی پہلی ملاقات امیر فرخ زاد ۴۴۳ھ و ۴۵۱ھ کے عہد میں ہوئی
ہے ابوحنیفہ اس وقت صرف درس دیا کرتا تھا۔ ابوالفضل کی فرمائش سے اس
نے تین قصیدے لکھے جو تاریخ بیہقی صفحہ ۳۳۵–۳۴۴ اور صفحہ ۴۷
۴۷۶ اور صفحہ ۷۹۷–۸۱ یہ درج ہیں۔ سلطان ابراہیم نے اپنے حسن کے
ایام میں ابوحنیفہ کی بعض تصنیفات دیکھیں ان کی عبارت اور خط کو بہت پسند
کیا جب تخت نشین ہوا ابوحنیفہ کو بلوایا اور اس کے قصیدے سنے اور خوب
خوب انعام دیے اور تربیت کی۔ بعد میں منصب اشراف ترمذ اس کے
سپرد ہوا۔

قولہ "فردوسی اس وقت چپکا ہو رہا اور خود یہ داستان نظم کرنی شروع کی
رات کو حسب معمول کے موافق کھانے پر بیٹھے تو فردوسی نے کہا عنصری
سے پہلے شعرائے رستم و سہراب کی داستان نظم کی ہو جیسا کہ خود میرے

ایسے ابتدائی زمانے میں یہ مشہور شعرا عنصری فرخی اور عسجدی جن میں سے ہر ایک صاحبِ شعر کامل استادی و شہرت حاصل کر کے محمود کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اوروں کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن فرخی کی نسبت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ سلطان محمود کے دربار میں اس عہد سے پندرہ سولہ سال بعد آیا ہے جیسا کہ فرخی کے حالات میں گزارش ہو چکا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر مجھ کو اس قصے کے تسلیم کرنے سے انکار ہے مغربی تنقید بھی اس کے تسلیم کرنے سے منکر ہے۔

اس کے بعد شبلی سلطان محمود کے ندیم ماہک کا قصہ قلم بند کرتے ہیں جس میں دکھایا گیا ہے کہ ماہک کی معرفت فردوسی دربارِ سلطانی میں رسائی حاصل کرتا ہے لیکن اس قصے کا راوی بھی صاف دیباچۂ بایسنغری ہے اور اسی فہرست میں داخل ہونا چاہیے جس میں رودکی اور عنصری والا قصہ درج ہوا ہے

اس کے بعد شبلی فرماتے ہیں -

"یہ وہ زمانہ تھا کہ سلطان محمود نے شاہنامے کی تصنیف کا حکم دیا تھا اور سات شاعر یعنی عنصری، فرخی، زینی، عسجدی، منجیک، جنگری، حرمی، ابوبکر اسکاف ترمذی اس کام کے لیے انتخاب ہوئے تھے۔"

(شعرالعجم حصہ ۱، ۹۷، ۹۸)

شاہنامے کے لیے سات شعرا کا سلطان کے حکم سے مامور ہونے کا قصہ سب سے پہلے دیباچۂ بایسنغری میں ملتا ہے اس کی مجعولیت کے لیے یہی کافی دلیل ہے شعرا کے نام لکھنے میں شبلی خاص بے پروائی سے کام لیتے ہیں ان ناموں میں نمبر سوم زینی ہے اس نام کا کوئی شاعر نہیں گزرا۔ ان کی مراد غالباً زینتی سے تھی۔ محمد عوفی اس کو زینتی علوی محمودی لکھتا ہے۔ نمبر پنجم منجیک اس کا

خداوند تاج و خداوند گنج — خداوند شمشیر و دہقان و رنج
کہ گنج از بخشش بنالد ہمی — بہ رزمی ز بانش بنالد ہمی
ز دریا بدریا سپاہ ویست — جہاں زیر فر کلاہ ویست
بگیتی نکاں اندروں زر نماند — کہ منشور بخشش ورا بر نخواند
ز دشمن ستاند رساند بدوست — خداوند پیروز گر یار اوست
ببزم اندروں گنج پیرا کند — چو رزم آیدش شیر و پیل افگند
چو او مرد گیرد بہ شمشیر تیز — برانگیزد اندر جہاں رستخیز
از آں دست و آں تیغ گوہر فشاں — ز گیتی بجوید ہمی سرکشاں

کہ در رزم دریاست خواند سپہر — برزم اندروں شیر خورشید چہر
گواہی دہد در جہاں آب و خاک — ہماں بر فلک چشمۂ آفتاب
کہ چوں او نبود دست شاہی بجنگ — بہ در جستن و کوشش و نام و ننگ
اگر مہر ماکیں سیا میر دے — ستارہ ز خشمش فرو ریزدے
تنش رود مداست و چندیں سپاہ — کہ اندر میاں باد را نیست راہ
پس لشکرش ہفصد ژندہ پیل — خدائے جہاں یاور و جبرئیل
ہمی باژ خواہد ز ہر مہترے — ز ہر نامدارے و ہر کشورے
اگر باژ ندہد کشور دہد — ہماں گنج و ہم تخت و افسر دہد
کہ یارد گزشتن ز پیماں اوے — دگر سر کشیدن ز فرماں اوے
کہ در بزم گیتی بدو روشن است — برزم اندروں شیر در جوشن است
ابوالقاسم آں شہریار دلیر — کہ گور استاند از چنگ شیر
جہاں دار محمود کامد نبرد — سر سرکشاں اندر آرد بگرد

(شاہنامہ جلد دوم صفحہ ۴۴ ۲ مسنی ۱۲۷۵ھ)

پاس ایک نظم موجود ہے جس کے آگے عنصری کے اشعار کی کچھ حقیقت
نہیں۔ یہ کہہ کر نظم جانے کی سرنامہ تھا ؎

کنوں خورد باید مئے خوش گوار — کہ می بوئے مشک آرد از جویبار
ہوا پر خروش و زمیں پر ز جوش — خنک آں کہ دل شاد دارد بنوش
ہمہ بوستاں زیر برگ گل است — ہمہ کوہ پر لالہ و سنبل است

(صفحہ ۹۲ طبع سوم)

دیباچے میں نہ کھانا کھانے کا ذکر ہے اور نہ عنصری سے پہلے داستان رستم و سہراب کی نظم کا۔ اس کی عبارت ہے ۔

"ابوالقاسم مادک رماں داستان رستم و اسفندیار نظم کرد چنانکہ ماہک
واقف بود ابتدائیش آں بود ؎
کنوں خورد باید مئے خوش گوار — کہ می بوئے مشک آرد از جویبار
شبے ماہک گفت سیرالملوک را بیشتر نظم دادہ اند وصفت کس ندی
آرا اساس محکم نہادہ ماہک گفت ممکن باشد۔"

لطف یہ ہے کہ مولانا رستم و سہراب کی داستان کا ذکر کرتے ہیں اور شعر داستان رستم و اسفندیار کے نقل کر رہے ہیں۔ بہرحال دیباچے کے نزدیک سب سے پہلی داستان جو فردوسی نے سلطان محمود کو پیش کی داستانِ رستم و اسفندیار ہے نہ داستان رستم و سہراب۔ دیباچہ قدیم اس سلسلے میں داستانِ سیاوش کا ذکر کرتا ہے لیکن شاہنامے کے نزدیک سب سے پہلی داستان جو سلطان محمود کو پیش کی گئی ہے داستان جنگ کیخسرو ہے۔ شاہنامے میں سب سے پہلا موقع یہی ہے جہاں سلطان محمود کے مدحیہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ اس کی ابتدا ہے ؎

بہ یزداں ابر شاہ باد آفریں — کہ نازد بدو تخت و تاج و نگیں

شاہنامے سے اس قدر اور معلوم ہوتا ہے کہ داستانِ رستم و سہراب اور داستانِ سیاوش طوس میں لکھی گئی تھیں۔ مؤخر الذکر داستان فردوسی نے اپنی عمر کے سال پنجاہ و ہشتم یا ۳۸۴ھ میں لکھی ہے داستانِ رستم و اسفندیار اگرچہ غزنیں میں لکھی گئی ہے اور اس میں سلطان کی طرف تلمیح بھی موجود ہے تاہم اس کو اولیت کا فخر حاصل نہیں اس کے مقابلے میں داستانِ سکندر بہتر استحقاق رکھتی ہے۔

قولہ "فردوسی نے کہا طوس کا باشندہ ہوں محمود نے اس کے حالات پوچھے اور اسی سلسلے میں پوچھا کہ طوس کب سے آباد ہے اور کس نے آباد کیا فردوسی نے تفصیل سے واقعات بیان کیے"

(شعر العجم صفحہ ۹۹)

گویا یہ باتیں سلطان اور فردوسی میں داستانِ اسفندیار سنانے کے بعد ہو رہی ہیں مولانا طوس کی آبادی کے سامان کی طرف ایک نگاہ غلط انداز ڈالتے ہوئے گزر گئے اس کی تفصیل دیباچۂ بایسنغری میں حسب ذیل ہے کہ۔

"جب کیخسرو نے اپنے باپ سیاوش کا انتقام لینے کے لیے طوس بن نوذر کو افراسیاب سے جنگ کے لیے بھیجا تو ہدایت کر دی کہ کلات کے راستے سے توران نہ جانا کیوں کہ وہاں میرا ایک بھائی فرود رہتا ہے وہ سودائی مزاج ہے ایسا نہ ہو کہ تجھ سے لڑ مرے طوس اس ہدایت پر تعمیل کا اقرار کر کے رخصت ہوا جب تورانی سرحد آئی تو کیخسرو کی ممانعت کے باوجود اس نے کلات ہی کا راستہ اختیار کیا۔ بعد میں کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ طوس اور فرود میں جنگ ہوئی اور فرود مارا گیا کیخسرو فرود کے قتل کی خبر معلوم کر کے بہت برافروختہ ہوا کہ میں نے طوس کو باپ کے خون کا بدلہ لینے بھیجا تھا نہ بھائی کو قتل کرانے جب طوس توران

اس مدح کے بعد فردوسی گویا ہو کہ میں نے یہ نظم اس مقصد سے لکھی ہو تاکہ ایامِ پیری میں اس سے نفع حاصل کروں لیکن مجھ کو کوئی قدرداں سرپرست نہیں ملا۔ میں منتظر رہا تھی کہ اس امید اور انتظار میں عمر کے پینسٹھ سال میں نے فکر افلاس اور پریشانی میں گزار دیے جب پینسٹھ گزر کر میں چھپاسٹھویں سال میں لگا ضعیفی نے عصا میرے ہاتھ میں دے دیا میری سُرخ و سفید رنگت زعفرانی ہوگئی بڑھاپے نے کمر جھکا دی آنکھوں کی بصارت ضعیف ہوگئی تب میں نے ایک آواز سُنی کہ فریدوں کی تلاش کوں کر رہا تھا وہ دیکھو فریدوں زندہ ہوگیا اور زمین و زمانہ اس کے غلام بن گئے (یہ تلمیح ہو سلطان محمود کی تخت نشینی کی طرف) اِس نے اپنی فیاضی اور انصاف سے دُنیا کو مسخر کر لیا ہو اس کی تاریخ کے آثار اور علامات سب طرف نمایاں ہیں جب میں نے یہ آواز سُنی اپنی کتاب اس کے نام پر منسوب کر دی اور توقع کرتا ہوں کہ پادشاہ اس ضعیفی کے عالم میں میری دستگیری کرے اور خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں کہ یہ کتاب پادشاہ کے نام پر ختم کر دوں اسی تمہید میں ذیل کے شعر آتے ہیں ؎

چو پیکار کیخسرو آمد پدید   زمن جادوی ها باید شنید

بدین داستان در بیارم همی   ز سنگ اندرون لاله کارم همی

کنون خطبه یافتم زین نشان   که مر سخن یافتم پیش ازان

اِن اشعار سے ظاہر ہو کہ شاہنامہ فردوسی اس وقت سلطان کے نام معنون کر چکا ہو تب ہی تو پھر یہ لہجے میں کہتا ہو کہ جنگ کیخسرو کے دوران میں تم میری سحر کاریاں دیکھنا اس داستان میں موتیوں کا مینہ برسا دوں گا اور پتھر میں لالہ اُگا کر ناممکن کو ممکن کر دکھاؤں گا۔ میرے دیباچے کے لیے ایسا عالیشان مخاطب مل گیا ہو جس سے میرے سخن گستری کے سر میں ملبتی ہوگئی۔

اب ظاہر ہو کہ شاہنامے کے بیاں کے مطابق طوس بجائے خراساں میں ٹھہرنے اور طوس آباد کرنے کے سیدھا کیخسرو کے پاس جاتا ہو اور قید کر دیا جاتا ہو شاہنامے سے یہ امر بھی ثابت ہو کہ شہر طوس طوس بن نودر سے بہت پہلے آباد تھا، گنج عروس کیکاؤس نے طوس ہی میں رکھا تھا۔ کیخسرو نے یہ خزانہ خلع سلطنت کے وقت گیو زال اور رستم پر تقسیم کر دیا۔ (شاہنامہ) ؎

دگر گنج کش خواندندے عروس — کہ آگند کاؤس در شہر طوس
بگودرز فرمود کا نرا بہ بخش — بگیو و بزال و بدادو درخش

سام نے جو رستم پہلوان کا دادا ہو اسی طوس میں ایک اژدہا مارا تھا۔ داستانِ رستم و اسفندیار میں رستم اپنے اسلاف کی ستایش کے وقت سام کے ذکر میں گویا ہو ؎

نخستیں بطوس اندروں اژدہا — کہ از چنگ اوکس نگشتے رہا
بدریا نہنگ و بہ خشکی پلنگ — دمش نرم کردے بگہ خارہ سنگ
بکشت آنچناں اژدہا را بگرز — جہاں گشت او را زبہر فر و برز

شہر طوس کے بانی کی حیثیت سے ہمارے ہاں عام طور پر طوس بن نودر کا نام لیا جاتا ہو اور یہ روایت دیباچۂ بایسنغری سے قدیم ہو۔ پہلوی روایات بھی اسی عقیدے کی موید ہیں جیسا کہ "شتر وی ہائے ایراں" (شہر ہائے ایراں) سے معلوم ہوتا ہو میرا مطلب یہاں اس روایت کے صحت و سقم سے نہیں بلکہ صرف یہ دکھانا ہو کہ اس قصے کا فردوسی کی طرف منسوب کیا جانا غلط ہو۔

شبلی فرماتے ہیں ۔

اس زمانے میں امرد پرستی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا محمود نے فردوسی سے فرمایش کی کہ ایاز کے سرو خط کی تعریف میں کچھ کہے فردوسی نے

سے لوٹا۔ ندامت کی وجہ سے کیخسرو کے پاس نہیں گیا بلکہ خراساں میں ٹھہر گیا اور وہاں کسی قصبے کو شہر کی صورت میں آباد کر کے اپنے نام پر اس کا نام شہر طوس رکھا۔"

اس قصے کے متعلق دعویٰ کیا گیا ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود سے بیان کیا جس سے تاریخ میں فردوسی کی بلند پائگی کا نقش سلطان کے دل پر جم گیا نیز اس روایت کے پچھلے حصے سے یہاں بحث کرتا ہوں۔ اتفاق سے شاہنامے میں یہ تمام قصہ موجود ہے شاہنامے میں لکھا ہے کہ جب کیخسرو کو اس کے بھائی فرود کے مارے جانے کا پرچہ گزرا تو اس نے اپنے چچا فریبرز کو سپہ سالار بنا کر بھیج دیا اور طوس کو معزول کر کے واپس آنے کا حکم دیا طوس لشکر کی کماں فریبرز کے سپرد کر کے سیدھا کیخسرو کی خدمت میں پہنچ گیا۔ چنانچہ شاہنامہ ؎

برفت و ببرد آنکه بد نوذری ـــ سواران جنگ آور لشکری
به ره بر نکرد ایچ گونه درنگ ـــ بنزدیک شاه آمد از دشت جنگ
زمین را ببوسید در پیش شاه ـــ نکرد ایچ خسرو بدو در نگاه
بدشنام بگشاد لب شهریار ـــ بر آن انجمن طوس را کرد خوار

خسرو نے بڑی لعنت و سرزنش کے بعد طوس بن نوذر کو اس کے اپنے گھر میں قید کیے جانے کا حکم دیا جس کو خدائے سخن اپنے برجستہ اور زوردار الفاظ میں یوں ادا کرتا ہے ؎

نژاد منوچهر و ریش سپید ـــ ترا داد بر زندگانی امید
دگرنه بفرمودمی تا سرت ـــ بد اندیش کردی جدا از برت
برو جاودان خانه زندان تست ـــ همان گوهر بد نگهبان تست
ز پیشش براند و بفرمود بند ـــ نه شد از دلش هیچ شادی نکند

(شاہنامہ صفحہ ۷۱۳ جلد دوم طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

سال ہونی چاہیے۔

ناظرین کو فرخی کا قصیدہ ایاز کی تعریف میں یاد ہوگا جس کے بعض اشعار فرخی کے حالات میں نقل ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک دو شعر یہاں دوبارہ نقل کرتا ہوں ؎ (فرخی)

سوار یکہ درمیدان بیاید ہمی اندر صف دلہا رباید
یکے گوید کہ آں سرو یست برکوہ یکے گوید گل تازہ است بربار
نماید پارسا را ستوے گردد نگاہیں کردلی اورا خریدار

یہ قصیدہ ۴۲۱ھ میں لکھا گیا ہے فرخی یہاں ایاز کو کبھی سرو کہتا ہے اور کبھی گل تازہ اس قسم کے الفاظ سولہ سترہ سے پچیس تیس سالہ نوجوان کے لیے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں نہ ترپن چوّن سال کے بوڑھے کے لیے۔ اس سے میں یہ قیاس مترتب کرتا ہوں کہ ایاز ۴۲۱ھ میں اپنی عمر کا خوش ترین دور یعنی شباب کا زمانہ طے کر رہا تھا اور یہ کہ جب فردوسی سلطان کے یہاں آیا ہے یعنی ۳۸۹ھ میں اُس کا وجود بھی دنیا میں نہ تھا اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ایاز ان ایام میں پیدا ہو چکا تھا تو اپنی ماں کی گود میں کھیلتا ہوگا۔ نزاعی بالا ایک نامعلوم طریقے سے فردوسی کی طرف منسوب ہے غالباً دیباچۂ بایسنغری اس کا قدیم ترین راوی ہے۔

قولہ "محمود نہایت محظوظ ہوا اور شاہنامے کی تصنیف کی خدمت سپرد کی ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی صلہ مقرر ہوا اور حکم ہوا کہ جب ہزار شعر تک نوبت پہنچ جائے تو ہزار اشرفیاں دے دی جایا کریں لیکن فردوسی نے متفرق رقم سے انکار کیا اور کہا کہ جب کتاب پوری ہو جائے گی تو ایک ساتھ لوں گا"

(شعر العجم صفحہ ۹۲ طبع سوم ۱۳۳۹ھ)

برجستہ کہا ہے

مست است ساچشم تو دتیر بدست — بس کس کہ رتیر چشم مست تو خست
گر لونشد عارضت زرہ در بیست — کر تیر تر سد ہمہ کس حاصہ رست

(شعر العجم صفحہ ۹۹)

عنصری اور فرخی کے ذکر میں اس خاص موضوع پر مولانا کافی لکھ چکے تھے اگر اس موقعے پر ایاز کے قصّے کو نہ دوہراتے تو کرم کرتے ع

کہ حلوا چو یکبار خوردند و بس

علامہ شبلی نے شعر العجم کے ورق کے ورق فردوسی کے حالات سے بھر دیے لیکن افسوس ہو کہ ان کو ایک ادنیٰ سی بات اب تک معلوم نہیں ہوئی کہ آخر فردوسی سلطان محمود کے دربار میں کون سے زمانے میں آیا اگر اس خفیف سے واقعے کی تعیین کرلی جاتی تو کئی موقعوں پر دیباچے کی لعویات پر اعتبار کرنے سے بچ جاتے اور ایسا آسان شکار نہ بن جاتے میں پھر گزارش کرتا ہوں کہ فردوسی سلطان محمود کے دربار میں اُس کے اورنگ نشیں ہوتے ہی آجاتا ہو۔ یعنی ۳۸۸ھ میں غزنیں آچکا ہو اس سال سے ۳۹۴ھ تک سلطان محمود سے اس کے خوش گوار تعلقات قائم رہتے ہیں اس کے بعد کوئی واسطہ نہیں رہتا اب میں یہ سوال پیش کرتا ہوں کہ ان ایام میں کیا ایاز کے رخسار پر سبزۂ خط نکل آیا تھا؟ اگر ایسا ہو تو کم سے کم ۳۸۸ھ میں اس کی عمر بیس سال کی ہونی چاہیے یہ بھی یاد رہے کہ مولانا، فرخی کو بھی ایاز کے تیرِ نگاہ کا زخمی بتا چکے ہیں جس کی یادداشت میں شاعر کا دربار بند ہوتا ہو (شعر العجم صفحہ ۸۰) یہ پہلے دکھایا جاچکا ہو کہ فرخی غزنیں میں ۴۰۶ھ کے بعد آیا ہو۔ ایاز کی عمر جس کا شعلۂ عارض ۳۸۸ھ میں آتش جس پوش بن چکا ہو فرخی کی آمد تک تیس

"تباہ کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ عراق اور اطراف و جوانب کے امرا فردوسی کو طرح طرح کے تحفے بھیجتے تھے فردوسی بھی اشعار کے ذریعے سے ان کا شکریہ ادا کرتا تھا جس کو یہ ناگوار معلوم ہوتا لیکن فردوسی کچھ پروا نہیں کرتا تھا اور کہتا تھا ؎

من بندہ کہ مبادی فطرت بودہ‌ام — مائل بمال ہرگز و طامع بجاہ نیز
سوئے در وزیر چرا ملتفت شوم — چوں فارغم ز بارگہ پادشاہ نیز

حسن میمندی مذہباً خارجی تھا اور فردوسی شیعہ اس لیے اس نے فردوسی کی مخالفت کی ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے"

(شعر العجم صفحہ ۱۱ و ۱۲۲)

جب یہ وقیع بزرگوں نے دیباچۂ بایسنغری کی طرف توجہ نہیں کی تو اس کی یہی وجہ تھی کہ دیباچہ کے بیانات (اور مجھ کو کہنا چاہیے اکثر بیانات) پایۂ تاریخ سے ساقط ہیں لیکن شبلی نے اس قابل مورخ کی تصنیف کو تو "بزرگوں کی کھتونی" کہہ کر دور پھینک دیا اور دیباچے پر آنکھ بند کر کے بھروسا کر لیا۔ اب پاس کے پیچھے فرماتے ہیں کہ ان متناقض روایتوں میں سے کس پر اعتبار کیا جائے وہی مثل ہوئی جیسے کوئی کہے کہ تاریخ میں ہارون الرشید کا تذکرہ الف لیلہ کے بیان سے مختلف ہے ان میں سے کس پر اعتبار کیا جائے، یہ معاملہ تو نہایت آسان تھا سب کو معلوم ہے کہ نظامی نے ۵۵۰ھ کے قرب و جوار میں اپنی کتاب لکھی ہے اور دیباچہ ۸۲۹ھ میں لکھا گیا اب جو ذرائع معلومات کے نظامی کو مل سکتے ہیں وہ صاحب دیباچہ یا دولت شاہ کو نہیں مل سکتے اس لیے نظامی کے بیانات کے مقابلے میں دیباچے کی لغویات کو کوئی وقعت نہیں دی جا سکتی۔

دیباچہ نگار کا پایۂ تحقیق صرف اس ایک ادنیٰ سی بات سے ظاہر ہے کہ اس کو

فردوسی کے حامیوں نے قانونی حیلے تراشنے کی خاطر اس معاملے کو ایک معاہدے کی صورت میں بدل دیا ہے تاکہ سلطان پر الزام آسکے اور فردوسی اس کی ہجو لکھنے میں حق بجانب ٹھیرے۔ یہ روایت دیباچۂ قدیم میں بھی موجود ہے۔ تاہم ناقابل قبول ہے۔ سلطان اور فردوسی میں کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہوا۔ فردوسی اپنی نیک نامی اور قدردانی کی امید میں شاہنامے کی نظم پر مصروف ہوا، اور بقول خود سلطان محمود کی تخت نشینی کے وقت سے بیس سال پہلے سے مشغول تھا۔ چنانچہ؎

سخن را نگہ داشتم سال بیست　　　بداں تا سزاوار ایں گنج کیست

کسی دوسرے مقام پر کہتا ہے؎

ہمی گفتم ایں نامہ را چند گاہ　　　نہاں بود از چشم خورشید و ماہ

خود مولانا شبلی بھی اس روایت کو صحیح نہیں مانتے۔ فرماتے ہیں:-

"عام طور پر مشہور ہے کہ فردوسی نے سلطان محمود کے دربار میں پہنچ کر اس کے حکم سے شاہنامہ لکھنا شروع کیا اکثر تذکروں میں بھی یہی لکھا ہے لیکن یہ غلط اور محض غلط ہے" (شعرالعجم صفحہ ۱۶ طبع سوم ۱۳۳۹ھ)

فرماتے ہیں:-

"دولت شاہ نے لکھا ہے کہ چوں کہ فردوسی نے ایاز کی طرف کبھی توجہ نہیں کیا اس لیے اس نے دراندازی کی اور محمود کو یقین دلایا کہ فردوسی رافضی ہے"۔ نظامی عروضی کا بیان ہے کہ دربار کا ایک گروہ وزیر اعظم حسن میمندی کا مخالف تھا اور چونکہ فردوسی کا مربی اور سرپرست وہی تھا اس لیے اس کی ضد پر اس گروہ نے محمود کے کان بھرے اور فردوسی کو معتزلی اور رافضی ثابت کیا" دیباچے میں ہے کہ فردوسی کو خود حسن میمندی نے

اِن دنوں خواجہ احمد میمندی وزیر نہیں تھا بقول عُتبی ۴۰۱ھ میں خواجہ احمد باقاعدہ وزیر بنایا جاتا ہے اگرچہ اس سے چند سال پیشتر ہم سرکاری طریقے پر وزارت کا کام بھی کرتا رہا ہے۔ اشعار کی زبان بھی فردوسی کی زبان ہے میں نظامی کے بیان کو تسلیم کرتا ہوں اس ترمیم کے ساتھ کہ فردوسی کا دوست اور محسن وزیر اوّل تھا وہ وزیر دوم کو سمجھا اس وزیر کا نام خواجہ ابو العباس فضل بن احمد اسفرائنی ہے اس سے فردوسی کے اچھے تعلقات تھے شاہنامے میں دو موقعوں پر اس کا ذکر آتا ہے اور فردوسی اس کا ممنون بھی معلوم ہوتا ہے شاہنامہ ؎

ز دستور فرزانۂ دادگر   پراگندہ رنج من آمد بسر[1]

صورتِ حالات میں یہی درست معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی کا سرپرست خواجہ ابو العباس تھا نہ خواجہ ابو القاسم احمد۔ شاہنامے میں خواجہ ابو القاسم کا کہیں ذکر نہیں آتا۔

مذکورۂ بالا دونوں شعر وزیر اور بادشاہ کی درگاہ سے ہمارے شاعر کی بے نیازی اور استغنا کے متعلق ہیں۔ فردوسی کے خیالات کی ترجمانی نہیں کرتے نہ وہ اس کی زبان میں ہیں۔ ان پر عربی کا گہرا اثر ہے۔ مبادی فطرت مائل طامع وزیر ملتفت خارج۔ فردوسی کے روز مرہ میں داخل نہیں ان شعروں کا مالک صاحبِ دیباچہ ہے نہ فردوسی۔

حسن میمندی مذہباً خارجی تھا۔ کاش اس موقع پر تو مولانا اپنی آنکھیں کھولتے کہ وہ شیعہ روایات کی بھول بھلیاں میں پھنس گئے ہیں۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ خواجہ ابو القاسم احمد جو سلطان محمود کا رضاعی بھائی اور بچپن کا دوست ہم مکتب اور ہم صحبت تھا خارجی کیوں کر ہو سکتا ہے لیکن مولانا شیعہ

---

[1] جلد دوم ص ۲۴۴ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ

دیگر واقعات در کنار سلطان محمود کے وزیر کا نام تک صحیح معلوم نہیں اس وزیر کا نام خواجہ ابو القاسم احمد بن حسن میمندی ہی والدین کے گناہ کی اولاد کو عقوبت ملتے سنا ہی، لیکن فرزند کی بداعمالیوں کی پاداش میں صاحب دیباچہ نے احمد کے باپ حسن کو ماخوذ کیا ہو۔ علامہ شبلی جو ایک مورخ نے بدل ہیں بجائے اس کے کہ ان امور سے دیباچے کی لغویت کا سراغ چلاتے خود اس کی لغویت کے شکار بن گئے۔ چنانچہ بار بار اس کا نام حسن میمندی لکھ رہے ہیں اور لطف یہ ہو کہ جہاں نظامی عروضی نے چہار مقالے میں "خواجۂ بزرگوار احمد حسن" لکھا تھا شبلی نے اس کو بھی اصلاح دے دی۔ چنانچہ جب اس کا بیان نقل کیا تو وہاں احمد حسن کے بجائے حسن میمندی لکھا گویا نظامی کی غلطی کی تصحیح کی۔ مولانا کو معلوم ہونا ہو گلستاں خوب یاد تھی کیوں کہ اس میں ایک حکایت آتی ہو" تنے چند از بندگان سلطان محمود گفتند حسن میمندی را کہ سلطان چہ گفت در فلاں مصلحت"! (باب چہارم حکایت ہشتم) لیکن شیخ سعدیؒ کو میں مصلح اخلاق مانتا ہوں نہ مصلح تاریخ جو لوگ غزنوی ادبیات اور اس عہد کی تاریخ سے واقف ہیں ان کو معلوم ہو کہ خواجہ احمد بن حسن میمندی اپنے ذاتی نام سے یاد کیے گئے ہیں نہ اس کے باپ حسن میمندی کے نام سے۔ فرخی کہتا ہو ؎

خواجہ بزرگ شمس کفاۃ احمد حسن کاحسان او ولعمت او دست کرباست

دیگر

دستور ملک صاحب ابو القاسم احمد آں حمد و ثنا را دل و دیدہ خریدار

عتبی اور بیہقی وغیرہ سب اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ حسن میمندی کسی زمانے میں سلطان کا وزیر نہیں بالکہ امیر ناصر الدین سبکتگین کے عہد میں کسی خطا پر معتوب ہوا تھا۔ دوسری بات یہ ہو کہ جن دنوں فردوسی کا قصہ در پیش تھا

سنہ ۳۷۱ھ میں مویدالدولہ نے جرجان پر حملہ کیا قابوس اور فخرالدولہ شکست کھا کر خراسان بھاگ آئے۔ سامانیوں نے ان کی امداد کے لیے حسام الدولہ ابوالعباس تاش کے ساتھ زبردست فوج روانہ کی لیکن مہم ناکامیاب رہی سنہ ۳۷۳ھ میں مویدالدولہ کے انتقال پر فخرالدولہ اپنے بھائی کے تخت پر بیٹھا۔ امیر سبکتگین اور فخرالدولہ ماہ شعبان ۳۸۷ھ میں آگے پیچھے انتقال کرتے ہیں سبکتگین کے بعد باپ کی وصیت کے موافق امیر اسمٰعیل تخت نشین ہوتا ہے ملک کے مقاسمہ پر بھائیوں میں جھگڑا ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محمود ۳۸۸ھ میں تخت نشین ہوتا ہے فردوسی اس واقعے کے بعد غزنین آتا ہے داستانِ رستم و اسفندیار غزنین ہی میں لکھی جاتی ہے۔ اس کے خاتمے میں سلطان کے حق میں دعائیہ اشعار موجود ہیں۔ چنانچہ شاہنامہ

؎ سر آمد کنوں رزم اسفندیار — کہ جاوید بادا سر شہریار
ہمیشہ دل از رنج پرداختہ — زمانہ بفرمان او ساختہ
دلش بادشاداں و تاجش بلند — نگردد بد اندیش اورا گزند

قصہ کوتاہ جب داستانِ رستم و اسفندیار لکھی گئی ہے فخرالدولہ اپنی قبر میں سو رہا تھا اس لیے فخرالدولہ کا فردوسی کے لیے انعام بھیجنے کا قصہ بالکل بے بنیاد ہے۔

قولہ "بہرحال وجہ کچھ ہو واقعہ یہ ہے کہ محمود نے فردوسی کی قدردانی کا حق ادا کیا فردوسی حمام میں نہا رہا تھا کہ شاہنامے کا صلہ پہنچا فردوسی حمام سے نکلا تو ایاز نے روپے کی تھیلیاں پیش کیں فردوسی نے بڑی شتابی سے دستِ شوق بڑھایا لیکن سونے کے پھول کے بجائے چاندی کے پھول تھے فردوسی کے دل سے بے ساختہ آہ نکلی تھیلیاں کھڑے کھڑے لٹا دیں اور ایاز سے کہا کہ بادشاہ سے کہنا کہ میں نے یہ خونِ جگر ان سپید دانوں کے لیے نہیں کھایا تھا۔ ایاز نے محمود سے ساری کیفیت بیان کی۔

(شعرالعجم صفحہ ۱۵۰ ؛ ۱۵۱)

روایت کے راز کو نہ سمجھے جو اس کا خارجی خیال کیا جانا ایسا ہی ہو جیسا سلطان محمود کو خارجی کہنا۔ ہجو کے اشعار میں خود سلطان کو خارجی بنانے کی کوشش کی گئی ہو افسوس شبلی برون کے سبعہ معلقہ کی سوئی نہ دیکھ سکے لیکن دیباچے کے اونٹ کے اونٹ نگل گئے۔

قولہ "دیباچے میں ایک اور وجہ بیان کی ہو اور وہ قرین قیاس ہو سلطان محمود کو دیلمی خاندان سے سخت عداوت تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سخت متعصب شیعہ تھے (دیباچے میں رافضی کا لفظ تھا جس کو ہم نے بدل دیا) اس خاندان کا تاجدار فخر الدولہ تھا وہ فردوسی کا نہایت قدرداں تھا جب فردوسی نے رستم و اسفندیار کی داستان نظم کی تو اُس نے صلے کے طور پر ہزار اشرفیاں بھیجیں اور لکھا کہ اگر آپ یہاں تشریف لائیں تو نہایت اعزاز و احترام کیا جائے گا یہ خبر تمام عزنیں میں پھیل گئی محمود نے سنا تو اس کو ناگوار گزرا۔ (شعر العجم صفحہ ۱۳۱)

یہاں علامہ شبلی پھر دیباچہ بایسنغری کے دام فریب میں پھنس گئے وہ اس کے عشوہ ہائے لاجوردی کے کچھ ایسے مفتون ہو گئے ہیں کہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

فخر الدولہ دیلمی اور فردوسی کا قصہ تاریخی لحاظ سے قطعی غلط ہو جس کی تفصیل یہ ہو کہ رکن الدولہ بویہ المتوفی سنہ ۳۶۶ھ کے تین فرزند تھے عضد الدولہ مؤید الدولہ اور فخر الدولہ۔ عضد الدولہ بوجہ شہرت چنداں محتاج بیاں نہیں۔ مؤید الدولہ کو باپ نے حینِ حیات میں اصفہان دے دیا اور فخر الدولہ کو ری۔ رکن الدولہ کے بعد مؤید الدولہ نے عضد الدولہ اپنے بڑے بھائی کے حکم سے فخر الدولہ پر فوج کشی کی فخر الدولہ بھاگ کر قابوس بن وشمگیر کے ہاں پناہ گزیں ہوا

حسد برد بدگوئے در کار من تبہ شد بر شاہ بازار من

(شاہنامہ جلد چہارم صفحہ ۱۹۴ ا تمہید داستان شیریں خسرو)

بہر حال سائل سیم سے اور تشنہ دریا سے محروم گیا۔

محمود کے ہاں کئی بوسہل ہیں ایک بوسہل زوزنی دوسرا بوسہل حمدوی ایک بوسہل ہمدانی بھی ہے۔ لیکن فردوسی کے قیام غزنیں کے زمانے میں ان میں سے شاید ایک بھی دبیرنہ ہو حسن میمندی اس وقت ایسی گور میں آرام کر رہا تھا۔

صاحب دیباچۂ بالسنقری میں ایجاد کا مادہ ضرورت سے زیادہ ہے بعض اوقات اس کے پاس قدیم راوی ہیں ورنہ اکثر اوقات وہ خود واقعات تراش لیتا ہے مثلاً ہجو سلطان محمود میں شعر ذیل اس نے دیکھا ؎

مرا ہم داوی کہ دریائے نیل تمت را اسام چو دریائے نیل

اس پر اس نے قصۂ ذیل سار کیا جس کو میں شبلی کے الفاظ میں ادا کرتا ہوں

محمود نے حسن میمندی کو بلاکر ناراضی ظاہر کی اور کہا تیری دراندازی نے مجھ کو بدنام کر دیا میمندی نے کہا کہ حضور خاک کی ایک چٹکی بھیج دیتے تب بھی فردوسی کو آنکھوں سے لگانا تھا انعام شاہی کا رد کرنا بڑی گستاخی ہے اس چبھتے ہوئے فقرے نے محمود کے دل میں اثر کیا اور برہم ہوکر کہا کہ کل میں اس قرمطی کو اس گستاخی کا مزہ چکھاؤں گا (یہاں دیباچے کے اصلی الفاظ یہ ہیں کہ آں قرمطی را بامداد در پائے پیل اندازم وعقوبت اوراعبرت سائرے ادمان سازم) فردوسی کو خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوا صبح کو محمود باغ میں آیا تو فردوسی نے دوڑ کر پاؤں پر سر رکھ دیا اور بدیہہ یہ اشعار پڑھے" ؎

دیباچہ قدیم کسی راوی منصور کی سند پر لکھتا ہو کہ سلطان محمود کے وزیر ابو سہل ہمدانی نے سلطان سے عرض کی کہ ساٹھ ہزار دینار زر کسی ایک شاعر کو دینے کی کیا ضرورت ہو طلائی سکوں کے بجائے روپہلے سکے ہی بہت ہیں سلطان اس مشورے پر عمل پیرا ہوا اور ساٹھ ہزار درم ایک طرف میں رکھوا کر بھجوا دیئے اس رقم کو فردوسی نے حمام کے دروازے پر لٹوا دیا اس بارے میں دیباچہ قدیم اور چہار مقالہ متفق ہیں

یہ رقم اگرچہ شاہنامے کے مقابلے میں ہیچ ہو تاہم ان ایام میں زر کی قیمت پر لحاظ کرتے ہوئے اچھی خاصی رقم تھی ساٹھ ہزار درہم ہمارے سکوں میں پندرہ ہزار روپے کے مساوی ہیں، اب پندرہ ہزار رُپے ایک اَسّی سال کے بوڑھے کے لیے جو افلاس کے ہاتھوں تنگ ہو چنداں محقر نہیں فردوسی کا شاہنامے کی نظم سے یہی مقصد تھا کہ اس کا ضعیفی کا زمانہ آسایش اور فارغ البالی میں گزر جائے۔ ؎

بہ پیوستم این نامۂ باستان | پسندیدہ از دفتر راستان
کہ تا روز پیری مرا بر دہد | بزرگی و دینار و افسر دہد[1]

یہ مقصد اس رُپے سے ایک حد تک حاصل ہوسکتا تھا میرے نزدیک اس رقم کثیر کا حمام کے دروازے پر لٹوا دینا ناقابل عمل ہو اور نہ شاہنامہ اِس قصے کی تائید کرتا ہو۔ فردوسی کے بیان سے اس قدر معلوم ہوتا ہو کہ وہ حاسدوں اور بدگویوں کی سخن چینی کی وجہ سے سلطان کے ہاں سے قطعاً محروم گیا۔ ؎

چنیں شہریارے و بخشندۂ | بگیتی ز شاہاں درخشندۂ
نکرد اندریں داستانہا نگاہ | زبد گوئے و بخت بد آمد گناہ

---

[1] شاہنامہ جلد دوم صفحہ ۲۴۴ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ

سر ناسزایان برافراشتن — وزیشان امید بهی داشتن
سر رشتهٔ خویش گم کردن است — به جیب اندرون مار پروردن است
درختی که تلخ است وی را سرشت — گرش بر نشانی به باغ بهشت
ور از جوی خلدش به هنگام آب — به بیخ انگبین ریزی و شهد ناب
سرانجام گوهر بکار آورد — همان میوهٔ تلخ بار آورد
ز بد اصل چشم بهی داشتن — بود خاک در دیده انباشتن
از آن گفتم این بیت‌های بلند — که تا شاه گیرد ازین کار پند
که شاعر چو رنجد بگوید هجا — بماند هجا تا قیامت بجا

(ص ۹۹، شعرالعجم ۱۳۲۹ھ طبع سوم)

سلطان محمود کے دربار سے فردوسی کی محرومی کا قصہ موجودہ ہجو کا بانی ہے لیکن یہ ہجو کسی اصلی بنیاد پر قائم نہیں بلکہ وضعی ہے۔ تذکرہ نگاروں کی عام روایت ہے کہ سلطان نے فی شعر ایک دینار دینے کا وعدہ کیا اور جب تیس پینتیس سال کی محنت کے بعد شاعر شاہنامہ ختم کرکے لایا تو سلطان نے وعدہ خلافی کی اور سونے کے سکوں کی جگہ چاندی کے درہم دیئے جو شاعر نے کھڑے کھڑے حمام کے دروازے پر لٹا دیئے۔ یہ بیان اگر درست ہوتا تو فردوسی ہجو لکھنے میں حق بجانب ہوتا مگر فردوسی کی اپنی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان محمود کی تخت نشینی سے بیس سال پہلے سے اس نظم پر مصروف تھا۔ شاہنامے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ شاعر کو کسی قسم کا انعام نہیں ملا۔ چنانچہ

چنین شهریاری و بخشنده‌ای — به گیتی ز شاهان درخشنده‌ای
نکرد اندرین داستانها نگاه — ز بدگوی و بخت بد آمد گناه

چو در ملک سلطاں کہ جویش ستود | لیسے ہست تر سائد گرد بہو د
گر صد در ظل عدلش فتاد | شدہ ایمن از گردش روزگار
حہ استد کہ سلطاں گردوں شکوہ | رہی را شمارد یکے زاں گروہ

سلطاں محمود کو رحم آیا اور اس کی تقصیر معاف کی۔" (شعر العجم صفحہ ۱۰۵)

یہاں فردوسی کے بدیہہ اشعار کی زبان پر بھی ناظرین ایک منٹ کے لیے غور کر لیں

خدا جانے صاحب دیباچہ کا یہ کون سا ئہ اسرار ماخذ ہو جس سے حسب ضرورت وہ فردوسی کے اشعار نقل کر دیتا ہو جس تک نہ متقدمین کی رسائی ہوئی اور نہ متاخرین کی، اور اشعار بھی ایسے برمحل ہوتے ہیں کہ گویا فردوسی نے اسی موقعے کے لیے لکھے تھے مگر میں یہی کہوں گا کہ یہ اشعار صاحب دیباچہ کی تصنیف ہیں۔

قولہ غزنین سے چلتے وقت فردوسی نے ایاز کو ایک لفافہ سربمہر دیا اور کہا کہ میرے جانے کے ۲ دن بعد بادشاہ کو دینا، فردوسی ہرات کو روانہ ہوا، محمود نے لفافہ کی مہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے

یکی بندگی کردم اے شہریار | کہ ماند ز تو در جہاں یادگار
بنا افگندم از نظم کاخ بلند | کہ از باد و باراں نیابد گزند
بسے رنج بردم دریں سال سی | عجم زندہ کردم بدیں پارسی
چو بر باد دادند گنج (گدا) مرا | نبد حاصلے سی و پنج مرا
اگر شاہ را شاہ بودے پدر | بسر بر نہادے مرا تاج زر
وگر مادر شاہ بانو بدے | مرا سیم و زر تا بزانو بدے
پرستار زادہ نیاید بکار | وگر چند دارد پدر شہریار

شاہنامے میں کسی مختلف مقصد سے کیا تھا جب نوشیرواں نے مہران ستاد کو اپنے واسطے خاقان چین کی دختر پسند کرنے کے لیے چین روانہ کیا اس کو ہدایت کی کہ خاقان کے متعدد لڑکیاں ہیں تو ان کے ظاہری حسن وجمال اور زیب و زینت پر نہ جانا ۔ اصلی ملکہ کی اولاد لانا ۔ مجھے ماندی کی بیٹی نہیں چاہیے اگرچہ اس کا باپ بادشاہ ہو۔ فردوسی نے اس موقعے پر یہ شعر لکھا تھا ۔

پرستار زادہ نیاید بکار اگر چند باشد پدر شہریار

(آغاز نامہ خاقان از نوشیرواں و فرستادن مہران ستاد را برائے دیدن آوردن دختر خاقان" صلا ۸۹۶ جلد چہارم ۱۲۶۷ھ)

ہجو نگار نے شاہنامے سے یہ اکر سلطان محمود کے خلاف استعمال کیا۔ شعر ۸ و ۹ "سراسر ایاں" الخ اور "سررشتہ خویشتن" الخ ہیں نامے کے بعض اوراق میں جو دسویں صدی ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے میری نظر سے گزرے ہیں

قولہ "اس نے ہرات سے طوس کا رخ کیا۔ طوس سے قہستان گیا ناصرلک یہاں کا حاکم تھا، اس کو خبر ہوئی تو ندیمان خاص کو استقبال کے لیے بھیجا اور نہایت اخلاص کے ساتھ پیش آیا۔" (صلا شعر العجم)

مولانا غالباً دیباچۂ بایسنغری کی سند پر لکھ رہے ہیں۔ مگر مشکل یہ آپڑی ہے کہ فردوسی کے عہد میں کسی ناصرلک والئ قہستان کا پتا نہیں چلتا۔ اس موقعے پر صاحب دیباچہ کو سہو ہو گیا۔ اس نے ناصرالدین والی قہستان کو جو ہمارے شاعر سے دو ڈیڑھ سو سال بعد گزرا ہے فردوسی کا معاصر قرار دے دیا۔ محقق طوسی نے اپنی مشہور تالیف اخلاق ناصری اسی ناصرالدین والی قہستان کے نام پر لکھی ہے۔ یہ ناصرالدین رکن الدین خورشاہ والی الموت کی طرف سے قہستان کا عامل تھا۔ اخلاق ناصری

حسد برد بدگوی درکار من	تنہ شد بر شاہ بازار من

(داستان خسرو پرویز و شیریں ص۵۱)

وہ اپنی ناکامی دشمن کی بدگوئی اور اپنی بدنصیبی پر محمول کرتا ہے اس صورت میں ہجو لکھنا اس کے لیے نامناسب تھا۔

موجودہ ہجو دیباچہ بایسنغری (تالیف سنہ ۸۲۹ھ) کے عہد سے چلتی ہے اور دیباچہ نگار زیادہ تر اس کا ذمہ دار ہے اس کی طیاری کے لیے بڑا حصہ شاہنامے سے لیا گیا ہے اس کے بعد گرشاسپ نامہ، بہمن نامہ پیر دیگر نامعلوم ذرائع سے خوشہ چینی کی گئی ہے۔ پھر اس کا لائے و زوائد کو مسلسل نظم کی شکل میں ترتیب دینے کے واسطے جدید اشعار حسب موقع و ضرورت لکھ کر داخل کیے گئے۔ اس طرح سو شعر کی یہ ہجو تیار ہوئی۔ ورنہ دیباچہ بایسنغری سے قبل کے شاہناموں میں ہجو کے اشعار نہایت کم تعداد میں ملتے ہیں۔

مولانا شبلی کے منقولہ اشعار کی تعداد پندرہ ہے۔ ان میں سے شعر اوّل و دوم 'بناہائے آباد' الخ اور 'ز انگندم' شاہنامے سے لیے گئے ہیں جو 'در شکایت سلطان محمود و گلہ روزگار' کی سرخی کے ذیل میں 'لشکر آراستن خسرو بجنگ افراسیاب' سے قبل (ص۷۹۴ جلد دوم۔ شاہنامہ طبع محمد مہدی اصفہانی سنہ ۱۲۶۲ھ بمبئی) ملتے ہیں۔

شعر۳ 'بسی رنج بردم' الخ اگرچہ مطبوعہ شاہناموں میں نہیں ملتا لیکن ایک نہایت قدیم نسخے سنہ ۷۵۳ھ کے حاشیے میں موجود ہے۔ اس کے دوسرے مصرع میں زندہ کی جگہ 'گرم' مرقوم ہے۔

شعر۱۲ 'چو بر باد دادند رنج مرا' الخ خاتمۂ شاہنامہ میں آتا ہے۔

شعر۸ 'پرستار زادہ نیاید' الخ اس شعر کا استعمال فردوسی نے

فرستادم از گفتهٔ داستم — بہ بردیک خود ایچ نگراستم
اگر ناسزد این گہر ناصواب — نسوزاں در آتش نشویاں در آب
گزشتم ازاں سرور نیک رای — ازیں داوری تا بدیگر سرای
رسد لطف یزداں بفریاد من — ستاند ز محشر ازو داد من

فردوسی نے مثنوی کے اشعار ناصرلک کو سنائے تو اس نے سمجھایا کہ بدگوئی اہلِ کمال کی شان نہیں، میں لاکھ روپے ان اشعار کے معاوضے میں دیتا ہوں اشعار کہیں ظاہر نہ ہونے پائیں، فردوسی نے منظور کیا"

(شعر العجم ص۱۷۱ و ص۱۸۱)

میرے خیال میں مثنوی سے مراد اشعار بالا نہیں بلکہ ہجو کے ابیات ہیں۔ نہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا کہ فردوسی نے ناصرلک کو سنائے تھے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی اور ناصرلک میں ملاقات نہیں ہوئی شاعر سلطان کی ہجو گوئی پر تلا ہوا تھا بلکہ اس کے ماں باپ تک کو لکھنا چاہتا تھا لیکن محتشم کے کہنے پر اس نے ہجو کا ارادہ ترک کر دیا اور جو کچھ لکھی وہ محتشم کی خدمت میں یہ کہہ کر بھیج دی کہ اب اسے اختیار ہے چاہے جلائے چاہے دھو ڈالے۔ وہ اپنا معاملہ خدا پر چھوڑتا ہے قیامت کے دن انصاف ہوگا۔

اشعار بالا فردوسی کے قلم سے نہیں نکلے اس کے مقابلے میں صاحب دیباچہ بایسنغری ان کا جائز مالک کہلائے جانے کا زیادہ حقدار ہے قدیم مآخذ میں یہ اشعار نہیں ملتے

قولہ "فردوسی جب غزنی سے روانہ ہوا تھا تو جامع مسجد کی دیوار پر یہ اشعار لکھ آیا تھا۔

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست — چگونہ دریا کہ کرا کنارہ پیدا نیست

کے دیباچے میں یہ عبارت ملتی ہے۔

"بوقت مقام قہستان در خدمت حاکم آں بقعہ مجلس عالی شہنشاہ اعظم بادشاہ معظم ناصر الحق والدین ملک الملوک عرب العجم اعدل ولات السیف والقلم خسرو جہاں شہریار امیراں ناصر الدین عبدالرحیم بن ابی منصور تغمدہ اللہ برحمتہ"

میں لک کی تشریح سے قاصر ہوں، غالباً تمیزی یا عربی کلمہ ہے۔ اسی ناصر الدین کا ایک خطاب محتشم بھی ہے جو نظم آیندہ منسوب بہ فردوسی کے شعر ذیل سے معلوم ہوتا ہے۔

ولیکن ز فرمودۂ محتشم   مدامم کزیں بیش چوں سرکشم

روضۃ الصفا میں بھی اس کو ناصر الدین محتشم کہا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ناصر لک محتشم اور ناصر الدین محتشم ایک ہی شخص ہے۔ اس کی عبارت ہے۔

"دریں اثنا ملک شمس الدین کرت را برسالت پیش ناصر الدین محتشم کہ فاضل محقق خواجہ نصیر الدین طوسی اخلاق ناصری را بنام او نوشتہ فرستاد واو درآں اوان از قبل رکن الدین خور شاہ والی قلعۂ سرسخت بود۔" (صہ جلد پنجم)

قولہ "فردوسی نے ایک مثنوی لکھنی شروع کی تھی جس میں حاسدوں کی دراندازی اپنی مظلومی اور سلطان محمود کی بدعہدی و ناقدر دانی کا ذکر تھا"

بہ غزنین مرا گرچہ خوں شد جگر   ز بیداد آں شاہ بیدادگر

گراں پنج سد رنج سی سالہ ام   شنید از زمیں آسماں نالہ ام

ہمی خواستم تا جہانہا کنم   بگیتی ازو داستانہا کنم

بگویم زمادرش وہم از پدرش   بہ رسم نبیرہ ز جداد و بدگوہرش

چو دشمن بمیداں ز دوست یار   بہ پیچ زمانش کنم پست خوار

ولیکن ز فرمودۂ محتشم   مدامم کزیں بیش چوں سرکشم

ادیب لیسے را الفرو مانہ دہد   درو بہر سے رنج دہقاں کشید
طبیعت مکافات آغاز کرد   سرش نادم تیغ اسار کرد"

تاریخی معاملات میں اس قدر دست بُرد قطعاً ناجائز ہی مولانا کو اختیار تھا کہ روایات کو قبول کریں یا رد کر دیں لیکن جب ایک مرتبہ قبول کر لیا تو لازم تھا کہ قصّے کے تمام خط و خال نقل کرتے حسن میمندی سبکتگین کے عہد میں بے شک قتل کیا گیا ہی لیکن ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا فردوسی کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

بعض وقت دو روایتوں کو لے کر مولانا نے ان کی کھچڑی سی پکا کر رکھ دی ہی۔ اس غرض کے لیے دو مختلف روایتوں کا ذکر کرنا ضروری ہی۔

نظامی کا بیان ہی کہ فردوسی ہرات سے طوس جا کر وہاں سے سیدھا مستقیم طبرستان اسپہبد شہریار کے پاس چلا گیا جو مشہور آل باوند کا ایک رکن تھا طبرستان میں فردوسی نے ہجو لکھ کر اور دیباچے میں اضافہ کر کے شاہنامہ شہریار کو پیش کیا کہ اس کتاب میں تمھارے بزرگوں کے حالات ہیں اس لیے تمھارے نام اس کا منسوب ہونا بہت مناسب ہی۔ شہریار نے اس کو تسلی دی اور کہا کہ کتاب تو محمود ہی کے نام پر رہنے دے البتہ سلطان کی ہجو میں ایک لاکھ رُپے میں خریدتا ہوں خود سلطان کسی دن نادم ہوگا اور تیری رضا جوئی کرے گا۔

دوسری روایت دیباچۂ بایسنغری میں یوں ہی کہ فردوسی سلطان کے خوف سے مازندران چلا گیا وہاں کا والی ان دنوں فرزندان شمس المعالی قابوس بن وشمگیر سے تھا دیباچے کے اصلی الفاظ یہ ہیں۔

"والی مازندران درآں زماں از فرزندان وزراں (کذا) شمس المعالی
قابوس بن وشمگیر بن منوچہر (کذا) بن شمس المعالی بود و پسر او داماد

چو غوطہا زدم واندرو ندیدم دُر گناہ بخت منست ایں گناہ دریا نیست

(شعر العجم صفحہ ۱)

یہ قطعہ بالعموم فردوسی کی طرف منسوب ہے اور فردوسی کا معلوم ہوتا ہے لیکن دراصل اس کے چار شعر ہیں وہ یہ ہیں ۔

حکیم گفت کسی را کہ بخت والا نیست ہیچ وجہ مر اورا زمانہ جویا نیست
برو بحار در یا نشیں مگر روزے بدست افتد دُرے کہ آں بہا نیست
نشستہ در گہ محمود زاولی دریاست کدام دریا کا نرا کرانہ پیدا نیست
شدم بدریا غوطہ زدم بدیدم دُر گناہ بخت منست ایں گناہ دریا نیست

حقیقت میں یہ قطعہ فردوسی کے صحیح جذبات کا آئینہ دار ہے۔

قولہ سلطان نماز جمعہ پڑھنے کے لیے جامع مسجد میں آیا تھا اتفاق سے ان اشعار پر نظر پڑی نہایت متاسف ہوا مسجد سے آکر ناصر لک کا عریضہ دیکھا اور بھی مکدر ہوا ان لوگوں نے فردوسی کے حق میں کانٹے بوئے تھے ان کو بلا کر سخت توبیخ کی کہ تم نے دنیا میں مجھ کو بدنام کر دیا"

(شعر العجم صفحہ ۱۸)

یہاں دیباچے میں صاف لکھا ہے کہ سلطان نے حسن میمندی کو فردوسی کے حق میں کانٹے بونے کی پاداش میں ہلاک کر دیا، مولانا شبلی خدا جانے کیوں اس اہم واقعہ کو قلم انداز کر گئے دیباچے کے الفاظ ہیں ۔

"و دراں ساعت کہ حیات فردوسی کردہ بود بد عصب بسیار فرمود و حسن میمندی را بخطاب خفیف مخاطب داشت بلکہ نام آں بد فرجام بر جریدۂ اموات برنگاشت سہ

چو فردوسی آں مرد والا گہر کہ بیں شد ز میمندی بے ہنر

بادوند یہ خاندان کی حکومت کوہستان پریم اور شہریار کوہ میں تھی اس خاندان کے تمام حکمراں اسپہبد کہلاتے تھے۔ مثلاً اسپہبد شہریار، اسپہبد رستم اور اسپہبد سروین وغیرہ۔ صاحب دیباچہ جس کی روایت کو مولانا مالے نظامی عروضی کے بیان پر ترجیح دی حسب معمول شبلی کو غلط راستے پر لے جا رہا ہے اس غریب کو والی کا نام تک بھی معلوم نہیں اگرچہ اس کے بڑے بوڑھوں کے نام گنا گیا اور وہ بھی غلط سلط۔ آل زیار میں دو بادشاہ سلطان محمود کے داماد ہوئے پہلا منوچہر بن قابوس ۴۰۳ھ و ۴۲۴ھ لیکن یہ شخص صاحب دیباچہ کا ہیرو نہیں سلطان کا دوسرا داماد امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس مصنف قابوس نامہ ہے کیکاؤس ۴۱۲ھ میں پیدا ہوتا ہے عہد سلطان مودود ۴۳۲ھ و ۴۴۱ھ میں غزنیں جاتا ہے اور انہیں ایام میں صبیہ سلطان محمود سے غالباً اس کی شادی ہوتی ہے اور عنقریب بعد تخت نشین ہو جاتا ہے۔ اب صاحب دیباچہ کی مراد اس کیکاؤس سے ہے کیونکہ وہ سلطان کا داماد ہونے کے علاوہ مرزبان بن رستم بن شروین کا دختر زادہ بھی ہے قابوس نامہ میں امیر عنصر المعالی اپنے فرزند گیلان شاہ سے کہتا ہے

"و جدہ مادرم دختر ملک زادہ المرزبان بن رستم بن سروین کہ مصنف مرزبان نامہ است، و سہ دیگر جدت کیکاؤس بن قابوس بود نبیرہ ملک لوشیران عادل و مادر تو فرزند ملک سلطان محمود بن ناصر الدین بود۔"

عنصر المعالی کا باپ امیر اسکندر ہے وہ کبھی بادشاہ نہیں ہوا اگر صاحب دیباچہ کی مراد عنصر المعالی سے ہے تو وہ فردوسی کی وفات سے جو ۴۱۱ھ میں واقع ہے ایک سال بعد پیدا ہوا اگر اس کے باپ اسکندر بن قابوس سے مراد ہے تو وہ کبھی بادشاہ نہیں ہوا یہ ہے معیار صاحب دیباچہ کی تاریخ دانی کا خدا بچائے

سلطاں بود واز طرف مادر دختر زادۂ مرزباں بن رستم بن شروین کہ مصنف مرزباں نامہ است ۔"

جب والی کو معلوم ہوا کہ طوس کا ایک شیعہ شاعر جس نے شاہنامہ غزنین میں نظم کیا تھا اپنی کتاب لے کر مازندران آیا ہے اور فردوسی اور محمود کے تعلقات بھی اس کو معلوم ہوئے چوں کہ شیعہ علامت سے تھا کہنے لگا چونکہ شاعر دوستدار اہل بیت ہے اگر اپنی تصنیف میرے پاس بھیجے گا معقول معاوضہ پائے گا القصہ فردوسی نے والی اور اس کے اسلاف کی تعریف میں ابیات اضافہ کر کے شاہنامہ پیش کیا والی بہت خوش ہوا لیکن بعد میں سلطان کے خوف سے معقول صلہ دے کر رخصت کر دیا۔

مولانا فرماتے ہیں ۔

"مازندراں کی حکومت قابوس بن وشمگیر کے خاندان میں چلی آتی تھی اور اس زمانے میں سپہبد فرماں روا تھا اس کو فردوسی کے آنے کی خبر ہوئی تو نہایت مسرت ظاہر کی اور فردوسی کو دربار میں بلایا۔ فردوسی نے مدحیہ اشعار اضافہ کر کے شاہنامہ پیش کیا سپہبد نے چاہا کہ فردوسی کو دربار سے جانے نہ دے لیکن پھر سلطان محمود کا خیال آیا ایک گراں بہا صلہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ محمود آپ سے ناراض ہے اس لیے میں آپ کو ٹھیرا نہیں سکتا آپ اور کہیں تشریف لے جائیں ۔"

(شعر العجم صفحہ ۱۹)

قابوس کے خاندان میں کوئی اسپہبد نہیں گزرا ۔ اسپہبد کسی شخص کا نام نہیں بلکہ آل باوند کا خاندانی خطاب ہے۔ قابوس آل زیار سے تعلق رکھتا ہے جس کا پایۂ تخت جرجان تھا۔

بعض اوقات مولانا ایسے راویوں کے بیانات میں تصرف بیجا یا دخل بیجا بھی کر لیا کرتے ہیں جس کی ذمے داری ان کی سہل انگاری اور بے پروائی مانی جا سکتی ہے۔ اس قسم کی بعض مثالیں پیشتر گزر چکی ہیں۔ ذیل میں تازہ مثال پیش ہے

ایک دفعہ سلطان محمود ہندستان کی مہم سے واپس آ رہا تھا راستے میں دشمن کا قلعہ تھا وہیں ٹھیر گیا اور قاصد بھیجا کہ حاضر خدمت ہو کر اطاعت بجا لائے۔ دوسرے دن قاصد جواب لایا لیکن ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ محمود نے وزیر اعظم سے کہا کہ دیکھو کیا جواب لایا ہے وزیر نے برجستہ کہا ؎

اگر جز بکام من آید جواب — من و گرز و میدان افراسیاب

محمود پھڑک اٹھا اور پوچھا کس کا شعر ہے۔ وزیر نے کہا اس بد قسمت کا جس نے ۲۵ برس خون جگر کھایا اور کچھ نہ حاصل ہوا۔ محمود نے کہا مجھ کو سخت ندامت ہے غزنیں پہنچ کر یاد دلانا۔ غزنیں پائے تخت میں پہنچ کر ساٹھ ہزار اشرفیاں فردوسی کے پاس روانہ کیں لیکن تقدیر برعکس کا دور ہے

(صفحہ ۱۲۴ کا بقیہ حاشیہ)

بکشتن برادرش کہتر سال — کہ در مردمی کس ندارد ہمال
نبیرہ دلاور سپہدار طوس — کہ در جنگ بر شیر دارد فسوس
زگیتی پرستندۂ فر و نصر — زبردست او در سایۂ شاہ عصر

دوسرے مقام پر خاتمۂ داستان اسکندر میں ہے ؎

جہاندار و سالار او بونصر — کہ روشن دلانست گردندہ عصر
سپہدار چون بو المظفر بود — سرلشکر از ماہ برتر بود
کہ پیروز نامست و پیروز بخت — ہمی بگذرد کلک او از درخت

ایسے جاہل کو شبلی نے اپنا خضرِ راہ کیوں بنا لیا۔

فردوسی کا انہتّر اسی سال کی عمر میں قہستان، طبرستان، مازندران اور بغداد جانا غیر اغلب معلوم ہوتا ہے دیباچۂ قدیم اس باب میں خاموش ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیباچے کے عہد تک فردوسی کے سفر کا قصہ اختراع نہیں ہوا تھا۔ صحیح صرف اس قدر ہے کہ وہ غالباً سجستان یا خراسان امیر ابوالمظفر نصر بن ناصر الدین سبکتگین برادر سلطان محمود کے پاس چلا جاتا ہے شاہنامہ ان کی خدمت میں پیش کرتا ہے صلہ مانگتا ہے اور ساتھ ہی یہ التجا کرتا ہے کہ امیر سلطان سے بھی سفارش کرے چنانچہ شاہنامہ سے

چو سالارِ شہ[1] این سخن‌های نغز	بخواند ببیند بہ پاکیزہ مغز
ز گنجش من ایدر شوم شادمان	کزو دور بادا بد بدگمان
وز آن پس کند یاد بر شہریار	مگر تخم رنج من آید بہ بار
کہ جاوید باد افسر و تخت اوی	ز خورشید تابندہ‌تر بخت اوی

(داستان خسرو شیرین جلد چہارم صفحہ ۱۴)

معلوم نہیں کہ فردوسی امیر نصر کے ہاں کامیاب رہا یا ناکام رہا؟

---

[1] امیر نصر بن ناصر الدین سبکتگین متوفی ۴۱۲ھ جنہیں فردوسی 'سالارِ شہ' کے خطاب سے یاد کرتا ہے ابتدا میں سپہ سالار خراسان مقرر ہوئے۔ بعد میں سجستان ان کو تفویض ہوا۔ ان کا سکہ ۴۱۲ھ کا ضرب سجستان لاہور میوزیم میں موجود ہے بعض درموں پر صرف 'شاہ نصر' درج ہے ایسے دو درم راقم کے مجموعۂ مسکوکات میں شامل ہیں۔ فردوسی کے ساتھ ان کے تعلقات بے حد خوشگوار معلوم ہوتے ہیں شاہنامے میں تین مختلف موقعوں پر ان کا ذکر آیا ہے پہلے تمہید داستان شیرین خسرو میں جس سے اشعار بالا منقول ہیں۔ دوسرے دیباچۂ شاہنامہ میں سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۵ پر ملاحظہ ہو)

مصنف کے بیانات کے ساتھ اس طرح بے پروائی کریں اور یہ طریقہ کچھ دن جاری رہے تو اصلی روایت چند ہی روز میں بالکل مسخ ہو جائے گی۔ مثال کے لیے میں شعر مرقومۂ بالا پیش کرتا ہوں کہ بے پروا اور غافل راویوں کے ہاتھوں اِس شعر میں اس قدر تصرّف اور تغیّر ہوا ہے کہ فردوسی موجودہ حالت میں صرف ایک مصرع کا مالک رہ گیا ہے جس کا اثر روایت کے اعتبار پر بھی پڑتا ہے شاہنامے میں فردوسی نے دو طرح اِس کو لکھا ہے۔

(۱) چو فردا برآید بلند آفتاب   من و گرز و میدان و افراسیاب
(شاہنامہ جلد اول صفحہ ۱۳۲ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

(۲) نجوئیم زیں کینہ آرام و خواب   من و گرز و میدان و افراسیاب
(جلد دوم صفحہ ۲۲ طبع بمبئی ۱۲۷۵ھ)

شبلی ارشاد کرتے ہیں:۔

"ناصر خسرو نے سفرنامے میں لکھا ہے کہ ۴۳۷ھ میں جب میں طوس پہنچا تو ایک بڑی کاروان سرا دیکھی لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ فردوسی کے صلے سے تعمیر ہوئی ہے فرہنگ رشیدی اور چہار مقالے میں لکھا ہے کہ اس کا نام چاہہ ہے اور مرو اور نیشاپور کے راستے پر ہے"

(شعر العجم صفحہ ۱۱۱)

ناصر خسرو کا سفرنامہ مؤلّفۂ مولانا الطاف حسین حالی طبع ۱۸۸۲ء میرے زیر نظر ہے اس میں رباط چاہہ یا کسی اور رباط کا جو فردوسی کے صلے سے تعمیر ہوئی ہو مطلق ذکر نہیں۔ شبلی ایسی اقتباسات کو ایک بے پروائی اور بے تعلقی کے ساتھ لکھتے ہیں خدا جانے کہاں سے حوالہ لیا اور کس کے نام سے لکھا مولانا نے بسم اللہ ہی غلط کی۔ ناصر خسرو کا سفر ۴۳۷ھ سے شروع ہوتا ہے اور آپ فرماتے

اِدھر شہر کے ایک دروازے سے جس کا نام رود بار تھا صلہ پہنچا اُدھر دوسرے دروازے سے فردوسی کا جنازہ نکل رہا تھا۔"

(شعرالعجم صفحہ ۱۹۱ و ۱۹۲)

یہ روایت فردوسی کے بہت قریب زمانے تک پہنچ جاتی ہے کیونکہ ۵۱۰ھ میں نظامی نے امیر معزی سے سُنی اور معزی نے امیر عبدالرزاق سے۔ میں اس کے بعض خط و خال جو اصل روایت سے مختلف ہیں یہاں دکھاتا ہوں۔ نظامی نے لکھا تھا کہ ۵۱۰ھ میں میں نے یہ واقعہ سُنا مولانا نے حاشیہ میں اس کے بجائے ۵۱۵ھ لکھا۔ نظامی نے لکھا تھا کہ "محمود کے راستے میں کسی متمردین کی عملداری تھی جو ایک مضبوط قلعے کا مالک تھا اور محمود کا پڑاؤ دوسرے روز اسی قلعے کے نیچے تھا اس لیے قاصد پیشتر روانہ کر دیا کہ رئیس کل حاضر ہو کر مراسم بندگی بجا لائے اور خلعت لے کر واپس چلا جائے۔ دوسرے روز محمود نے کوچ کیا خواجہ بزرگ بادشاہ کے دست راست پر چل رہا تھا کہ ایلچی واپس آتا اور سلطان کی طرف بڑھتا نظر آیا خواجہ سے سلطان نے پوچھا کیا جواب دیا ہوگا۔ خواجہ نے جواب میں شعر مذکورۂ بالا پڑھ دیا۔ اس بیان سے بعض جزئیات میں مولانا کو اختلاف ہے جہاں نظامی نے لکھا تھا کہ فردوسی نے پچیس سال محنت کی وہاں شبلی نے پندرہ سال لکھے، نظامی نے لکھا تھا کہ فردوسی کے لیے ساٹھ ہزار دینار کی نیل سرکاری اونٹوں پر بھجوائی مولانا نے اس کے بجائے ساٹھ ہزار اشرفیاں بھجوانا ظاہر کیا۔ اشرفی اور دینار میں جو فرق ہے ظاہر ہے۔ دینار ہمارے سکوں میں قریباً بیس روپے کے برابر ہے اور اشرفی پچیس تیس روپے کے۔ نہ اشرفیاں اس عہد میں رائج تھیں۔ نظامی کے ہاں شہر کا نام طبران اور اُس کے دوسرے دروازے کا نام رزان ہے مولانا نے ان ناموں کا ذکر تک نہ کیا۔ اگر ہم کسی

اس اندراج سے لگایا ہو جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ فردوسی کے سرپرست اور مربّی نہیے کاتب اور راوی نہ تھے ؎

ازاں نامور نامداراں شہر ‏ ‏ ‏ علی دیلم و بودلف راست بہر

بودلف کی نسبت قاضی نور اللہ شوستری کا قیاس ہو کہ یہ وہ بودلف ہو جو ایک محتشم رئیس تھا جس کے نام پر اسدی طوسی نے گرشاسپ نامہ (کذا) اور دیباچے میں اس کی مدح و ثنا کی ہو ؎

ملک بودلف شہریار زمین ‏ ‏ ‏ جہاں دار ازادی پاک دین

در رگے کہ با آسماں ہمسر است ‏ ‏ ‏ رلسل براہیم پیغمبر است

(شعرالعجم صفحہ ۱۱۵ و ۱۱۶)

شاہنامے میں بودلف کا ذکر یوں آتا ہو ؎

ازاں نام در نامداراں شہر ‏ ‏ ‏ علی دیلمی بودکو راست بہر

کہ ہموارہ کارم بحوبی رواں ‏ ‏ ‏ ہمی داشت آں مرد روشن رواں

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ "بودکو" کے بجائے بودلف چاہیے میں یہی اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ علی دیلم اور بودلف ایک ہی شخص معلوم ہوتے ہیں علی اس کا نام اور کنیت بودلف ہو کیونکہ شعر مابعد میں ضمیر اور فعل واحد آئے ہیں اور کوئی تعجب نہیں اگر وہ کاتب ہو جو اسمائے صفات اس کے لیے استعمال ہوئے ہیں مثلاً "راست بہر" اور "آں مرد روشن رواں" اس سے ظاہر ہو کہ وجاہت دنیاوی کے لحاظ سے علی دیلمی کوئی موقر رتبہ نہیں رکھتا تھا۔ میں قاضی صاحب کے نظریے میں شریک نہیں ہو سکتا کیونکہ کنیت کی مماثلت اوّل تو کوئی وسیع اور وزنی دلیل نہیں ہو سکتی علاوہ بریں گرشاسپ نامہ اسدی جیسا کہ اسدی کے حالات میں دکھایا جا چکا ہو ۴۵۸ھ میں تصنیف ہوتا ہو۔ نوید رمانی کے

ہیں کہ ۴۳۷ھ میں ناصر خسرو طوس پہنچا مرو سے حکیم ناصر خسرو ۲۳ شعبان ۴۳۷ھ کو نیشاپور کے ارادے سے نکلا اور سرخس ہوتا ہوا شنبہ گیارہ شوال سال مذکور کو نیشاپور پہنچ گیا۔ سرخس اور نیشاپور کے راستے میں طوس[۱] جہاں رباط چاہ سائی حاقی ہو نہیں آتا اسی لیے حکیم مذکور نہ طوس اور نہ اس کی رباط کا ذکر کرتا ہو اس کے الفاظ یہ ہیں -

پس بمرو رفتم و از آن شغل کہ بعہدۂ من بود معاف خواستم و گفتم کہ مرا عزم سفر قبلہ است پس حسابیکہ بود جواب گفتم و از دنیاوی آنچہ بود ترک کردم الا اندک ضروری و بست و سوم شعبان بعزم نیشاپور بیرون آمدم و از مرو بسرخس شدم کہ سی فرسنگ باشد و از آنجا بہ نیشاپور چہل فرسنگ است روز شنبہ یازدہم شوال در نیشاپور شدم چہارشنبہ آخر این ماہ کسوف بود و حاکم زمان طغرل بک محمد بود برادر جغری بک۔" (سفرنامہ صفحہ ۴۴)

فرماتے ہیں :-

'نظامی عروضی کا بیان ہو کہ علی دیلمی شاہنامے کا مسودہ صاف کیا کرتا تھا اور بودلف راوی تھا یعنی شاہنامہ حفظ یاد رکھتا تھا اور جلسوں اور محفلوں میں لوگوں کو سناتا تھا لیکن شاہنامہ میں فردوسی نے ان دونوں کا نام

---

[۱] سرخس اور نیشاپور کے راستے کی منزلیں حسب ذیل ہیں

سرخس سے رباطِ آبگینہ (چھ فرسنگ) رباطِ آبگینہ سے رباطِ توراں (سات فرسنگ) رباطِ توراں سے رباطِ ماہی (سات فرسنگ) رباطِ ماہی سے رباطِ سنگ بست (چھ فرسنگ) رباطِ سنگ بست سے دیہہ خاکستر (تین فرسنگ) دیہہ خاکستر سے دیہہ باد (پانچ فرسنگ) دیہہ باد سے نیشاپور (سات فرسنگ) ان منازل میں جو ہم نے نزہۃ القلوب حمد اللہ مستوفی سے لی ہیں معلوم ہوتا ہو کہ شہر طوس راستے میں نہیں آتا۔

بردک نامہ، گنج شایگاں، شطرنج نامہ، کارنامک ارتخشتر، یادگار زریران، اندرز خسرو قباتان ثابت کرتی ہیں کہ تاریخ عجم ایک منتشر حالت میں تھی اور اس کی داستانیں مختلف لوگوں کے پاس ملتی تھیں ؎

پراگندہ در دست ہر موبدے　　　ازو بہرۂ بردہ ہر بخردی

(شاہنامہ جلد اول صفحہ ۳)

فردوسی کا یہ دعویٰ کہ ایک دہقان نے پرانے موبدوں کو جمع کرکے ایران کی تاریخ پر ایک کتاب تدوین کی بالکل راست معلوم ہوتا ہے دیباچۂ قدیم شاہنامہ اس بارے میں کافی روشنی ڈالتا ہے ابومنصور عبدالرزاق کے ذکر میں اس دیباچے میں لکھا ہے۔

"ابومنصور عبدالرزاق[1] مردے بود با فر و خویش کام و بزرگ اندر کام روائی و با دستگاہی تمام از پادشاہی و اندیشہ بلند داشت و گوہر از تخم گردان ایران بود　　از روزگار آرزو کرد تا او را نیز یادگارے ماند دریں جہاں پس دستور خویش ابومنصور المعمری را بفرمود تا خداوندان کتب نامہ گرد کرد و کس فرستاد از دہقانان و فرزانگان و جہاں دیدگان از ہر جا بیاوردند و چاکر او ابومنصور المعمری را بفرمود تا نامہ گرد کرد و کس فرستاد بشہرہائے خراسان و ہشیاران را از آنجا بیاوردند از ہر جائے چوں شاج (ماخ؟) پسر خراسانی (؟) از

---

[1] بقول گردیزی اس کا نام ابومنصور محمد بن عبدالرزاق ہے۔ اس کے ابتدائی حالات معلوم نہیں۔ عبدالملک بن نوح سامانی ۳۴۳ - ۳۵۰ھ کے عہد میں امیر ابوالحسن محمد بن ابراہیم کے عزل پر جمادی الآخر ۳۴۹ھ میں اس کو سپہ سالار خراسان بنا دیا گیا لیکن الپتگین (بانی خاندان غزنہ) کو خوش رکھنے کے واسطے اسی سال ذیحجہ میں یہ منصب اس سے لے کر الپتگین

(بقیہ صفحہ آئندہ پر)

جو تمام قصص و افسانہ و تاریخ ایران پر حاوی ہو۔ مورخ کو اپنے تاریخی سرمایہ کے لیے قدیمی ذرائع بھی درکار ہیں اس ضرورت سے اس نے اپنے آپ کو زرتشتی روایات کا پابند کر لیا چنانچہ ایسی ہی کتاب پسند کی جس کے راوی اور مدون پارسی اور مجوسی تھے فردوسی کا یہ قول کہ قدیم تاریخ ایران ایک پریشان اور بے ترتیب حالت میں تھی میری رائے میں بالکل صحیح ہے۔ شبلی نے جس قدر تصانیف کا نام لیا ہے ان کے باوجود کہا جا سکتا ہے کہ عربی ذرائع تاہم فردوسی کے مقصد کے لیے ناکمل تھے فردوسی خود باوجود جد و جہد تمام سلسلۂ روایات ایران پر حاوی نہ ہو سکا۔ اگرچہ نامۂ خسروان کے علاوہ متعدد مقامات پر زندہ راویوں سے بھی مدد لی پھر بھی کئی داستانیں فردوسی سے چھوٹ گئیں مثلاً گرشاسپ نامے کی داستانیں فردوسی کو دستیاب نہیں ہوئیں چنانچہ (اسدی) ؎

بشہنامہ فردوسی نغز گوی ——— چو از پیش گویندگاں بردگوی
بسے یاد رزم یلاں کردہ بود ——— دریں در سخن یاد ناوردہ بود
نہالے بد ایں رستہ ہم اندر رست ——— شدہ خشک و بے بار و پژمردہ سست [1]

ابو علی بلخی بھی کہتا ہے کہ گرشاسپ کی داستان ابو المؤید بلخی نے اپنے شاہنامہ رنگ میں مفصل بیان کی ہے علیٰ ہذا شہریار نامہ اور بہمن نامے کے واقعات ہیں جو فردوسی کی نظر سے نہیں گزرے اور سلجوقی عہد میں دوسرے شعرا نے ان کو نظم کیا اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ ایران کی تاریخ پر کوئی سندی اور جامع کتاب موجود نہیں تھی اس کے علاوہ پہلوی اور عربی زبانوں میں چھوٹے چھوٹے رسالوں اور داستانوں کا وجود کافی شہادت ہے اس خیال کی کہ سلسلۂ روایات ایران کی مکمل تدوین نہیں ہوئی تھی جستہ جستہ داستانیں مثلاً شہر اد و پرویز۔ کارنامۂ اردشیر

---

[1] گرشاسپ نامہ حکیم اسدی ص ۱۰ و ۱۱ طبع آقا میرزا محمد ملک الکتاب۔ بمبئی سنہ ۱۳۱ھ

(یعنی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم) و ایں را شاہنامہ نام نہاد۔"

دیباچۂ قدیم کا یہ بیان فردوسی کے قول کی پوری پوری تصدیق کرتا ہے اور یہی شاہنامہ فردوسی کا قدیمی ماخذ ہے جس کا نسخہ اس کے مہربان دوست سے بہم پہنچایا تھا

قولہ "شاہانِ (کذا) کو ایران کی تاریخ مرتب کرنے کا ہمیشہ خیال رہا۔ ان میں سے نوشیرواں کو سخت شغف تھا۔ چنانچہ تمام اطراف و دیار میں قاصد بھیج کر ہر جگہ سے تاریخی ذخیرے جمع کیے یزدگرد نے اپنے زمانے میں ان سب کو دانشور دہقاں کے حوالے کیا کہ کیومرث سے لے کر خسرو پرویز کے زمانے تک مکمل اور مرتب تاریخ تیار کر دے۔ دانشور مدائن کے رؤسا میں تھا اور نہایت صاحب حوصلہ اور فاضل شخص تھا اس نے ان تمام ذخیروں کو عمدگی سے ترتیب دے کر ایک مبسوط اور جامع تاریخ تیار کی۔ (شعر العجم صفحہ ۱۲۵)

تاریخ ایران کے متعلق نوشیرواں کا اشتیاق اور اس کے لیے ذخیرہ جمع کرنے کا ذکر کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گزرا علیٰ ہذا دانشور دہقان اور اس کی کتاب تدوین کرنے کا قصہ بھی کتب تواریخ میں نہیں ملتا فردوسی نے شاہنامے میں نوشیرواں کے حالات بڑی تفصیل سے لکھے ہیں اُس کی دانشمندی اور دانائی کی بڑی تعریف کی ہے لیکن واقعۂ بالا کا ذکر نہیں کیا شاہنامے سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ ہرمز پسر نوشیرواں عادل نے قید کے ایام میں اپنے فرزند خسرو پرویز سے درخواست کی کہ وہ ایک وہی آدمی جس کو پرانی جنگوں کے قصے یاد ہوں بھیج دے اور ایک بوڑھا آدمی جو بادشاہوں کے حالات میں دستگاہ رکھتا ہو ان کی نوشتہ تاریخ لائے۔ (شاہنامہ)

دیگر سوارے ز گردن کشاں کہ از رزم دیرینہ دارد نشاں

ہرات و چون یزدان داد پسر شاپور از بیستان و ماہوی خورشید پسر بہرام
از شاپور (نیشاپور) و شادان پسر برزین از طوس و بنشاندند و آوردند
این نامہا (داستان کیومرث) تحقیق کہ اندر جہان آمد او بود کہ آئین مردمی
آورد و مردمان را از جانوران پدید کرد تا بہ ... دیگر گرد کہ آخر ملوک کیان بود
اندر ماہ محرم کہ سال بر سی صد و چہل و شش (بود) از ہجرت خواجہ دنیا

(صفحہ ۱۴۳ کا بقیہ)

کو دے دیا گیا۔ ابو منصور واپس طوس چلا گیا منصور بن نوح ۳۵ ۲۹۶ھ کے زمانے میں
غزنی کی طرف فرار کرتے وقت الپتگین خراسان اسی ابو منصور بن عبدالرزاق کے حوالے
کر گیا۔ ادھر دربار بخارا سے وہ الپتگین کی مزاحمت اور گرفتاری کے واسطے مقرر ہوا۔ ابو منصور
نے اپنی فوج تعاقب میں بھیجی مگر الپتگین ہاتھ نہ آیا۔ اگرچہ دربار بخارا نے ابو منصور کو سپہ سالار
خراسان بنانے کا وعدہ کر لیا تھا لیکن اس کو یقین نہ آیا اور کھلم کھلا بغاوت کر دی۔ مرو کی طرف
بڑھا شہر کے دروازے اس پر بند کر دیے گئے اس نے غارت گری شروع کر دی باورد
اور نسا پہنچا حاکم نسا کے ورثا سے بہت مال وصول کیا۔ آخر وشمگیر نے یوحنا طبیب کو ہزار
دینار رشوت دے کر اس کو زہر دلوا دیا۔ سامانیوں نے امیر ابوالحسن محمد بن ابراہیم مذکور کو
دوبارہ سپہ سالار خراسان بنا کر ابو منصور کی سرکوبی کو روانہ کیا جنگ قائم ہوئے پر زہر اپنا
اثر کر چکا تھا بینائی تک زائل ہو گئی شکست کے بعد اس کے آدمیوں نے اسے لے جانا
چاہا مگر اس کی حالت اس قدر غیر ہو چکی تھی کہ خود اس نے کہا کہ میرے لیے راحت اسی میں
ہے کہ تم مجھے یہیں چھوڑ جاؤ چنانچہ اس کو میدان جنگ میں چھوڑ دیا گیا عین اس وقت ایک
سقلابی غلام جو احمد بن منصور قراتگین کی فوج سے متعلق تھا پہنچا اس نے سب سے پہلے
اس کا سر کاٹا پھر انگلی سے انگوٹھی اتاری اور لے کے افسر کے پاس لے گیا۔ ابو منصور کا قتل
سنہ ۳۵۰ھ میں تصور کرنا چاہیے۔

کام نکلے۔ اسمٰعیل کے جانشین احمد بن اسمٰعیل ۲۹۵ھ و ۳۰۱ھ کے عہد میں فوج معزز
ومکرم رہا۔ امیر نصر ۳۰۱ھ و ۳۳۱ھ کے دور میں حسین بن علی نے بغاوت کی
احمد اس کی سرکوبی کے لیے مامور ہوا۔ اس نے ہرات حسین کے بھائی سے چھینا
پھر حسین کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اس کے بعد ایسے واقعات پیش آئے کہ
خود احمد بن سہل باغی ہو گیا اس نے امیر نصر کا نام خطبے سے موقوف کر دیا۔ قراتگین
امیر گرگان نے اس پر چڑھائی کی احمد بن سہل نیشاپور چھوڑ کر مرو چلا آیا اور شہر پناہ
تعمیر کیا۔ بخارا سے اس کی سرکوبی کے واسطے حمویہ بن علی آیا اس نے ایسی ایسی
چالیں چلیں کہ احمد بن سہل تمام حزم و احتیاط بالائے طاق رکھ کر قلعہ سے نکلا اور
اپنے حریف سے جنگ کرنے میدان میں پہنچ گیا دریا کے کنارے گھمسان کا معرکہ ہوا
اس کی فوج شکست کھا کر بھاگ گئی۔ احمد بہادر لڑتا رہا گھوڑا مارا گیا پیدل ہو کر
لڑا اور پکڑا گیا۔ بخارا لے جا کر قید میں ڈال دیا گیا جہاں ۳۰۷ھ میں اس نے
وفات پائی۔

آزاد سرو احمد بن سہل کا ساتھی فردوسی سے ملاقات کے وقت تقریباً سو
سال سے زیادہ عمر کا ہوگا۔ ان کی ملاقات ۳۶۵ھ اور ۳۷۰ھ کے درمیان ہونی
چاہیے جب فردوسی شاہنامے کے واسطے ذخیرے کی تلاش میں مختلف شہروں
کا سفر اختیار کر رہا ہو۔

قولہ "عربوں کے حملے میں یہ کتاب حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش کی گئی آپ
نے اس کا ترجمہ سنا اور فرمایا کہ یہ مزخرفات کا مجموعہ دیکھنے کے قابل
نہیں غرض یہ کتاب لوٹ میں تقسیم ہو کر حبش پہنچی۔ بادشاہِ حبش نے
اس کا ترجمہ کرایا وہاں سے ہندوستان پہنچی یعقوب لیث نے اپنے
زمانہ حکومت میں اس کو ہندوستان سے منگوا کر ابو منصور عبدالرزاق

ز من فرستی که از کار زار — سخن گوید و کرده باشد شکار
همان نیز داننده مردی کهن — که از شهریاران گزارد سخن
نوشته یکے دفتر آرد مرا — بدان درد و سختی سرآمد مرا

قولہ۔ "رستم وسہراب کا قصہ جہاں شروع کیا ہے تمہید میں لکھا ہے کہ احمد بن سہل کے دربار میں ایک بڈھا تھا جو سام نریمان کی اولاد سے تھا اس کے پاس ایران کی تاریخ تھی اور رستم کی اکثر داستانیں اس کو زبانی یاد تھیں۔ یہ قصہ میں نے اس سے لے کر نظم کیا" (شعر العجم صفحہ ۱۱۸، سنہ ۱۳۳۹ھ)

مولانا کے آخری جملے کی کسی قدر تشریح ضروری ہے فردوسی نے لکھا ہے
مصرع: نگویم سخن آنچہ زو یافتم بظاہر شاعر کا مطلب روایت شفاہی سے ہے اگرچہ آزادسرو اور فردوسی کی ملاقات ان کے زمانوں کے تفاوت کو دیکھتے ہوئے مشکل معلوم ہوتی ہے۔

احمد بن سہل جس کے پاس آزادسرو تھا بقول زین الاخبار اصیلان عجم سے ہے رزیق میں جو مرو کے عمدہ مواضعات سے ہے ان کا خاندان آباد تھا احمد کا باپ سہل بن ہاشم نجوم میں بڑا کامل تھا۔ احمد کے تین بھائی تھے فضل، حسین اور محمد۔ سہل سے کسی نے پوچھا کہ تم نے اپنے فرزندوں کا طالع بھی دیکھا ہے اس نے جواب دیا کیا دیکھوں، تینوں ایک ہی دن میں عربوں کی حمایت میں مارے جائیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا جب احمد بڑا ہوا اس نے اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ لینے کی ٹھانی اس کے پاس ہزار آدمی جمع ہو گئے عمرو بن لیث نے اس کو بلوا کر قید میں ڈال دیا آخر حمام کے بہانے فرار ہو کر مرو پہنچا اور فوج جمع کر کے عمرو کے عامل کو گرفتار کر لیا پھر اسمٰعیل بن احمد سامانی کے پاس بخارا چلا گیا۔ جب سنہ ۲۸۹ھ میں خراسان پر اسمٰعیل کا قبضہ ہوا، نیشاپور احمد بن سہل کے حوالے ہوا۔ اس کے ہاتھ سے بڑے بڑے

فردوسی نے اس سے داستان ہرمز حاصل کی مولانا کا سلیمان طوسی دیباچہ بایسنغری میں سلیمان بن نوریں ہو مگر دیباچہ قدیم میں صاف شادان بسر برزین ہو مزید شہادت کے لیے شاہنامہ موجود ہو۔ بیت

نگہ کن کہ شادان برزین چہ گفت ۔ بدانگہ کہ بکشاد راز از نہفت

(شادان نوشیرواں برزوی پزشک را بہندستان برائے آوردن داروی فرستاد و شادان بسر برزو کتاب کلیلہ و دمنہ را سر داد (جلد چہارم صفحہ ۲۲)

گویا شادان بن برزین کے حوالے سے داستان کلیلہ و دمنہ فردوسی نے لکھی ہو مولانا کے بیان کا یہ حصّہ کہ یہ کتاب سامانیوں کے ہاتھ آئی اور ان کے حکم سے دقیقی نے اس کو نظم کرنا شروع کیا ۔ قابل غور طلب ہو۔ خدا جانے صاحب دیباچہ نے یہ بیان کہاں سے اخذ کیا۔ اگر صحیح ہو تو مولانا شبلی فردوسی پر عربوں کے احسان نہ ماننے کے معاملے میں ناحق ناراض ہوئے جب سامانی اور دقیقی اس کو مستند کتاب مانتے آئے ہیں تو پھر فردوسی نے معتبر مان کر اپنے شاہنامے کی بنیاد اگر اسی کتاب پر ڈالی تو کیا قصور کیا۔

غور طلب امر کا سلطان محمود کی خدمت میں تاریخ عجم پیش کرنا یا دشاہ کرمان کا مورخ آذر برزین کو جو عجم کی تاریخ پر سب سے بڑے سرمائے کا مالک تھا سلطان کے دربار میں روانہ کرنا عجیب روایتیں معلوم ہوتی ہیں ایک بات البتہ صاف ہو وہ یہ ہو کہ محمود کو تاریخ ایران سے کوئی خاص ذوق یا لگاؤ معلوم نہیں ہوتا۔ شبلی فرماتے ہیں ۔

"ایران میں عربی نہایت شدت سے مخلوط ہو گئی تھی عباس مروزی نے مامون الرشید کی مدح میں جو قصیدہ لکھا اس کے چار شعر آج موجود ہیں جن میں نصف سے زیادہ عربی الفاظ ہیں مدودکی اور ابوشکور وغیرہ کا

بن عبدالرزاق بن عبداللہ فرخ کو حکم دیا کہ اس کا ترجمہ کیا جائے
چنانچہ تاج بن خراسانی ہروی، یزداں داد شاپور سیستانی، ماہوی
بن خورشید نیشاپوری، سلیمان طوسی ان سب نے مل کر اس کا ترجمہ کیا
یہی کتاب سامانیوں کو ہاتھ آئی اور ان کے حکم سے دقیقی نے اس کو
نظم کرنا شروع کیا۔ اس روایت کا یہ حصہ کہ کتاب جلش گئی، عربی
ترجمہ ہو کر پھر ہندستان پہنچی، ہندستان سے ایران میں آئی صریح غلط
اور بیہودہ ہے باقی واقعات صحیح ہوں تو عجب نہیں۔"

(شعر العجم صفحہ ۱۲۵ و ۱۲۶)

شکر ہے کہ اس موقعے پر شبلی نے اپنے مایۂ ناز دیباچے کے خلاف کسی قدر صدا بلند کی لیکن میں ان باقی واقعات پر نظر ڈالتا ہوں۔ صاحبِ دیباچہ نے یعقوب بن لیث کو ایک صدی پایۂ فرودیں میں رکھا۔ یعقوب سنہ ۲۶۵ھ میں رہگرائے ملکِ عدم ہوتا ہے۔ بھلا سنہ ۳۶ھ میں یعقوب اپنی قبر سے اٹھ کر ابو منصور عبدالرزاق کو حکم دینے کہاں سے آ گیا، صاحبِ دیباچہ کو اپنے قصوں کے توڑ جوڑ میں تاریخ کا لحاظ نہیں رہا۔ ابو منصور عبدالرزاق نے ترجمے کا حکم نہیں دیا بلکہ تدوین اور تصنیف کا۔ اس معاملے میں دیباچۂ قدیم اور شاہنامہ دونوں متفق ہیں۔ سنہ ۳۴۶ھ میں تصنیف تیار ہوئی تھی۔ سنہ ۳۶ھ میں تاج خراسانی کو دیباچۂ قدیم میں شاج نیسرخانی لکھا ہے لیکن شاہنامے میں اس کا نام "ماخ" ہے۔

یکے پیر بد مرزبان ہری — پسندیدہ و دیدہ از ہر دری
جہاں دیدہ و نام او بود ماخ — سخنداں و بافر و بابرز و شاخ
بپرسیدمش تا چہ دارد بیاد — ز ہرمز کہ بنشست بر تخت داد

(پادشاہی ہرمز و انوشیرواں جلد چہارم صفحہ ۴۵)

"شاید کہ من خادم این مجلس بزرگوار کتابے در تصنیف کم مایہ سی کہ اندر وے
اصلہا و نکتہاے ہیچ علم از علماے پیشینگاں گرد آوردم بغایت مختصر"
(مایۂ دانستن علائی طبع فرود دکن)

علامہ شبلی فردوسی کی شاعری پر خیال آرائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں
"سہراب اب سپہ گری چھوڑ کر عشق کا دم بھرنے لگا دیکھو فردوسی اس
کی نالہ و زاری کو کس طرح ادا کرتا ہو

ہمی گفت از آں پس دریغا دریغ	کہ شد ماہ تابندہ در زیر میغ
عجیب آہوے آدم در کمند	کہ از بند جست و مرا کرد بند
رہی چشم بندی کہ آں پرفسوں	بتیغم بجست و مرا ریخت خوں
ندانم چہ کرد آں فسوں گر بمن	کہ ناگہ مرا بست راہ سخن
بزاری مرا خود بباید گریست	کہ دلدار خود را ندانم کہ کیست
ہمی گفت و می سوخت از غم بسے	ہمی خواست زارش بنالد کسے
ولے عشق پنہاں نماند کہ زار	مروم نماید ہمی اشک بار
غم جاں نیارد و خروش از دروں	اگرچہ عاشق بود ذوفنوں

ان شعروں میں عشقیہ شاعری کی تمام ادائیں موجود ہیں استعارات اور تشبیہات
کا بھی ہلکا سا رنگ ہو شاعرانہ ترکیبیں بھی ہیں ع کہ از بند جست و مرا کرد بند
ع بتیغم بجست و مرا ریخت خوں
یہ سب کچھ ہو لیکن فردوسی اس بات کو نہیں بھولا کہ وہ سہراب کی
داستان لکھ رہا ہو محمد شاہ و واجد علی شاہ کی نہیں اس لیے فوراً سہراب
کو جواں کی زبان سے نصیحت کرتا ہو اور دیکھو ایک حوصلہ مند فاتح
کی نصیحت کا کیا انداز ہو

> کلام عربی الفاظ سے بھرا پڑا ہے سلطان محمود کے زمانے میں ایک فاضل
> نے شاہنامے کے جواب میں ظفرنامہ ایک کتاب نثر میں لکھی تھی وہ
> ہماری نظر سے گزری ہے اس کا بھی یہی حال ہے اسی زمانے میں شیخ بوعلی
> سینا نے حکمت علائیہ فارسی زبان میں لکھی اور قصد کیا کہ خالص فارسی
> میں لکھی جائے لیکن عہدہ برآ نہ ہو سکا۔ (شعر العجم صفحہ ۱۴۲)

ایران میں شروع ہی سے عربی کا شدت سے مخلوط ہونا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ عباس مروزی کے اشعار اس بارے میں سند نہیں مانے جا سکتے متاخرین کے ہاتھوں ان میں اس قدر ترمیم ہو گئی ہے کہ قدامت کی بو تک باقی نہیں رہی رودکی کے متعلق مولانا کو جو شبہ ہے وہ ظاہراً قطران تبریزی کے قصائد کی بنا پر ایسا فرماتے ہیں لیکن وہ سلجوقی عہد کی زبان ہے اس دور میں عربی فارسی زبان میں بہت دخیل ہو گئی تھی اسی غلط فہمی کی بنا پر مولانا نے یہ نظریہ قائم کیا کہ دقیقی فارسی زبان کے گلزار کو عربی الفاظ کے خس و خاشاک سے پاک کرنے والا ہے رہا ابوشکور بلخی اس کے کلام کا جس قدر نمونہ شعر العجم صفحہ ۵۴ و ۵۵ میں دیا گیا ہے اس میں عربی کا ایک لفظ بھی قسم کھانے کو نہیں ملتا عربی کا اثر ابتدا میں فارسی پر کچھ نہیں تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ اثر بتدریج ترقی کرتا گیا حتیٰ کہ پانچویں اور چھٹی صدیوں میں اس نے ایک طوفان بے تمیزی برپا کر دیا ظفرنامہ اور حکمت علائیہ ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہیں اس لیے کہ وہ پانچویں صدی ہجری سے تعلق رکھتی ہیں اور نثر میں ہیں حکمت علائیہ کی نسبت یہ خیال کہ شیخ بوعلی سینا نے خالص فارسی میں لکھنے کا قصد کیا مجھ کو غیر تاریخی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اول تو فلسفیانہ اصطلاحات کی فارسی زبان میں غیر موجودگی کی بنا پر ایسا قصد کرنا دیوانگی سے کم نہیں تھا دوسرے شیخ نے اس تصنیف میں ایسا ارادہ ظاہر نہیں کیا وہ صرف یہ کہتا ہے ۔

جلد چھوٹ کر نکل جاتا ہے۔ فردوسی نے موقع پاکر عشقیہ شاعری کا کمال بھی دکھلا دیا۔" (شعر العجم صفحہ ۱۴۹، ۱۵۱ طبع سوم)

سطور بالا میں مولانا کی نکتہ سنجیاں قابل ستائش ہیں لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس موقع پر مولانا کسی نامعلوم شاعر کے کلام کی داد دینے میں مصروف ہیں کیونکہ یہ تمام اشعار الحاقی ہیں فردوسی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور بعد میں کسی نے اضافہ کر دیے ہیں یہ اصل میں چھتیس اشعار کا ایک قطعہ ہے جو ؎

ہمی جست گرد آفرید و ندید   دلش مہر پیوند او برگزید

سے شروع ہو کر

ازاں شاد شد شاہ توراں زمیں   ہمی کرد سہراب را آفریں

پر ختم ہوتا ہے اور ان اشعار کے درمیان واقع ہے ؎

بفرماں ہمہ پیش او آمدند   سپہ ہر کسے چارہ جو آمدند

(سطر ۳۲ صفحہ ۸۹)

ازاں پس چو نامہ بخسرو رسید   غمی شد دلش کاں سخنہا شنید

(جلد اول صفحہ ۹ سطر ۱۵ بمبئی ۱۲۷۵ھ)

ان اشعار کی تلاش میں میں نے شاہنامے کے کئی معتبر اور قدیمی نسخے دیکھے لیکن ان میں یہ اشعار نظر نہیں آئے علاوہ بریں جو ٹرنر میکن جس نے پہلی مرتبہ شاہنامہ چھاپ کر شائع کیا ہے ان اشعار کو الحاقی مانتا ہے۔

ازاں کار ہوماں شد آشفتہ سر | کہ سہراب را ہست خون دگر
ولے از فراست بدل نقش بست | کہ او را پریشانیے داد دست
بدام کسے پائے بند آمدہ است | ز زلفے ستی در کمند آمدہ است
نہاں می کند درد و جویند راست | ہوس میرود راہ و پا در گلست
یکے روز صحبت بگفتش براز | کہ اے شیر دل گرد گردن فراز
فریب پری پیکراں جواں | نخواہد کسے کو بود پہلواں
برسم جہانگیری و سروری است | کہ از مہر ماہی بباید گریست
بتوران بکارے بروں آمدیم | شناور بدریائے خوں آمدیم
اگرچہ ایں کار باشد بکام | ولے ہست در پیش رزمے تمام
بیاید شہنشاہ کاؤس و طوس | چو رستم کہ بر پیل دارد کوس

پھر بہت سے ایرانی پہلوانوں کے نام گنا کر کہتا ہے

توئی مرد میداں ایں سروری | چہ کار است با عشق پری پیکراں
تو کارے کہ داری بمردی بسر | چرا دست یازی بکار دگر
بہ نیروئے مردی جہاں را بگیر | ز شاہاں بدست آر تاج و سریر
چو کشور بدست تو آید قرار | بہر جائے خوباں بدست بکار
ازاں گفتہ سہراب بیدار شد | دلش بستہ بند پیکار شد
بگفت اے سر نامداراں چنیں | بگفتار خوبت ہزار آفریں
شد ایں گفت تو داروے جان من | کنوں با تو گشت پیمان من
جہاں را سراسر چہ خشک و چہ آب | در آرم بفرمان افراسیاب
بگفت ایں و دل را ز دلبر بکند | برآمد بر افراز تخت بلند

دیکھو ایک شجاع دام عشق میں اتفاقاً پھنس بھی جاتا ہے تو کس طرح

اس کے بعد فرماتے ہیں:-

"بہرحال عنصری نے اس کو دربار شاہی میں پہنچایا اور سلطان محمد ابن سلطان محمود کے حضور میں ترخانی کا منصب ملا یعنی جب چاہتا دربار میں چلا جاتا کچھ روک ٹوک نہ تھی محمد چند روز کی سلطنت کے بعد یعنی ۴۲۱ھ میں گرفتار ہو کر قید ہوا اور اس کے بھائی سلطان مسعود نے تختِ سلطنت پر جلوس کیا" (شعر العجم صفحہ ۱۸۷)

منصبِ ترخانی کا ذکر ہم غزنوی دور میں نہیں پڑھتے - میرا خیال ہے کہ یہ عہدہ سلاطینِ مغول کے عہد میں رائج ہوا یہ ایک ترکی عہدہ ہے نہ ایرانی۔ منوچہری کا سلطان محمد ابن سلطان محمود سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اسی لیے اس کے دیوان میں محمد کی مدح میں کوئی قصیدہ موجود نہیں اور نہ ان ایام میں منوچہری کے دربار غزنہ سے تعلقات قائم ہوئے تھے فرماتے ہیں -

"دولت شاہ نے اس کو بلخی لکھا ہے چونکہ نہایت دولت مند تھا اس لیے شصت گلہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا" (شعر العجم صفحہ ۱۸۶)

قبلہ مولانا دولت شاہ کی سند پر منوچہری کو بلخی مان رہے ہیں لیکن اگر منوچہری کے اشعار پر جن کو خود مولانا بھی نقل کرتے ہیں ذرا لحاظ کر لیا جاتا تو معلوم ہو جاتا کہ وہ بلخی نہیں بلکہ دامغانی ہے۔ چنانچہ شعر

سوی تاج عمرانیان ہم ندیمان   بیاید منوچہری دامغانی

اس کا لقب شصت گلہ نہیں تھا بلکہ کسی اور متاخر شاعر کا جس کا نام بقول پروفیسر براؤن (صفحہ ۱۵۴ جلد دوم) شمس الدین احمد منوچہر ہے۔

منوچہری اپنا نسب سامانی شاہی خاندان سے بیان کرتا ہے:-

منم از نژاد بزرگان سامان   کہ بودند شاہان چیرہ و کواکب

منوچہری

اس سے قبل ایک مقام پر گزارش ہو چکا ہے کہ مولانا کے سنین و تاریخ غلط ہوتے ہیں اس قسم کی ایک تازہ مثال ذیل میں پیش ہو شبلی فرماتے ہیں۔

"امیر منوچہر بن شمس المعالی امیر قابوس بن وشمگیر مشہور رئیس اور جرجان کا فرماں روا تھا اور سنہ ۳۸۶ھ میں تخت نشین ہوا تھا یہ اس کے دربار میں ملازم تھا۔ اس مناسبت سے منوچہری تخلص کیا تھا سنہ ۴۲۴ھ میں امیر منوچہر نے انتقال کیا تو یہ غزنین میں آیا"

(شعر العجم صفحہ ۱۸۶)

فلک المعالی امیر منوچہر سنہ ۴۰۳ھ میں تخت نشین ہوا نہ سنہ ۳۸۶ھ میں۔ اس کی وفات سنہ ۴۲۳ھ میں ہوئی نہ سنہ ۴۲۴ھ میں۔ ولہ

"تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اس نے عنصری کی شاگردی بھی اختیار کی لیکن یہ بھی ایک خوشامد کا پہلو تھا جس طرح قلعہ میں لوگ بہادر شاہ سے گلستاں پڑھنے جایا کرتے تھے" (صفحہ ۱۸۶ شعر العجم)

یہاں تذکرہ نگار کیوں بدنام کیے جاتے ہیں عنصری کی استادی کا تو خود منوچہری کو اعتراف ہے جہاں وہ کہتا ہے ؎

کو جریر و کو فرزدق کو ولید و کو لبید رؤبہ و عجاج و دیک الجن و سیف ذویزن
گو فراز آیند و شعر اوستادم بشنوند تا غریبی روضہ بینند و طبیعی گلشن

کیا واقعی بہادر شاہ بادشاہ اتنی فارسی بھی نہیں جانتے تھے کہ گلستاں پڑھا سکتے؟ بادشاہ مرحوم کی تالیف شرح گلستاں جو ۱۸۵۵ء سے کئی سال پیشتر قلعۂ معلیٰ میں چھپی تھی راقم کے کتب خانے کی زینت ہے۔

خواست از ری خسروِ ایران مرا از منت نیل ... خود ز تو هرگز نمید یشید در چندین سنین

جب سلطان غزنین کی طرف مراجعت کرتا ہے منوچہری بھی کچھ عرصے کے بعد غزنین پہنچ جاتا ہے۔

دانی کہ من مقیم بر درگہ تہ ہستم ... تا باز گشت سلطان از لاله زار ساری
وین دستها بر یدم وین کوہہا پیادہ ... دو پای ما جراحت و دیدہ گشتہ تاری
امید آن کہ روزے خواہد ملک بہ تیغم ... تخم سود مساعد روزم شود بہاری
آگنون کہ شاہ شاہان برسد بکوی رحمت ... کوتی کہ رحمت شہ از سد بدر گزاری
ختم آیدت کہ خسرو بر من کند نکوئی ... ای دیدگان آب دریا از من دریغ داری

سلطان مسعود کو اس کی طرز شاعری دل سے پسند تھی۔

از بہر آن کہ شعرم شہ را بدل خوش آید ... رحمت از تو علمل رحمت از تو زاری
من شعر بیش گویم کان شاہ را خوش آید ... الفاظ ہای نیکو ابیات ہاے جاری
گر تو بہر مدیحے چندین طلبید خواہی ... بہار راصوری بہار ہے فراری

مسعود نے بعض وقت خود شعر کی فرمایش کی ہے منوچہری سے

در خواستی تو شعرم این آمدت ادای ... ایسے کریم طبعی اینت بزرگواری
اصناف حرفہائے کر شعر ترندیدی ... بیگیت یاد و رحمت شاد بیت شادخواری

سلطان مسعود کے دربار سے تعلق پیدا کرنے سے پیشتر منوچہری گرگان، ری اور طالقین میں رہ چکا ہے۔

مر مرا بارے مدیر در گاہ شاہ ست آرزو ... بر ری و گرگان ہمی یاد آیدم بر طالقین

پھر مسعود کی ستا یاں میاصیوں کی طرف تلمیح کرتا ہوا کویا ہے۔

شاعر ارا در ری و گرگان در شروان کہ دید ... مدرۂ عدنی بہشت پیل آورده بریں
آنچہ اسا ہنتر و ہدر و رسے گمتر شاہان ... معتصم ہرگز نہ عمر اندر بداد و مستعین

منیہ ہونے کے علاوہ عربی صرف و نحو اور علم طب میں بھی کامل تھا ؎

من بدانم علم دین و علم طب و علم نحو تو نہ دالی دال از ذال و را و سین و شین

عربی ادب میں اس کی مہارت غیر معمولی تھی، تاریخ عرب اور تاریخ عجم سے خوب واقف تھا، نجوم و ہیئت اور موسیقی کا بھی عالم تھا۔ غیر معمولی حافظے کا مالک ہونے کی وجہ سے شعرائے عرب کا کلام اس کے ورد زبان رہتا ہے، اس کی غیر معمولی علمیت تھی، ادبی اور تاریخی تلمیحات نے اس کے دیوان کو مشکل اور ادق سا دیا ہے بعض قصیدوں میں وہ لغات کا انبار کر گزرتا اور برتتا ہے تشبیب نگاری، مناظر قدرت، بہار، باغ، گل و ریاحین، مرغ و پرند، سفر، شام و صبح، برف وغیرہ کے بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے جس طرح کہ تشبیہات و استعارات میں جدت قدم قدم پر اس کے ہاں ملتی ہے اسی طرح صنائع بدائع، لفظی لطافتیں، نئے عروضی اوزان کے استعمال میں بھی اسے تقدم حاصل ہے۔ مبالغہ، تکلف اور تصنع اس کے ہاں سب سے پہلی مرتبہ دیکھے جاتے ہیں۔ منوچہری کو اس نئی صنف شاعری کا موجد کہنا چاہیے جس کی ابتدا اور نشو و نما سماں مغرب ایران میں ہوئی اور جس نے قطران تبریزی خاقانی اور نظامی جیسے شعرا پیدا کیے۔ تخمیس کی بدعت منوچہری نے غزل کے میدان میں بھی شروع کر دی تھی لیکن شکر ہے کہ یہ رواج مقبول نہ ہوا گھوڑے کے بیان میں منوچہری کو خاص شغف ہے جس طرح تشبیب کا وہ بادشاہ ہے اسی طرح مدح کے میدان میں اس کا سمند قلم اسپ لنگ بن جاتا ہے مدح نگاری کبھی اس کو راس نہ آئی وہ طبیعت کا تمام زور تشبیب پر صرف کر دیتا ہے اور اسی ایک بات نے اس کے دیوان کو موجودہ مذاق میں زیادہ مقبول سا دیا ہے۔

۴۲۵ھ میں جب ساری اور آمل کی طرف سلطان مسعود بن محمود کا گزر ہوا سلطان نے رے سے جہاں ان ایام میں منوچہری مقیم تھا خواہش کر کے بلایا ؎

اس کے متعلق منوچہری ایک قصیدے میں کہتا ہی ؎

جز تو نہ بست کردن جیحون کسے بعل   وندر برا ندبسیل بہ جیحون دراں ہزار
دو سال یا سہ سال دراں بود تا ببست   جسری در آب جیحون محمود نامدار
در مدت دو ہفتہ ببستی تو اے ملک   جسری در آب جیحون بر راں ہزار بار
دریا مداں سپہ کہ بجیحون گزاشتی   دریا گرد بود بجیحوں کسے گزار
سالار خانیاں را باخیل و با حشم   کردے ہمہ نگون و نگوں بخت وخاکسار
تا برکسے گرفتہ نباشد خدائے حشم   بیں تو باید و نہ کسد با تو چار چار
پور تگیں کہ حشم خدائے اندر رسید   اورا اراں دیار دواند بایں دیار
تا گنج او خراب شد و خیل او اسیر   تا روز او سیاہ شد وجان او فگار
او مار بود و مار چو آہنگ او کنی   اندر جہد ربیم بسوراخ تنگ و تار
گرشاہ ما کشتے ورا بود زیں قبیل   کرسنگ غار ہیچ امیرے نکشت مار

مذکورۂ بالا بیانات میں شاعر نے واقعیت کا بہت کم لحاظ رکھا ہی اصلی معاملات کو اس قدر رنگینی کے ساتھ بیان کیا ہی کہ ان کی شناخت قریب قریب مشکل ہوگئی ہی پل کے لیے بیہقی کہتا ہی -

> و ہشتم ماہ ربیع الاول ماندہ رفت سوئے سکتگیں بچگاں دار محمودی و فرمودہ آمد تا بر جیحون پلے ببستہ آید کہ رکاب عالی را حرکت خواہد بود بدست راہ و جواب رسید کہ پل بستہ آمد و جائے در میانہ جزیرہ پلے سخت قوی و محکم کہ آلت و کشتی ہمہ بر جائے بود ازاں وقت باز کہ امیر محمود فرمودہ بود (بیہقی صفحہ ۷۴۴)

جب تمام ضروری ساماں اور کشتیاں محمود کے وقت سے تیار تھیں تو ظاہر ہی کہ پل دو ہفتہ کے اندر آسانی سے ترتیب دیا جا سکتا تھا اس پر شاعر

جس طرح انشا کی آمد نے لکھنؤ میں اسی طرح منوچہری کی آمد نے دربار غزنین میں ایک شور مچا دیا ہی۔ حسد جو تلامیذ الرحمٰن کا ازلی حصہ ہی بہت جلد اپنا رنگ لایا اور منوچہری کے بہت حاسد کھڑے ہو گئے ان میں شرواں کی طرف کا کوئی شاعر ہی جس کا نام باوجود کوشش نہ معلوم ہو سکا منوچہری کے خلاف اس نے بہت کچھ حصہ لیا۔ عام حاسدوں کی شکایت اگرچہ منوچہری کے کئی قصائد میں ملتی ہی لیکن دو قصائد میں شاعر کا روئے سخن اسی شروانی کی طرف ہی۔ جب کہتا ہی ؎

سال پارین با تو ما را چه جدال و جنگ خاست | سال امسالین تو با ما در گرفتی جنگ و کین
باش تا سال دگر نوبت کرا خواهد بدن | تا کرا می بایدم زد بر بروت و پوستین
من ترا از خویشتن در باب شعر و شاعری | کمترین شاعرستانم بوده حق الیقین
گر مرا آزموده بودے خسرو سیده نواز | بهتر از دیوان شعرت یا سپه کردم مبین
مهر فرمودت که رو یک شعر او را کن جواب | بود سالے و نکردی سگ ماندی بیش ازین
لیکن اشعار ترا آن قدر و آن قیمت نبود | کش بفرمودے جواب آن خسرو شاعر گزین
گر تو اے نادان ندانی هر کسے داند که تو | نیستی با من بیکجا شعر گفتن هم نشین
من بفضل از تو فزونم تو بمال از من فزون | بهتر ست از مال فضل و بهتر از دنیاست دین
مال تو از شهریار شهریاران گرد گشت | ورنه اندر ری تو سرگین چیده از پارگین
گرنه مانند در چنین حالت مریدے مر ترا | خارشے بس ماندہ بت زلت کر میزہین
هیچ سالے نیست کز دینار سی صد چار صد | از پئے عوض حشم کمتر کنی در آستین
وان گہے گوئی من از شاه جهان شاکر نیم | گر نه سگ آید ازین شه رحمت او بعد ازین
مار شروان شو بدان جائے که وا درت همی | گوشت خوک مرده یکماهه و مار حزین

سنہ ۴۲۸ھ میں سلطان مسعود نے دریاے جیحوں پر پل باندھے جانے کا حکم دیا

کی طرف بڑھ رہا ہو اس کا قصد ہو کہ اندھود کے راستے سے جیحوں پہنچ کر پل توڑ دے اور دریا پر قبضہ کرلے اگر جدا ہوا ستہ پل ٹوٹ گیا تکلیف کے علاوہ بڑی رسوائی کا سامنا ہو امیر مسعود اس خط کو دیکھ کر بہت پریشان ہوا پورتگین اس وقت تک سرحان سے نکل چکا تھا اور دَرّے پر قابض تھا وہاں کے جیہ جیہ زمین سے واقف تھا۔ علاوہ بریں ہوستیار مددرقے اس کے ہمراہ تھے ناچار امیر مسعود بغیر کوئی کام سانے لوٹا۔ بارہ کو جمعہ کے روز نہایت عجلت میں روانہ ہوا۔ پورتگین اس موقعہ کا منتظر تھا دست پاکر بہیر پر آپڑا کچھ اونٹ اور کوتل گھوڑے لے گیا جس سے پریشانی اور بدنامی ہوئی (بیہقی صفحہ ۷)

ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس بیان میں اور منوچہری کے بیان میں کتنا فرق ہو محمودی دور کے شعرا مثلاً عنصری اور فرخی کے اکثر بیانات تاریخ سے حرف بحرف ملتے ہیں۔ لیکن منوچہری اپنے زوربیان قادرالکلامی اور جوش طبیعت کی خاطر واقعات کو بے دردی کے ساتھ قربان کر دیتا ہو۔

منوچہری کے ممدحین کی فہرست میں یہ نام شامل ہیں ۔

(۱) ابوسعید سلطان مسعود بن یمین الدولہ محمود۔ (۲) شمس الوزرا احمد بن عبدالصمد وزیر سلطان مسعود (۳) بادشاہ ابوالمظفر (۴) فضل بن محمد (۵) ابوالحسن بن الحسن (۶) علی ابن محمد (۷) خواجہ احمد (۸) خواجہ ابوالعباس (۹) علی بن عبیداللہ (۱۰) سکتو (۱۱) خواجہ محمد (۱۲) محمد قصری (۱۳) ابوحرب بختیار محمد (۱۴) ابوالحسن بن علی بن موسیٰ عمرانی (۱۵) حمید ابوسہل زوزنی دبیر سلطان مسعود (۱۶) ابوالربیع بن ربیع (۱۷) اسد بن حارث بن منصور امام جیلان ۔

کو پھر ادرے حاضر کرنے کا موقع ملا کہ جب محمود نے پل کے لیے دو تین سال لگائے میرے ممدوح نے صرف دو ہفتوں کے اندر اندر تیار کر لیا

پورتگین کے خلاف مسعود نے جس مہم کا ارادہ کیا تھا اس کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وزیر اور سرانِ سپاہ اس مہم کے سخت مخالف تھے چنانچہ وزیر احمد عبدالصمد کی اس کی نسبت جو رائے تھی جو اس نے ابونصر مشکانی سے ظاہر کی تھی، میں بیہقی کے الفاظ درج کرتا ہوں ۔

"وزیر چند بار استادم را گفت می بینی کہ چہ خواہد کرد از آب گذارہ خواہد شد درچنین وقت بہ میدان پورتگین، بداں کہ وے بخلال آمدہ وہیچ آب نگذشت این کار سست کہ خدائے نداند کہ چوں شود و او مرا وخاطر این حاضر بود و بونصر جواب داد کہ جز خاموشی روئے نیست کہ صیحت کہ تہمت مار گردد ماگر دلی ست وہمہ تشم می دانستند و با یک دیگر می گفتند بیرون پردہ ا ہر جلسے چیزے، و بوسعید مشرف رامی فراکرد تا می نشست سود نمی داشت و چوں پیش امیر رسید مدے بر موافقت او سخن گفتندے کہ در خشم می شد"

(بیہقی صفحہ ۵۵۷)

اسی ماہ کی اکیسویں تاریخ دوشنبہ کے روز مسعود نے پل سے عبور کیا اور سرِندہ پہنچ گیا ماہین کو ترمذ سے کوچ کیا اور صلح کو چغانیاں پہنچا تیسری ماہ ربیع الآخر منگل کے روز درۂ شومان کی طرف بڑھا کیونکہ اس طرف پورتگین کا گزراع چلا تھا۔ سردی نے اُدھر اپنا زور دکھایا برف باری جاری تھی جتنی تکلیف لشکر نے اس سفر میں اٹھائی پہلے کسی سفر میں نہیں دیکھی تھی۔ ۱۰ ربیع الآخر کو وزیر کا خط آیا اس میں تحریر تھا کہ داؤد سلجوقی ایک بڑے لشکر کے ساتھ سرخس سے گوزگانان

اس کو سلطان محمود کے سبعہ سیارہ میں شمار کیا ہو

(شعرالعجم صفحہ ۱۸۲)

یعنی بسم اللہ ہی غلط کی محمود کے سبعہ سیارہ میں اگر کسی اسدی کا شمار ہوسکتا ہو تو وہ اسدی کلاں ہو اور مولانا اسدی خرد کا حال لکھنے بیٹھے ہیں جو گرشاسپ نامہ کا مصنف ہو۔ اگر مذکورۂ بالا معنی نظریے پر لحاظ نہ کیا جائے تو بھی مولانا کا بیان غلط ہو اس لیے کہ صاحب گرشاسپ نامہ سلطان محمود کا ہم عصر نہیں اس کا گرشاسپ نامہ جیسا کہ آیندہ ذکر ہوگا، ۴۵۸ھ میں تصنیف ہوا ہو اس لیے وہ محمود سے بعد کا شاعر ہو۔ قولہ -

"عراق سے آذر بائیجان آیا یہاں کا رئیس ابودلف کرکری تھا"

(شعرالعجم صفحہ ۱۸۲)

آذر بائیجان میں ان ایام میں جیسا کہ قطران تبریزی کے قصائد سے معلوم ہوتا ہی مملانی خاندان برسر حکومت تھا جو کرکوئی کہلاتا تھا ابودلف کرکری اران کا بادشاہ تھا جو سرداران آذربائیجان اور بحر خزر کے درمیان واقع ہو۔ اران اور ارس دونوں ابودلف کی زیر حکومت تھے۔ نہیں معلوم مولانا کو یہ مغالطہ کیونکر پیش آیا حالانکہ اسدی کے اشعار سے جن کو خود مولانا صفحہ ۱۱۶ پر نقل کرتے ہیں یہ امر صاف ظاہر ہو۔ وہ اشعار یہ ہیں ؎

ملک بودلف شہریار زمیں جہاں دار ارانی اکسدیں

اسدی ان ابیات میں اُس کو ارانی کہتا ہو۔ شبلی فرماتے ہیں -

"اسدی سب سے پہلا شخص ہو جس نے مصطلحاتِ فارسی پر کتاب لکھی چنانچہ اس کے خاص ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ دیا مانت (کذا) کے کتب خانے میں موجود ہو۔ سلگیس نے اس کتاب کو چھاپ کر شائع

اسدی طوسی

یورپین تحقیقات مظہر ہیں کہ دو اسدی گزرے ہیں جو ایک دوسرے سے باپ بیٹے کا تعلق رکھتے ہیں اور اسدی تخلص دونوں میں عام ہے۔ اسدی کلاں کا نام ابونصر احمد بن منصور طوسی ہے جو صاحبِ مناظرہ ہے۔ دوسرا اسدی خود اس کا فرزند جس کا نام علی بن احمد الاسدی الطوسی ہے اور گرشاسپ نامہ اور لغتِ فرس کا مصنف ہے یہ بیان مجھ کو بظاہر عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے۔ باپ بیٹے میں تخلص کا اشتراک نہایت غیر معمولی ہے۔ لیکن دو زبردست مغربی مستشرق ڈاکٹر ایتھ اور پروفیسر براؤن اس کے راوی ہیں۔ اس نظریے کی ایک تصدیق نظامی گنجوی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ محمود کے دربار سے فردوسی کی ناکامی کے اسباب پر غور کرتے ہوئے موصوف اتفاقیہ اسدی کا بھی ذکر کر دیتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ؎

در سخا و سخن چو می پیچم　　کار بر طالع است من ہیچم
نسبت عقربی است با قوسی　　بخل محمود و بذل فردوسی
اسدی را کہ بودلف بنواخت　　طالع و طالعے بہم درساخت

(بہرام نامہ خمسہ ص ۱۱)

یہاں محمود کے تعلق میں اسدی کلاں مانا جا سکتا ہے نہ اسدی خورد۔ اس لیے یہ مغربی نظریہ قابلِ تسلیم ہے۔

مولانا شبلی کے پیشِ نظر اگرچہ پروفیسر براؤن کی تاریخ تھی تاہم وہ اس اہم مغربی انکشاف کے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہتے۔ جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شعرالعجم میں دونوں اسدیوں میں تخلیط قائم ہو گئی۔ فرماتے ہیں۔

"اسدی طوس (رزم) کا یہ دوسرا تاجدار ہے۔ صاحبِ آتش کدہ

به پیروزی آورد لیکن پیام | گزین خدا بو دلف نیک نام
که گوید همی شاه فرهنگ جوی | به نام من این نامه را بازگوی
اگر زانکه فردوسی این نامه گفت | تو با گفتهٔ خویش گردانش جفت
کنون گر سپهرم بیارد کمین | بگویم بفرمان شاه زمین

اس کے بعد اسدی کہتا ہے کہ دو مثنوی نگار خاک طوس سے پیدا ہوئے پر تم کوئی تعجب نہ کرنا یہ امر واقعہ ہے جیسا کہ ؎

دو گویا چنین خاست با شد ز طوس | چو پیوسته گوئی تو با شد فسوس
گر این نامه را خوب کاری بود | ز من در جهان یادگاری بود

گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ میں دو سال کی محنت کے بعد ختم ہوا۔ اس کے اشعار کی تعداد دس ہزار ہے۔ شاعر نے جیسا خود بیان کیا ہے۔ (گرشاسپ نامہ) ؎

شد این داستان بزرگ اسپری | به پیروز روزی و نیک اختری
ز هجرت بُد و بر سپهری که گشت | شده چارصد سال و پنجاه و هشت
جز آن کاندرین داستان اندرون | ز هر در بسی گرد کردم سخن
چنین نامهٔ نامور نیک گفت | که هر داستانی رو توان برگرفت
بهشتیست پر نقش بر کاخ فرهنگ | گیاهش ز عنبر درختان ز مشک
بسی حور بر کردش آراسته | از اندیشه و نیرنگان خاسته
ز یاکی روان شاه فرهنگ جوی | ز دانش زبان و ز معنی دهن
چنان کم بدان در سخن پایگاه | بگفتم بشعر و سپردم به شاه
بر آمد همی بیت او ده هزار | دو سال اندرین برده شد روزگار
مبادا به بیننده را آفرین | که کمتر نویسد یکی بیت ازین

آخری تاکید کے باوجود گرشاسپ نامہ جس قدر برباد کیا گیا ہے مشکل سے اور کتاب

بھی کیا ہے" (شعر العجم صفحہ ۱۰۴)

یہ اطلاع "مسٹر براؤن کی کتاب جلد دوم" سے لی گئی ہے جیسا کہ حاشیہ میں ارشاد ہوا ہے لیکن مولانا پروفیسر براؤن کا مطلب نہ سمجھے۔ اسدی کی مصطلحات فارسی ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کہیں موجود نہیں نہ اس کو سلگین نے شائع کیا البتہ اس کا ایک نسخہ جو پنجشنبہ ۹ ر ماہ محرم ۷۳۳ھ کو عبدالرحمٰن بن احمد بن الظہیر نے نقل کیا تھا ڈاکٹر پال ہورن نے ۱۸۹۷ء میں شائع کیا ہے۔ عبدالرحمٰن کا نسخہ دنیا میں نہیں ملکہ پایۂ روم کے کتب خانے میں ہے۔ دارالسلطنت دیانا میں اسدی کے قلم کی جو کتاب ہے وہ حکیم ابو منصور موفق بن علی ہروی کی کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ ہے جس کو اسدی نے شوال ۴۴۷ھ میں اپنے قلم سے نقل کیا ہے کاتب نے اپنا نام اس طرح لکھا ہے "علی بن احمد الاسدی الطوسی الشاعر" اس کتاب کو سلگین نے البتہ ۱۸۵۹ء میں چھاپا ہے۔

اسدی کے نام کو زندہ رکھنے والی اس کی تصنیف گرشاسپ نامہ ہے ابتدا میں گرشاسپ نامے کا محرک ابو دلف شیبانی کا وزیر محمد بن اسمٰعیل حصی ہوا۔

(گرشاسپ نامہ) ص ۵

بہی مہتر داد و دیبان دین گران مایہ دستور شاہ زمین

محمد کہ خود چہر تو ہنر سمٰعیل حصی مر او را پدر

ز چرخ روان تا بہ ارمد خاک چہ دیون گیتی بدانستہ پاک

باقی اشعار شبلی نے درج کیے ہیں اس لیے میں دوہرانا ضروری نہیں سمجھتا جب ابو دلف شیبانی کو اسدی کے اس ارادے کی اطلاع ہوئی اس نے اپنے ملازم لولو کی زبانی پیام بھیجا کہ یہ کتاب میرے نام پر لکھی جائے

(گرشاسپ نامہ) ص ۵

صرف چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں ؎

بشب مورچہ بر پلاس سیاہ | بدیدی بچشم از دو صد میل راہ
زگرد سپہ وز گرد زمیں | زمیں گشت گردون و گردون زمیں
خروشش چناں سخت بگماشتے | کہ در دشت سیاہے گزر یافتے
جہاں تیرہ گشتی کہ از بس خروش | زبس تیرگی رہ سپردی بگوش

فردوسی اور اسدی کی شاعری میں وہی تفاوت ہو جو آمد اور آورد سادگی اور تصنع میں مشاہدہ کیا جاتا ہو۔

فردوسی کے ہاں جہاں حلاوت ہو اسدی میں ملاحت جھلک مارتی ہو جسلے حسن کی متانت کے مقابلے میں اسدی کے ہاں چلبلاہٹ اور نمکین سا نمک بھی موجود ہو۔ بلند مضمون، متحمل الفاظ، حسن بندش، جوش و خروش کی تاثیر، چیدہ تشابیہ برجستہ اسمائے صفات نے اسدی کے کلام کو زیادہ شوخ اور شگفتہ بنا دیا ہو۔ زبان کی ترقی، وقت کی مساعدت اور طبیعت کی رنگینی اسدی کے حق میں فیصلے کے لیے جھکتی ہو۔ لیکن سچ تو یہ ہو کہ اصل اصل ہو اور نقل نقل۔

شاہنامہ اور گرشاسپ نامے میں بہت مضامین عام ہیں بعض موقعوں پر تو ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اسدی نے شاہنامہ سامنے رکھ کر گرشاسپ نامہ لکھا ہو مثلاً داستان بیژن کی تمہید کے وہ اشعار جن میں ایک تاریک رات کا منظر کھینچا گیا ہو اور جو شاہنامے کے قدیم ترین اشعار مانے جاسکتے ہیں اسدی ان کا جواب دیتا ہو۔

شاہنامہ | گرشاسپ نامہ
شبے چوں شبہ روئے شستہ بقیر | شبے بد چو زنگی سیہ تر ز زاغ
نہ بہرام پیدا نہ کیواں نہ تیر | مہ نو چو در دست زنگی چراغ

اس قدر برباد ہوئی ہوگی۔ قطران آذربائیجانی اور اسدی ایران میں اس طرز شاعری کے مقلد ہیں جس کے خصوصی خواتیم پہلی بار منوچہری کے ہاں سامنے میں آتے ہیں۔ یہ صنف شاعری صنائع بدائع، لفظی لطافت، ترکیبوں کی خوش آہنگی، غیر فطری تشبیہات و استعارات اور صنعت مبالغہ میں اغراق کے لیے مشہور ہے لفظی شان و شوکت اور خیالات کے اظہار میں غیر معمولی تکلف جس کے نمایاں خط و خال ہیں۔

منوچہری اپنی مرکب تشبیہات میں عدیم المثال ہے۔ اسدی نے بعض موقعوں پر اس کی تقلید کی ہے مثلاً یہ شعر۔

ہمی تافت صبح از گرد سیاہ   چو ایمان پاک از میان گناہ

دیگر

دو زلفش ہمہ جیم و در جیم دال   دہن میم و بر میمش از نقطہ خال

قطران صنعت تجنیس کا عالم ہے اسدی اس کی بھی پیروی کرتا ہے۔ شعر

سرگاں سرم اندر آرام رام   نشستند خفت غم انجام جام

لیکن یہ صنعت لطیف ہیچ تو یوں ہے کہ قطران کا حصہ ہے۔ میں اس کے چند اشعار نقل کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا (قطران)

چوں نظر بہ سوے بہادہ گل خود بہ سوے   جائے ما معشوق ہو خوردں لطف ہمے خوے
بردہ از مرجاں نگوں لالہ نعمان سبق   بردہ از مطرب مدستاں بلبل خوش گوے گوے
ستد از یاقوت ستد لالہ و گلنار بار   یافت از کافور و عنبر خیری و شبو بوے
از نسیم سوسن و گل گشت چوں قرقیر باغ   و ز دم در لعبت من گشت چوں مشکوے کوے
چشم من چوں چشمہ آموے گشت از ہجر او   تن بحوں چوں درمیاں چشمہ آموے موے

صنعت مبالغہ اس میں شک نہیں کہ اسدی کا خاص حصہ ہے میں بخوف طوالت

گرشاسپ نامہ	شاہنامہ
برآں سوگ برکردہ گردوں زشک	جہاں را دل از خویشتن پر ہراس
زرہ نیلگوں پر ز سیمیں سرشک	جرس برگرفتہ نگہباں پاس
تو گفتی یکے آئینہ ست از فراز	نہ آوائے مرغ و نہ ہرائے دد
ستارہ درو چشم زنگی ست باز	زمانہ زباں بستہ از نیک و بد

فردوسی کے ہاں اکثر تشبیہات مادی اشیا سے تعلق رکھتی ہیں، اسدی کی اکثر تشبیہیں ایسی ہیں جو غیر محسوس ہیں موج دریائے قیر، پیرہن انگشت، زداں پشت دو رنج تار وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسدی نے اپنے سبھی سابقہ کو ہاتھ سے نہیں دیا اور چوتھے شعر میں اپنی برجستہ طرز میں کہتا ہے کہ دنیا اس قدر تاریک تھی کہ نالہ لب سے نکلتے ہی بوجہ کثرت تاریکی راہ گم کر کے کہیں کا کہیں بھٹک جاتا تھا اور کانوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا فردوسی جداگانہ سحر ہے، اسدی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تاہم اسدی نے جو کچھ زور طبیعت دکھایا ہے لائق تحسین ہے

بعض موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ اسدی نے فردوسی کے خیالات کو سلیقے سے لے لیا ہے اور سرقہ کی سرحد ممنوعہ سے ڈانڈا ملایا ہے

گرشاسپ نامہ	شاہنامہ
ہرآں چہ کہ خیزد ز آب و خاک	گرامے کہ چوں سرو آزاد رست
بشاید فگندن بر و سنگ و خاک	سرو گر بباید بر و خاک نشست
چو پیریت سیمیں کند گوشوار	پیامست از مرگ موئے سپید
ازاں پس تو جز گوش مردن مدار	ببودن چہ داری تو چندیں امید

شاهنامہ

دگر گونہ آرایشی کرد ماہ
بسیج گذر کرد بر پیشگاہ
شدہ تیرہ اندر سرای درنگ
میان کردہ باریک و دل کردہ تنگ
ز تاجش سہ بہرہ شدہ لاجورد
سپردہ ہوا را بہ زنگار گرد
سپاہ شب تیرہ بر دشت و راغ
یکی فرش افگندہ چون پر زاغ
چو پولاد زنگار خوردہ سپہر
تو گفتی بہ قیر اندر اندودہ چہر
نمودم ز ہر سو بہ چشم اہرمن
چو مار سیہ باز کردہ دہن
ہر آنگہ کہ بر زد یکی باد سرد
چو زنگی بر انگیخت ز انگشت گرد
چنان گشت باغ و لب جویبار
کجا موج خیزد ز دریای قار
فرو ماند گردون گردان بجای
شدہ سست خورشید را دست و پای
زمین زیر آن چادر قیرگون
تو گفتی شدستی بخواب اندرون

گرشاسپ نامہ

سیاہیش درہم سیاہی پذیر
چو موج از بر موج دریای قیر
چو جبہ ز قیر اندر اندودہ شی
سیہ جامہ در رخ فرو ہشتہ موی
چنان تیرگیی کہ از لب خروش
ز بس تیرگی رہ نبردی بگوش
میان ہوا جای جای ابر و یم
چو افتادہ بر چشم تاریک نم
جہان گفتیش دوزخی ہست تار
بہر گوشہ دیو اندرو صد ہزار
از انگشت بدشان ہمہ سرزمین
دمان باد تاریک دود از دہن
زمین را کہ از غار دیدار نہ
زمان را رہ و روی گفتار نہ
بر ایوان شب در بہ بند آفتاب
فرو ہشتہ بر دیدہا پردہ خواب
فرشتہ گرفتہ ز بس بیم پاس
پری در نہیب اہرمن در ہراس
زمان بر زمین بیرد آن بد زمین
ہوا چون دژم سوگی دل غمین

چوتھا دور

قولہ "اس عہد میں فارسی زبان کی ترقی کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ اب تک تمام اسلامی سلطنتوں کی علمی اور دفتری زبان عربی تھی۔ سلطان محمود اپنی ملکی اور قومی خصوصیات کا بہت دلدادہ تھا، تاہم دفتر کی زبان اس کے عہد میں بھی عربی رہی۔ فرامین اور توقیعات تک اسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ لیکن الپ ارسلان سلجوقی جب تخت نشین ہوا تو اس نے حکم دیا کہ دفتر کی زبان فارسی کر دی جائے۔"

(شعر العجم صفحہ ۲۹)

سلطان محمود کے دور میں ابتدائی دس گیارہ سال تک دفتر کی زبان فارسی رہی، کیونکہ سلطان کے وزیر اول ابو العباس فضل بن احمد کو عربی کا علم نہ تھا، اس لیے تمام تحریرات فارسی ہی میں تھیں۔ سنہ ۴۰۴ھ سے ابو القاسم احمد بن حسن میمندی وزیر ہوئے چونکہ وہ عربی داں تھے اس لیے فارسی ترک کر دی گئی اور عربی کا رواج ہوا تاہم فارسی کا استعمال قطعاً متروک نہیں ہوا۔ اور ایسی حالتوں میں جب کہ مکتوب الیہ فارسی داں ہوتا تمام تحریرات فارسی ہی میں لکھی جاتی تھیں۔

گذشتہ بالا بیان میں نے تاریخ یمینی سے اخذ کیا ہو، لیکن تاریخ بیہقی کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہی کہ سلطان مسعود کے زمانے میں دربار غزنہ کی زبان فارسی ہی تھی۔ میرا مطلب یہ ہی کہ دربار میں عربی سے زیادہ فارسی کا رواج تھا جب خلیفہ قادر باللہ وفات پاتا ہی اور قائم بامر اللہ اس کا جانشین ہوتا

گرشاسپ نامہ	شاہنامہ
	یکے داستاں زد بریں مرد مہ
یکے را بدہ در بدادند جائے	کہ درویش را چوں برائی زدہ
ہمی گفت بردہ ہم کتخدائے	نگوید کہ من بہتر از وے بدم
	ہمہ بندہ بودند وس مہ بدم

اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ صاحب گرشاسپ نامہ نے فردوسی کے خیالات سے اپنی شاعری کو چمکایا ہے۔

مثنوی کا ایوان جس کی بنیاد رودکی، ابوشکور اور دقیقی جیسے معماران سخن نے ڈالی تھی فردوسی نے اپنے زمانے میں اس ایوان کو نہایت بلند اور عالیشان بنا دیا، اسدی نے دھیمے رنگوں میں اس پر بیل بوٹے اور نقش و نگار بنائے نظامی نے اپنے وقت میں ان رنگوں کو زیادہ شوخ اور لطیف کر دیا۔



عہدنامے کو سر دربار پڑھ کر سناتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دربار غزنہ میں فارسی ہی درباری زبان مانی جاتی تھی، علاوہ ازیں بیہقی میں اور بیسیوں خطوط ہیں جو سلجوقیوں، غزنویوں اور طبرستانیوں کے درمیان آتے جاتے ہیں، لیکن سب فارسی میں ہیں جس سے بوثوق کہا جاسکتا ہے کہ کم از کم مسعود کے دور میں فارسی زبان ہی درباری زبان تھی۔

قولہ "سنجر کے شاعرانہ مذاق اور قدردانی کی داستانیں اکثر تذکروں میں مذکور ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کی قدر و قیمت اس کے دربار میں کیا تھی۔

ایک دفعہ ارکان دولت کے ساتھ عید کا چاند دیکھنے نکلا۔ سب سے پہلے ہلال پر اسی کی نظر پڑی، خوشی سے اُچھل پڑا، سب کو انگلی کے اشارے سے بتایا، ساتھ ہی حکم دیا کہ کوئی شاعر فی البدیہہ ہلال کی تعریف میں شعر سنائے۔ معزّی اس وقت تک دربار میں امیدواری کرتا تھا، موقع پاکر اس نے برجستہ کہا۔

اے ماہ چو ابروان یاری گوئی ‌ ‌ ‌ ‌ یا نے چو کمان شہریاری گوئی
نعلے زدہ از زر عیاری گوئی ‌ ‌ ‌ ‌ درگوش سپہر گوشواری گوئی

یعنی اے چاند تو ابروئے معشوق ہے یا بادشاہ کی کمان یا سونے کی نعل یا آسمان کے کان کا آویزہ۔

سنجر نے اسپ خاصہ اور پانچ ہزار درہم عطا کیے، معزّی نے پھر برجستہ کہا۔

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید ‌ ‌ ‌ ‌ از خاک مرا بر زبر ماہ کشید
چوں آب یکے ترانہ از من بشنید ‌ ‌ ‌ ‌ چوں باد یکے مرکب خاصم بخشید

ہے، بارگاہ خلافت سے ایک سفیر مع فرمان خلیفہ آتا ہے۔ یہ فرمان عربی میں تھا، چنانچہ اس کو اصل عربی میں سنائے جانے کے بعد سلطان مسعود کی خواہش پر اس کا فارسی ترجمہ سنایا جاتا ہے جس سے ظاہر ہے کہ غزنین میں عربی کم سمجھی جاتی تھی بیہقی کے الفاظ یہ ہیں:۔

"امیر خواجہ بونصر را آواز داد، پیش تخت شد، و نامہ بستد، و باز پس آمد، و روے فراتخت بایستاد، و خریطہ بکشاد، و نامہ بخواند چوں بپایاں آمد، امیر گفت، ترجمہ اش بخواں، تا ہمگاں را مقرر گردد، و بخواند بپارسی، چناں کہ اقرار دادند ستودگاں کہ کسے را ایں کفایت نیست۔" (صفحہ ۲۹۲)

اسی طرح سلطان مسعود جب دربار عام میں اپنے بیعت نامے کی تصدیق کرتا ہے تو ابونصر مشکانی اصل عربی کو پڑھ کر سناتا ہے لیکن اس کے فارسی ترجمے کو خود سلطان مسعود پڑھ کر حاضرین کو سناتا ہے چنانچہ:۔

"امیر گفت، شنودم و جملہ آں مرا مقرر گشت، نسخہ پارسی مرادہ بونصر بدو باز داد و امیر مسعود خواندن گرفت وار بادشاہان ایں خاندان رضی اللہ عنہم ندیدم کسے کہ پارسی چناں خواندے و نبشتے کہ وے نسخہ عہد را تا آخر بر زبان راند، چناں کہ ہیچ قطع نہ کرد و پس دوات خاصہ پیش آوردند در زیر آں بخط خویش تازی و پارسی ہم زیر آنچہ از بغداد آوردہ بودند و ہم زیر آنچہ استادم ترجمہ کردہ بود نبشت۔"

بیعت نامے کا عربی مسودہ اگرچہ بغداد سے تیار ہو کر آتا ہے لیکن سلطان مسعود عہد بیعت کرتے وقت اس کے فارسی ترجمے کو ترجیح دیتا ہے چنانچہ فارسی

میرا باپ نہایت ہوشیار آدمی تھا، اور سلطان شہید الپ ارسلان فی الحقیقت اس کا معتقد بھی تھا۔ میں شرمیلا اور خاموش طبیعت کا واقع ہوا ہوں، سال بھر خدمت گزاری کرتے گزری تنخواہ سے ایک حبہ وصول نہیں ہوا بلکہ میں ہزار دینار کا قرض دار ہو گیا ہوں، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر سلطان سے اجازت دلوا دیں کہ نیشاپور چلا جاؤں اور اپنا قرض ادا کر لے کی کوئی سبیل نکالوں۔ امیر علی نے جواب میں کہا کہ یہ ہمارا قصور ہے کہ اب تک تیری طرف سے غفلت برتی گئی لیکن اطمینان رکھ کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا، آج مغرب کے وقت بادشاہ چاند دیکھنے نکلے گا، تو حاضر رہنا دیکھیں خدا کیا کرتا ہے۔ شہزادے کے حکم سے سو دینار نیشاپوری مجھ کو اسی وقت مل گئے، میں خوش خوش گھر آیا، اور رمضان کے بندوبست میں مصروف ہو گیا، عصر کے قریب سراپردۂ سلطانی پر آ کر حاضر ہو گیا، شہزادہ علاء الدولہ بھی اسی وقت آیا۔

میں اب نظامی کی اپنی عبارت نقل کرتا ہوں:۔

"آفتاب زرد سلطان از سراپردہ بدر آمد، کمان گروہہ در دست، علاء الدولہ بر راست، من در دویدم و خدمت کردم، امیر علی نیکوئیہا پیوست و بماہ دیدن مشغول شدند، و اوّل کسے کہ ماہ دید سلطان بود عظیم شادمانہ شد علاء الدولہ مرا گفت، پسر برہانی دریں ماہ نو چیزے بگوئے۔ من بر فور ایں دو بیتی بگفتم۔

اے ماہ چو ابروان یاری گوئی یا نی چو کمان شہریاری گوئی
نعلے زدہ از زر عیاری گوئی در گوش سپہر گوشواری گوئی

چوں عرضہ کردم، امیر علی بسیارے تحسیں کرد، سلطان گفت برو از آخر ہر کدام اسپ کہ خواہی بگشائے، و دریں حالت بر کنار

سنجر نے ہزار دینار کے عطیے کے ساتھ حکم دیا کہ شاہی لقب اس
کے خطاب میں شامل کیا جائے۔ چونکہ سنجر کا لقب معزالدین بھی تھا
اس لیے معزی لقب ملا جو آج تخلص ہو کر مشہور ہو"۔
(شعرالعجم صفحہ ۲۱۱)

حکایت بالا سلطان سنجر سے علاقہ نہیں رکھتی، بلکہ نظامی عروضی جو اس
قصے کا سب سے قدیم راوی ہو اور جو تمام قصہ خود امیر معزی کی زبان سے سنا
ہو، سنجر کے باپ ملک شاہ کی طرف منسوب کرتا ہو۔ ملک شاہ کا لقب معزالدین
بھی تھا، اس کے علاوہ نظامی کے اور مولانا کے بیانات میں بھی اختلافات ہیں۔
ایک موقعے پر امیر معزی نظامی سے اپنی سرگزشت بیان کرتے وقت
کہتا ہو کہ میرے باپ امیر الشعرا برہانی نے ابتدائے عہد سلطنت سلطان ملک
شاہ میں اپنی وفات کے وقت مجھ کو اس مشہور قطعے کے ذریعے سے جس کا ایک
بیت یہ ہو۔

من بر فتم و فرزند من آمد خلف الصدق   اورا بخدا و بخداوند سپردم

سلطان ملک شاہ کے سپرد کر دیا، اس کی وفات کے بعد اس کی تنخواہ اور
جاگیر میرے نام کر دی گئی اور بادشاہی شاعر بن گیا۔ اگرچہ سال بھر برابر حاضر
رہا، لیکن بادشاہ کا دیدار دور سے بھی مجھ کو میسر نہ آیا اور تنخواہ سے ایک دینار
تک وصول نہیں ہوا اور قرض برابر بڑھتا گیا۔ رمضان سے ایک یوم قبل
میں شہزادۂ علاء الدولہ امیر علی فرامرز کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ شہزادہ شرف بیعت
ہونے کے علاوہ سلطان کا داماد اور ندیم خاص تھا، دربار میں اس کی بڑی عزت
تھی اور میرے ساتھ مہربانی سے پیش آیا کرتا تھا۔ میں نے اس سے عرض کی کہ
یہ بڑی مشکل ہو کہ جو وصف باپ میں ہو بیٹے میں بھی ہو بات یہ ہو کہ امیر برہانی

باغان شہید، رودکی اور دقیقی ہیں۔عزنوی دور میں عنصری بلکہ خود سلطان محمود کو اس کی آبیاری میں مصروف دیکھا جاتا ہے حکیم سنائی زیادہ تر رہبانیت اور کمتر تصوف کے مضامین کی اس میں اشاعت دیتے ہیں، مجاز کے پردے میں حقیقت کے اسرار کی ترجمانی ان سے شروع ہو جاتی ہے۔انوری کے ہاں سوز و گداز اور عشق محض ہے۔یہ عطار ہیں جو غزل کو میخانہ کا راستہ بتاتے ہیں۔رندوں کی صحبت میں جگہ دیتے ہیں اور حقیقت و مجاز کی دوعملی میں اس کا تیس آباد کرتے ہیں۔مولانا روم اور عراقی بادۂ تند کے ساغر پلا پلا کر اسے مست سرمدی بنا دیتے ہیں، حقیقت و مجاز ایک دوسرے سے ایسے گھل مل جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے امتیاز کرنے میں دقت پیش آتی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نظامی نے غزل کی کوئی خدمت کی ہو۔لیکن سنائی، انوری اور خاقانی کے مقابلے میں انھوں نے کوئی امتیازی رتبہ حاصل نہیں کیا، اس لیے اس میدان میں نظامی کسی خاص شکریے کے مستحق نہیں ہیں۔

حکیم سنائی

دیوانہ لائے خوار کے قصے کے ذکر کے بعد جس کو بسبب کثرت شہرت قلم انداز کیا جاتا ہے علامہ شبلی فرماتے ہیں -

قولہ حکیم سنائی پر یہ اثر ہوا کہ اسی دم سب چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے اور یہ رتبہ حاصل کیا کہ یا تو بہرام شاہ کے دربار میں بھٹی کرتے تھے یا بہرام شاہ نے اپنی بہن کو ان کے عقد نکاح میں دینا چاہا اور انھوں نے انکار کیا، چنانچہ بہرام شاہ کو جواب میں لکھا:-

آخر بودیم، امیر علی اسپے بامر کرد، بیاوردند و بکسان من دادند، ارزیدے سی صد دینار نشاپوری، سلطان بمصلیٰ رفت و من در خدمت، نماز شام بگزاردیم و بخوان بنشستیم، بر خوان امیر علی گفت پسر برہانی دریں تشریفے کہ خداوند جہاں فرمود ہیچ نگفتی حالی دو بیتے بگوے من بر پاے خاستم و خدمت کردم و چنانکہ آمد حالے ایں دو بیتی بگفتم۔

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید   از خاک مرا بر زبر ماہ کشید
چوں آب یکے ترانہ از من بشنید   چو باد یکے مرکب خاصم بخشید

چوں ایں دو بیتی ادا کردم، علاء الدولہ احسنتہا کرد و بسبب احسنت او سلطان مرا ہزار دینار عطا فرمود علاء الدولہ گفت جامگی و اجراش نرسیدہ است فردا بر دامن خواجہ خواہم نشست تا جامگیش از خزانہ بفرماید و اجراش بر سپاہان نویسد، گفت نگر تو کنی کہ دیگراں را ایں حشمت نیست و او را بلقب من باز خوانید و لقب سلطان معز الدنیا والدین بود، امیر علی خواجہ معزی خواند سلطان گفت امیر معزی، آں بزرگ زادہ چناں ساخت کہ دیگر روز بار پیشیں ہزار دینار بخشیدہ و ہزار و دویست دینار جامگی و برات نیز ہزار من غلہ بمن رسیدہ بود و چوں ماہ رمضان بیروں شد مرا بمجلس خواند و با سلطان ندیم کرد و اقبال من روے در ترقی نہاد و بعد ازاں پیوستہ تیمار من ہمی داشت و امروز ہرچہ دارم از عنایت آں پادشاہ زادہ دارم۔"

(چہار مقالہ طبع لیڈن صفحہ ۴۲ و ۴۳)

قولہ "غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہے لیکن سچ یہ ہے کہ اس صنم کدہ کے آذر نظامی ہی ہیں۔" (صفحہ ۲۱۴)

غزل میں نظامی کسی خاص امتیاز کے مستحق نہیں کیونکہ غزل کے پہلے

الغرض یہ اشعار اسی طرح چلے گئے ہیں اور ان سے کوئی صریحی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ شاعر کا مقصد قناعت کی تعلیم و تلقین ہو اور یا دشاہی حرمت سے اعراض و اغماض وغیرہ وغیرہ۔

قولہ "حکیم سنائی نے جب حدیقہ تصنیف کیا تو چونکہ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو عام عقائد کے خلاف ہیں اس لیے علما نے سخت مخالفت کی یہاں تک کہ بہرام شاہ تک شکایت پہنچی بہرام شاہ نے دار الخلافہ بغداد سے استفتا طلب کیا، وہاں کے علما نے لکھا کہ یہ مسائل قابل اعتراض نہیں" (شعر العجم صفحہ ۲۱۸)

جہاں تک تذکروں سے معلوم ہو، بہرام شاہ نے دار الخلافت سے استفتا طلب نہیں کیا خود دولت شاہ جس سے غالباً مولانا نے یہ قصّہ نقل کیا ہو کہتا ہو۔

چوں کتاب حدیقہ تمام کرد، علماء ظاہر عزنیں برحکیم طعن کردند و آں کتاب را بدار الاسلام بغداد فرستادند بدار الخلافت عرض کردند علمائے بغداد و ائمہ آں دیار بر صحت عقیدۂ خود فتوی حاصل کرد"

مخزن الغرائب میں لکھا ہو۔

"چوں کتاب حدیقہ را باتمام رسانید، مطالعۂ علماء ظاہر عزنیں درآمد، زبان طعن براو دراز کردند و بہ کفر و الحاد منسوب نمودند، جواب ستفید ادرا تشہیر کند، او بعلماء عزنیں گفت کہ چرا مرا ملامت و سرزنش می کنید۔ گفتند تو در حدیقہ خلاف شرع گفتۂ، گفت کتاب حدیقہ را بعلماء دار السّلام بغداد عرض

من نہ مرد زن و درروحاہم · عذرا اگر کم و گر خواہم
گر تو تاجم دہی ز احسانم · سر تو کہ تاج بستانم

(شعرالعجم صفحہ ۲۱۷)

مجھ کو اس قصے پر یقین لانے میں بہت کچھ تامل ہے، اس لیے کہ یاستغنا حدیقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور حدیقہ حکیم سنائی نے ساٹھ سال کی عمر میں تصنیف کیا ہے چنانچہ اشعار

روز گار مسعود بے باکم · ار دل شوخ جان غمناکم
کرد پشتم کمان وگام چو تیر · کرد رویم چو قیر وموے چو شیر
پائے بر پایم آمد از غم شصت · لا بجرم دست میزنم بر دست

(حدیقہ صفحہ ۵۹۶)

دیگر

عمر دادم بکلگی بر باد · بر من آمد ز شصت صد بیداد

(صفحہ ۵۹۸)

عمر کی زیادتی بجائے خود اہم مانع ہونے کے علاوہ جس موقعے پر ان کا ایراد ہوا ہے وہاں متن میں کوئی ایسا اشارہ نہیں پایا جاتا جس سے یہ گمان کیا جائے کہ ان اشعار کا مخاطب سلطان بہرام شاہ غزنوی ہے۔ تنہا ان اشعار کی بنا پر نتیجہ بالا قائم کرنا خالی از غرابت نہیں۔ یہ اشعار "قناعت" کے عنوان کے ذیل میں آتے ہیں اور زیادہ تر ایسا پایا جاتا ہے کہ ان میں کسی خاص بادشاہ کی طرف خطاب نہیں ہے۔ ان ہی ابیات کے بعد یہ اشعار آتے ہیں ؎

زاں کہ چوں طوق منت بکشم · لقمۂ خوان نعمت بچشم
نبوم بہر طمع مدحت گوئے · ایں بیانی ز من جز از من جوئے

(حدیقہ ص ۶۱۱)

گرچہ ہستم اسیرِ ہر نا اہل　　چشم دارم کہ کارگر دد سہل
تا کی ایں انقاص و ایں دوری　　بسر من کہ تو نہ معدوری
عہدہائے قدیم را یاد آر　　حق نان و نمک فرو مگذار"

اس کے بعد حدیقہ کے ذکر میں کہتے ہیں -

ایں کتابے کہ گفتہ ام در پند　　چوں زرِ جعد و لسر و دلسد
ہرچہ دانستہ ام ز نوعِ علوم　　کردہ ام جملہ خلق را معلوم
آنچہ نقص است و آنچہ اخبار است　　در مناقب ہر آنچہ آثار است
اندریں نامہ جملگی جمع ست　　مجلسِ عقل را یکے شمع است
ملکوت ایں سخن چو برخوانند　　حرز و تعویذ خویشتن دانند
یک سخن زیں و عالمے دانش　　ہمچو قرآن پارسی دانش" ص٨٥٢

اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہوئے گویا ہیں -

"جاہلاں جملہ ناپسند کنند　　در سرِ جہل ریشخند کنند
واں کہ باشد سخن شناس و حکیم　　ہمچو قرآں ورا کند تعظیم
گر کند طعنہ اندریں ناداں　　گو بکن نیست بہر از قرآں
ہر شاں لعظم ار بود تر ہند　　تو بر و سکر کن را ایشاں ہند
بخورم غم گر آلِ بو سفیاں　　نوبد از حدیث من شاداں
سدہ را مدحِ مصطفےٰ است علا　　جان من باد جانش را فدا
آل او را بجان خریدارم　　در بدی خواہ آل بیزارم
گر بدست ایں عقیدہ و مذہب　　ہم بریں بداریم یارب" ص٨٥٣

اس کے بعد امیر ریاگر سے استعفا کرتے ہیں -

تو چہ گوئی بیار و منثوی کن　　نیست اندر سخن محال سخن

می دارم، اگر علمای آں کار کفرش فتویٰ دہند ہرچہ سزاے ما باشد بما رسانید، پس حدیقہ را بدار الخلافت بغداد فرستاد، و از علمای بغداد و ائمہ آنجا از صحت عقیدۂ خود فتویٰ ساخت، علما و ائمہ آنجا از صحت عقیدہ و بہ قوت ایمان و مذہبش دستخط و مواہیر نمودند، ازاں سرزنش و بلیہ نجات یافت۔"

مزید ثبوت کی ضرورت کے وقت خود حکیم سنائی کا قول نقل کیا جا سکتا ہے، اس بارے میں حدیقہ کے خاتمے میں کافی اطلاع موجود ہے۔

سنائی امیر برہان الدین ابوالحسن بن ناصر الغزنوی الملقب بہ بریانگر کو خطاب کرکے کہتے ہیں:۔

اے تو در دیں مصطفیٰ سالار — بر طریق برادراں کن کار
عہد دیرینہ را بیاد آور — از طریق برادری مگذر
دین حق را توئی توئی برہاں — مر مرا زیں عقیلہا برہاں
تو بہ بغداد شاد و من ناشاد — خود نگوئی درا رسم فریاد
سال دو مہ ترس نک اندر گیں — گشتہ محبوس تربت غزنیں

(صفحہ ۱۵۸۔ نولکشور)

بدایونی نے غالباً اس شعر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کتاب حدیقہ سنائی نے اپنے حبس کے ایام میں لکھی تھی۔ منتخب التواریخ میں بہرام شاہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔

"و حدیقۃ الحقیقۃ شیخ سنائی اوست کہ در ایام حبس فرمودہ و جہت حبس شیخ تعصب غزنویہ بودہ در وادی تسنن۔" (صفحہ ۱۲ طبع نولکشور)

کس آخر برادری پیش آ — درمیاں ایں حجابہا بردار

اور کہا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ اس جنگ میں فرار ہوتے ہیں اور بغداد کی طرف چلے جاتے ہیں ؎

در جمل چوں معاویہؓ نگریخت — خون ناحق بسے بخیرہ ریخت
شد ہزیمت بجانب بغداد — گشتہ از فعل زشت خود ناشاد

جب حضرت عائشہؓ کے اونٹ کی کوچیں کاٹ دی جاتی ہیں اور ہودج گرتا ہے، ام المومنین اماں مانگتی ہیں حضرت علیؓ حضرت محمدؓ بن حضرت ابوبکرؓ کو بلاتے ہیں اور محمدؓ آکر چاہتے ہیں کہ بہن کا سر کاٹ لیں، لیکن حضرت علیؓ منع کرتے ہیں ؎

حمل آں شتر را چو پے کرد — ترک و سار معاویہؓ پے کرد
ہودج زن بخاک تیرہ فتاد — وز جہالت نقاب رخ نکشاد
گفت بنگر دہ ام امانم دہ — در ترحم کنوں ضمانم دہ
چوں بدید آں زود برگشتند — در جوئے خوں درآ بیاغشتند
خواند حیدر برادرش را زود — حملہ اخواہرا ورا سمود
رفت و گفتہ محمدؓ بوبکرؓ — آں ہمہ صدق و مانع از ہمہ مکر
پس سرآہیخت تیغ تا برد — گفت حیدر کہ کس ایں نکند
عفو کن تا بسوئے خانہ رود — بعد ازیں کارہائے بد نکند صفحہ ۲۸۰

حضرت محمدؓ پھر اپنی بہن کو مکۂ معظمہ کی طرف بھجواتے ہیں آپ جب مکہ پہنچ جاتی ہیں، کچھ عرصے بعد حضرت معاویہؓ آپ کو قتل کر دیتے ہیں ؎

برگرفتش محمدؓ از سر راہ — حملہ لشکر شدہ زکار آگاہ
سوئے مکہ روز بفرستاد — در تواضع محل ورا بنہاد
ماہ زاراں حمالت و تشویر — رفت زی مکہ حضرت گرم و دلیر

گفتم این دُر بست و فرستادم — در گنج علوم بگشادم
گر ترا این سخن پسند آید — جان من رسته از گزند آید
ور پسند تو نابد این گفتار — خود ندیدی بجمله باد انکار
این سخن را مطالعت فرمائے — نیک و بد در جواب ما بنمائے
ندہم هیچ ازین ترا تصدیع — عرض کن بر همه شریف و وضیع
گوئی این اعتقاد مجد و دست — جمله بر گفتنش آنچه مقصود ست ص ۸۵۴

حکیم سنائی ایک معلم کے فرزند تھے، جیسا کہ حدیقۃ الحقائق کے دیباچے میں ارشاد کرتے ہیں، حدیقہ آپ نے خواجہ رئیس احمدؒ بن مسعود تیشہ کی فرمائش سے لکھا ہے

لیکن کون رس کرمش زپیشہ ام — خواجہ رئیس احمد مسعود تیشہ را

اس کتاب کی تصنیف کے زمانے میں خواجہ احمدؒ ہی ان کی جملہ ضروریات کے متکفل تھے۔ سنائی اس کی تصنیف پر قریباً دس سال یعنی سنہ ۵۲۴ھ سے ۵۲۵ھ تک مصروف رہے

پانصد و بست و چار رفته ز عام — پانصد و سی و پنج گشته تمام

بعض نسخوں میں آخری مصرع یوں آتا ہے ع

پانصد و بست و پنج گشته تمام

حدیقہ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اشعار الحاقی بھی ہیں، مثلاً جنگ جمل کے واقعات کے ذکر میں شاعر نے تمام معتبر تاریخوں سے اختلاف کیا ہے جنگ جمل (۳۶ھ) میں حضرت عائشہؓ و حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ ایک فریق تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک فریق۔

حدیقہ میں حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہؓ کو ایک فریق قرار دیا ہے

بہاد رپاے، بند تکلیف — رفتار معانہ برمیان است
بے جور د و مرانگشت، می جور — تا توانی مباش جرمست
اندر رہ نیستی ہمی رو — آتش دررن ہر چہ شے ہست

میرزا محمد حواشی چہار مقالہ (ص۱۵۱) میں لکھتے ہیں کہ ان کی وفات با صحیح اقوال ۵۴۵ھ میں ہوئی۔ امیر معزی المتوفی ۵۴۲ھ کے مرثیہ میں سنائی نے یہ اشعار لکھے ہیں ۔

تا چند معز اے معزی کہ خدایش — زیں حالعلک برد وقبائے ملکی داد
چوں تیر فلک بود قریش سرہ آورد — بیکاں ملک برد وبہ تیر فلکی داد

بہرام شاہ غزنوی کے علاوہ انھوں نے سلطان سنجر کی بھی مداحی کی ہے، ایک قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

خاک را از باد بوئے مہربانی آمدہ است
در دہ آں آتش کہ آب زندگانی آمدہ است

سنجر کے ابتدائی تخت نشینی کے ایام میں لکھا گیا ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں ؎

چوں بسلطانی نشستی تہنیت گویم ترا
اے کہ اسلاف ترا سلطان نشانی آمدہ است

خواجہ احمد معروف بہ عارف زرگر اور قاضی فضل بن یحییٰ بن صاعد اور علی بن ہیثم ہروی کے ساتھ سنائی نے قصائد تبدیل کیے ہیں۔ شیخ الاسلام جمال الدین ابو المفاخر، محمد بن منصور سرخسی مفتی مشرق کی تعریف میں سنائی نے ایک سے زیادہ ترکیب بند لکھے ہیں اور بقول پروفیسر محمد اقبال ام، اے پی ایچ ڈی مثنوی سیر العباد الی المعاد بھی انہی محمد بن منصور کے نام پر لکھی ہے۔

(حواشی راحت الصدور (ص[illegible]) طبع یورپ)

عاقبت اہم مدست آں باعی ۔۔۔ شد تہید وکشت آں طاعی
آں کہ ماجفت مصطفیٰ رینیاں ۔۔۔ مدکید مرورا بمرد محواں حاشیہ ۲۸

شاعری کی ایک اور اہم خدمت جو سائی سے کی ہو تغزل ہو سائی کے عہد سے بیشتر غزل کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن اس صنف سخن نے ان کے ہاں مستقل شان پیدا کرلی ہو۔ بلحاظ زماں اُن کی غزل، قطعہ اور قصیدے میں متقدمین کی طرح کوئی تفاوت نہیں دیکھا جاتا تخلص کا رواج، غزل کے مقطع میں سب سے پیشتر انہی کے ہاں پایا جاتا ہو واردات حقیقت کو مجاز کی زبان میں ادا کرنا انہی سے شروع ہوتا ہو۔ اگرچہ مذاق میں زہدیت غالب ہو تاہم تغزل کو خرابات کا راستہ سانے والے حکیم سائی ہیں۔ عرفان اور رندی کی آمیزش کے قدیم ترین نمونے ان کے کلام میں ملتے ہیں عطارؒ اور مولانا رومؒ ان ہی کی بنیادوں پر قصر و ایوان تعمیر کرتے ہیں۔ قصہ مختصر سائی کے ہاں شاعری بلحاظِ غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہو۔ زہدِ خشک کا خاتمہ ہوتا ہو۔ رندی اور مستی کی داغ بیل ڈالی جاتی ہو، صومعہ چھوڑا جاتا ہو۔ میخانہ آباد کیا جاتا ہو۔ زہد سے اعتزال ہوتا ہو اور خرابات نشینی اختیار کی جاتی ہو۔ امثال ۔

در دل آں را کہ روشنائی نیست ۔۔۔ در خرابات آشنائی نیست
پسر آسیہ و جام بادہ بیار ۔۔۔ کہ مرا برگ پارسائی نیست
جرعۂ می بجاں و دل بخرم ۔۔۔ پیش کس مو مدیں روائی نیست

دیگر

اے ساقی می بیار پیوست ۔۔۔ کاں یار عزیز توبہ بشکست
برخاست برجائے زہد و دعوی ۔۔۔ در میکدہ بانگار بنشست
بنہاد بسر ریا و طامات ۔۔۔ از صومعہ ناگہاں بروں جست

اس کے ذاتی حالات، اس کے مذہبی، اخلاقی اور فلسفی خیالات پر گزشتہ پچاس سال کے عرصے میں یورپ کی مختلف زبانوں میں لکھا جا چکا ہے اس کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتا ہے۔

لیکن اب تک جو کچھ ہوا سب اہل مغرب کی تحقیق اور کاوش کا نتیجہ ہے مسلمان بلکہ خود اہل ایران جن کے لیے خیام کے کمالات مایۂ ناز ہو سکتے تھے شروع ہی سے اس کی شخصیت کی طرف سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔ فارسی یا عربی تذکرہ نویسوں نے مستقل طور سے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا، مورخوں نے اس کو بالکل پس پشت ڈالا، اس کی رباعیات کا کوئی ایسا نسخہ جس پر ذرا سا بھی اعتبار کیا جا سکے محفوظ نہیں رکھا گیا۔ اور سخت افسوس کا مقام ہے کہ اب بھی جب کہ یورپ خیام کو ہم سے روشناس کرا چکا ہے اور اس کی خوبیوں کو تمام و کمال ہمارے ذہن نشین کرا چکا ہے، ہماری بے توجہی بدستور چلی جا رہی ہے۔ ہر چند یہ ہمارے لیے شرم کی بات ہے کہ ہماری اپنی زبان اور اپنے ملک کی ادبیات کی تنقید میں اجنبی لوگ ہمارے مذاق کی رہنمائی کریں لیکن اس سے بھی بڑھ کر شرمناک امر یہ ہے کہ ہم اُن کی رہنمائی کے ممنون نہ ہوں اور اس سے فائدہ نہ اُٹھائیں۔ اپنی ذاتی تحقیق کا قدم آگے بڑھانا اور اپنے پیش رو محققوں کی غلطیوں کی تصحیح کرنا یا اُن کے ذخیرۂ انکشافات میں اضافہ کرنا ہر صاحب تصنیف کا فرض ہے لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اس درجہ قابل الزام نہیں جتنا کہ یہ امر قابل اعتراض ہے کہ اُن معلومات کو جو پہلے سے مہیا کی جا چکی ہوں نظر انداز کیا جائے۔

یہی وہ اعتراض ہے جس کے مورد مولانا شبلی اپنی مشہور کتاب شعر العجم میں خیام کے حالات لکھنے میں ہوئے ہیں۔ مولانا شبلی اُردو ادیبوں میں واحد

عمر خیّام

ذیل کا مضمون میری درخواست پر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال پروفیسر اورینٹل کالج لاہور نے لکھا تھا جیاں چہ اکتوبر ۱۹۲۳ء کے رسالہ 'اردو' میں اُنھی کے نام سے چھپا تھا۔ مضمون میں بقول ان کے اُس وقت بھی خامیاں تھیں اور اب جب کہ بیس سال کا زمانہ گزر چکا اور اس عرصے میں خیام پر سیکڑوں مقالات اور بیسیوں کتابیں لکھی گئیں نئے نظریے قائم ہوئے اور نئی حقیقتیں منکشف ہوئیں ضرورت تھی کہ مضمون پر نظرِ ثانی کی جاتی۔ علاوہ اس کے چوں کہ وہ اس کے لہجے اور انداز بیان پر بھی مطمئن نہ تھے میں نے اُن سے دوبارہ درخواست کی کہ مضمون کو از سرِ نو لکھ دیں۔ لیکن مشکل یہ آپڑی کہ اِدھر تو کتابت ہو چکی تھی اور اُدھر اُنھیں فرصت نہ تھی اس لیے افسوس ہے کہ ان ناگزیر حالات میں مضمون کو اُسی ناقص شکل میں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔

اس دوران میں خیّام پر جو نہایت اہم کتابیں تالیف ہوئیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔ (۱) "رباعیاتِ خیّام کا تنقیدی مطالعہ" از پروفیسر کرسٹن سین (کوپن ہاگن ۱۹۲۷ء)، (۲) "خیّام" از سید سلیمان ندوی (اعظم گڑھ ۱۹۳۳ء) (۳) "عمر خیام" از ڈاکٹر ریمپس (جرمنی ۱۹۳۳ء)، (۴) "عمر خیام اور اس کی رباعیاں" از ڈاکٹر ریمپس (۱۹۳۵ء)، (۵) "رباعیات حکیم عمر خیّام" معہ مقدمہ از ڈاکٹر روزن (طہران ۱۳۱۲ھ شمسی)، (۶) انسائکلوپیڈیا آف اسلام میں عمر خیام پر مضمون از پروفیسر مینورسکی، (۷) "دی نکٹار آف گریس" از سوامی گووند تیرتھا (الہ آباد ۱۹۴۱ء)۔

محمود شیرانی

اسلامی دُنیا کے تمام گزشتہ شاعروں اور ادیبوں میں خیّام کی ہستی بالکل یکتا ہے ایران کے اس شاعر فیلسوف کو جو شہرت آج حاصل ہے اور جتنا لٹریچر اس کی شخصیت،

اس کے متعلق یورپ کے تمام مشہور فضلا نے جو فارسی زبان کے ماہر ہیں، تنقید کے طور پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن سب سے زیادہ قابلِ وقعت وہ تنقید ہے جو چہار مقالہ نظامی عروضی کے شارح مرزا محمد قزوینی نے کتاب مذکور کے حاشیوں میں لکھی ہے۔ چونکہ مرزا صاحب علاوہ عالم و ماہر ہونے کے اہلِ زبان اور خیام کے ہم وطن ہونے کا فخر بھی رکھتے ہیں اس لیے ان کی رائے اس معاملے میں ہر طرح قابلِ اعتماد ہے۔ ہم ان کی عبارت کا ملخص یہاں درج کرتے ہیں :-

"رشید الدین فضل اللہ صاحب جامع التواریخ نے جو کہ ۷۱۸ھ میں مقتول ہوا اپنی کتاب میں عمر خیام، حسن بن صباح اور نظام الملک کی رفاقت اور ہم مکتبی کے زمانے میں عہد وفا باندھنے کی حکایت بیان کی ہے یہ حکایت رشید الدین کے اپنے بیان کے مطابق اس نے کتاب "سرگزشت سیدنا" سے اخذ کی ہے جو کہ حسن بن صباح کے حالات میں لکھی گئی تھی اور جو اسماعیلی فرقے کے مشہور قلعے الموت کے کتاب خانے میں تھی۔ ہلاکو خاں تاتاری نے جب اس قلعے کو سر کیا تو علاء الدین عطا ملک جوینی صاحب تاریخ جہاں کشا کو مامور کیا کہ وہ قلعے کے اندر جا کر کتاب خانے کا ملاحظہ کرے اور جس کتاب کو وہ اپنی دانست میں محفوظ رکھنے کے قابل سمجھے، رکھے باقی کو جلا دے۔ من جملہ ان کتابوں کے جو علاء الدین نے محفوظ کر لیں یہ کتاب بھی تھی۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ خود علاء الدین نے جس نے کہ اپنی تاریخ جہانکشا کا ایک مستقل حصہ اسماعیلیوں اور قلعہ الموت کی تاریخ میں لکھا ہے، اس کتاب کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

تینوں ہم سبقوں کے عہد کرنے کی یہ داستان یورپ کے اکثر علما کے نزدیک جعلی ہے۔ نظام الملک کی تاریخ ولادت باتفاق مورخین ۴۰۸ھ ہے اور تاریخ وفات ۴۸۵ھ۔ عمر خیام اور حسن بن صباح کی پیدائش تو معلوم نہیں۔ لیکن اس

شخص ہیں جنھوں نے اسلام کی تاریخ اور خصوصاً عجم کی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ اُن کے فضل و کمال سے ہم کو توقع تھی کہ خیام جیسے بے نظیر صاحب کمال کے بارے میں جس کی شخصیت کے متعلق علمی دُنیا اس قدر گہری دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے، ہماری معلومات میں اضافہ کریں گے اور اپنی فاضلانہ تنقید سے ان شکوک کو رفع کریں گے اور اُن غلط روایتوں کی تردید کریں گے جو خیام پرستوں کے اعتقادات میں شامل ہیں۔ لیکن شعر العجم کو دیکھنے سے ہمیں مایوسی ہوتی ہے کہ جو تفاصیل خیام کے حالات میں ہم کو اس میں ملتی ہیں وہ اس کی رباعیات کے ہر معمولی دیباچہ نویس نے لکھی ہیں بلکہ کچھ زیادہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا

خیام کے حالات میں سب سے پہلے مولانا شبلی نے وہ مشہور قصہ لکھا ہے جس میں بیان کیا جاتا ہے کہ حسن بن صباح، نظام الملک وزیر اور خیام تینوں ایک ہی مکتب میں ہم سبق تھے اور انھوں نے زمانہ طالب علمی میں عہد کیا تھا کہ ہم میں سے جو ترقی پاکر کسی بڑے منصب پر پہنچے وہ اپنے ساتھیوں کی دستگیری کرے۔ مولانا نے محض ایک مقبولِ عام روایت کو مختصر طور سے لکھ دینے پر قناعت کی۔ حالانکہ یہ قصہ معاً اس قدر عجیب اور اس درجہ موردِ شکوک ہے کہ ایک علمی تصنیف میں اس پر بہت لمبی چوڑی تنقید ہونی چاہیے۔

یہ قصہ تاریخ اور تذکرے کی متعدد کتابوں میں منقول ہے مثلاً تاریخ گزیدہ، روضۃ الصفا، حبیب السیر، اور تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی وغیرہ میں لیکن قدامت کے اعتبار سے سب سے پہلے اس کو صاحب جامع التواریخ نے (جو آٹھویں صدی ہجری کے شروع میں تصنیف ہوئی) لکھا ہے۔ اگرچہ جامع التواریخ ایک مستند کتاب ہے اور اس کے مصنف کی ثقاہت مسلمہ ہے تاہم یہ قصہ ایسا سیدھا سادہ نہیں ہے کہ ہم اس کو محض ایک مصنف کی ثقاہت کی وجہ سے قبول کریں۔

خیال کرنا چاہیے کہ ایک سو برس کے بڈھے بچوں کے لیے اعمال نجوم کے ذریعے سے پیشین گوئیاں کرتا اور پھر جاڑے اور برف باری کے عالم میں بادشاہ کی ہمراہی میں شکار کو نکلنا کہاں تک قرین قیاس ہے؟

اگر یہ مانا جائے کہ نظام الملک اپنے دوسرے ہم مکتبوں سے عمر میں بڑا تھا تو ہم کو اس کی عمر کی بڑائی کم از کم بقدر تیس برس کے ماننی ہوگی اگر خیام اور حسن صباح نے اسی اسی پچاسی پچاسی برس کی بھی عمر پائی تو ظاہر ہے کہ ان کی ولادت ۴۳۵ھ کے قریب قریب ہونی چاہیے۔ اس صورت میں نظام الملک ان دونوں سے ورساً سائیس برس بڑا ٹھہرا تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک چالیس برس کا سن رسیدہ آدمی بارہ بارہ تیرہ برس کے بچوں کا ہم سبق ہو حت کہ دوسری طرف ہم کو معلوم ہے کہ نظام الملک نے نوجوانی ہی میں ابوعلی شاذان گورنر بلخ کے ہاں محتسب کاتب کی ملازمت اختیار کر لی تھی[۱]

اگرچہ یورپ میں کتاب چہار مقالہ شعر العجم کے بعد شائع ہوئی لیکن اوس کی ہمتار میں جو مطالب بیان کیے گئے ہیں ان میں سے اکثر پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب "تاریخ ادبیات ایران" کی دوسری جلد (صفحہ ۹-۱۹۲) میں درج کیے ہیں اور پھر قریب قریب ان ہی مطالب کو ون ہیلڈ صاحب نے دیباچۂ رباعیات عمر خیام (طبع لندن ۱۹۱۵ء) میں تحریر کیا ہے رباعیات کے اس اڈیشن کا ذکر خود مولانا نے کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب مذکور سے بخوبی واقف تھے مولانا اگر انگریزی سے نابلد تھے تو کم از کم فرانسیسی اچھی طرح جانتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں میں متعدد دفعہ اس کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر ہوتسما نے عماد الدین الکاتب الاصفہانی کی مشہور تاریخ زبدۃ النصرۃ

---

[۱] دیکھو تاریخ ابن خلکان ترجمہ نظام الملک

کی وفات کی تاریخ ۱۰۵۰ھ اور ۱۵۸۵ھ ہو۔ پس اگر خیام اور حسن نظام الملک کے ہم سن یا متقارب السن تھے جیسا کہ اس حکایت کا مقتضا ہو تو پھر ظاہر ہو کہ ان دونوں کی مدت عمر سو سو سال سے بھی زیادہ ہوئی اور گو یہ عادتاً محال نہیں تاہم مستبعد ضرور ہو۔ پھر اگر ان دونوں میں سے ایک کی عمر اس قدر بڑھی ہوئی ہوتی تو چنداں بعید الوقوع بات نہ تھی تعجب اس بات پر ہو کہ دونوں کے دونوں نے معاً اس قدر فوق العادت عمریں پائیں اور پھر ایک ساتھ مرے۔ علاوہ اس کے کہیں کسی کتاب میں بھی تصریحاً یا اشارۃً ان دو نامور اشخاص میں سے کسی ایک کا غیر معمولی عمر تک پہنچنا ثابت نہیں ہوتا[۵۱]"

نظامی عروضی مصنف چہار مقالہ جو خود خیام کا معاصر تھا اور جس کو متعدد دفعہ اس سے ملاقات کرنے کا موقع ملا ہو۔ خیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہو کہ ۵۰۸ھ میں بادشاہ وقت نے پیغام بھجوایا کہ ہم شکار کو جانا چاہتے ہیں تم اپنی نجوم دانی کے ذریعے سے کوئی ایسی تاریخ مقرر کرو جو برف باری سے محفوظ ہو چنانچہ اس نے حساب لگا کر ایک تاریخ تجویز کر دی۔ سردی کا موسم تھا ابھی تھوڑی دُور نکلے ہوں گے کہ بڑے زور کا بادل اُٹھا اور سرد ہوا چلنے لگی خیام ساتھ تھا بادشاہ نے اس کو سخت زجر و توبیخ کی۔ اُس نے کہا آپ ذرا صبر کریں ابھی مطلع صاف ہوا جاتا ہو اور پانچ دن تک بادل دکھائی بھی نہ دے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اس حکایت کو خود مولانا شبلی نے شعر العجم میں نقل کیا ہو[۵۲]۔ اگر ہم خیام کو نظام الملک کا ہم سن مانیں تو ۵۰۸ھ میں اس کی عمر سو برس کی ہونی چاہیے۔ اب

---

[۵۱] چہار مقالہ طبع یورپ صفحات ۲۱۶ و ۲۱۷۔

[۵۲] دیکھو کتاب مذکور جلد ۱ صفحہ ۲۳

انھوں نے اخذ کر لیے ہیں لیکن ان کتابوں کے علاوہ اور بھی بہت سی تاریخی اور ادبی کتابیں ہیں جن میں ضمناً خیام کا ذکر آگیا ہے جس کو اخذ کر کے ناظرین کے سامنے پیش کرنا تذکرہ نویس کا فرض ہے۔ ہر فارسی داں اس بات کو جانتا ہے کہ ایران کے جتنے نامور شاعر گزرے ہیں مثلاً فردوسی، انوری، حافظ، عطار، خیام وغیرہ۔ ان سب کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں اور جتنی کسی کی شہرت زیادہ ہے اتنا ہی اُس کے متعلق معلومات کا ذخیرہ کم ہے حتیٰ کہ حافظ اور فردوسی جیسے مایۂ ناز شعرا کی تاریخ ولادت و وفات تک محفوظ نہیں رکھی گئی۔ ایسی حالت میں جب کہ ان اہل کمال کے حالات زندگی اس درجہ کمیاب ہوں تو اُن کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں بھی جو اتفاقیہ طور سے تاریخی کتابوں سے ہاتھ لگ جائیں ترک کر دینا یا ان کی طرف سے بے پروائی برتنا بہت بڑے ادبی نقصان کا موجب ہو سکتا ہے۔ مولانا شبلی نے خیام کے ذخیرۂ حالات میں سے جو ان کو بغیر کسی تلاش اور کاوش کے مہیّا مل سکتا تھا نصف کے قریب بالکل چھوڑ دیا ہے جس سے اس کے سوانح عمری میں بہت بڑی کمی رہ گئی ہے خیام کے متعلق پروفیسر ژوکوفسکی کا وہ فاضلانہ مضمون جو انھوں نے ۱۸۹۷ء میں روسی زبان میں لکھا تھا اور جس کا ترجمہ انگریزی میں ڈاکٹر راس نے ۱۸۹۸ء میں رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں شائع کیا تھا اس کا علم مولانا کو ضرور تھا کیونکہ انھوں نے خود خیام کے تذکرے کے اخیر میں اس مضمون کا اور اس کے انگریزی ترجمے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن شاید وہ اتنی زحمت گوارا نہیں کر سکے کہ اس کو منگوا کر ایک نظر دیکھ لیتے ورنہ اتنی بڑی فروگذاشت ان سے سرزد نہ ہوتی اس مضمون میں پروفیسر ژوکوفسکی نے ان تمام کتابوں کو جن میں خیام کے حالات تھوڑے یا بہت مل سکتے تھے باعتبار قدامت یکے بعد دیگرے ترتیب دے کر

(طبع لندن ۱۸۸۹ء) کے فرانسیسی دیباچے میں قریب قریب یہی باتیں ہوئی ہیں[51]۔ اور ساتھ ہی ایک دلچسپ حقیقت کو منکشف کیا ہے جو قابل تسلیم ہے۔ وہ یہ کہ در اصل خیام اور حسن بن صباح کا ہم مکتب نظام الملک نہ تھا ملکہ انوشیرواں کی حالد تھا جو کہ منصب وزارت میں نظام الملک کے جانشینوں میں سے تھا۔ چنانچہ خود انوشیرواں نے واضح طور سے اس کو لکھا ہے[52]

عموماً تاریخی روایتوں میں اور خصوصاً ایران کی تاریخی روایتوں میں ایسا اکثر ہوا کہ غیر مشہور لوگوں کے کارناموں کو مشہور لوگوں کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اغلب یہ ہے کہ یہاں بھی انوشیرواں بن حالد کے حالات زندگی نظام الملک کی طرف منتقل کیے گئے ہیں۔

اگر تحقیق کا قدم اور آگے بڑھایا جائے تو اسی حکایت کی تنقید کے لیے اس قدر مواد جمع کیا جا سکتا ہے کہ ایک مستقل تصنیف کی صورت بن سکتی ہے لیکن تعجب ہے کہ مولانا شبلی جیسے فاضل ادیب نے ایسے اہم مسئلے کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں لکھا۔

آگے چل کر مولانا شبلی نے خیام کے حالات جن کتابوں سے اخذ کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی (۲) نزہتہ الارواح شہرزوری جس کو وہ تاریخ الحکما شہرزوری کے نام سے یاد کرتے ہیں (۳) تاریخ الکامل ابن الاثیر (۴) تاریخ الحکما قفطی (۵) چہار مقالہ نظامی عروضی

ان پانچ کتابوں میں سے جو حالات اخذ کیے جا سکتے تھے وہ بے شک

---

[51] دیباچہ مذکور صفحہ ید و یہ۔

[52] نصرۃ النصرۃ صفحہ ۶۶

تعداد کو نکال لیا اور ان کو مناسب طور سے ترتیب دینا ممکن نہیں۔ ان مختلف نسخوں میں رباعیات کی تعداد پندرہ سے آٹھ سو تک ہے اور بعض مطبوعہ نسخوں میں ہزار سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔

خیام کی اپنی رباعیات کو متعین کرنا تو اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ کوئی قدیم اور صحیح نسخہ دستیاب نہ ہو جو اعتماد کے قابل ہو۔ زبان کا معیار اس بارے میں کارآمد نہیں کیونکہ اول تو خیام کے اپنے صحیح انداز کا نمونہ ہمارے پیش نظر نہیں اور اگر ہو بھی تو بہت سے دوسرے اساتذہ مثلاً مولانا روم، عطار، حافظ، سنائی، انوری، بوعلی سینا وغیرہ کی جو رباعیاں خیام کی رباعیوں کے ساتھ مخلوط ہو گئی ہیں، ان سب کا انداز قریب قریب یکساں ہے اور سب کے مضامین متحد اور مشابہ ہیں۔ لہذا ان میں تمیز کرنا اور صرف انداز بیان سے مصنف کا پتا لگانا محال ہے۔ پروفیسر ژوکوسکی نے اپنے مضمون میں جس کا اوپر ذکر ہوا نہایت محنت اور تلاش سے خیام کی بیاسی رباعیوں کا کھوج لگا کر بتایا ہے کہ یہ رباعیاں دوسرے شعراء کے دیوانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ پھر ان شاعروں کی فہرست دی ہے جس کی تعداد چالیس سے زائد ہے اور اسی فہرست کو پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ کی دوسری جلد (صفحہ ۲۵۶ و ۲۵۷) میں نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر نکلسن ماہر فارسی، رباعیات خیام (طبع لندن ۱۹۰۹ء) کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ پروفیسر ژوکوسکی کے مضمون لکھنے کے بعد سے اب تک (یعنی ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۹ء تک) اس قسم کی رباعیوں کی تعداد بیاسی سے تجاوز کر کے ایک سو ایک تک پہنچ چکی ہے۔ اور اگر تلاش جاری رکھی جائے تو اور بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ حالات موجودہ میں خیام کی رباعیات کا متعین کرنا دشوار ہے۔ مولانا شبلی نے اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کیا ہے اور ان امور سے بالکل کوئی

ذکر کیا ہے اور جو حالات ہر ایک کتاب میں سے میسر آئے ہیں ان کو بھی جمع کیا ہے اس مضمون کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ علاوہ ان پانچ ماخذوں کے جن کا استعمال مولانا نے کیا ہے اور جن کا اوپر ذکر کر دیا گیا ہے پانچ کتابیں اور ہیں جن میں خیام کے حالات ملتے ہیں اور جو باعتبار ثقاہت کے کچھ کم قابل وقعت نہیں ہیں ان میں سے ایک تو "مرصاد العباد" تالیف شیخ نجم الدین ابوبکر رازی معروف بہ "دایہ" ہے جو سنہ ۶۲۰ھ میں لکھی گئی۔ دوسری "آثار البلاد" قزوینی ہے جو سنہ ۶۷۴ھ کی تصنیف ہے تیسری "جامع التواریخ" ہے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے چوتھی "فردوس التواریخ" مصنفہ مولانا خسرو ابرقوہی جو سنہ ۸۰۸ھ میں لکھی گئی اور پانچویں تاریخ الفی جو اکبر کے عہد کی مشہور تصنیف ہے

ان پانچ کتابوں میں سے خیام کے متعلق جو حالات اخذ کیے گئے ہیں ان کو ہم طوالت کے خوف سے یہاں دہرانا نہیں چاہتے جس کو اشتیاق ہو وہ پروفیسر ژوکوسکی کے مضمون کا انگریزی ترجمہ با کتاب چہار مقالہ (طبع یورپ) کے حواشی میں دیکھ لے۔

آگے چل کر مولانا شبلی نے خیام کی رباعیات پر بلحاظ مضامین کے مفصل ریویو کیا ہے اور اس کی شاعری کے محاسن دکھلائے ہیں لیکن تنقیدی حیثیت سے یہاں بھی مولانا ایک بہت بڑی فروگذاشت کے مرتکب ہوئے ہیں خیام کی رباعیات کے مطالعہ کرنے والے کو سب سے بڑی دقت جو پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ رباعیات کا کوئی صحیح نسخہ جو قابل اعتماد ہو سکے ہمارے زمانے تک محفوظ نہیں رہا۔ قلمی نسخے جو یورپ اور ایشیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود ہیں ان میں رباعیات کی تعداد اور ترتیب اس قدر متفاوت ہے کہ ان سب نسخوں کا مقابلہ اور موازنہ کر کے مشترک رباعیوں کی ایک قابل اعتبار

ہ عالیم رضاے تو کجاست
، پدید گشتم از قدرت تو
پرح ز گردش تو حرسندیم
لہ فردوس زین حوا ہد لود
معکر ند در مذہب و دیں
ہے شہوت و ہوا ہی رفت
ہو نحو است آنچہ من حو استہ ام
ے کہ از رُوح حدا حواہی رفت
ہر ہر آنکہ ہیم نا ے دارد
، دوسہ ماداں کہ چناں می دانند

ت کے ذکر میں مولانا شبلی فرماتے ہیں :-

ت بہت کم ہیں رنیچ جو تیار کی تھی اس کا ہمارے اسلامی
، تو پتا نہیں لیکن یورپ نے چھاپ کر شائع کی ہے"

(شعرالعجم صفحہ ۲۳)

ی رنیچ آج تک یورپ میں شائع نہیں ہوئی رباعیات کے
رپ نے شائع کی ہے وہ دراصل اس کا الجبرا ہے جس کا فرنسیسی
ترجمے کے مقام پیرس ۱۸۵۸ء میں چھاپا گیا ہے یہ الجبرا اور اس
ہیں خیام کی اور ہیں جن کا مولانا نے ذکر نہیں کیا اور لطف یہ ہے
ے دو اس وقت قلمی نسخوں کی صورت میں موجود پائی جاتی ہیں
لہ فی شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس" جس کا ایک نسخہ
عالے میں ہے۔ دوسرے "رسالہ فی الاحتیال لمعرفہ مقداری الذہب

بحث نہیں کی کہ مثلاً وہ کون سی رباعیاں ہیں جو کمل طور سے خیام کی اپنی کہی ہوئی ہیں۔ اس کی رباعیوں کی شناخت ہوسکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہوسکتی ہے تو کیونکر کون سا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخہ زیادہ قابل اعتبار ہے۔ مذاق سلیم کو اس میں کہاں تک دخل ہوسکتا ہے۔ خیام کی رباعیات کا دوسروں کی رباعیات کے ساتھ مخلوط ہونے کا باعث کیا ہے اور کیا وجہ ہے کہ اس کا کلام محفوظ نہیں رہا وغیرہ وغیرہ۔

اس بحث کو حسب ضرورت طول دیا جا سکتا ہے اور رباعیات کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے حد سے زیادہ دلچسپ ہوسکتا ہے بلکہ ہمارا خیال ہے کہ اُن کے لیے بے حد ضروری ہے کیونکہ جب تک محنت اور تحقیق کے ساتھ خیام کی اپنی رباعیاں متعین نہ ہوسکیں گی اس کی شخصیت شکوک اور قیاسات کے غبار میں ملفوف رہے گی۔

مولانا شبلی نے اتنا بھی بیان نہیں کیا کہ رباعیات خیام کا کونسا نسخہ اُن کے پیش نظر ہے جس میں سے وہ تنقید کے لیے رباعیات کا انتخاب کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ساری دُنیا میں فقط ایک ہی نسخہ جس کا متن متحد ہے دستیاب ہوسکتا ہے جس کی صحت میں کسی کو کلام نہیں لہذا پتا نشان بتانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جو رباعیاں مولانا نے تنقید کے لیے انتخاب کی ہیں ان میں سے دس ایسی ہیں جو پروفیسر ژوکوفسکی کی ان بیاسی رباعیوں میں سے ہیں جن کو انھوں نے اوروں کی طرف منسوب پایا ہے ان میں سے ہر ایک کا پہلا مصرع ناظرین کی دلچسپی کے لیے لکھ دیا جاتا ہے[1]۔

---

[1] افسوس ہے کہ ژوکوفسکی کا اصل مضمون جو انھوں نے روسی زبان میں لکھا تھا دستیاب نہیں ہوسکتا ورنہ ہم یہ بھی بتا سکتے کہ ان میں سے ہر ایک رباعی کس کی طرف منسوب ہے مضمون کے انگریزی ترجمے میں صرف رباعیاں بتائی گئی ہیں شعرا کا نام نہیں دیا۔

اوحدالدین انوری

م، اوحدالدین لقب، انوری تخلص ابیورد کے علاقے میں
ـ گاؤں ہے جو مہنہ کے مقابل واقع ہے، انوری یہیں پیدا ہوا،
ہتاہ کا میاں ہے۔ لیکن عرفی کہتا ہے ع

"انوری گر بود از مہنہ ہم از ابیورد"

(شعر العجم صفحہ ۲۶۴)

ے کلیات کا جامع جس نے انوری کی وفات کے بہت جلد بعد اس
اور اس پر ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا ہے اس کا نام علی بتاتا ہے۔
کے الفاظ ہیں —

م امام ہمام اوحدالدین عماد الاسلام نادرۃ الفلک اعجوبۃ الزمان
فخر الدہر ملک الکلام والشعراء علی الانوری نور اللہ مرقدہٗ
وعرف بفضلہ راہ"

ں کے باپ کا نام تھا اس پر محمد عوفی اور رشادی آبادی[۱] متفق ہیں،
تھا۔ انوری کے کلیات سے ثابت ہے شعر ،

سلاف تو متوجہ ہیں   جدّم اسحٰق و جدِ شما اسمٰعیل[۲]

انوری از محمد بن داؤد بن محمد علوی رشادی آبادی مصنف رشادی آباد عرف
لاہے اور سلطان ناصرالدین ماوی ۹ ۹۱۶ کی ... لے ہے

[۲] کلیات انوری، طبع نول کشور صلا۲۲ یہ کلیات نول کشور کے اس
۶ میں چھپ چکا ہے پہلی اشاعت میں ۶۷۶ اور دوسری میں ۶۹۶ صفحات
ہیں ... کے دوران میں پہلی اشاعت سے کام لیا ہے۔ خیال احتیاط آمیز
... اکثر ... گار

والعقۃ فی جسم مرکب منہما" جس کا نسخہ مقام گوتھا (جرمنی) کی لائبریری میں موجود ہے اور تیسرے "لوازم الامکنہ در حصول و علت اختلاف ہوای بلاد و اقلیم" [1]

ایک دوسری جگہ مولانا نے لکھا ہے۔

> 'خیام مسائل فلسفیہ کے بیان کرنے میں نہایت بخل کرتا تھا اس لیے پہلے تو یہ کہہ کر ٹالا کہ میں اس مسئلہ کو اپنی کتاب عرائس النفائس میں تفصیل لکھ چکا ہوں" الخ (صفحہ ۲۲۹ ۲۳)

کتاب عرائس النفائس جس کو مولانا نے خیام کی تصنیف بتایا ہے اس کے لیے انھوں نے کوئی سند نہیں دی شہرزوری کی اصل عبارت میں جس کا وہ ترجمہ کر رہے ہیں اور جو علیحدہ حواشی چہار مقالہ (صفحہ ۲۱۲) میں نقل کی گئی ہے عرائس النفائس کا کہیں ذکر نہیں، ظاہراً اتنی بات انھوں نے اپنی طرف سے بڑھا دی ہے۔

جو مطالب اس مضمون میں بیان کیے گئے ان کے متعلق یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ان میں کوئی نئی بات بیان نہیں کی گئی۔ فارسی زبان کے جاننے والے جو بواسطہ انگریزی تاریخ ایران کا مطالعہ کرتے ہیں ان باتوں سے بالعموم واقف ہیں۔ البتہ اردو میں شاید ابھی تک ان مطالب کی ترجمانی نہیں ہوئی اور یہی خیال اس مضمون کے لکھے جانے کا باعث ہوا جب کہ شعر العجم کی بلند پایہ کتاب میں ان باتوں کو ترک کر دیا گیا ہے تو یہ فرض کر لینا کہ چھوٹے درجے کی تصانیف میں یہ مباحث لکھے جا چکے ہیں بعید از قیاس ہے۔

---

[1] دیکھو حواشی چہار مقالہ صفحہ ۲۲ و ۲۲۱

دربار میں جاکر قصیدہ پڑھا، شعر نہایت سخن شناس تھا بہت
ل ہوا اور کہا نوکری چاہتے ہو یا صلہ؟ انوری نے آداب بجالاکر
لی

جز آستان توام درجہاں پناہے نیست
سر مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

لے منصب اور وظیفہ مقرر کر دیا، سنجر بادگاں سے روانہ ہوا تو
ی بھی ساتھ تھا، راہ میں چند قصیدے لکھ کر مشق کیے جن میں
ایک یہ ہے۔

بار ایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را
ویں حال کہ نو گشت زمین را و زماں را

شعر العجم صفحہ ۲۶۳

آستان توام الخ خواجہ حافظ کی غزل کا مطلع ہے جو ان کے دیوان
ور انوری سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔
ں سے روانگی کے وقت جو قصیدہ سنایا جاتا ہے اور جس کا مطلع اوپر
سک انوری کا ہے لیکن سلطان سنجر کی تعریف میں نہیں بلکہ
در شاہ اور اس کے وزیر جلال الوزرا کی مدح میں ہے۔ کلیات
ں یہ سب سے پہلا قصیدہ ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں ممدوح کا
ہے

ہر عادل منصور و مظفر کز عدل دگر بارہ بنا کرد جہاں را
(کلیات صفحہ ۱)

بھی ہے

وطن کے متعلق اگرچہ مورخین میں اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ خاوران ہے
اوری خود ایک سے زیادہ مقام پر اپنے آپ کو خاوراں کی طرف منسوب کرتا ہے
قطعۂ ذیل اور اشعار ملاحظہ ہوں:۔

برسپہر صحبت پیدا شد ز خاک خاوراں — تا شا نگاہ اند چار آفتاب خاوری
خواجہ چوں بو علی سینا آں صاحقراں — مفتی چوں اسعد شتوحال ہرنشر کے ری
صوفی صافی چو سلطاں طریقت بو سعید — شاعرے ساحر چو مشہور خراساں اوری[51]

شعر

اے زخاک خاوراں چوں ذرہ مجہول آمدہ — گشتہ اندر اندروچوں آفتاب خاوری[52]
چنداں کہ از زمانہ برآید نگیر زر — در خاوراں بیم کہ میسر نمی شود[53]
کاندر اطراف خاوراں امروز — ہیچ کس را ہمی نیاید یاد[54]

خاوراں ایک ناحیہ کا نام ہے جس میں مہنہ، نسا، ابیورد اور دیگر شامل ہیں
لیکن یہ بھی یاد رہے کہ خاوراں ناحیہ ہونے کے علاوہ ایک قصبے کا نام بھی ہے
اور اوری اسی قصبے کی طرف منسوب ہے[55]۔

قولہ "اوری نے اسی دھن تعلیم و تعلم کو خیر باد کہا اور رات بھر میں قصیدہ
لکھ کر تیار کیا جس کا مطلع یہ ہے:۔

گر دل و دست بحر و کاں باشد
دل و دست خدا یگاں باشد

---

[51] ایضاً کلیات ص۔
[52] ایضاً کلیات ص۔
[53] کلیات ص۔
[54] ایضاً کلیات ص۔
[55] معجم البلدان از یاقوت حموی، نزہت القلوب حمد اللہ مستوفی ص۱۵۹ طبع ملک الکتاب ۱۳۱۱ھ بمبئی۔

) کی امیدواری کے باوجود جیسا کہ گزشتہ اشعار سے واضح ہوتا
ے دربار میں منادمت برطرف، مقیم آستاں ہیے کا رتبہ بھی حاصل
رفتار سے اُس نے ترقی کی ہو تو سحر کو اس کے گھر آنے کے
کار ہو

ر انوری کے تعلقات کی بات اسی مضمون کے ضمن میں
م پر گفتگو کروں گا یہاں اسی قدر کہنا مناسب معلوم ہوتا ہو کہ
سحر کے آنے کی روایت کی اصلیت صرف اس قدر ہو کہ
وزیر انوری کے مکان پر آیا تھا اور شاعر نے اس کے خیر مقدم
ہ اور رباعی لکھے ہیں چنانچہ رباعی

رت در آمد بضمیر — کاید بدرست موکب میموں وزیر
ہیچہ گویا دست ابوس — ہاں دست چہار گوسیا دست گیر

(کلیات ص۶۹۸ طبع نولکشور)

س کہتا ہو ؎

بجیرے دیگر ایں تشریف را تشبیہ نتواں کرد
حدیث مصطفےٰ امیداں و بوایوب انصاری (کلیات ص۱۳۷)

ملاحظہ ہو ؎

لہ شاے جہاں یعنی جلالے — گوہر پاک ترا اصل نکو کاری بہاد
ماہ ترا چوں برکشید — عقل کلی پائے رحاکش بدشواری بہاد
روری دیدہ ار گیتی ناگہ — چوں قضا در دیدۂ بخت تو بیداری بہاد
دستے مرا در تن چنانک — بااللہ ار در خاک ہرگز ابر آواری بہاد
س خواہم کہ خاکش را سپہر — سر بہ چشم حدا وندی و حتاری بہاد

دستور جلال انوری را کرد در عالیش — انصاف رساند ہر انصاف رساں را

قولہ "ہمارے تذکرہ نویسوں کی بے خبری دیکھو، یہ واقعہ سب لکھتے آتے ہیں لیکن یہ کسی سے نہ ہو سکا کہ اس قصیدے کو جو انوری کی شاعری کا دیباچہ کہتے ہیں اس کو کبھی اُٹھا کر دیکھ ہی لیا ہوتا، انوری خود اس قصیدے میں کہتا ہے ؎ ص۵

خسروا سدہ را چو دہ سال است — کہ ہمی آرزوے آں باشد
کز ندیماں مجلس ار نبود — از مقیماں آستاں باشد

اس میں صاف تصریح ہے کہ یہ قصیدہ ابتدائی نہیں، بلکہ دس برس کی امیدواری کے بعد لکھا گیا ہے۔" (شعر العجم ص۲۶۵)

اگر واقعی سب سے پیشتر یہ اعتراض مولانا شبلی کو سوجھا ہے تو وہ تہ دل سے مبارک باد کے مستحق ہیں لیکن میرا عقیدہ ہے کہ علامہ موصوف اس معاملے میں پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران کے مرہون منت ہیں اگرچہ بظاہر اس سے استفادہ تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس موقعے پر پروفیسر براؤن کے الفاظ ہیں

"امر فی الواقع یہ ہے کہ قصیدۂ مذکورہ خود ایسی شہادت پیش کرتا ہے کہ شاعر بڑی مدت پیشتر سے مشق سخن میں مصروف تھا۔ اشعار

خسروا سدہ را چو دہ سال ست — کش ہمی آرزوے آں باشد"
کز ندیماں مجلس ار نبود — از مقیماں آستاں باشد"

(تاریخ ادبیات ایران ص۳۸، طبع سنہ ۱۹ء)

قولہ "رفتہ رفتہ یہ مرتبہ حاصل کیا کہ سنجر نے باآں جاہ و جلال دو دفعہ انوری کے مکان پر جا کر اس کی عزت افزائی کی۔"

(شعر العجم صفحہ ۲۶۶)

حالت معلوم ہوئی تو پھٹے پرانے کپڑے پہن کر پاگلوں کی صورت
بنا کر، معزی کے پاس گیا اور کہا کہ میں شاعر ہوں، بادشاہ کی مدح میں
قصیدہ لکھ کر لایا ہوں آپ پیش کرا دیجیے، معزی نے پوچھا کیا لکھا
ہے پڑھ کر سناؤ، انوری نے پڑھا ؎

بہے شاہ و رہے شاہ و بہے شاہ   رہے میر و رہے میر و رہے میر

معزی نے کہا یوں کہیے تو مطلع ہو جاتا ہے ؎

بہے شاہ و بہے شاہ و بہے شاہ   بہے ماہ و رہے ماہ و بہے ماہ

انوری نے بہکی بہکی باتیں کیں، معزی نے یہ سمجھ کر کہ دربار کا مسخرہ
بنائیں گے، انوری سے کہا، کل آنا، انوری دوسرے روز پہنچا تو
معزی خود ساتھ لے کر دربار میں آ گیا اور کہا کہ جو قصیدہ تم نے
مدح میں لکھا ہے سناؤ۔ انوری نے شاعرانہ ادا میں پڑھا ؎

گر دل و دست بحر و کان باشد   دل و دست خدایگاں باشد

شاہ سنجر کہ کمتریں خدمش   در جہاں پادشہ نشاں باشد

دو شعر پڑھ کر رک گیا اور معزی کی طرف خطاب کر کے کہا کہ اگر یہ قصیدہ
آپ کا ہو تو باقی اشعار سنائیے۔ معزی بے حیب ہوا، انوری نے پورا
قصیدہ سنایا سنجر نہایت محظوظ ہوا اور ندیمان خاص میں داخل کیا۔"

(شعر العجم صفحہ ۲۶۵ و ۲۶۶)

پروفیسر براؤن نے اس قصے کو حبیب السیر سے ماخذ نقل کر کے اس پر
کوئی تنقید ظاہر نہیں کیا ہے میں اس خیال میں پروفیسر موصوف کا تابع ہوں علامہ
شبلی نے اس کے بعض خط و خال قلم انداز کر دیئے ہیں میں اس روایت کے
اس غیر معمولی پہلو سے جس میں ایک شخص کا حافظہ اس قدر قوی مان لیا جائے کہ

شاد باش اے مصطفیٰ امیرت کہ حلق مشتاق — بے تکلف بر تکبر داغ بیزاری نہاد
از شرف در عرض من عرفی نہاد ستے چنانک — مصطفیٰ در نسل بو ایوب انصاری نہاد

(صفحہ ۲۶۹)

اسی سلسلے میں وہ قصیدہ لکھا گیا ہے جس کا مطلع ہے ؎

رہے از کلکت اندر چشم دولت کحل بیداری
بعونش کردہ در تہا جہاں مانان جہان داری

یہ عقیدہ کہ قصیدہ کسی وزیر کی تعریف میں ہے، رباعی بالا کے علاوہ ذیل کے ابیات سے بھی مفہوم ہوتا ہے ؎

مجیر دولت و دین و اندر دیدۂ دولت — ز رائے تست مینائی ز رحمت تست بیداری
تو آں صدری کہ عالم را کمال آمد وجود تو — مگر تا خویشتن را کمتر از عالم بہ پنداری

ناظرین اسی قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ کریں ؎

ترا لطف تو داعی بود اگر بر کس وا دارد — کہ رحمت کر با ہرگز بچنداں کلبۂ آری
مر دولت از بر دمِ ثقل دائی چیہ می آرم — بر دل مصطفیٰ بر دیک بو ایوب انصاری

(کلیات صفحہ ۳۶۹ و ۳۷)

قولہ "انوری جس طرح سنجر کے دربار میں پہنچا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ انوری مدت سے شعر و شاعری میں مشغول تھا لیکن دربار میں رسائی حاصل نہیں ہوتی تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعرا امیر معزی تھا اور وہ کسی کو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا اس کا حافظہ نہایت قوی تھا، یعنی صرف ایک بار کے سننے میں وہ قصیدے کا قصیدہ یاد کر لیتا تھا جب کوئی شاعر دربار میں آتا اور قصیدہ سناتا تو معزی بادشاہ سے کہتا کہ یہ قصیدہ میری تصنیف ہے چنانچہ قصیدے کا قصیدہ خود پڑھ کر سنا دیتا، شاعر خفیف ہو کر چلا آتا۔ انوری کو یہ

"امیر معزی کہ سرآمد شعرائے زمانہ بود و پیش سلطان سنجر مرتبہ و تقرب بسیار داشت از دیوان مولانا احمد معالی (ابوالمعالی نحاس ؟) دزدیدہ است و ہر دو دیوان را ہلاک کردہ است و دیوان خود ساختہ است۔"

علاوہ بریں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انوری کا سرپرست سلطان سنجر کا آخری وزیر ابوالفتح ناصر الدین طاہر ابن مظفر ابن نظام الملک (۵۲۸ھ و ۵۴۸ھ) تھا کلیات میں اس وزیر کی مدح میں بیسیوں قصیدے اور قطعات ہیں اس لیے قوی احتمال کیا جاسکتا ہے کہ ایسے طاقت ور وزیر کے مقابلے میں امیر معزی کی کوشش دربار میں انوری کی رسائی کے برخلاف چنداں سرسبز نہیں ہوسکتی تھی۔

قولہ "انوری کو علم نجوم میں کمال تھا، سنجر کے عہد حکومت میں اتفاق سے سبعہ سیارہ برج میزان میں جمع ہوگئے، انوری نے اس بنا پر پیشین گوئی کی کہ فلاں دن اس زور کا طوفان آئے گا کہ تمام مکانات برباد ہوجائیں گے لوگوں نے ڈر کر تہ خانے اور سرد آب تیار کرائے اور تاریخ مقررہ پر اس میں چھپ کر بیٹھے، اتفاق سے اُس دن اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ چراغ گل ہوتا، سنجر نے انوری کو بُلا کر عتاب کیا، انوری نے کہا قرانات کے احکام فوراً ظاہر نہیں ہوتے۔ فرید کاتب نے اس پر قطعہ لکھا ؎

گفت انوری کہ از جہت بادہائے سخت
ویراں شود عمارت و کوہ و کمر سری
در سال (کذا) حکم او نوزید ست ہیچ باد
یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

(شعر العجم صفحہ ۱۶۶)

ایک مرتبہ کے سننے میں کامل قصیدہ ازبر کر سکتا ہے، اس کا فرزند دو مرتبہ کی سماعت میں یاد کر لیتا ہے اور اس کا غلام تین مرتبہ کی سماعت میں حفظ سنا سکتا ہے اور حسن اتفاق سے ان نوالعجب ہستیوں کا اجتماع ایک ہی وقت میں اور ایک ہی خاندان میں ہوتا ہے، قطع نظر کر کے اس قدر کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انوری کے معتقدین نے صرف اس قصے میں بلکہ اور موقعوں پر بھی امیر معزی کو بدنام اور مطعون کرنے کی کوشش کی ہے، مثال میں انوری کا ایک شعر پیش ہے ؎

بر سر من معزی کرد کلہ واں برگذشت
بگذرد بر طیلسانم تیر دور معزی

شادی آبادی اس شعر کی تشریح میں کہتے ہیں —

"درین بیت رمز آنست کہ امیر معزی بحضرت انوری از روے حسد تہمتے دروغ کردہ بود و پیش پادشاہ تعریض کردہ کہ انوری شہر بلخ را ہجو کردہ پادشاہ بدو منقلب شد و حکیم انوری را مقنعۂ زناں پوشانید و تشہیر کرد و خواست تا حضرت انوری را بر خر سوار کند و گرد شہر بگرداند چوں حکیم مذکور ایں قصیدہ را گفت و پادشاہ را مع کبرائے بلخ تعریف کرد بار داشتند و بخر سوار نہ کردند و مہرباں شدند۔"

حالانکہ امیر معزی سنہ ۵۴۲ھ میں سنجر کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے اور ہجو بلخ کا واقعہ سنجر (متوفی سنہ ۵۵۲ھ) کی وفات کے بہت عرصہ بعد طغرل تگین کے دور میں ہوتا ہے۔

شادی آبادی نے ایک اور واقعہ انوری کے ایک اور شعر کی شرح میں لکھا ہے، شعر یہ ہے ؎

کس از اکابرِ گردن کشانِ نظم کو را صریح چوں دو دیوان بگردن ست

شادی آبادی کہتے ہیں: —

می گفت انوری کہ شود بادہا چنانک ۔۔۔ کوہ گراں ز پائے در آید چو لنگری
سالے گذشت و برگ نجنبید از درخت ۔۔۔ یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

(قصائد ظہیر صـ۱۴۲، طبع نول کشور سنہ ۱۸۸۸ء)

سیاروں کے اقتران کا ذکر ذیل کے اشعار میں آتا ہے۔

اجتماع اختراں دانی کہ در میزاں چراست ۔۔۔ خود نکو دانی کہ آں صنعت چہ نیکو کردہ اند
از برائے ذرۂ خاکِ کفِ پائے ترا ۔۔۔ نقدِ ہفت اقلیم گردوں در ترازو کردہ اند

(قصائد ظہیر صـ۱۶۵)

ظہیر نے طوفان کے ابطال میں کوئی رسالہ بھی لکھا ہے۔ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں۔

رسالتے کہ بہ انشائے خود فرستادم ۔۔۔ بمجلس تو در ابطال حکم طوفانی
اگر در آں سخنم شبہتے ست و میخواہی ۔۔۔ کہ از جریدۂ ایام نیز برخوانی
مزاج جاں کہ بود ہم نشستے باید ۔۔۔ کہ بے غذا نتواں داشت روح حیوانی

(قصائد ظہیر صـ۱۷۱)

ظہیر جن ایام میں طوفان کی نزاع میں مصروف تھا آذربائیجان میں مقیم ہے۔ قزل ارسلان ۵۸۷ھ میں قتل ہوتا ہے اور نظامی کا ممدوح ابوبکر نصرۃ الدین اس کا جانشین ہوتا ہے۔ قطعۂ ذیل میں ظہیر کا مخاطب یہی نصرۃ الدین معلوم ہوتا ہے شاعر شکایت کرتا ہے کہ جس شخص نے ایسی پیشین گوئی میں کہا تھا کہ طوفان باد سے دنیا تباہ ہو جائے گی اس کو تم نے خلعت اور انعام سے سرفراز کیا لیکن میرے ساتھ جس نے اس کی پیشین گوئی کی تردید کی ہے اور ہی طرح کا سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔

شاہا زکوٰۃ گوشِ زماں را زدی نقط ۔۔۔ بشنو ز من سوالے و تشریف دہ جواب
آنکس کہ حکم کردہ بطوفانِ باد گفت ۔۔۔ کاسیبِ آں عمارتِ گیتی کند خراب
تشریف یافت از تو و اقبال دید و جاہ ۔۔۔ در بندِ آں نہ شد کہ خطا گفت یا صواب

یہ سبعہ سیارہ کا اقتران نہیں تھا بلکہ پانچ ستاروں کا لیکن سلطان سنجر کے عہد میں نہیں کیونکہ اس کا انتقال ۵۵۲ھ میں ہوتا ہے اور ستاروں کا اجتماع بسند نزہت القلوب حمداللہ مستوفی ۵۸۱ھ میں اور بسند کامل ابن الاثیر ۲۹ رجادی الآخر ۵۸۲ھ کو ہوتا ہے۔ اس میں پچھلی تاریخ صحیح ہے۔

فی الواقع انوری نے اس طوفان کے متعلق اگر کوئی اشعار لکھے ہیں تو وہ ہم تک نہیں پہنچے۔ کلیات میں پسر میرداد کے مدحیہ قصیدے میں البتہ ایک تلمیح پائی جاتی ہے جس سے اس قدر ضرور مفہوم ہوتا ہے کہ انوری طوفان کی شدت کی اس نوعیت کا جو مولانا شبلی کے بیان سے مترشح ہے اور جس کو تمام تذکرہ نویس ایک مبالغہ آمیز طریق سے بیان کرتے آئے ہیں ہرگز ہرگز معتقد نہیں تھا۔ وہ اس طوفان کا ذکر نہایت بے پروایانہ انداز میں کرتا ہے۔ اور تلمیح شعر ذیل میں آتی ہے۔

آباد دار نیمۂ خود از جہاں مداد　　طوفانِ باد نیمۂ خود گو خراب خواہ

(کلیات ص ۴۶۳)

مقطع میں یہی شعر کسی قدر تغیر کے ساتھ یوں لایا گیا ہے۔

آباد دار ملک رہیں خسروا مداد　　طوفان باد ملک ہوا گو خراب خواہ

(ص ۴۶۳)

طوفان کا ذکر[۱] اکثر معاصر تاریخوں میں ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضیلان ایام میں بہت کچھ بحث وجدال اور مناظرات کا مورث ہوا ہے اس بحث میں جیسا کہ پروفیسر براؤن نے ذکر کیا ہے ظہیر فاریابی نے سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا ہے وہی قطعہ جو فرید کاتب کی طرف منسوب ہے قصائد ظہیر میں بھی موجود ہے۔ دیوان

[۱] طوفان سے متعلق اشارے، جیسا کہ آیندہ مذکور ہوگا نظامی گنجوی اور کمال اسمٰعیل کے ہاں

عراساں کے بعض حصے جن میں بلخ اور ترمذ شامل ہیں اس
آجاتے ہیں جن میں موخرالذکر مقام کو وہ ایسا پایۂ تخت سا لیتا
شہرادہ نہیں تھا انوری کے شعر سے واضح ہوتا ہے سے
ر شیر پیشۂ سلجوقیاں بیک جولاں
شکارِ سے کہ بصد سال کردہ بود ہ صفحہ ۲۶۵
رم شاہیوں سے بھی اس کا کوئی علاقہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ
ائی مانتا ہے۔ بلخ پر پہلی مرتبہ قابض ہونے کے بعد بعض مصلحتوں
کو چھوڑ دیتا ہے اس وقت تک ہمارے شاعر کے اس کے ساتھ
قائم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کلیات میں ایک سے زیادہ موقعوں پر
کے بلخ چھوڑنے پر اپنا افسوس ظاہر کرتا ہے شعر
تو میرِ دریں دریاں ہمی گویند
بہ عدل تو خلقِ خدا ئے آسودہ
جس وقت ترمذ کو مستقلاً اپنا صدر مقام سا لیتا ہے انوری جو اس
قیام پذیر ہے اس کے دربار میں حاضری کا اشتیاق اسے بعض
کرتا ہے۔ مثلاً ۔

تو بد وری چرا شاد گفت انوری نہ جہ آری گِ ہست
گفت آخری کس نگر کہ عالمے ہمہ آب وگیاہ ست
بلبلے ہست گفت نیست عیب ار جیا لہاے داغ سیاہ ست
اگر نہ گفتے کار زار آئے مجلس شہ بلخ جاہ نشست
(صفحہ ۵۵)

رقصیدے میں جو عمادالدین سرور شاہ کے بلخ چھوڑنے کے بعد

من بندہ چوں خطاے بہ اطالت کردہ‌ام   باش چرا ز روجہ دگرمی رود جواب

(قصائد ظہیر ص ۱۴۷)

قولہ "انوری نے اب دربار میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور ترک ملازمت کرکے نیشاپور چلا آیا۔ اب اُس کی شہرت دُور دور پھیل گئی تھی، ہر طرف سے امرا و رؤسا کے پیغام آتے تھے کہ ہمارے دربار میں قدم رنجہ کیجیے ۵۴۳ھ میں سلطان احمد پیرو رشاہ نے اس کو خط بھیج کر بلایا اور ساتھ لے کر خوارزم کی طرف روانہ ہوا، انوری پیش گرکر دریائے جیحوں راہ میں پڑتا ہے اس قدر ڈرا کہ بلخ پہنچکر سلطان احمد سے معذرت چاہی اور وہیں رہ گیا، لیکن بلخ میں اس قدر تکلیف پہنچی کہ تنگ آکر ایک قصیدہ لکھا اور سلطان احمد کی خدمت میں بھیجا مطلب کی بات اس طرح ادا کی :-

این حال کہ در بلخ کنوں دارم   از خوف پریشانی و گمراہی
زین پیش اگر وہم و گماں بردے   آں مخطے کوتہ نظر ساہی
در عرصۂ جیحوں نہ آموزمش   چوں نطفہ طبیعت شدے راہی

سلطان احمد نے اس کو دربار میں طلب کیا اور معتمد خاص بھیجا کہ انوری کو ساتھ لے کر آئے" (شعر العجم ص ۲۶۷)

یہ خیال کہ یقیناً کوئی غلط ثابت ہونے کی بنا پر انوری سنجر کے دربار سے قطع تعلق کرکے نیشاپور چلا جاتا ہے درست نہیں معلوم ہوتا سنجر اور انوری کے تعلقات میں کبھی کوئی تغیر رونما نہیں ہوا

سلطان احمد سنجر شاہ کے سوانح کے متعلق تاریخیں خاموش ہیں کلیات اس قدر روشنی ڈالتا ہے کہ ابتدا میں وہ ایک خطائی شہزادہ تھا اور سنجر کے عہد سے

طبیعت میں تنگ ظرفی اور کم حوصلگی تھی ذرا کسی سے رنج ہوا اور
اس نے ہجو کا طومار باندھ دیا اس عادت کی وجہ سے اس نے سارے
زمانے کو دشمن بنا لیا تھا۔" (شعرالعجم ص ۲۶۹)

اس پر مجھ کو ایک انگریزی ضرب المثل یاد آتی ہے کہ "پہلے کتے کو بدنام کر لو، پھر شوق سے اس کو پھانسی دو"۔ ایک شاعر کے کمالات سے انکار کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے کمتریں اوصاف کو خوب چمکایا جائے اور اصلی کمال سے اغماض کیا جائے۔ چونکہ علامہ شبلی کے گوشۂ خاطر میں ظہیر فاریابی کے مبالغہ آمیز احترام نے اپنا گھر بنا لیا ہے اس لیے غریب انوری کو مشکل سے بیرونِ آستاں جگہ دی جاتی ہے۔ دو تلواریں، تمام دنیا جانتی ہے ایک نیام میں نہیں آتیں اسی لیے مجھ کو حیرت ہے کہ انوری کو شعرالعجم کے مشاہیر میں کیوں داخل کیا گیا اور کیوں اس کے ساتھ نابرادر کا سا سلوک جائز رکھا گیا۔

انوری کے کمالات سے جس نے اپنے وطن کی تاریخ کے بعض نہایت تاریک موقعوں پر اپنی شاعری کے ذریعے سے عظیم الشان کارنامے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور جس نے اپنی طبعی شرافت اور اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا، مولانا کو اسی قدر یاد رہا کہ ہجو میں وہ نہایت لطف مضامین پیدا کرتا ہے لیکن طبیعت کا دنی اور تنگ ظرف ہے۔

متقدمین کے بیانات پر کلیات کے تتبع سے یہ امر متحقق نہیں ہوتا کہ انوری کو ہجو میں کوئی خاص شغف تھا۔ ہجو اتفاقیہ انوری کے ہاں بھی پائی جاتی ہے جیسے اور شعرا کے کلام میں لیکن یہ کہنا کہ جہاں کسی سے ناراض ہوا ہجو کہہ دی اور اس طرح ساری دنیا کو اپنا مخالف بنا لیا میرے خیال میں واقعات پر مبنی

ماہ بعد لکھا جاتا ہے انوری کہتا ہے ؎

خسروا من بندہ را در مدت این ہفت ماہ — گر میسر گشتے اندر ہفت کشور یاورے
تا مرا از لجۂ دریائے حرماں دست دار — فی المثل بر تختۂ بودے کشتاں تا معبرے
ہستی از بس کہ بر سر آستانت سودمے — چوں دگر ابنائے جنس خویش اکنوں بودمے
لیکن از بس قصد این ناقص عنایت روزگار — ماندہ ام در قعر دریائے عنا چوں لنگرے ص۲۷۴

بیرور شاہ آخر کار اپنے وزیر جلال الوزرا کو اس کی طلبی کا حکم دیتا ہے۔ وزیر انوری کے نام فرمان طلب روانہ کرتا ہے۔ جواب میں شاعر ایک قطعہ لکھتا ہے جس کے بعض اشعار حوالۂ قلم ہوتے ہیں ؎

مثال عالی دستور چوں بہ بندہ رسید — قیام کرد و بوسید و بر دو دیدہ نہاد
مرا بخدمت او خواندہ کہ خدمت او — کند سپہر کہ ہست اوز مادر راستیاد
عماد دولت دیں آں کہ حصن دولت دیں — پس از دو دور خرابی از و شدہ آباد
شہ مظفر بیرورست آں کہ فتح و ظفر — رسانیہ علم و مشعلۂ سنان یاد ص۳۰۱

علامہ شبلی شاعر کے طلب کیے جانے کی تاریخ ۵۳۳ھ بیان کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ انوری کا بیان اس کے متعلق بالکل صاف ہے شعر

اندر آمد در حجرۂ من نیم شبے — روز بہمنہ یعنی دوم بہمن ماہ
سال بُد پانصد دسی و نہ تاریخ عجم — گفت برخیز کہ از شہر بروں شد بخدا صـ۲۵۷

شاعر کا مقصد یہاں سن یزدجردی سے ہے جو اُن ایام میں عام طور پر ایران میں رائج تھا۔ سن ہجری اس وقت ۵۴۰-۴۱ھ کے مابین ہونا چاہیے۔

قولہ "اقسام سخن میں سے انوری کی طبیعت ہجو سے خاص مناسبت رکھتی تھی، ہجو میں وہ نہایت دلچسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا، جو شعر اس کی زبان سے نکلا عالم میں پھیل جاتا، اس کے ساتھ

درسوال دعواست　　مدہد داد علم ولستاند
ست این متولی　　نکند چون بفضل برخواند
حال عالم چیست　　پس تو اند کزان نگرداند
ماند ارچہ بود　　عقل این جا فرو ہمی ماند　ص۶۶۵

ہے

ں حمید الدین　　کہ خرد مدح تو ہمی خواند
ردئے سوال گفت　　کہ بداند ہمی و نتواند
ں کہ خود نکند　　گرچہ جائے بواند وداند
ہ نیاز واجب نیست　　کہ بیئے نفع کس قصار اند
او نیاید اراں　　کہ سبب درمیانہ نستاند
عرض دور ست　　فعل او گر بفعل ما ماند
منت حر تسلیم　　خویش را نیک ازیں برنجاند　ص۶۶۵

ماعرہی جو انوری کو لکھتا ہے ۔

اے انوری توئی کہ بفضل وہنر بوند
حرار روزگار د افاضل ترا رہی　ص۷۵۲

ں انوری لکھتا ہے ۔

تجاعی اے خط وشعر تو دام ودانۂ عقل
ہزار مرغ چو من صید دام ودانۂ تو

الت صرف ایک ایک شعر پر قناعت کرتا ہوں۔ پورے
یاں ملاحظہ ہو۔

نہیں۔ انوری فرشتہ نہیں تھا انسان تھا، بعض معاصرین سے اس کی عداوت ضرور رہی ہو اور یہ تلخ تجربہ ہر شاعر اور ہر انسان کو ہوا کرتا ہو لیکن اُس کے دشمنوں کے مقابلے میں اس کے دوستوں اور مداحوں کا دائرہ وسیع تھا بڑے بڑے لوگوں سے اُس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ صدور اور امرا اُس کی عزت کرتے تھے، سلاطین اور وزرا اُس کا احترام کرتے تھے اس میں سے بعض نے اس کے قطعات کے جواب میں قطعات لکھے ہیں۔ یہاں بعض کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

(۱) قاضی حمیدالدین صاحب مقامات حمیدی (المتوفی ۵۵۹ھ) اُس عہد کے نہایت مشہور شاعر فاضل اور ادیب ہیں۔ انوری سے اُن کا رشتۂ اتحاد بے تکلفی کی حد تک پہنچا ہوا تھا دونوں ایک دوسرے کے کمال کے معترف تھے اور دونوں نے مختلف موقعوں پر ایک دوسرے کے حق میں قطعات لکھے ہیں۔

انوری کے ایک قطعے کے جواب میں جس سے شبلی نے دو شعر نقل کیے ہیں قاضی صاحب لکھتے ہیں :۔

مرا انوری آں چو دریا توانگر ۔۔۔ ہمی از سخن رادہٗ کاں فرستد
چو لے برگیم گشتست اورا مقرر ۔۔۔ زحلد بریم ہمی جواں فرستد
جو ہر گنج را جائے ویرانی آمد ۔۔۔ ازاں گنج خود سوئے ویراں فرستد
بماناد آں دوست کو دوستاں را ۔۔۔ غدائے دل و راحت جاں فرستد

ایک موقعے پر قاضی صاحب انوری سے دریافت کرتے ہیں کہ خدا کا علم ہر شے پر محیط ہو اور تمام واقعات اس کے ارادے کے مطابق ظہور پزیر ہوتے ہیں لیکن خدا جب چاہے اس میں تغیر پیدا کر سکتا ہو کیونکہ وہ قادر مطلق ہو لیکن دیکھا جاتا ہو کہ اس کی مشیئت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی آخر اُس کی

وحدہ اوحد الدین فسر زانہ انوری   اے آنکہ از دو عالم وحدت منور است

(۹) سراجی شاعر ترمذی کے خط کے جواب میں انوری کہتا ہے ؎

سراجی اے زمقیمان حضرت ترمذ   رسید نامۂ تو ہمچو نامہ رحمت ص۶۱۵

(۱۰) ایک وزیر دربار سے اٹھ کر اپنے محل کی طرف جا رہا تھا راستہ میں پاؤں الجھا گر پڑا۔ انوری نے اس موقعے پر ایک قطعہ لکھ کر بھیجا جس کا ابتدائی شعر ہے ؎

صاحبا سقطۂ مبارک تو   بر آسیب حادثات رسید ص۶۳۸

وزیر قطعہ کا جواب قطعے میں دیتا ہے جس کے ابتدائی شعر پر قناعت کرتا ہوں ؎

گرچہ شست سقطۂ من ہر کہ دید   یادہ از روز قیامت شمرد ص۶۶۹

کلیات سے بعض ایسے واقعات معلوم ہوتے ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انوری نے زمانے کو اپنا دشمن بنانے کے بجائے ایسی کوشش بھی کی ہے کہ دشمنوں کو دوست بنایا جائے۔

فتوحی مروزی اس کا سخت ترین معاند مانا گیا ہے لیکن انوری اس کی طرف بھی اپنی دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لیے تیار ہے۔ چنانچہ کسی دوست کو لکھتا ہے ؎

آمدم با غمے کہ جان سرد   گر ز لطف تو غمگسار آید
گر فتوحی ز دوست داری تو   بندہ را نیز دوستدار آید
یا بر دیگ او زدم زد نے   کہ بروی یک دو بار آید ص۶۴۵

کسی اور موقعے پر شاعر اپنے کسی دشمن کی سفارش میں جس نے اس کو نقصان پہنچایا ہے کہتا ہے ؎

اے جوان بخت سرورے کہ ندید   چون تو فرزانہ ہیچ عالم پیر
بندہ را خصم اگر نہ بیش تو کرد   نقش عنوان نامۂ تزویر

(۳) تاج الافاضل فخر الدین خالد بن ربیع المالکی سے انوری کی گہری دوستی تھی وہ کہتے ہیں ؎

سلام علیک انوری کیف حالک　　مرا حال سے تو نہ نیک است بارے

(۴) ارشد الدین ایک اور شاعر ہے جس کے قطعے کے جواب میں انوری کہتا ہے ؎

ہیچ دانی ارشد الدین کز کفِ طبع تو دوش
من چہ شربت ہائے آبِ زندگانی خوردہ ام صشے

(۵) کمالی شاعر انوری کا معاصر ہے اُس کے قطعے کے جواب میں انوری لکھتا ہے ؎

شعرہائے کمالی آں سحر　　پائے طبعش سپردہ فرق کمال

(۶) ایک اور شاعر انوری کو اپنے گھر بلاتا ہے ؎

اوحدین انوری اے من مرید طبع تو　　شیفتہ ہوائے عشق و مہر تو مراد طبع من
ہم نسیم دولت وصل تو اندر ربع خویش　　گر محل دولت و اقبال گرد د ربع من

(۷) ایک اور شاعر جس کا نام معلوم نہ ہو سکا انوری کی مدح میں قصیدہ لکھتا ہے ؎

اے در ہنر مقدم اعیان روزگار　　در نظم و نثر افضل دہقان روزگار
آسان بر افاد تو دشوار احتراز　　پیداست بر ضمیر تو پنہان روزگار
حلم ترا کما نہ ہمی کرد ناگہاں　　بگسست ہر دو پلۂ میزان روزگار
اخلاقِ تو سواد ہمی کرد لطفِ تو　　پُرشد میان دفتر و دیوان روزگار
با عقل ترسان ترسان گفتم کہ در ثنا　　آں را کہ ہست دیدۂ اعیانِ روزگار
لقمان روزگارش خوانم چہ گفت ہے　　خر انوری کہ رسید لقمان روزگار
ص۱۵۵

(۸) ایک اور شاعر لکھتا ہے ؎

ھی الدنیا تقول بملاء فیھا حذار حذار من بطشی وفتکی

انوری سمجھا کہ کچھ بھید ہے، تحقیق سے اصل واقعہ معلوم ہوا۔"

(شعر العجم ص ۲۷)

مولانا شبلی اس موقعے پر پہلی مرتبہ محمد عوفی کی لباب الالباب کا حوالہ دیتے ہیں لیکن میرا عقیدہ ہے کہ یہ کتاب اس وقت تک ان کی نظر سے نہیں گزری تھی اس لیے کہ شبلی فخر الدین مروزی کو ملک طوطی کے دربار کا شاعر اور منشی بیان کرتے ہیں جو ملک طوطی کے خوف سے انوری کو اصل واقعے سے اطلاع نہیں دے سکتا حالانکہ لباب سے کوئی ایسا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا بلکہ قیاس میں آتا ہے کہ خود علاء الدین کے دربار سے اس کا تعلق تھا۔ اس موقعے پر لباب کی عبارت ہے -

"نزدیک ملک طوطی نشست تا آن بلبل بستان فصاحت را بخدمت او فرستد و لطف مجالست درمیان آورد وچنان می نمود که او را بصحبت بتعهد و تلطف استدعا می کند و در ضمیر داشت که چون بروے دست یابد او را نکال گرداند و امیر عمید فخر الدین را ازان حال علم بود و صورت حال بر دیگر آدمی توانست گفت چه از سطوت قهر سلطان علاء الدین می اندیشید و مصادقت و دوستی با همگان رعایت می داد"۔ (لباب الالباب جلد دوم ص ۱۲۵)

ملک طوطی مرو شاہجہاں کا رئیس نہیں ہے بلکہ قبائل غز کا سردار سنجر کے دربار میں غزوں کے دو ایلچی رہا کرتے تھے ایک کا نام قرعود تھا اور دوسرے کا طوطی۔ جب ۵۴۸ھ میں ان قبائل نے سنجر کو شکست دے کر اور اسیر کر کے تمام خراسان پر قبضہ کر لیا تو میاں طوطی کا طوطی خوب بولنے لگا اور

مالش آں کس کہ تا بحشر نماند — بے گنہ مست تربت تشویر
مر امیدش از عطائے بزرگ — اے بزرگ جہاں بجرم حقیر
زانکہ جز دست جود تو نکشد — پائے ظلم و نیاز در زنجیر
مادرے پیر دارد و دو سہ طفل — از جہاں نور حضرت نفیر
ہمہ گریاں لقمہ از امید — ہمہ عریاں جامہ از تدبیر
غم دل کردہ بر رخ ہر یک — صورت حال ہر یکے تصویر
دست اقبالت ار نہ بکشاید — بندہ ادبار ایں عیال فقیر
گاو دوشانے عمر او بدہد — زیں پس از خشک سال حادثہ شیر ص ۱۵۲

انوری کا اگر زمانہ دشمن ہوتا تو اُس کو کیا ضرورت تھی کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ اس قدر خاص خدمات کا اظہار کرتا۔ مولانا شبلی کی افراط و تفریط استعجاب انگیز ہو کبھی تو انوری کو ایسا بلند پایہ مانتے ہیں کہ سنجر جیسا جلیل القدر سلطان دو مرتبہ اُس کے گھر جاتا ہو اور جب ناراض ہوتے ہیں تو اتنا کم ظرف اور بدحوصلہ بتاتے ہیں کہ تمام دُنیا کو اس کا دشمن بنا دیتے ہیں۔

قولہ "سلطان علاء الدین ملک الجبال سے لوگوں نے شکایت کی کہ انوری نے حضور کی ہجو لکھی ہے سلطان نے ملک طوطی کو جو مرو شاہجہان کا رئیس تھا، خط لکھا کہ انوری کو گرفتار کر کے دربار میں بھیج دو۔ ملک طوطی نے فخر الدین مروزی کو جو اس کے دربار کا شاعر اور منشی تھا حکم دیا کہ انوری کو لکھو کہ میں آپ کے ملنے کا مشتاق ہوں فخر الدین مروزی انوری کا بڑا دوست تھا اُس نے انوری کو اصل حال سے مطلع کرنا چاہا، لیکن ملک طوطی کے ڈر سے صاف صاف نہیں لکھ سکتا تھا اس لیے خط کے سرنامہ پر یہ شعر لکھا ؎

چار شہرست خراساں را بچار طرف — کہ وسطشاں بمسافت کم صد در صد نیست
گرچہ معمور و خرابش ہمہ مردم دارد — نہ چناں ہست کہ آنستش دام و دد نیست
بلخ را عیب اگرچند ما و ماتش کند — نہ ہر سے خردی نیست کہ صد نحو دلیست
مصر جامع را چارہ نبود از مدرسک — معدن زر و گہر سے سرب و نشد نیست
خہ شہر نسا پور کہ در ملک خدائے — گر بہشت ست ہمیں ست و گرنہ خود نیست

اہل شہر اس پر اس قدر برہم ہوئے کہ انوری کو پکڑ کر سختہ کلاہ کیا اور اوڑھنی اُڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی، اس سے بھی زیادہ نوبت پہنچتی لیکن قاضی حمید الدین جن کی تصنیف سے مقامات حمیدی ہے اور جن کی شان میں انوری نے کہا ہے ؎

مدح دنیا گر کمم راست لیکن — نہ دشوار گویم نہ آساں فرستم
ولیکن نہ مدح جناب حمیدی — اگر وحی باشد ہراساں فرستم

انھوں نے انوری کی حمایت کی اور اس کی جان بچ گئی، انوری نے ان واقعات کا اس قصیدے میں ذکر کیا ہے ع

اے مسلماناں فغاں از دور چرخ چنبری

چونکہ انوری کے بچانے میں ابوطالب نعیم، صفی الدین عمر، مفتی تاج الدین حسن محتسب، نظام الدین احمد مدرس نے بھی کوشش کی تھی، اس لیے قصیدے میں سب کا ذکر کیا ہے اور بلخ کی ہجو سے نہایت بری کی ہے کہ بلخ قبۃ الاسلام ہے میں اُس کی ہجو کیوں کر کہہ سکتا ہوں۔"

(شعر العجم صفحہ ۲۷ و ۲۷۲)

ہجو بلخ کے اصل واقعات، ایسا معلوم ہوتا ہے ہم تک نہیں پہنچے۔ تذکرہ نگاروں کا ماخذ غالباً وہی قصیدہ ہے جو سوگند نامہ درباب نفی ہجو بلخ

طوطی سے ملک طوطی بن گئے۔ انوری جو عرصہ سے دلی نوبت رکھتا تھا شومیٔ قسمت سے عہد انقلاب کے دور میں کچھ عرصے کے لیے ملک طوطی کے دربار میں توسل پیدا کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور بضرورت وقت اس کی مدح و ثنا میں نظمیں بھی لکھتا ہے لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ تعریفوں میں در پردہ تعریض مقصود ہے مثلاً یہ شعر ۔

طوطی اے آنکہ ز انصاف تو ہر یم شبے　　　بلبل شکر بیتوق برد زمزمہ را

دیکھو شاعر طوطی کے لیے بلبل لے آیا اور یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ۔

خسرو صاحبقران طوطی کہ از انصاف او　　　مادر ایّام ہموا خواہ است شاہین را حمام

شاعر نے پردوں کا صلح نہیں چھوڑا اور ذیل کی رباعی میں تو پورا چڑیا خانہ بھر دیا ہے۔ رباعی

اے زیر ہمائے ہمتت چرخ مدام　　　کبک از نظرت گرفتہ با باز آرام

اقبال تو شاہین و کبوتر ایام　　　سیمرغ لطیفہ خسرو طوطی نام ؎۵۴

دیوان میں اگرچہ غوریوں کے متعلق کئی تلمیحات ملتی ہیں لیکن کوئی نظم ایسی موجود نہیں جس کو علاء الدین کی ہجو کے نام سے موسوم کیا جا سکے البتہ ایک شعر ایسا ہے جو علاء الدین کی ناراضی کے اسباب پیدا کر سکتا ہے ۔

کہ سوراخ غور کیں تو در　　　بنل موش مادہ شیر است صے

قولہ " انوری کے مخالف شعراء نے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود ہجویں لکھ کر اُس کے نام سے مشہور کرتے تھے اور انوری کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑتا تھا۔ چنانچہ جب وہ بلخ میں آیا تو موجی شاعر نے حکیم سوزنی کی فرمائش سے بلخ کی ہجو لکھی اور انوری کے نام سے مشہور کر دی اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

اور ہمارے شاعر کے ساتھ اس کی عداوت دس سال سے چلی آرہی ہے۔

تا تو فرصت جوے گردی وز کمینی گاہ حسد ۔۔۔ غصۂ دہ سالہ را نامِ سحر آوری

ہجو کا مصنف خواہ کوئی ہو حکیم انوری کے بیان سے صاف پایا جاتا ہے کہ صاحب "خر نامہ" نے جو بقول شادی آبادی حکیم سوزنی ہے اس کی ہجو کی ہے

سوگند نامہ شعر

چوں مر اورا واضع خر نامہ گیرد لیش گاؤ ۔۔۔ گاہ او در خر من ناسزاوار خری

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ "ہجو بلخ" اور چیز ہے اور "خر نامہ" کوئی اور چیز ہے اور وہ نظم جس سے بلخی ناراض ہوتے ہیں ہجو بلخ ہے نہ خر نامہ۔ شادی آبادی نے حکیم سوزنی کے کلیات سے خر نامہ کے چند اشعار نقل کیے ہیں چونکہ موجودہ مذاق کے معیار سے پست ہیں لہذا قلم انداز کیے جاتے ہیں، صرف وزن و ردیف کی خاطر ایک شعر یہاں لکھ دیا جاتا ہے ؎

آں سر خراں بجائے نماید سر خری ۔۔۔ پر معز خر شود ہمہ دیواں دفترم

شادی آبادی سوزنی کے دیوان سے امیر معزی کی ہجو کے بعض اشعار نقل کرکے یہ غلط نتیجہ مترتب کرتے ہیں کہ ہجو بلخ کا واضع خود امیر معزی تھا لیکن امیر معزی ۵۴۲ھ میں وفات پاتا ہے، اثیر الدین فتوحی ان ایام میں زندہ تھا اور انوری سے اس کی مخالفت کا راز بھی طشت از بام ہے اسی لیے تذکرہ نگاروں نے ہجو کا قرعہ اس کے نام پر ڈالا ہے۔

آمدم بر سر قصہ، ہجو کا خمیازہ بے گناہ انوری کو اٹھانا پڑا تفصیلی واقعات کسی کو معلوم نہیں سوگند نامے میں شاعر نے اس قدر کہا ہے بیت

رہبر من معزی کرشے کلہ داں برگزشت ۔۔۔ مگز زد برطیلسانم بیر دور معزی

اس شعر کی ترجمانی میں اہل تذکرہ نے قیاس دوڑایا ہے کہ بلخیوں نے

کے نام سے مشہور ہے۔ میں بھی ان واقعات کے مطالعے کے وقت اسی سوگند نامے سے کام لوں گا۔

سنجر کی وفات کے بعد جب خراساں میں انقلاب پر انقلاب آ رہے تھے اور آئے دن حکمراں بدل رہے تھے انوری بلخ میں سکونت اختیار کر چکا تھا۔ ان دنوں طغرل تگین کا عہدِ حکومت تھا جیسا کہ شاعر سوگند نامے کے مقطع میں کہتا ہے ۔

خدا تاریخ این انشا کہ فرمانده بر بلخ رایت طغرل تگین بوده است برائے نامور ہا

اس فرمانده کے حالات سے ہم تاریکی میں ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا زمانہ سنجر کے بعد ہے۔ چنانچہ انوری سے

ملک اگر در دولتِ سنجر آخر پیر گشت شد جواں بارِ دگر در دولتِ طغرل تگین

علیٰ ہذا ہجو بلخ کی تاریخ سے ہم ناواقف ہیں۔ بالعموم یہی خیال کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ انوری کے آخر حصۂ عمر سے تعلق رکھتا ہے جس کے بعد وہ عزلت نشیں ہو جاتا ہے۔ پروفیسر براؤن اور میرزا محمد قزوینی اس واقعے کا ظہور انوری کے پیشین گوئی کے غلط ثابت ہونے کی یادداشت میں بتاتے ہیں لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ وہ انوری کی عزلت گزینی سے بہت عرصہ پیشتر ظہور میں آیا ہے۔ انوری کی تشہیر سلطان سنجر المتوفی ۵۵۲ھ اور قاضی حمید الدین المتوفی ۵۵۹ھ کے بیں وفات کے درمیان کسی وقت عمل میں آئی ہوگی کہا جاتا ہے کہ قاضی حمید الدین شاعر کو بلخیوں کے ہاتھ سے نجات دلواتے ہیں۔

ہجو کے اصلی مصنف کے نام سے ہم ناواقف ہیں سوگند نامے میں صرف "حسود" کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ شعر

یار داں آخر کلامِ من رسولِ حسود در تو کن نقش الٰہی را رنقش آذری

ان کی موجودگی میں بھلا میری کیا مجال ہو سکتی ہے کہ ملح کی ہجو کا خیال بھی دل میں لاسکوں اس کے متعلق سوگند نامہ کے بیانات بالکل صاف ہیں۔

ما چنیں سگاں اگر از دربتاں عقدے کشند   فارغ آید حجرۂ اعظم از چنارے زیوری
ہجو گویم ملح را ہیہات یارب زینہار   خود بواں گفتش کہ زنگارست بر جوہری

ان بزرگوں میں سب سے مقدم نظام الدین ہیں شبلی ان کو نظام الدین احمد مدرس کہتے ہیں۔ لیکن ان کا پایہ اس سے بدرجہا افضل و ارفع معلوم ہوتا ہے شادی آبادی ان کو صالح ملح کہتے ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ قاضی القضاۃ ہیں سوگند نامہ —

افتخار خانداں مصطفےٰ در بلخ و ہم   کردہ ام در مدحتش حسانی و ہم بوذری
آں نظام دولت و دیں کانتظام عدل او   در دل انصاف کند با دصبا را رہبری
در پناہ سدۂ جاہ رعیت پرورش   بر عقاب آسماں فرماں دہد کبک دری
ہم بوقت در نسب ہم پادشاہی در حسب   کو سلیماں تا در انگشتش کند انگشتری
مسند قاضی القضاۃ شرق و غرب آراستہ   آں کہ ہست از مسندش عباسیاں را برتری
آنکہ پیش کلک و طبعش آں و سحر آنکہ حلال   صد چو من ہستند چوں گوسالہ پیش سامری
آب و آتش را اگر در مجلسش حاضر کند   از میاں ہر دو برخیزد بشکوہش داوری

قاضی حمید الدین کے ذکر کے بعد انوری خواجہ صفی الدین عمر کا ذکر کرتا ہے شعر العجم میں انھیں "صفی الدین عمر" کہا گیا ہے لیکن سوگند نامہ —

خواجۂ ملت صفی الدین عمر در صدر شرع   آنکہ سود دیو را در سایۂ او قادری

کلیات میں ان کی تعریف میں ایک اور قصیدہ موجود ہے جس کا مطلع ہے -

زمانہ گرزاں بس حقیر و مختصر است   ازیں زمانۂ دوں درگزر کہ درگزر است

تاج الدین کے بعد مجد الدین ابوطالب کا نام آتا ہے غالباً یہ وہی بزرگ

انوری کو تختہ کلاہ کیا اور عورتوں کی اوڑھنی اُڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی شادیا آبادی کہتے ہیں کہ امیر معزی کی شکایت پر یہ تشہیر بادشاہ عہد کے حکم سے وقوع میں آئی ۔

لیکن ایک اور قصیدے سے جو مجدالدین کی مدح میں ہو اور جس کا مطلع ہی ۔

اکنوں کہ ماہ روزہ سقصاں در اوفتاد　　آہ از سحاب محرۂ دل بر در اوفتاد

اس قدر معلوم ہوتا ہو کہ یہ واقعہ رمضان میں ہُوا تھا ۔ عوغائی اُس کے گھر پر چڑھ آئے تھے اور اس کی تحویف و توہین وہیں عمل میں آئی تھی ۔ شاعر مجدالدین کو خطاب کر کے کہتا ہو ؎

الحق محال نیست کہ مدہ چو دیگراں　　از عشق حدست تو مدیں کشور اوفتاد

اورا کہ شکرہائے شکر ریز شعرہاست　　زہرے مدست واقعہ در شکر اوفتاد

از حصرتے حشر بدرتش حاضر آمدند　　ما دیدہ مرگ در فزع محشر اوفتاد

تیمارش از تعرض ہرے حر فرو د　　دستارش از عقیلۂ صد معجر اوفتاد

نشنو کہ در عداب چگونہ رسید صبر　　سگر کہ در عداب چگونہ بر حر اوفتاد

ما سکراں عقل دریں خطہ کار او　　دا مدہی حدلے کہ بس مسکر اوفتاد

کافور در عدا س ما فطار ہر شبے　　از جور او (؟) سوس ورکا فر اوفتاد

از بس کہ مار داوری ایں و آں کشید　　او را سحن بحصرت ایں داور اوفتاد

اس ورطۂ ملاسے جن لوگوں نے انوری کو نجات دلوائی ہم ان کے ناموں سے مطلق بے خبر ہیں ہو گند نامے میں جن بزرگوں کا نام لسبیل تذکرہ آیا ہو اس سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ وہ اس کے نجات دہندہ ہیں ۔ شاعر کا مقصد صرف اس قدر ہو کہ جب بلخ میں ایسے ایسے مشاہیر فضلا و علما جمع ہیں

علاءالدین انوری سے صاف نہیں تھا۔ دوسرے یہ امر بھی خاطر نشین رہے کہ اگرچہ انوری کی گوشہ نشینی کا سال ہم کو معلوم نہیں لیکن کلیات سے اس قدر قطعی پایا جاتا ہے کہ حکیم انوری ۵۶۱ھ میں سلطان عمادالدین پیروز شاہ کے پاس ترمذ جاتا ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ اس سن سے ایک عرصہ بعد تک وہ مدح سرائی اور شعر گوئی سے تائب نہیں ہوتا۔ کیونکہ کلیات میں متعدد قصائد اسی پیروز شاہ کی مدح و ثنا میں ملتے ہیں جو غالباً کئی سال کے عرصے میں لکھے گئے ہوں گے لیکن علاءالدین جہاں سوز ۵۵۶ھ میں وفات پاتا ہے اس لیے انوری کی عزلت نشینی کے زمانے تک اس کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔

قطعۂ بالا میں انوری جس بادشاہ[1] کی خدمت سے دلشکستہ ہوتا دیکھا جاتا ہے وہ کوئی اور بادشاہ ہے جس سے اس کے گہرے اور دیرینہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں اور جس کے دربار میں وہ عرصے تک رہ چکا ہے کیونکہ یہ طلبی کی تحریک ایک عرصے تک جاری رہی ہے اور کئی قطعات اس سلسلے میں لکھے گئے ہیں۔ ذیل میں انوری کا آخری جواب اور بادشاہ کی طرف سے اس کا جواب الجواب جس پر یہ تحریک ختم ہو جاتی ہے درج کیے جاتے ہیں۔

خسروا روزے دو عمرم گر سپہر افزوں کند ۔۔۔ تا نگیرد رشتہ مرگم چو مگس را عنکبوت
گر توام سجدہ گاہ شکر سازم ساختن ۔۔۔ چون مسیح مریم از صدر حمل تا پائے حوت
پس حکیمی صرف یارم کرد بر درگاہ تو ۔۔۔ ہر یکے زیں دو دو بارا از پی یکدیگر فوت
طالب مقصود را یک سمت باید مستوی ۔۔۔ مرد را سرگشتہ دارد اختلافات سموت
من چو کرم پیلہ ام قانع بیک نوع از علا ۔۔۔ تا اماں یا صبر جوں در تہ جیبی یا قوت (جواب)

بادشاہ بھی اسی زمین میں جواب دیتا ہے لیکن وزن متن کے بجائے مسدس ہے۔

---

[1] بادشاہ غالباً عمادالدین پیروز شاہ ہے۔

ہیں جس کے وجیہ قصیدے سے چند اشعار اوپر درج ہوئے ہیں۔ شبلی ان کو ابوطالب نعیم کہتے ہیں۔ سوگند نامہ۔

مجدد دیں بوطالب آں عالم کہ رہ گم شد درو	عقل کل آں کردہ از بیرون عالم اطہری

شعر العجم میں ایک اور نام ملتا ہے "حسن محتسب" مگر سوگند نامہ اس سے واقف نہیں ہے۔

قولہ "بالآخر انوری نے تمام تعویات سے توبہ کی اور گوشہ گزیں ہو کر بیٹھا، سلطان غوری جہاں سوز نے دربار میں طلب کیا لیکن اس نے انکار کیا اور یہ قطعہ جواب میں لکھا"

کلبۂ کاندرو نہ روز و نہ شب	جائے آرام و خورد و خواب من ست
جایگہ دارم اندرو کہ درو	ہیچ در عین رشک ماہ من ست
ہر چہ در مجلس ملوک بود	ہمہ در کلبۂ خراب من ست
رحل اجزا و نان خشک درو	گرد خوان من و کباب من ست
قلم کوتہ و صریر خوشش	زحمہ و نغمۂ رباب من ست
خرقۂ صوفیانۂ اطلس	از ہزار اطلس انتخاب من ست
ہر چہ بیرون بود ازیں کم و بیش	حاش للسامعین عذاب من ست
خدمت پادشہ کہ باقی باد	نہ بمقدار آب و خاک من ست
زیں قدر راہ رحمتم بستہ است	آں کہ او مرجع و مآب من ست
زیں طریق ار نمایش ست خطا	حکم ایں خطا صواب من ست

نیست ایں بندہ را زبان جواب

جامہ و جائے من جواب من ست (شعرالعجم ص ۱۴۲)

علاء الدین غوری کی طلب کا واقعہ صحیح نہیں مانا جا سکتا کیونکہ بروایت مشہور

جاکر کہا کرتا۔

قولہ "انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی کوئی شریف
ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا، ہجو میں اس نے بہت سے اچھوتے،
نادر، باریک اور لطیف مضامین پیدا کیے ہیں، ان ہجوؤں میں
قوت تخییل جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے صاف نظر آتی ہے
لیکن افسوس اور بہت افسوس ہے کہ اس صنف میں اس کا جو کلام
زیادہ نادر ہے، اسی قدر زیادہ فحش ہے، سیکڑوں اشعار ہیں لیکن
(دو ایک کے سوا) ایک بھی درج کے قابل نہیں، کسی کو
ایسا ہی شوق ہو تو آتش کدۂ آذر موجود ہے ہم اپنے دست و قلم
کو اس سے آلودہ نہیں کر سکتے، ایک آدھ ہجو فحش سے خالی
بھی ہے وہ حاضر ہے

پہلے ایک شخص کی مدح لکھی پھر صلے کا تقاضا کیا، اس کے بعد
ہجو کی دھمکی دی، دیکھو کس لطیف طریقے سے ادا کیا ہے۔

سہ چیز رسم بود شاعراں طامع را — یکے مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ورنہ داد ہجا — ازیں سہ، ہست دو گفتم دگر چہ فرمائی"

(شعر العجم صفحہ ۲۸۳)

انوری کی شاعری کے کئی پہلو ہیں مثلاً اوصاف نگاری یا مداحی، اخلاقیات و پند و حکم اور ہجویات۔ اپنے ہم وطنوں میں انوری اپنے کمال قصیدہ نگاری کی بنا پر فردوسی اور سعدی جیسے شہسواران فن کا ہمعناں مانا گیا ہے مولانا شبلی برخلاف مذہب جمہور اس کو ہجو گوئی کی نبوت کا منصب عطا فرماتے ہیں اور اس کے حقیقی کمال کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ انھوں نے

اے بتو مخصوص اعجاز سخن — چوں بتر آئی و در معنی قنوت
سمت درگاہت سعود چرخ را — گشتہ در دوراں گل حیز السموت
ما چو قرص ارزن و حوت غدیر — تو چو قرص آفتاب برج حوت
صورۂ ما مرغ سیمرغ لوبیت — تو قوی بازو لفصل و ما لقوت
پیش نظم چوں نسیج الوحد تو — چیست نظم ما نسیج العنکبوت
گرچہ در تالیف ایں ابیات نیست — بے سمیں معنے و قصہ بے کروت
رائے عالی در جواب ایں مسد — لائق ابحا السکوت ست السکوت

قولہ " انوری نے حسب روایت دولت شاہ سنہ ۵۴۷ھ میں بمقام بلخ وفات پائی اور سلطان احمد خضرویہ کے پہلو میں دفن ہوا۔"
(شعر العجم ص ۲۴۳)

انوری کی وفات میں سخت اختلاف ہے پروفیسر براؤن، پروفیسر ژوکوفسکی کے حوالے سے یہ تاریخیں دیتے ہیں۔ آتش کدہ قلمی سنہ ۵۶۰ھ اور طبع بمبئی سنہ ۵۵۹ھ، تقویم التواریخ حاجی خلیفہ سنہ ۵۴۷ھ، مرأت الخیال شیر خان لودھی سنہ ۵۹۴ھ، ہفت اقلیم سنہ ۵۰ھ، مجمل فصیحی سنہ ۵۸۵ھ، خلاصۃ الاشعار تقی کاشی سنہ ۵۸۶ھ اور مرأت العالم سنہ ۵۹۲ھ۔

دولت شاہ نے جو تاریخ دی ہے ہر صورت میں غلط ہے چونکہ طوفان باد کے سلسلے میں انوری کا نام بھی لیا جاتا ہے اور طوفان کی تاریخ سنہ ۵۸۲ھ ہے اس لیے انوری کی وفات اس سن کے بعد کسی وقت ماننا ہوگی۔

حمد اللہ مستوفی نزہت القلوب میں انوری کا مزار سرخاب، تبریز میں جہاں خاقانی اور ظہیر فاریابی وغیرہم دفن ہیں بتاتا ہے اور یہ کسی قدر حیرت خیز ضرور ہے اس لیے کہ شاعر کا اکثر حصۂ عمر بلخ میں بسر ہوا ہے۔ اواخر عمر میں تبریز

میں نہیں گزری ہوگی ؎

گوش علیحدہ دستِ تیغ عاری ماندہ تحسین
تو اوّل زیب اسپ و دریست رگستواں بینی

ہجو کی مثال میں جو قطعہ مولانا شبلی نے نقل کیا ہے اور جس کو میں اوپر درج کر آیا ہوں ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کو ہجو سے کس قدر حقیقی تعلق ہے۔ اس اچھے خاصے قطعے پر یہ کلنک کا ٹیکا ناحق لگایا گیا۔ اگر اس قسم کی لطیفہ سنجی ہجو میں داخل کر لی گئی تو میرے خیال میں مولانا کی فقاہت کے اعلیٰ معیار تک کوئی مشرقی اور مغربی شاعر نہیں پہنچ سکتا اور ظرافت و خوش طبعی کا وجود جس کے ایرانی شعرا بالعموم شیدائی نظر آتے ہیں شجرِ ممنوعہ قرار پاتا ہے۔

ذیل میں اسی ذخیرے سے جس کو مولانا شبلی رد کر چکے ہیں ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے چند مثالیں جو مذاقِ حال کی رو سے قابلِ اعتراض نہیں، پیش کی جاتی ہیں۔

جن ایام میں انوری سرخس میں مقیم تھا وہاں بوعلی آبی نام کا ایک عہدہ دار رہا کرتا تھا بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر شاعر اس سے ناراض ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بوعلی آبی کی ناک اس کے منہ پر بلحاظ تناسب کثیر الحجم واقع ہوئی تھی اور تمام چہرہ پر چھا گئی تھی۔ انوری اس شاندار ناک کی تعریف میں اپنے خیالات ذیل کی رباعی میں دیتا ہے رباعی

با بوعلی آبی ار بہم بنشینی — شخصے بینی ست جنبشی چوں بینی
گر دیدہ بدیدن رخش چار کنی — چنداں کہ در او بینی بینی بینی

ایک مرتبہ سرخس میں امساکِ باراں ہو گیا اور بارش دیر میں ہوئی۔ انوری نے آبی اور بے آبی کے التزام سے یہ لطیفہ حاصل کیا ؎

قصیدہ گوئی کی اہم دقائق، مشکلات اور اس کی پیچیدگیوں کی داد دی ہے۔

مولانا نے انوری کا کلیات بجنسہٖ خود نہیں دیکھا۔ محض اس انتخاب کی بنا پر جو صاحب آتش کدہ نے انوری کے کلام کا دیا ہے یہ حکم صادر فرمایا ہے کہ انوری کا کلام جس قدر نادر ہے اسی قدر زیادہ فحش ہے سیکڑوں اشعار ہیں لیکن ایک بھی درج کے قابل نہیں۔ اب اگر صاحب آتش کدہ نے انوری کے کلام سے زیادہ تر ایسا نمونہ پیش کیا جو مولانا کے نزدیک مردود و مطرود ہے تو یہ صاحب آتش کدہ کی بد مذاقی کا قصور ہے جس نے صرف ایسا کلام پسند کیا یا خود مولانا شبلی کا جنھوں نے محض آذر کے انتخاب کی بنا پر ایک غیر موجہ اور ناحلانہ فیصلہ دے دیا جو حقیقت اور واقعیت سے کوسوں دور ہے۔ ہمیں انوری کا کلام خود دیکھنا چاہیے وہ ابھی تک بازار میں دستیاب ہوتا ہے۔

کلیات میں ہر قسم کا ذخیرہ موجود ہے جس سے ہر مذاق کا شخص اپنے اپنے مطلب کے پھول چن سکتا ہے۔ اس چمنستان میں جہاں ہجو اور فحش کے خار ہیں وہاں متین اور سنجیدہ کلام کے گل و ریاحین بھی کثرت کے ساتھ نظر آ رہے ہیں البتہ کانٹوں کی اس قدر بہتات نہیں جس کے مولانا شبلی مدعی ہیں اور یہ خیال تو قطعی غلط ہے کہ اس کا کلام جس قدر زیادہ نادر ہے اسی قدر زیادہ فحش ہے۔ انوری کی فحش گوئی صرف چند عریاں اور قابل اعتراض الفاظ کے استعمال پر منحصر ہے۔ دشنام دہی میں کسی لطافت خیال اور دقتِ نظر کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے اس صنفِ سخن میں شاعر کی قوتِ تخیل کے کارناموں کی تلاش کرنا سرے سے خیال میں بے سود ہے۔ انوری کی اوصاف نگاری سے قطع نظر کرنا اس کی فحش نگاری کی تعریف کرنا، اس کے اخلاقیات کو پس پشت ڈالنا اور اس کی ہجویات کو اچھالنا ایک ایسی عجیب تحسین ہے جو کسی کے وہم و گماں

گفت زین مژدہ کہ ہمی گوییم — رونق دین ایزدی بردہ است
آنچہ این بار مژدہ می خواند — جبرئیل آن ہمہ بیاوردہ است

کسی وزیر کو جس سے انعام کی امید میں شاعر پاس سے ہمدوش ہے
یہ مشورہ دیا جاتا ہے ۔

تو وزیری و من مدحت گوئے — دست من بے عطا روا نیست
شو، وزارت بمن سپار و مرا — مدحتے گوئے تا عطا بینی

تم وزیر ہو اور میں تمہارا مداح ۔ سخت افسوس ہے کہ پھر بھی خالی ہاتھ رہوں
چنانچہ میں تجویز کرتا ہوں کہ وزارت تم میرے حوالے کرو اور شاعری میں تمہارے
سپرد کروں پھر تم قصیدے کہنا اور میں انعام دوں گا۔

تاج الدین عماد جب زیارت بیت اللہ سے واپس آتا ہے انوری اس
کے خیر مقدم میں کہتا ہے۔

عماد رنج بار رسید است سوئے — با توره طاعت و احسان کرامت

انوری کے ہاں ہجو بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو دس بارہ آدمیوں
سے زیادہ کی نہیں ملے گی ان میں چار اشخاص ایسے ہیں کہ متعدد موقعوں
پر کلیات میں ان کی مذمت ملتی ہے۔ ان مذکورین میں ایک قاضی طوس
ہیں، نمبر دوم سدید الدین بیہقی، نمبر سوم تاج الدین عماد اور نمبر چہارم
کافی ہروی ہیں۔ شاعر کہتا ہے ؎

چار کس یابی کہ در ہجوش اند — گر بجوئی از ثریا تا ثری
قاضی طوس و سدید بیہقی — تاجک عماد و کافی ہری

قولہ "انوری کے دیوان میں جس قدر ہجویں انوری کے بیوی اور بیٹے کی بھی
پائی جاتی ہیں عام لوگوں کا خیال ہے کہ انوری کو ہجو کا ایسا چسکا پڑ گیا

سرخس از رنج بے آبی و آبی | در بیچارہ سے دارد در جرائی
ز بے آبی خلاصی یافت امسال | خدا وندا خلاصش دہ ز آبی

یعنی سرخس بے آبی اور آبی کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا اس سال بے آبی سے اس کو نجات مل گئی الٰہی اس کو آبی سے بھی پاک کر ۔

خواجہ ابوالفتح کے بخل کی تشہیر ؎

خواجہ بوالفتح از کمال حرص و بخل | سیم حاصل می کند بے فائدہ
در پئے مائدہ ہمی گوید رلش | ربنا انزل علینا مائدہ [illegible]

ممدوح کو جس سے صلہ حاصل کرنے میں شاعر مایوس ہو چکا ہے یوں خطاب کرتا ہے ؎

خداوندا ہمی دانم کہ چیزے نیست در دستت | گرم چیزے ندادستی ندیں تقصیر معذوری
ولیکن گر کسے پرسد چہ دادستت ؟ دادارا | کہ گویم عشوہ اول روز و آخر روز دستوری [illegible]

اگر آپ نے مجھے کچھ عطا نہ کیا تو معذور ہیں اس لیے کہ آپ کے پاس دینے کو کچھ نہیں لیکن جب لوگ مجھ سے پوچھیں کہ کیا دیا ! تو کہیے کیا کہوں ؟ کیا یہی کہ صبح کو فریب دیا اور شام کو رخصت دی ۔

سحیب مشرف اور فرید عارض

چہ چیز ماست در لشکرے کہ میر درو | سحیب مشرف و عارض فرید لنگ بود
شکست پائے یکے ؟ روا یا کہ دیر رسد | خبر کہ دست دگر میر ریہ سنگ بود [illegible]

ایک قرآن خواں قاری کی قرأت انوری کے لیے ناخوشنودی کے اسباب پیدا کرتی ہے اور شاعر اپنی ناراضی کا اظہار ذیل کے ابیات میں کرتا ہے ؎

دوستش در خواست من ہمیشہ را | وندستش کور امت آزردہ است
گفتمش لے بزرگ جیست بودہ است | طبع پاک تو از چہ پژمردہ است

انوری کے حالات

اوحدالدین انوری کا باپ محمدؒ ایک شہزادی کریمۃ النساء رضیۃ الدین کی سرکار میں ایک قابل اعتماد منصب پر سرافراز تھا۔ یہ سرکار شعرا کی قدرداں تھی انوری اپنے باپ کی وفات کے بعد غالباً اسی سرکار میں توسل قائم کرنا چاہتا ہے۔ ایک خطابیہ قصیدے میں جس کا مطلع ہے ؎

اے فخر ہمہ نژاد عالم　　وے سیدۂ زنانِ عالم

(کلیات صفحہ ۲۸۱)

شاعر اپنا مدعا یوں عرض کرتا ہے ؎

بودے پدرم بہ مجلسِ تو　　پارسنہ و حریف محرم
تو شاد بری کہ رحمت ازو باد　　میراث بہ ماندگان او ہم
ارجو کہ رہی شود بمدحت　　بر اہل بلاد حساں مقدم[1] [illegible]

بلحاظ پایۂ علوم انوری اپنے زمانے کا غیر معمولی آدمی مانا جاسکتا ہے اس کا حافظہ نہایت قوی تھا ؎

خاطرے دارم منقاد چناں کاندر حال　　گو پدرم گنجینہ ہزاراں علم کہ گویم یکبار [illegible]

نجوم میں اُستاد ہونے کے علاوہ منطق، فلسفہ اور ہیئت میں ماہر تھا، حکمت اور فلسفے میں اُس کا پایہ نہایت بلند تھا طبعیات اور الہیات میں کامل

---

[1] یہ قصیدہ اگرچہ مطبوعہ کلیات اور بعض قلمی نسخوں میں موجود ہے، لیکن بعض وجوہ سے جو اس مضمون کے حاشیے میں ظاہر کیے گئے ہیں احتمال کیا جا سکتا ہے کہ وہ انوری کا ہو۔

تھا کہ بیوی اور بیٹے کو بھی نہ چھوڑ سکا لیکن اور شعرا نے یہ ہجویں لکھ کر اس کے دیوان میں داخل کر دی ہیں اور چونکہ پبلک اس کی دشمن تھی وہ اسی طرح قائم رہ گئیں۔" (شعر العجم صفحہ ۲۸۵)

میں نہیں سمجھا کہ یہ عام لوگ کون ہیں اگر تذکرہ نگار ہیں تو باوجود متعدد تذکرے دیکھنے کے مجھ کو اس قسم کا کوئی ذکر نظر نہیں آیا۔ بعض اشعار سے پایا جاتا ہے کہ انوری نے شادی ہی نہیں کی تھی ؎

انوری زن از آن سبب نہ کند — کہ مبادا برش پسر آید

کسی دوست کو جس نے شادی کے باب میں مشورہ دیا ہے جواب دیتا ہے

سیدا اے کہ بے ارادت او — خلق را رنج و شادمانی نیست
کامدین روزگار زن کردن — جز از محض قلتبانی نیست



ہو، تاریخ اور محاضرات پر عبور ہو، قصے، لطیفے، اور چٹکلے خوب جانتا ہو، قدرتی خوش تقریر ہو، موسیقی داں ہو اور چنگ و رباب بجا جانتا ہو، مختصر یہ ہے کہ علوم میں قاموس ہو، اور نرا زاہد خشک نہ ہو۔

انوری فطرتاً، علماً و عملاً اس ممتاز منصب کا مستحق تھا۔ اور اسی آرزو میں وہ سلطان سنجر سلجوقی کے دربار کا رُخ کرتا ہے۔ اِس مقصد کی تکمیل کی غرض سے اُس نے دربار کے اُمرا سے تعلقات قائم کیے ہوں گے لیکن اس سے قبل میں ایک ضروری مسئلے کو چھیڑتا ہوں۔

انوری کا صحیح زمانہ تعین کرنا ہمارے لیے ایک مشکل معمّا ہے۔ اُس کے ہاں بعض قصائد کسی وزیر نظام الملک صدرالدین محمدؒ کی تعریف میں ملتے ہیں جو بظاہر مشہور نظام الملک طوسی کا نبیرہ اور فخر الملک کا فرزند مانا جا سکتا ہے یہ شخص اپنے باپ کے قتل کے بعد ۵۰۰ھ سے ۵۱۱ھ تک سلطان سنجر کا وزیر رہا ہے، بلکہ ایک قصیدہ تو اُس کے منصبِ وزارت پر فائز ہونے کے عین موقع پر لکھا گیا ہے ؎

بہ نیک طالع و فرخندہ روز و فرخ فال[1] — بہ سعد اختر و میمون زمان و خرم حال

بہ بارگاہِ وزارت بہ فرخی بنشست — خدایگانِ وزیراں و قبلۂ آمال

نظامِ مملکت و صدرِ دین و صاحبِ عصر — سپہرِ رفعت و قدر و جہانِ جاہ و جلال

محمدؐ آں کہ بہ اقبال او خورد سوگند — روانِ پاکِ محمدؐ بہ ایزدِ متعال

دوسرے قصیدے میں اُس کا نام یوں آتا ہے ؎

نظامِ مملکت سلطان و صدرِ دیں کہ بود — خدایگانِ وزیراں، وزیرِ خوب سیر

---

[1] بہت ممکن ہے کہ یہ قصیدہ انوری کا نہ ہو اور کسی دوسرے شاعر کا بات ہو اس کی زبان انوری کی زبان سے یکسر مختلف اور سلیس و سادہ ہے۔

لیاقت رکھتا تھا۔ شاعری جس کی بنا پر وہ دنیا میں مشہور و معروف ہے اس کے کمالات کا ایک ادنیٰ پایہ ہے۔ نثر میں بھی صاحب قدرت تھا ؎

اگر نامہ باید نوشتن نویسم
کلک و بیاں ہمیشہ خسروانی (کلیات صفحہ ۴۱۶)

ادبیات میں البتہ کمزور تھا ؎

در ادب گرچہ پیادہ است چو تہمت گہ عو
در سخن ہست چو عقلت گہ ادراک سوار

وہ اعلیٰ درجے کا خطاط بھی تھا ؎

گویند کہ چیست حاصل تو
اے بے حاصل زر مدگانی
گویم خطکے و بیتکے چند
اندوہ لہتا ے ایں جہانی ص۴۵۵

نرد و شطرنج خوب کھیلتا تھا ؎

دگر نرد و شطرنج خواہی سازم
حریفانہ سحر حلال ار روانی ہے

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ انوری کی تعلیم و تربیت ایک خاص نصب العین کی بجا آوری کی غرض سے ہوئی تھی، یعنی یہ کہ بڑا ہو کر سلاطین کی منادمت کے قابل ہو سکے۔ ایسے درباروں میں جہاں علمی روایات اور تہذیب نے ایسا گہوارہ بنا لیا تھا منصب ندیمی ایک قابل اعتماد اور وجہ افتخار منصب شمار کیا جاتا تھا۔ ملک کے بہترین دماغ اس عہدے کے آرزومند رہتے تھے اور دربار سلطانی میں رسائی اُن کی غایت مرام ہوتی تھی۔ مگر ندیمی بجائے خود ایک دشوار گزار مرحلہ تھا اس میں انسان کو مستجمع کمالات اور ہمہ صفت موصوف ہونا ضروری تھا۔ ظریف، طبّاع اور حاضر جواب ہونے کے علاوہ ندیم کے لیے ضروری تھا کہ شاعر بھی ہو، طب، فقہ اور نجوم میں مہارت رکھتا ہو، شعرائے قدیم و جدید کا کلام اس کو مستحضر ہو، ادب سے آشنائی رکھتا

(ص ۲۱۴) زاں روے بر ویم ایں قدر کار آورد تا دشمن از دوست پدیدار آورد

اب اگر سنہ ۵۰۰ھ انوری کی شاعری کا سال آغاز مانا جاتا ہے تو سنہ ۵۳۰ھ میں یہ مدت سی سالہ ختم ہو جاتی ہے حالانکہ کلیات میں ان دو سالوں کے درمیانی زمانے کی ایک تلمیح بھی نہیں ملتی، اور اگر ملتی ہے تو سنہ ۵۴۱ھ کے بعد کی ملتی ہے۔

کلیات میں تاریخ و سال کی طرف جو متعدد اشارے ملتے ہیں ذیل میں علیحدہ علیحدہ دکھائے جاتے ہیں۔

سنہ ۵۴۳ھ	بحکم دعوے ریج و گواہی تقویم شب چہارم ذی حجہ بسہ تاسیم	(ص ۳)
سنہ ۵۴۱ھ	عدد سالہائے عمر تس باد ہچو تاریخ پانصد و چل و یک	(ص ۲۴۴)
سنہ ۵۴۲ھ	بودہ در برد فرخ نقش بکام تا فرخ تاریخ ایں نقش ست و برد	(ص ۱)

(فرخ = ۲۸۸، برد = ۲۵۴ ۲ فرخ + برد = ۵۴۲)

سنہ ۵۴۰ھ	(عدد سالہائے مدت تو) ہچو تاریخ پانصد و چل و اند	ص ۶۲۶
سنہ ۵۴۳ھ	عدد سالہائے عمر تس باد ہچو تاریخ پانصد و چل و اند	ص ۶۵۱
سنہ ۵۶۱ھ مطابق سنہ ۵۳۳ یزدجردی	سال بر پانصد و سی و سہ ز تاریخ عجم گفت بر خیر کہ از شہر بروں شد ہمراہ	ص ۳۵۷

علاوہ بریں کلیات میں جو اور تلمیحیں واقعات تاریخی سے متعلق ملتی ہیں،

محمد آں کہ بخواہش گرفت ملت و ملک ۔۔۔ ہماں نظام کہ دیں را بتدا بعدل عمر

ان قصائد کے اعتبار پر انوری کی شاعری گویا قرن ششم کے آغاز میں شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن اس نظریے کے تسلیم کرنے میں کئی مشکلات مانع ہیں۔ اس کی وفات ۵۸۲ھ کے بعد، جب کہ ستاروں کا اقتران برج میزان میں ہوا تھا، مانی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ طوفان کی بحث و تمحیص میں انوری نے بھی حصہ لیا تھا اور کہ وہ ان لوگوں میں تھا جو طوفان کے ظہور کے حق میں اعتقاد رکھتے تھے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ طوفان کے سلسلے میں ایک آدھ تلمیح جیسا کہ گزشتہ اوراق میں دیکھا جا چکا ہے، انوری کے کلیات میں پائی بھی جاتی ہے۔ اب یہ خیال کرنا کہ انوری برابر اسّی سال تک شعر کہتا رہا واقعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کی عمر ایک صدی سے زیادہ تسلیم کرنی ہوگی، اور جہاں تک معلوم ہے اس کی درازیِ عمر کی بابت کوئی روایت موجود نہیں۔

کلیات سے اس قدر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کی مدت شعر گوئی زیادہ سے زیادہ تیس سال رہی، اس کے بعد وہ تائب ہو کر عزلت گزیں ہو جاتا ہے

سی سال در طریق تحیّر دلم شتافت
اکنوں رسد مگر در تو برکراں رسید (ص ۱۷۲)

دیگر

کسے کہ مدت سی سال شعر باطل گفت
جدائے بر ہمہ کا میش داد پیروری (ص ۴۳۷)

رُباعی

سی سال درخت بخت من بار آورد ۔۔۔ چرخ ایں ستم برشئے تیار آورد

مرحبا ای تو ہست اقسم — بیش از مساحت کشور
مدتے شد که تا بداں امید — چشم دارد براه و گوش بدر
ہست ہنگام آں که مار کند — بر سر او ہمائے چتر تو پر
حلقه بر گوش چرخ کرد ہر آنک — کرد روئے عنایت تو نظر
بنده را گوشمال داد بسے — بعنایت یکے درو بنگر
صله دادن ترا سزاوار است — زاں که آں دیدۂ رحق دیدہ
بیخ گاں را نشاند دستِ قضا — شاخ آں عز کرم بیار و بر
نیست نادر زخانداں نظام — دانش و رادی و دُکا و ہنر
نور نادر نه باشد از خورشید — بوے نادر نه باشد از عنبر (ص۵۹)

یہی عرضِ حال کسی قدر شکایت کے لہجے میں دیل کے ابیات میں کیا گیا ہے۔

ماحیا بنده را دریں یک سال — در مدیح تو شعرہاست متیں
وا اندر ابیات آں معانی بکر — چوں خط و لفظ تو خوش و شیریں
ہر که او را وسیلتے ست چناں — نه ہما نا که حالتے ست چنیں
گه زخاک تجرّدش بستر — گه زخشت تو فقرش بالیں
آمد ایں روزگار حالی را — گر نگاه تو دار اویں تمکیں
خود نه پرسی یکے زروئے حساب — تا چه می خواہد از من ایں مسکیں
وقت کوچ ست عرصه تنگ مرا — دل به تیمار حسرت راه زمیں
نیست در سکۂ زمانه کسے — کاضطراب مرا دہد تسکیں
توکس احساں که ہر که جز تو بود — ننہد پا اداں سوئے تحسیں (ص۴۲)

لیکن دیل کے اشعار میں یہ مودبانہ شکایت ستمگر مردانہ لہجے میں بدل جاتی ہے۔

سب کی سب ۵۴۲ھ کے بعد کے واقعات کے متعلق ہیں۔ مثلاً تسخیر ہزار اسپ ۵۴۲ھ، جنگ سلطان سنجر و علاء الدین غوری جہانسوز ۵۴۷ھ، وقت سنجر بعراق ۵۴۷ھ، وفات ابوالفتح ناصر الدین طاہر وزیر سلطان سنجر ۵۴۸ھ، فتنۂ غزاں ۵۴۸ھ، مقامات حمیدی ۵۴۹ھ، وفات سلطان سنجر ۵۵۲ھ۔

ان وجوہ کے زیر اثر یہ نظریہ قائم ہوتا ہے کہ انوری کی شاعری غالباً ۵۴۲ھ ہجری سے چند سال پہلے شروع ہوتی ہے اور یہ صدر الدین محمد نظام الملک معز الدین کا فرزند نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہے جو اگرچہ وہی نام و خطاب اور منصب رکھتا ہے لیکن زمانے کے لحاظ سے صدر الدین محمد مذکور الصدر سے بہت مؤخر ہے۔

سنجر کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کی غرض سے انوری سب سے پیشتر ابوالفتح ناصر الدین طاہر بن معز الملک بن نظام الملک کے دربار سے جو جمادی الاولیٰ ۵۴۵ھ سے ۵۴۸ھ تک سنجر کا وزیر تھا، تعلق پیدا کرتا ہے۔ ایک عرصہ امیدواری کرنے کے بعد طاہر کو اپنی طرف توجہ دلاتے ہوئے گویا ہے

ای بزرگی کہ از بزرگی و جاہ — ہر کہ در خدمت تو یافت ظفر
گرد میروں ز دست ہمت پائے — برد از دولتت بکیوان سر
بگذشت از فلک بمرتبہ آنک — کرد روزے بدرگہ تو گذر
بندہ نیز از بحکم امیدے — مدتے گشت از در حجب مستتر
عاجزے بود کرد با تو پناہ — از بد روزگار بدگوہر
بطلے بود دامن تو گرفت — از جفائے سپہر دون پرور
طمعش بود کر خزانۂ جود — سپہ نیازش کنی بجامہ و زر
گرد داز دست بخشش تو سخی — یابد از فر دولت تو خطر

کعبهٔ دلیر ستم جو ویلهٔ فصیلش — سجده کنان بر زمین بهاد چنین را
سپهر بیج شهاب کلک تو لیس بود — رجم جان صد هزار دیو لعین را
خود مدد تیغ پادشاه بچه کار است — خاصه تنها که کارهای چنین را
هیبت خوارزم شاه کرد بیستش ماه — چشمه خون کرد چشم حادثه بین را
دست لعزآک اصطناع تو در رد — معتصم ملک کرد حبل متین را ؁

تسخیر ہزار اسپ کے واقعات یہ ہیں کہ جب ۵۳۶ھ میں سلطان سنجر اتسماں سپہ سالار گورخاں سے جنگ میں مصروف تھا، اتسز خوارزم شاہ خراساں آکر مرو اور نیشاپور کو لوٹ لیتا ہے، سنجر اس کی اس حرکت پر جب فوج کشی کی دھمکی دیتا ہے تو خوارزم شاہ جواب میں ایک قطعہ لکھتا ہے جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

اگر باد پایست رخش ملک — کمیت مرا پائے ہم لنگ نیست
تو ایں جا بیائی من آں جا روم — خدائے جہاں را جہاں تنگ نیست[۱]

سنجر ۵۴۲ھ میں ہزار اسپ کا محاصرہ کرتا ہے، اثنائے تسخیر میں اوحد الدین انوری یہ رباعی لکھتا ہے ؎

اے شاہ ہمہ ملک زمیں حسب تراست — وز دولت و اقبال جہاں کسب تراست
امروز بیک حملہ ہزار اسپ بگیر — فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست

یہ رباعی ایک تیر کے ذریعے سے قلعے میں ڈلوا دی گئی۔ محصورین کی طرف سے رشید الدین وطواط نے جواب میں ذیل کی رباعی لکھی یا بھیجی

اے شہ کہ بجامت مئے صاف ست نہ دُرد — اعدائے ترا ز غصہ خوں باید خورد
گر خصم تو اے شاہ بود رستم گرد — یک خر ز ہزار اسپ تو نتواند برد

۱؎ راحت الصدور ص ۱۷۴ سال ۱۹۲۱ء۔

بندہ سالے ست تا درین حضرت | کہ بہ ہنگام دگہ بے ہنگام
دہد ازعاس دیگرت رحمت | آرد از نوع دیگرت ابرام
آں ہمی بیند از نہادن حویش | کہ ندان ہست مستحق ملام
واں ہمی بیند از مکارم تو | کہ لبستر عشق تواں بود قیام
شد مکرم رعایت کرمت | کرم الحق چنیں کنند کرام صفحہ ۲۹۳

دیگر

بندہ سالے ست کہ تا در کنف دولت تو | عمر ایام بسر بردست چہ اکثر چہ اقل
در ہمہ با او فلک آں کرد از بیش ہمی | کاتش و آب کند با شکر و موم و عسل
گاہ با صرصت بریدے زسماک رامح | گاہ با کمرت عرسے رسماک اعزل
رولیش از عصۂ ایام بر دشمن و دوست | داشتے چوں گل خود رو از حوف وجل
گوش کار ہ شود از قصۂ او لا تسمع | ہوس والہ شود از عصۂ او لا تسأل
بحت میداد قولہ دآں کہ بہ گیجت چنیں | دولت حصۂ اورا رجاں خواہ گسل
لندالحمد کہ تا جستہ ہمی باید لست | درقطار نعش نیز نہ باشم بہ حمل
شد رفرت تو ہمہ معتبر چو تجویف داع | گرچہ شے بود ہمہ پوست چو ترکیب بصل ص ۲۹۰

کلیات میں الوالفتح طاہر کی تعریف میں قصائد کثرت سے ملتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلی تاریخی تلمیح ۵۴۷ھ سے تعلق رکھتی ہے جب کہ شاعر نے اس کے حیر مقدم میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع گزشتہ سطور میں درج ہو چکا ہے۔

دوسری تلمیح جو اشعار ذیل میں پائی جاتی ہے تسخیر ہرار اسپ سے تعلق رکھتی ہے۔ انوری ناصرالدین طاہر کو خطاب کر کے کہتا ہے۔ ع

حصن ہزار اسپ اگرچہ رد رآں ملک | سد قدیم ست حصنہا ے حصیں را

اور مسند وزارت پر اس کے دوبارہ تقرر پر یہ قصیدہ لکھا ہے

شرف گوہر اولاد نظام ملک را یار شرف ساد نظام
خواجہ مملکت و حاکم عصر ناصر الدین و نصیر اسلام
بو المظفر کہ بعون ظفر ش عدل شد ظلم و صبا گشت ظلام

ذیل میں کوشش کی جاتی ہے کہ انوری اور سلطان سنجر کے تعلقات پر کسی قدر روشنی ڈالی جائے۔

سلطان سنجر

یاد رہے کہ کلیات میں سلطان سنجر بن ملک شاہ ۵۱۱ھ و ۵۵۲ھ کی مدح میں بہت کم قصائد ملتے ہیں، عام روایات اگرچہ انوری کو سنجر کا خاص شاعر مانتی ہیں، اور یہ بھی بیان کرتی ہیں کہ سلطان کی نظروں میں انوری کی قدر اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ خود دو مرتبہ سنجر اس کے مکان پر جا کر انوری کی عزت افزائی کرتا ہے۔ لیکن کلیات ان بیانات کی تائید نہیں کرتا۔ اور نہ قصائد میں ایسے اشارے پائے جاتے ہیں جن کی بنا پر شاعر کے ساتھ سنجر کے نہایت گہرے تعلقات تسلیم کیے جائیں۔

قصائد کی زبان میں بالعموم ایک تصنع اور تکلف کی ادا شروع سے آخر تک محفوظ ہے اور وہ بے تکلفانہ لہجہ جو ایک دیرینہ مداح اپنے ممدوح کے حق میں اختیار کر لیتا ہے، بالکل مفقود ہے، نہ کہیں صلہ مانگا گیا، نہ عطیہ کا شکریہ ادا کیا گیا اور نہ کہیں عرض حال ہے۔ شاعر صرف دو موقعوں پر البتہ اپنے متعلق کچھ کہتا ہے پہلا وہی جہاں اپنی دہ سالہ امید واری کی بابت کہتا ہے۔

پھر ایک قطعے سے جو راحت الصدور میں بھی دیا گیا ہے، اس قدر معلوم ہوتا

کچھ عرصے کے بعد قلعہ فتح ہوتا ہے، اور انوری سلطان کی زبان سے یہ رباعی لکھتا ہے ؎

اندیشۂ انتقام چوں جزم کنیم — وین ہمہ دشمناں بیک جزم کنیم
با چرخ چو با انسز اگر رزم کنیم — گردوں سُم اسپ چو خوارزم کنیم [illegible]

کلیات میں متعدد مقامات پر ایسے اشارے پائے جاتے ہیں، جن کی رُو سے کہا جا سکتا ہے کہ سنجر اپنے وزیر طاہر کو کچھ عرصے کے لیے معزول یا معطل کر دیتا ہے اور وزارت کسی اور کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ اس واقعہ کی اطلاع کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ لیکن ذیل کے اشعار اس بیان کی تائید کے لیے کافی ہیں۔ ابیات

اگرچہ طائفۂ در حریم کعبۂ ملک — ورائے پایۂ خود ساختند ماوی را
بہ پنج روزہ ترقی بہ سقف او برسد — چولات دعوی اطراف تاج عزیٰ را
شکوہ مصطفویت آحرار طریق لقاء — رطا قہاش در افگند لات عزیٰ را
طریق خدمت اگر بسپرند باکے نیست — زمانہ نیک شناسد طریق اولیٰ را [illegible]

دیگر

خصم ار بکمال تو تشبہ نکند بہ — نامی چہ کند مار دے بید ست علم را
بخت است رہین است کہ رہ گم کند اقبال — گر میل کند دشمن مدحت ورم را
خیرہ است مگر خصم تو زیرا کہ نباید — در ہیچ عمل منصب او بیش سہ دم را [illegible]

دیگر

بود سے بالش تو صدر وزارت خالی — بود بے حشمت تو کار ممالک مختل
خصم اگر دولتکے یافت بصد حیلہ ترا — روز کے چند نگہداشت بتزویر و حیل
آخر الامر در آمد بسر اسپ جلیش — تا در افتاد بیک واقعہ چوں سر وجل

چچا کی خدمت میں غزنی پہنچ گیا۔ چچا بھتیجوں میں جو غلط فہمی تھی دُور ہوگئی اور جنگ کا خطرہ بالکل جاتا رہا۔ مسعود اٹھارہ روز تک یا جب تک سنجر غزنی میں رہا، چچا کی خدمت گزاری میں مصروف رہا۔

تیسری تلمیح سلطان سنجر اور علاء الدین غوری جہاں سوز کے مابین دراوہ پر محاربے کے متعلق ہے۔ شاعر سنجر کو خطاب کرکے کہتا ہے ؎

بندہ دریں مختصر عرض کہ تو گفتی — آیت تفصیل آں چہ روز مبین ست
قاعدۂ تہنیت ہمی نہ نہد زانک — خصم نہ معفو زجائے غور بہ چین ست
گرچہ ہنوز از عدو بلشکر حشمت — تجربۂ کوہ پرند لئے این ست
ورچہ زتیغ مبارزاں سپاہت — سنگ بجوں مخالفات عجین ست
ماچو تو صاحبقراں مذکر سپر رد — دین سخن الہام آسمان برین ست

علاء الدین ۵۴۴ھ میں تخت نشین ہوکر اور بہرام شاہ بن مسعود پر فتح پاکر غزنی پر قابض ہوجاتا ہے۔ اور وہ اخراج جو ملوک غور ہر سال بطور خراج سنجر کو بھیجا کرتے تھے بند کردیتا ہے۔ یہ استبداد دیکھ کر سنجر بقصد جنگ غور کی طرف بڑھتا ہے اور اوبہ پر مقابلہ ہوتا ہے۔ عین جنگ کے وقت چھ ہزار سوار ترک، غز اور خلجی علاء الدین کو چھوڑ کر سنجر سے مل جاتے ہیں جس سے غوریوں میں بددلی پھیل جاتی ہے، تاہم وہ لڑتے ہیں اور شکست کھاتے ہیں۔ علاء الدین گرفتار ہوجاتا ہے۔ بقول نظامی عروضی یہ جنگ ۵۴۷ھ میں ہوئی تھی جس میں خود نظامی بھی شریک تھا۔

مجد الدین ابو الحسن عمرانی

سنجری دور میں انوری کا سب سے بڑا ممدوح مجد الدین ابو الحسن

ہے کہ سنجر نے ایک مرتبہ اپنے سامنے بلوا کر اس کے اشعار سنے تھے اور بیٹھنے کا حکم دیا تھا، وہ قطعہ یہ ہے ؎

انوری را حسد اَیگان جہان — بیش خود خواند و دست داد و نشاند
بادہ فرمود و شعر خواست ازو — و بدراں سحر کرد و دُر افشاند
چون بمستی برفت بار دگر — کس فرستاد و پیش تخت خواند
ہمہ بگذار، این بس کہ ملک — نام او در رکاب اعلیٰ راند
بیش ازین در زمانہ دولت نیست — ہیچ باقیش در زمانہ نماند

یہ امر قرین قیاس ہے کہ انوری سنجر کے دربار میں اس کے آخری ایام سلطنت میں پہنچتا ہے، پہلی تلمیح وہی ہے جو قلعہ ہزار اسپ کی تسخیر اور ۵۴۲ھ سے تعلق رکھتی ہے۔

دوسری تلمیح غالباً سلطان سنجر اور سلطان مسعود سلجوقی کی ملاقات سے علاقہ رکھتی ہے اور اشعار ذیل میں پائی جاتی ہے ؎

گفتم کہ حدیث عراق گویم — در خود ہمہ بیتے سہ چار باشد
چون سالک معانی نظام دادم — تا زاں سخنم آب دار باشد
الہام الٰہی چہ گفت، گفتا — آں را کہ خرد ہیچ یار باشد
چون سایۂ ما مدیح گوید — با ذکر عراقش چہ کار باشد
خسرو بسر تازیانہ بخشد — چون ملک عراق از ہزار باشد

سنجر ملک عراق کی بدنظمی کے حالات سُن کر جو اُن دنوں سلطان مسعود سلجوقی کے زیر نگیں تھا اواخر شعبان ۵۴۷ھ میں رے جاتا ہے۔ مسعود اُن دنوں ہمدان میں تھا چچا کی آنے کی خبر سُن کر اُس نے بالا بالا بغداد جانے کا قصد کیا لیکن شرف الدین موحد کے مشورے سے وہ اس ارادے سے باز آ کر سیدھا

سایہ تنگی رحدیتے انقلابے کاو شاد   کاں شناول جاو دتہ است از روے دور منقلب
کان و دریای منہ درجس دل اضطراب   واں کہ کاں پیوستہ موست و دریا مضطرب

---

۴)
ہیچ میدانی کہ در گیتی ز مرگ بوالحسن   چرخ جز قحط کرم دیگر چہ حادثہ زائدہ
اے دریغا آں کہ چوں یادش کند گوید جہاں   اے دریغا حاتم طائی و معن زائدہ
مدۂ روزی در آمد خواجہ بے رودی ساق   یاد می کن ربنا انزل علینا مائدہ

---

۵)
بس دور کہ چرخ و اختراں بگزارند   تا مرد دستے چو بوالحسن باز آرند
بو حیدر ہاشمی و کو حاتم طے   تا ماتم مردمی و مردی دارند

---

۶)
تا حادثہ قصد آل عمراں کردہ است   کس نیست کہ او حدیث احساں کردہ است
احساں زکساں بوالحسن بود مگر   کو ہمچو کسال سر روئے پنہاں کردہ است

اِن ہی ایام میں خواجہ مودود ابن احمد عصمی سے جو خاندان نظام الملک کا ایک رکن ہے، تعلقات ہو جاتے ہیں۔ متعدد قصائد خواجہ مودود کی مدح میں لکھے گئے ہیں لیکن خواجہ سے بے فیض، انوری نے آخر کار تنگ آکر لکھا۔

مودود احمد عصمی عشوہ ایم داد   گفتم کہ او مسرت و سر آخر تنگ است
اعت شدم بخدمت او تا شدم چنانکہ   حال سگاں بوالحسن از حال من بہ است

اب ہم اس دور میں آجاتے ہیں جو تاریخ میں حادثۂ غز کے نام سے مشہور ہے۔ قبائل غز ترکمانوں سے علاقہ رکھتے تھے اور خاص علاقۂ بلخ میں ان کو مویشیوں کے لیے رمنے بنا دیے گئے تھے۔ وہ چوبیس ہزار بکریاں بطور خراج سالانہ سلطانی مطبخ میں دیا کرتے تھے لیکن خوان سالار سلطانی

عمرانی ہی۔ شاعر خلوص دل سے اس کا سپاس گزار معلوم ہوتا ہی، اس کا زمانہ معلوم نہیں، لیکن انوری نے ایک مقام پر اس قدر کہا ہی ؎

عدد سالہائے عمر شش باد
ہمچو تاریخ پانصد وچل داد
ص ۱۵۱

ایسا معلوم ہوتا ہی کہ ابوالحسن کی جواں مردی اور فیاضی نے اُس کے دل پر گہرا نقش بٹھایا ہی جب وہ اپنے عروج امارت پر تھا، انوری نے اس کی تعریف میں خوب خوب قصیدے لکھے جب وہ گرفتار ہوکر حبس میں بھیج دیا جاتا ہی، شاعر اُس کو نہیں بھولتا، بلکہ اپنے اشعار سے اُس کی تسلی کرتا ہی اور ڈھارس بندھاتا ہی۔ آخر ابوالحسن قتل کیا جاتا ہی، انوری اب بھی اس کے ساتھ وفادار رہتا ہی اور اس کے احسان اور خوبیاں اپنے ابیات میں بیان کرتا ہی۔ ابوالحسن کے قتل کے واقعے سے پندرہ سال بعد تک بھی اس کی یاد انوری کے صفحۂ دل سے محو نہیں ہوتی۔

ذیل میں ان نظموں سے بعض اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

(۱)
در احساں نگو کہ بکشاید
بوالحسن را چو تختہ بند کنند
ص ۶۴

(۲) اختیار روزی خلق آسمان آغاز کرد — آدمی راد از بقا یکبارگی مایوس شد
خلق را لے دھر روزی عمر شاید بود لی — دھر روزی از کجا چوں بوالحسن محبوس شد
لے جہاں را بود دمیاد از طریق مکرمت — چوں تو مستاصل شدی یکبارگی مدروس شد (ص ۶۴)

قید خانے میں اس کی تسلی کے لیے یہ نظم بھیجتا ہی ؎

(۳) گرچہ در دور تو لے دریا دل و کان دستگاہ — مدتے گرگاں شبان بود و دوزداں محتسب
وارداں زاں دوراں کہ انصاف تو روئے اندر کشید — فتنہ ہا شد درستیزوں قصد ہا شد منشعب

شمارا پادشاہ ہفت کشور　　رسانیدہ میری ار بحاساں
برور کودکی حصہ کہ وہ　　بسے درپیش دکاں رواساں
ہر شہرے ز نام غز شنودن　　شدہ چوں دیو از آہن ہراساں
فلک گفراں نعمتہائے سنجر　　طلب کردار شما ناحق شناساں
نہے درماندگاں بے عمیّت　　نہے حرسدگاں ناسپاساں
کسے خود زاد و بوم وملک اقطاع　　چنیں بیروں دہد از دست آساں
مسلّم ہیں کہ چوں بیروں کشیدند　　شمشیر از　　زن تاں خراساں

قاضی حمید الدین، صاحبِ مقاماتِ حمیدی نے ذیل کا قطعہ لکھا ؎

حکیم کوشنکی را بخواب دیدم دوش　　زباں کشادہ بمدح صادران سپاہ
بہ راہ طعنہ وطنز و تماخرہ می گفت　　چہ گزاردہ ہریک حقوق نعمت شاہ
فسوس زیرکاں شما کمیت وسمند　　دریغ زر زرو فرق شما قبا وکلاہ
رہین کافر کفرانِ نعمت آوردہ　　گر بحتید چو اربیتس تو حیل گناہ
نہ دیدہ گرد سپاہِ سیاہ پوشس ہنوز　　کہ گشت صبح سپید شما چو شام سیاہ
زبس تعجب کفار حملہ می گفتند　　زہے جماعت غز لا الہ الا اللہ

فتح کے بعد غزوں نے مرو کا رُخ کیا، یہ شہر اُن ایام میں عروس البلا کا حکم رکھتا تھا اور داؤد چغری بیگ کے زمانے سے دارالملک رہا تھا۔ امر کی دولت کی کوئی انتہا نہیں تھی، خزائن اور دفائن سے معمور تھا۔ غز تین روز تک شہر کو غارت کرتے رہے۔ اکثر باشندے گرفتار ہوئے اور طرح طرح کے شکنجوں میں ڈالے گئے تاکہ پوشیدہ خزانوں کا سراغ بتائیں، قتل و غارت اور خوں ریزی ایک وسیع پیمانے پر عمل میں آئی۔ عورتوں کی عصمت دری کی گئی انوری غالباً ان ہی واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہوا کہتا ہے ؎

کی زیادہ ستانی اور سخت گیری سے یہ لوگ تنگ آکر آمادہ جنگ ہو گئے، او
مدرانہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ امیر قماج والی بلخ نے آخر یہ معاملہ
سلطان سنجر کے گوش گزار کیا۔ ان کی تنبیہ و تادیب کے لیے اجازت حاصل
کی اور فوج کشی کر دی۔ اس مہم میں قماج اور اس کا فرزند علاء الدین مارے
گئے اور فوج نے شکست کھائی۔ اب یہ مشورہ قرار پایا کہ سلطان بذات خود
لشکر کشی کرے۔ غز سردار بہت ڈرا نادان دینے پر آمادہ تھے اور سنجر بھی قبول
کرنا چاہتا تھا، لیکن امرائے دربار اس مصالحت کے بالکل خلاف تھے جن
میں موید کا نام قابل ذکر ہے۔ بہر حال جنگ کی ٹھن گئی۔ ادھر اہل لشکر جنگ کے
خلاف تھے۔ انھوں نے کوئی تندہی نہیں دکھلائی، ادھر غز جان توڑ کر
لڑے اور میدان ان ہی کے ہاتھ رہا۔ شاہی افواج کو شکست فاش ملی اور
سلطان گرفتار ہو گیا۔[۵]

اس میں شک نہیں کہ یہ مہم شروع ہی سے ایک غلطی تھی، اس ہزیمت
اور اس کے ہولناک نتائج کا الزام شعرائے عہد اہل فوج کے سر تھوپتے ہیں،
بلکہ اُن کو بے حمیتی، بزدلی اور جبن کا مجرم قرار دیتے ہیں، ان کی یہ رائے ہیں
ماور کر لینا چاہیے۔

حکیم کوشکی نے، جو اس عصر کا مشہور ہزال ہے، امرائے سنجری کے خلاف
کئی نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں سے ایک یہاں نقل کی جاتی ہے :

ایا شمشیر زن ترکاں بزدل ۔۔۔ نشستہ اری و تاتار و کاشاں
بکایک در خراسان پر دریدہ ۔۔۔ مدار و نعمت و دولت تن آساں

---

۵ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راحت الصدور صفحہ ۱۷۷ مرتبہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال
طبع یورپ ۱۹۲۱ء۔

ہراتیوں نے اپنی قوتِ بازو اور مردانہ جد وجہد سے رستگاری حاصل کی۔ جہاں جہاں غزوں کا قدم گیا، اُن کے عقب میں قحط و وبا اور عالمگیر تباہی نے اپنا چہرہ دکھایا۔ غز ملک میں چاروں طرف پھیل چکے تھے اور اپنی تباہ کُن سازش کے مقاصد اکام کو پہنچا چکے تھے۔ باشندے ان کے خوف سے جنگلوں، پہاڑوں اور کنوؤں میں چھپتے پھرتے تھے۔ سنجر کے جرنل اور کپتان جنھوں نے اس کے اقبال کے دور میں بیسیوں میدان مارے تھے اور مشہور مہمیں سر کی تھیں، ان غیر متمدن وحشیوں کے نام سے لرزتے تھے۔ خراساں میں جنگجو طبقے کی کمی نہیں تھی، لڑنے والے اور ملک کی حفاظت کرنے والے کافی تعداد میں میسر آسکتے تھے، لیکن ان کو ترتیب دینے اور حیطۂ انتظام میں لانے والا کوئی نہ تھا، مخلوق کی آنکھیں سنجر کو ڈھونڈھ رہی تھیں اور سنجر اُن میں موجود نہ تھا۔ اِن صورتہا حالات میں بعض وطن پرستوں نے خان سمرقند[1] کے نام ایک سفارت بھیجنا چاہی جس کے ذریعے سے وہ ملک کی حالتِ زار بیان کرکے خاقان سے امداد و استعانت اور مداخلت کے مستدعی ہوئے۔ خراسانی اس سفارت کے لیے یوں اور بھی آمادہ ہوئے کہ سال گزشتہ خاقان نے غزوں کے خلاف ایک مہم بھی سر کی تھی۔ یہ سفارت غالباً سنہ [illegible]ھ اور سنہ [illegible]ھ کے درمیان بھیجی جاتی ہے۔ خواجہ کمال الدین جو فضلائے عصر میں بے مثل عالم اور سنجر کے دربار میں بہت رسوخ رکھتے تھے، اس سفارت کے قائد اعظم تھے۔

یہ انوری تھا، جس نے سفارت نامہ کا مضمون نظم میں تیار کرکے دیا۔ خراسانیوں کا یہ فریاد نامہ ایک ایسی دستاویز ہے جو بلحاظ پاکیزگی جذبات، علو تخیل، اور صفائی زبان فارسی نظموں میں ایک بے مثل چیز ہے۔ اس میں عبرت، حسرت، تباہی اور مظلومی کے نقشے کو نہایت صحیح الفاظ میں کھینچا ہے،

---

[1] اس سے مراد غالباً رکن الدین محمود خان سوم بن ارسلان [illegible]ھ ہے جو سنجر کا مخدوم تھا

نعلم نیست کہ چندیں ہزار نفس نفیس — چہ زن چہ مرد چہ پیر و جواں چہ شاہ چہ گداہ
باضطرار دریں ورطہ او فتاد و نزیست — بلے اگرچہ یکے را دریں نبود گناہ
زخون کشتہ جیحوں ست رود مرو ہنوز — کہ در گزار نماند ماہیان بشناہ
مدتہاش رس کشتہ بعد چندیں سال — عجب مدار کہ ارغوں بود بجائے گیاہ

جب مرو کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تو غزوں نے نیشاپور کا رخ کیا۔ شاہی فوج کے لوگ بھی ان کے شریک ہو گئے تھے۔ ابتدا میں شہریوں نے مدافعت کے لیے ہاتھ پاؤں مارے، لیکن غزوں کی کثرت سے بہت جلد مغلوب ہو گئے، جامع مسجد منیعی میں اکثر عورات، اطفال اور ذکور، جو بغرض پناہ جمع ہوئے تھے، قتل کر دیے گئے، مسجد مطرز میں آگ لگا دی گئی اور اس کے شعلوں کی روشنی میں رات بھر شہر لٹتا رہا۔ شیخ محمد اکاف اور امام محمد بن یحییٰ جیسے پاک نفوس شکنجوں میں ڈالے گئے اور بیدردی سے ہلاک کیے گئے۔ خاقانی موخر الذکر کے مرثیہ میں کہتا ہے ؎

در دولت محمد مرسل نداشت کس — فاضل ترا ز محمد یحییٰ قفائے خاک
آں کرد در تہلکہ دنداں فدائے سنگ — ویں کرد روز قتل دہاں را فدائے خاک

دیگر

گردوں سر محمد یحییٰ بباد داد — محنت نصیب سحر مالک رقاب شد

دیگر

چرخ از سر محمد یحییٰ ردا ربود — دہر از سر سعادت سحر کلاہ برد

خراساں کے اور امصار کے ساتھ بھی غزوں نے یہی سلوک روا رکھا، صرف ہرات نے کامیابی کے ساتھ مدافعت کی، اور اس تباہی اور بربادی سے جس نے خراساں کو ایک دو نسلوں کے لیے بے چراغ کر دیا تھا،

تا کنوں حال خراسان و رعایا بودہ است — بر خداوند جہاں خاقاں پوشیدہ مگر
نے نبودہ است کہ پوشیدہ نباشد بروے — ذرۂ نیک و بد نہ فلک و ہفت کشور
کارہا بستہ بود بے شک در وقت کنوں — وقت آں ست کہ راند سوئے ایراں لشکر
خسرو عادل خاقانِ معظم کہ حد — پادشاہست جہانش ز پدر تا بہ پدر
دائمش فخر بدیں ست کہ در پیش ملوک — پسرش خواند سلطان سلاطین سنجر
باز خواہد ز غزاں کینہ کہ واجب باشد — خواستن کینِ پدر بر پسر خوب سیر

انوری کی شاعری کا ساغر مدح و قدح کی صاف و دُرد سے ہی لبریز نہیں ہے بلکہ اس کی سطح کے نیچے الم و درد و یاس کا عنصر بھی اپنا نشیمن بنائے ہوئے ہے، جو ضرورت کے وقت بجلی کی سی سرعت کے ساتھ سطح سے اُبھر کر فضائے بسیط میں طوفان یاس و حسرت بپا کرنے کی قابلیت رکھتا ہے اس کے کمال کے اس پہلو کو، افسوس ہے ہمارے ہاں بالکل ہی فراموش کر دیا گیا ہے

اب شاعر خاقاں کو خطاب کرکے یوں عرض مطلب شروع کرتا ہے ؎

اے کیومرث بقا پادشہ کسریٰ عدل — وے منوچہر لقا خسرو افریدوں فر
قصۂ اہل خراسان بشنو از رہ لطف — چوں شنیدی ز سر رحم در ایشاں بنگر
ایں دل افگار جگر سوختگاں می گویند — کاے دل و دولت و دیں را بتو شادی و ظفر
خبرت ہست کزیں زیر و زبر شوم غزاں — نیست یک پے ز خراساں کہ نشد زیر و زبر
بر بزرگانِ زمانہ شدہ خرداں سالار — بر کریمانِ جہاں گشتہ لئیماں مہتر
بر در دوناں احرار حزین و حیراں — در کف رنداں ابرار اسیر و مضطر
شاد الا بدر مرگ نہ بینی مردم — بکر جز در شکم مام نیابی دختر
مسجد جامع ہر شہر ستوراں شاں را — پایگاہیست کہ نہ سقفش پیدا ست نہ در
خطبہ نکنند بہر خطہ بنام غز ار آنک — در خراساں نہ خطیب ست کنوں نہ منبر

واقعات کے بیان کرنے میں مبالغے سے کام نہیں لیا حقیقت و واقعیت کی لہر شروع سے آخر تک موج زن ہے۔ اگر انوری کا اور کلام ہم تک نہیں پہنچتا اور صرف یہی نظم اس کی یادگار رہتی تو تنہا اس نظم کے اعتبار پر اس کا شمار ایران کے بہترین شعرا میں کیا جا سکتا تھا۔ نظم کیا ہے، ایک سیلاب اشک ہے جو خراسان نے اپنے ایتام، شہدا، عصمت دریدہ عورات، سوختہ عمارات، غارت شدہ اماکن، بے چراغ بلاد، پامال شدہ حرمت، اور تلف شدہ دولت کے ماتم میں بہایا ہے۔

انوری کی پیغمبری کے ثبوت میں یہی معجزہ اکتفا کرتا ہے۔ وہ اپنے ملک کو سرتاسر برباد ہوتا دیکھتا ہے، حب وطن اور حسرت کے جذبات اس کے قلب میں موجیں مارتے ہیں، درد اور حمیت اُس پر استیلا پاتے ہیں اور وہ ان جذبات کو کامیابی کے ساتھ شعر کے پیکر میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اس نظم میں شاعر نہ صنائع و بدائع کا منت کش ہے نہ لفظی دل فریبی اور آرائش عبارت کا ممنون احساں ہے، نہ استعارات کے اینچ پینچ میں نہ تشبیہات کی دھوم دھام ہے، سیدھے سادے جملوں میں ان خونیں واقعات کے بعض خط و خال بیان کر رہا ہے لیکن ہر جملہ درد میں ڈھلا ہوا ہے اور ہر فقرہ تاثیر کے رنگ میں ڈوبا ہوا۔ تمہید کے اشعار ہیں ؎

بر سمرقند اگر بگزری اے بادِ سحر
نامۂ اہل خراساں بہ برِ خاقاں بر

نامۂ مطلع آں رنج تن و آفت جاں
نامۂ مقطع آں درد دل و سوز جگر

نامۂ بر رقمش آہِ عزیزاں پیدا
نامۂ در شکنش خون شہیداں مضمر

نقش تحریرش از سینۂ مظلوماں خشک
سطر عنوانش از دیدۂ محروماں تر

ریش گردد ممر صوت از و گاہِ سماع
خوں شود مردمک دیدہ از و وقت نظر

رحم کن رحم بر آنہا کہ نیابند نمد / از پس آنکہ از اطلس شاں بودے بستر
رحم کن رحم بر آں قوم کہ رسوا گشتند / از پس آں کہ بہ ریسائی بودند سمر
گرد آفاق چو اسکندر برگرد ازانک / توئی امروز جہاں را بدل اسکندر
از تو در رزم اے شدہ از بخت موافق نصرت / از تو عزم اے ملک از ملک العرش ظفر
ہمہ پوشند کفن چوں تو بپوشی خفتاں / ہمہ خواہند اماں چوں تو بخواہی مغفر
اے سرافراز جہانبانی کز عنایت و فضل / حق سپردہ است بعدل تو جہاں را یکسر
بہرہ باید از عدل تو پیر ایراں را / گرچہ ویراں شدہ بیروں ز جہانش مشمر
تو چو خور روشنی و ہست خراساں اطلال / نہ بر اطلال بتابد چو بر آباداں خور
ہست ایراں بمثل شورہ و تو ابری و ابر / ہم ببارد بر شورہ چو بہ باغ مطر
بر ضعیف و قوی امروز توئی داور حق / ہست واجب بہم حق صفا بر داور

خواجہ کمال الدین کے ذکر میں گویا ہے

پیش سلطان جہاں سحر کو پرورد تت / اے چو یادستہ داد گر حق پرور
دیدۂ خواجۂ آفاق کمال الدیں را / کہ نباشد بہ جہاں خواجہ از و کامل تر
نیک دانی کہ چہ و تا بہ کجا داشت برو / اعتماد آں شہ دیں پرور نیکو محضر
ہست ظاہر کہ برو ہرگز پوشیدہ نبود / ہیچ اسرار ممالک چہ ز خیر و چہ ز شر
روشن است آں کہ برآں جملہ کہ خور گردو را / بود ایراں را رایش ہمہ عمر اندر خور
و اندراں مملکت و سلطنت و آں دولت / چہ اثر بود از و ہم بسفر ہم بحضر
باکمال الدیں اسباب خراساں گفتند / قصۂ ما بخداوند جہاں خاقاں بر
چوں کند پیش خداوند جہاں از سر سوز / عرضہ ایں قصہ ز رنج و غم و اندوہ و فکر
از کمال کرم و لطف تو رسید تا با / کز کمال الدیں داری خبر ما باور
روشنو حال خراساں و عراق از تہ شرق / کہ مرا دراست ہمہ حال چو الحمد از بر

کشتہ فرزند گرامی را اگر ناگاہاں — بیند از بیم خروشید نیارد مادر

آں کرا صد رہ غز زر ستد و باز فروخت — دارد آں جنس کہ گوئیش خرید است مگر

بر مسلماناں زاں شکل کنند استخفاف — کہ مسلماں نہ کند صد یک ازاں باکافر

ہست در روم و خطا امن مسلماناں را — نیست یک ذرہ سلامت بمسلمانی در

خلق را زیں غم فریاد رس اے شاہ نژاد — ملک را زیں ستم آزاد کن اے پاک گہر

اگر یہی مقصد ہم عبارت میں ادا کرنا چاہیں تو غالباً اس کے لیے بہت زیادہ الفاظ کی ضرورت ہوگی اور اگر اسی قدر الفاظ سے کام لینا چاہیں تو شاید خوبی اور صفائی سے نہ ادا کر سکیں یہ اس قادر الکلام کا کمال ہو کہ نہ زیادہ الفاظ کو کام میں لایا، نہ حشویات کو داخل کیا اور اپنا مقصد خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کر دیا، اور تاثیر بھی پیدا کر دی، جو دلوں کے گداز کرنے میں جادو کی خاصیت رکھتی ہو۔

شاعر عرض حال کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہو ؎

بخدائے کہ بیاراست سماوات و دیار — بخدائے کہ بیاراست بنصرت افسر

کہ کنی فارغ و آسودہ دل خلق خدائے — زیں فرومایہ غز شوم پی غارت گر

وقت آں ست کہ یابند ز رحمت پاداش — گاہ آں ست کہ گیرند ز بیعت کیفر

زن و فرزند و زر جملہ بیک حملہ ببرد — ردی، امسال زناں شاں بدگر حملہ ببر

آخر ایراں کہ ازو بودے فردوس برشک — وقف خواہد بد تا حشر بریں شوم حشر

ستدی آں حضرت کز عدل تو گشتست چو خلد — خویشتن زیں جا کر ظلم غزاں شد چو سقر

ہر کہ پائے و خرے داشت بحیلت بفگند — چہ کند آں کہ نہ پایست مر او را و نہ خر

رحم کن رحم بر آں قوم کہ بود شے زور — در مصیبت شاں حرنوحہ گری کار دگر

رحم کن رحم بر آں قوم کہ جویند جوے — از پس آں کہ بخوردندے از نار شکر

غز بھی جانے کے لیے ہی آئے تھے، وہ ایک طوفان بے تمیزی کی طرح اُٹھے خراسان، عراق، کرمان اور غزنہ پر چھا گئے اور کچھ عرصے کے بعد ہنڈیا کے ابال کی طرح بیٹھ گئے۔ لیکن اس سے قبل وہ عام بربادی اور عالمگیر تباہی کے کام کو خاطر خواہ تکمیل تک پہنچا چکے تھے۔ اب سنجر غزوں کی قید سے آزاد ہو کر وفات بھی پا چکا ہے، اور انوری شہر بلخ میں مستقل سکونت اختیار کر چکا ہے۔ ان ایام میں طغرل تگین بلخ کا حکمراں ہے اور آزاد حاکم معلوم ہوتا ہے۔

انوری کے کلیات میں دو تین قصیدے اور چند قطعات اس کی مدح میں ملتے ہیں، لیکن کوئی قابل ذکر تعلق نہیں معلوم ہوتا۔ طغرل تگین کے دور میں انوری کی زندگی کا وہ ناخوشگوار واقعہ پیش آتا ہے جسے ہجو بلخ کے نام سے پکارا جاتا ہے، اور جو کسی قدر تفصیل کے ساتھ دوسرے مقام پر بیان ہو چکا ہے۔

میں یہاں چند الفاظ انوری کے سوگند نامے کی بابت کہنا مناسب سمجھتا ہوں۔ یوں تو اس کی اکثر نظمیں چیدہ، منتخب اور لطیف ہیں لیکن یہ نظم اُس کی چوٹی کی نظموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ سوگند نامہ انوری کی اعجاز نگاری کی مثال میں بلا خوفِ تردید پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس نظم میں اس کی شاعری اپنے بہترین معیار اور انتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے۔ موقع نہایت نازک تھا۔ دشمن ایسا کام کر چکے تھے اور ہجو کا الزام اس کے سر منڈھ دیا گیا تھا اور غضب یہ ہوا تھا کہ بلخیوں کے جذبات اس کے برخلاف مشتعل ہو چکے تھے، جو غالباً اس کے گھر پر چڑھ آئے۔ اس کی ہجو کا جوش ابھی فرو نہیں ہوا تھا، بالکل ممکن تھا کہ اور دست اندازی کی جاتی اور عزت کے ساتھ جان پر بھی حملہ ہوتا۔ انوری خود بے جا تہمت طرازیوں، بے حرمتی کے رنج اور جان کے خوف جیسے مختلف جذبات کے اثرات سے مغلوب

میں نے اس نظم کے ذکر میں کسی قدر طوالت سے کام لیا ہے، صرف اس خیال کی بنا پر کہ ہمارے ہاں اب تک اسے قرار واقعی اہمیت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ مولانا شبلی نے اُسے فراموش نہیں کیا ہے مگر میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اس سے بہتر توجہ کی مستحق ہے۔ یورپ میں اس کی وقعت ایک عرصۂ دراز سے معلوم ہے اور ایک سے زیادہ مستشرق نے اس کے ترجمے پر قلم اُٹھایا ہے۔

۵۵۱ھ میں قاضی حمید الدین کی مشہور کتاب مقاماتِ حمیدی تصنیف ہوتی ہے، انوری قطعۂ ذیل اس کی تقریظ میں لکھتا ہے ؎

ہر سخن کاں نیست قرآں یا حدیث مصطفےٰ	از مقامات حمید الدین شد اکنوں ترہات
اشک اعمیٰ داں مقامات حریری و بدیع	پیش آں دریائے مالامال از آب حیات
شاد باش اے عنصر محمودیاں را روح تو	زاں کہ تو محمود عصری ما تبان سومنات
از مقامات تو گر فصلے نخواہم بر عدو	جائے از نامنطقی حد راصم یا درنجات
عقل کل خطے تامل کرد از ذوکت اڑ	علم اکسیر سخن داند مگر اقصی القضات
دیوان اے قدر روایت عالم تا ابد را	آفتابے بے زوال و آسمانے بے ثبات

اس کے دوسرے سال قاضی صاحب انوری کے نام ایک قطعہ بھیجتے ہیں۔ شاعر جواب میں قطعہ لکھتا ہے۔ میں پہلے شعر پر قناعت کرتا ہوں ؎

قطعۂ صدر اجل قاضی قضاتِ شرق و غرب
آں کہ بر عالم نفاذِ او قضائے دیگر است ص ۶۲۱

انہی ایام میں غزوں کے سردار ملک طوطی سے شاعر تعلق قائم کرلیتا ہے، لیکن یہ تعلق نہ اصلی ہے اور نہ دیرپا۔

خراساں کا سیاسی مطلع فتنہ آشوب اور انقلاب کے گہرے بادلوں سے گھرا ہوا تھا وہاں کسی چیز کو قیام نہیں تھا، جیسا کہ مشرقی ممالک کا دستور ہے۔

هجو گویم بلخ را هیهات یا رب زینهار — خود توان گفتن که رنگار است رجعفری
ماشاءالله از پاس تو ان بستی بسیار قضا — حبس این بدسیرتی یا مثل این بدگوهری
خاتم حجت در انگشت سلیمان سخن — افترا کردن برو در گیرد از دیو و پری
ماده ان آمد کلام من ز محصول حسود — فرق کن نقش الٰهی را ز نقش آزری
مردما چون مبتلی شد از حسد کار افتراست — معده‌هائے مدعیان را لقمۂ افتراگری
عیب من زین افترا نتوان گرفت و تو بود — چون کساد ہجیان چون حال تتبیر پیوری
آن همی گویم که در سطے زمان آورده‌ام — آن هجا گر بر دهن یابی تو دار کافری
گر سخاطر مکر را مدهم اندر عمر خویش — یا بیم چو ناکه گرگ یوسف از تهمت بری
جاودان سے زارم از ذاتے که میرادی او — ست در بازار دین صراف عالم ... ری
آن تو امانے دو امانے که در اطوار عیب — دام بدبختی نهاد و دانۂ ناسپاس اختری

اس طاقتور تردید کے سامنے دشمنوں کا افترا کب تک سرسبز رہتا آخر "نقش الٰہی" "نقش آزری" پر ظفریاب ہوا۔ اس کے ترکش کے آخری تیر (جن میں حیدر، دشمنوں کے اوپر بھی برسائے گئے ہیں) ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں ؎

چون مراد از بلخ هم از اصطناع اهل بلخ — دیدۂ مصری جیادری که دست از دبی بسری
بر سر ملک جهان قانع نه باشد کس چو من — خدا ملکے که باشد افسرش سے افسری
نے زبانک جادوان چون درۂ مجهول آمد — گشته امرد از دو یوں آں اشیا در سرا
ما چنین آن چها با داد از خاطر مرا — مایۂ محبت کرا آں خشکی را پدار آتش تری
این همه تکرار آمد عالم در نفس خویش — کار دمی را مست عقل از ممکنات اکبری
پس چگونه هجو گویم منطق را که درش — گر در آید نیو نهد از بر دو سیم انگری
تا تو فرصت جوئے کردی در کمینگاه حسد — عقدۂ ده ساله را ناخن تصحیح آوری

ہو چکا تھا۔ آخر اس نظم کی شکل میں وہ اپنی بے گناہی کی آواز بلند کرتا ہے اس کے طاقتور قلم کی گونج دور دور سنائی دیتی ہے۔ اور عوام کا جوش مخالفت ایک برف کے تودے کی طرح، جو تابش آفتاب کے سامنے پگھل کر اور پانی ہو کر بہہ جاتا ہے، فرد ہو جاتا ہے۔

اس نظر سے دیکھتے ہوئے سوگند نامہ انوری کا شاہکار ہے۔ ذرا اس کی تمہید ملاحظہ ہو ؎

اے مسلماناں فغاں از دور چرخ چنبری ،، در نفاق تیر و قصد ماہ و کید مشتری
کار آب جاہ اندر مشرب من آتش است شغل خاک جاہ اندر نسبت من صرصری
آسماں در کشتی عمرم کند دائم دو کار گاہ شادی بادبانی، وقت اندہ لنگری
گر بخندم، "داں بہر عمر نیست" گوید "در سر حد" ور بگریم، "کاں بہر روز نیست" گوید "چوں گری"
بر سر من مشتری کردے کلہ داں بر گذشت نگذرد بر طیلسانم سیہ دور مشتری
روزگارا اگر عقابی نیا موزی تناشتا!! چوں زغن تا چند سالے مادہ و سالے نری!!
از تہیائے فلک چنداں کہ گوئی گنج ہست وانگہم دریا کہ نامم ہم بدیں گنبد دری
گو بیا تا آسماں را رسم دوراں آمدہ ست دادہ اندر فتنہ را قطعی ملار اخوری
کر نگرداند بہ پہلو ہست کشور مر ترا یک دم از جہرت نہ گوید کز گدایاں کشوری
بعد ما کا مد زکلکر کوب حوادث چند سال سخت شوم صری کردہ است دورش صری
تیرہ تیرم کرد صاحب ہمت اندر ہجو ملح تا ہمی گویند کافر نعمت آمد انوری
ملت الاسلام را جو اے مسلماناں کہ گفت؟ حاش للہ باللہ ار گوید جہود و خیبری
سماں ار طفل نوشے تلخ کرشے واگیتی کہ وا داد کرد معمور جہاں را مادری

ہجو کی افترا کے خلاف گویا ہے ؎

جیبیں سکاں کہ گزار در ستاں علمے کشند فارغ آید جرح اعظم از جیہ ادبیے ریوری

بدین مثال بود تازه یاد تا عقبیٰ بدین بها و بود زنده نام تا محشر
نماند نام سکندر هزار و هفصد سال مصنفات ارسطو بنام اسکندر

مودود جو علمی فتوحات کی بجائے فتوح الارض اور فتح البلاد کی تجاویز میں زیادہ منہمک تھا، انوری کے مقاصد کے ساتھ کوئی دلچسپی کا اظہار نہیں کرتا، اس لیے شاعر، شکستہ دل ہو کر اور اجازت لے کر بغداد کو خیرباد کہتا ہے۔

ولیک شاه بفتح بلاد مشغول ست نمی کند به پرستندگان خویش نظر
بهر گهست که چون نیستت بکام جهان درین هوس هستین روزگار خویش بسر
به یک قصیده عشرا بخواه دستوری ز بارگاه خداوند تاج و تخت و فر

دیگر

خدایگانا امید داشت بنده همی که در ثنای تو بر سروران شود سرور
ببارگاه تو هر روز بیشتر آید کنون بر سم زمین تا بمی شود بیشتر
ز دخل نیست معاشی و خرج او بے حد ز نفع نیست نشانی و وام او بے مر
اگرچنان که دهد شهریار دستوری غلام وار دهد بوسه آستانهٔ در
سوی خانه گراید زبان بشکر و ثنا بیاد ملک خداوند کرده دائم تر

بغداد چھوڑنے کے بعد معلوم نہیں ہوتا کہ شاعر کہاں کہاں گیا اور کیا کرتا رہا مگر کچھ مدت بعد واپس بلخ آجاتا ہے

عمادالدین پیروز شاہ احمد

اب عمادالدین پیروز شاہ، خراسان کے افق پر ایک نئے ستارے کی کی طرح طلوع کرتا ہے، اور بلخ کے دربار سے بحیثیت فاتح نمودار ہوتا ہے وہ شہر کی عمارت کا حکم دے چکا ہے، ابھی اس کی تعمیل میں کچھ وقفہ ہے کہ بلخیوں

ہیچ عاقل این کند جز آں کہ یک سو افگند | اصل نیکو اعتقادی، رسم نیکو محضری
دشمناں را مایۂ اوں نزد من دانی کہ چیست؟ | جمع کردن موش دشتی با پلنگ بربری
مستقیم احوال شو تا خصم سرگرداں شود | بس کہ پرکاری کند او چوں تو گردی مسطری
این دقائق من چناں دانم کہ از بے دانشی | سکتہ گیرد این و آں بر بو فراس و بحتری
از عقابت پو ستینش گر نہ گوید نہ بود | گرچہ در دریا تواند کرد جز لطف گاوری
چند زحمی کر قولم تارہ شاخے می دمد | ہر کجا بیداری آسکیں کہ بیچے می بری
رو کہ از یاجوج بہتاں رخنہ ہرگز کے شود | حاصہ در سدّے کہ تائیدش کند اسکندری

اس واقعہ کے بعد انوری کچھ عرصے کے لیے بلخ چھوڑ دیتا ہے، اور بغداد پہنچ کر قطب الدین مودود بن زنگی (سنہ ۵۴۴ھ و سنہ ۵۶۵ھ) کے دربار میں رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ اس موقعے پر شاعر نے کوئی مستقل تصنیف بھی مودود کے نام پر منسوب کی ہے۔

بریں لوید رسیدم دریں دیار ورمں | نگوستں حضرت شاہ جہاں رسید خبر
مرا بحضرت عالی تقربے بنمود | برائے شاہ بپرداختم یکے دفتر
ہزار فصل درو لفظہا ہمہ دل کش | ہزار عقد درو نکتہا ہمہ دلبر[1]

یہاں وہ علمی مشاغل اور تصنیفات میں اپنی زندگی بسر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

بداں امید کہ شاہ جہاں شرف دہدم | شوم بدولت او نیک بخت و نیک اختر
بہر دو ماہ بسازم ز نسل تصنیفے | برائے دولت منصور خسرو صفدر

---

[1] انوری کا بلخ سے بغداد پہنچ کر مودود بن زنگی کی مدح میں قصیدہ لکھنا اور پھر فوراً بلخ واپس چلا آنا بظاہر نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ قصیدہ انوری کے ایک قدیم کلیات (نوشتہ سنہ ۷۴۲ھ) میں بھی جو راقم کی ملک ہے موجود ہے۔

میں ذیل کا قطعہ لکھتا ہے؎

احمد مرسل زخاک مکہ چوں ہجرت گزید — مدتے آں خطہ بود انگشت نومیدگاں
بار چوں بار آمد از اقبال میموں مو کبش — تازہ شد چوں در سحرگاہاں گل از باد وزاں
بلخ را ایں در رشتہ احمد ہماں ہجرت نمود — تا فرو ماند از ہم ہجو برگ اندر خزاں
بار چوں در ظل عالی رایتش آرام یافت — زندہ شد بار دگر چوں از صبا صحن رزاں
شکر یزداں را کہ شد آباد و حرم ما حستر — قبۂ اسلام ازیں و کعبۂ اسلام ازاں ،

بیرور شاہ کا زمانہ ۵۵۶ھ سے تصوّر کرنا چاہیے۔ یہی بادشاہ انوری کا حقیقی ممدوح ہے اور اس میں شک نہیں کہ سحر کے مقابلے میں اس کا دعویٰ نہایت زبردست ہے۔ شاعر نے بعض زبردست قصائد اسی بیرور شاہ کی تعریف میں لکھے ہیں۔ قصائد کی تعداد بھی کافی ہے اور ان کی زبان سے پایا جاتا ہے کہ شاعر کو اپنے ممدوح سے دلی اُنس ہے انوری کی اصلی قدردانی بھی اسی دربار میں ہوئی۔ اس کے وزیر جلال الوزرا کی مدح میں بھی متعدد قصائد ملتے ہیں۔

مجد الدین ابو طالب نعمہ، انوری کا (قیام بلخ کے زمانے میں) ایک اور ممدوح ہے اس کے تعریفی قصائد بھی کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ اور شاعر اس کا ممنون بھی ہے مجھے افسوس ہے کہ کلیات غوریوں کے ساتھ انوری کے مراسم پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ یہ ظاہر ہوتا کہ یہ مراسم کس زمانے میں قائم ہوئے، اگرچہ نہ وہ دیرپا تھے اور نہ گہرے۔

قرن ششم کے ساتویں عشرہ میں ملوک غور غزنوں کی طاقت کو برباد کرکے خراسان کے بعض حصوں پر قابض ہو جاتے ہیں، بعض رباعیوں میں ان کی طرف اشارے ملتے ہیں، امیر الجمال کے نام ایک قطعہ بھی ہے ایک پورا قصیدہ شہاب الدین اور حسن مودود کی تعریف میں ملتا ہے یہ شہاب الدین اگرچہ مشہور شہاب الدین غوری

کے مجمع سے ہوتے ہوئے فاتح کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آئے ہیں، انوری ان سے آگے بڑھتا ہے اور بلخیوں کی حمایت میں قطعۂ ذیل سناتا ہے ؎

اے ترا گشتہ میسر خاتم دیو و پری کوش تا آب سلیمانِ پیمبر نبری
زاں کہ در نسبت ملک تو کہ باقی بادا ہست امروز جہاں دوست عدلِ عمری
توئی آں سایۂ یزداں کہ شب چتر تو کرد ایں کہ در سایۂ او، رد و ستم شد سپری
نامۂ فتح تو سیارہ بہ آفاق برد کہ بشارت گر فتح تو نشاید بشری
تو کہ صد سدِ سکندر کنی از گرد سپاہ حوالیش را سد از صد چو سکندر شمری
رائے اعلائے ترا کشف شود حالت بلخ کہ برحمت سوئے آں آباد و خرابش نگری
در زوایاش ہمہ طائفۂ منقطع اند ہمہ از جادہ بروں و ہمہ از دادبری
تو سلیمانی و ایں طائفہ موران ضعیف بودہ خواہان تو عمرے بدعائے سحری
ظاہر و باطن ایشاں ہمہ پائے بلخ است چہ شود گر سر پائے بلخے درگذری

وہی انوری جس کی تذلیل میں چند سال پیشتر بلخیوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، آج ان کے حق میں فرشتۂ رحمت بن کر نئے فاتح کے سامنے رحم و معافی کی درخواست کر رہا ہے یہ واقعہ اس کی خلقی شرافت اور اخلاقی جرات کی ایک روشن مثال ہے۔ کیا ہم ایسے عالی ظرف اور بلند حوصلہ انسان کو "دنی الطبع، تنگ ظرف، اور کم حوصلہ" کہنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں

بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر سلطان شاہ بلخ کا قصد ترک کرکے یکایک روانہ ہو جاتا ہے، اور انوری اس کی روانگی پر اپنا دلی تاسف ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ ؎

تو ہمی رفتی و دریں و زماں ہمی گوید
رہے ز عدل تو خلق جہانے آسودہ ص ۲۶۴

کچھ عرصے کے بعد وہ دوبارہ وارد ہوتا ہے اور شاعر اس کے خیر مقدم

(۱۶) کمال الدین ابی سعد مسعود — (۱۷) عزیز الدین طغرائی
(۱۸) ضیاء الدین منصور — (۱۹) شرف الامرا اوحد الدین اسحق
(۲۰) بیرور شاہ بن طغان تگین — (۲۱) وزیر محمود
(۲۲) بہاء الاسلام فخر الدین محمد — (۲۳) تاج الدین ابراہیم
(۲۴) محمد بن ابراہیم سری — (۲۵) فخر الدین ابو المفاخر
(۲۶) صدر جہاں علاء الدین محمود — (۲۷) شمس الدین اعلک پہلوان لشکر
(۲۸) علاء الدین امیر اسحاق — (۲۹) فرزندان سپہ دار
(۳۰) مودود شاہ ناصر الدین مؤید — (۳۱) کمال الدین محمد (وزیر)
(۳۲) بہاء الدین علی — (۳۳) شمس الدین بہرور
(۳۴) حسام الدین حسین — (۳۵) قوام الدین
(۳۶) فخر الزماں اسحاق — (۳۷) جمال اشرف
(۳۸) خواجہ منصور عامر — (۳۹) خواجہ فخری (شاعر)
(۴۰) خواجہ اسعد یار — (۴۱) کمال الدین مسعود
(۴۲) اجل جمال الدین — (۴۳) تاج عمراد
(۴۴) صفی موفق سیجی — (۴۵) الغ جاندار بک ایناج سنقر
(۴۶) مجد الدین عالی ابو المعالی ابن احمد — (۴۷) صدر الوزرا مؤید الملک
(۴۸) نصیر الملک محمد بن عمر — (۴۹) مجد الدین علی ابن عمر
(۵۰) بدر الدین سنقر — (۵۱) مؤید الملک نظام الدین محمد
(۵۲) نصیر الدین محمود وزیر — (۵۳) ابو المناقب ظہیر الدین ناصر
(۵۴) رضی الدین ابو رضا — (۵۵) فخر الدین ایناج حاصبک
(۵۶) ناصر الدین قتلغ شاہ — (۵۷) عماد الدین ملک شاہ معظم

واقع ہندستان نہیں ہو۔ اس قصیدے کا مطلع ہو ؎

عرصۂ مملکت خور چہ با محدود ست
کہ دراں عرصہ چناں لشکر بامعدود ست

اس قصیدے میں غوریوں کے نسب کے سلسلے میں ایک عجیب بیان ملتا ہو، جو تاریخی روایات کے بالکل منافی ہو سلاطین غور کا نسب بروئے تاریخ ضحاک تازی سے ملتا ہو، اور طبقات ناصری میں یہ روایت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہو۔ لیکن انوری اُن کا سلسلۂ نسب حضرت داؤد پیغمبر علیہ السلام سے ملاتا ہو۔

غور کے ذکر میں وہ کہتا ہو ؎

رونقِ ملک سلیماں پیمبر دارد   عرق سلطاں چہ عجب گر نسب داؤد ست

کلیات میں ایسے قصائد، جو مختلف سلاطین و صدور و امرا و علما وغیرہم کے نام ایک ایک دو دو مرتبہ لکھے گئے ہیں بے شمار ہیں، ذیل میں صرف ان لوگوں کے اسما کی فہرست دے دی جاتی ہو۔

(۱) ستر اعلیٰ جلال الدین والدنیا   (۲) صفوۃ الدین مریم
(۳) کریمۃ النسا رضیۃ الدین   (۴) عصمت الدین
(۵) تاج الملوک بادشاہ   (۶) ملک یوسف
(۷) عز الدین   (۸) عضد الدین و ناصر الملک
(۹) ملک شاہ معظم بن طغانشاہ   (۱۰) زین الدین عبد اللہ
(۱۱) عماد الملک جلال الدین ابوالفضل   (۱۲) علاء الدین محمد
(۱۳) صاحب عادل عمر صدر دنیا   (۱۴) علاء الدولہ علاء الدین ابو علی حسن
(۱۵) کمال الدین جمال محمود صدری   (خانوادہ نظام)

دیرو دوری دشاعر چگونہ جنگ کند   اگرچہ چار دہ باشند در چہار ہزار

ہمیں اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ وہ قزاق تھے، اور جب تک کہ انھوں نے اس جماعت کو اچھی طرح نہ لوٹ لیا ہوگا، نہ چھوڑا ہوگا۔

وہ ایک بڑے کنبے والا آدمی تھا، جس کے افراد کی تعداد پچاس کے قریب تھی ؎

پدیرش کہ سدۂ تو سرد   او و پیوستگان او پنجاہ (۲۵۹)

مصارف زیادہ تھے اور خود بھی اسراف کی حد تک فیاض تھا اس لیے قرضے کی مصیبت میں گرفتار رہتا تھا۔

وہ طبیعت کا شریف، حوصلے کا بلند اور خوش اخلاق تھا، لیکن بلند نظری اور بے پروائی اس کے خصائل کا امتیازی جوہر ہے۔ صاف گوئی اس کی ایک اور خصوصیت ہے۔

خطرے اور مصیبت کے وقت وہ زیادہ دلیر اور جری تھا، خطرہ جس قدر زیادہ ہوتا اس کی ہمت اتنی ہی زیادہ بلند اور حوصلہ مضبوط ہوجاتا، دوسروں کی آفت میں سینہ سپر ہونے سے دریغ نہیں کرتا اور عام طور پر بے خوف اور نڈر تھا۔

وہ قدرتاً خوش طبع، بذلہ سنج اور ظریف تھا، ایسا شخص ہمیشہ کثیر الاحباب اور ہر دل عزیز ہوتا ہے، اسی لیے اس کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس کی صاف گوئی کی عادت نے بہتوں کو اس کا دشمن بھی بنا دیا تھا لیکن دشمنی کے اظہار میں وہ پہل نہیں کیا کرتا تھا، اسی طرح ہجو میں بھی ابتدا نہیں کرتا بلکہ پہلے حریف کو جتا دیتا کہ اپنا رویّہ درست کرے ورنہ ہجو سے تواضع کی جائے گی اس کے ساتھ ہی وہ رحم دل اور بردبار تھا، اور دشمنوں تک کو معاف

(۵۸) ابوالمحاسن نصر بن نصر (۵۹) سراجی (ترمذی) شاعر
(۶۰) ارشد الدین (شاعر) (۶۱) خواجہ کمال الدین (شاعر)
(۶۲) شجاعی (شاعر) (۶۳) تاج الافاضل فخر الدین خالد بن ربیع المالکی (شاعر)
(۶۴) ملک طوطی (۶۵) کمال الزمان، معنی سلطان سنجر (۶۶) فریدالدین کاتب

کلیات اس کے واقعات زندگی پر کچھ روشنی نہیں ڈالتا، اتفاقیہ چند باتوں کا ذکر آگیا ہے وہ یہ ہیں کہ ایک مرتبہ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا تھا، ایک قصیدے میں جو کسی وزیر کے نام ہے، کہتا ہے ؎

تا دست شکستہ پائے ہمدم — در جستن ما اگر بر لنگ ست
دریاب مرا و زود دریاب — کیں دست شکستہ بیک تنگ ست (کلیات)

ایک مرتبہ بیماری رشتہ میں مبتلا ہوا تھا ؎

بدست حادثہ بندے نہاد بر پایم — کہ ہیچ حادثہ گاہے نہاں وگہ پیداست
سبک بصورت جوماں گراں بقوتِ طبع — کہ پشت طاقتم از بار او ہمیشہ دوتاست
نظر بجملہ از اعضا جدا نمی گردش — کہ راست سد بر اعضا کہ آہم از اعضاست
عصاست پایم و در وضع آفرینش خلق — شنیدہ کہ کسے را بجائے پائے عصاست (کلیات)

درد نقرس کی تکلیف بھی اس کو ہو جایا کرتی تھی ؎

در گوارا دانی کہ آفت نقرس — زہر چہ ترستی من سدہ می پرہیزم (کلیات)

سفر میں ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ انوری اور اس کے ہمراہیوں کو جو تعداد میں تیرہ تھے، جن میں تین شاعر، چھ خیاط اور چار منشی تھے، دو سواروں نے آکر گھیر لیا، اور بہت پریشان کیا ؎

من و سہ شاعر و شش درزی و چہار دبیر — اسیر و خوار بماندیم در کف دو سوار

اور لوعلی کا کلمہ پڑھتا ہے، وہ شاہساے کو رد کرتا ہے اور شفا کے آگے سرخم کرتا ہے، کہتا ہے ؎

درکمال بوعلی نقصان فردوسی مگیر ہر کجا آمد شفا شہنامہ گو ہرگز مباش

لوعلی کے لیے یہ احترام اس کو سنائی کے خلاف اعتراض کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ حکیم سنائی نے ایک مقام پر لکھا تھا ؎

کریارب مرسنائی را سنائے دہ تو در حکمت چناں کز وے برشک آید روان بوعلی سینا

انوری نے جواب میں کہا ؎

سنائی گرچہ از وجہ مباحاتے ہمی گوید بشنو اندر حرص آں کہ یابد دیدۂ بینا
ولیکن از طریق آرزو بیخش حرد داند کہ ماحت زمرد لس نیابد کوشش بینا
برو جانے بکش تن در مقیتے دہ کہ دیر افتد زیا حوج تمنا رخنہ در سد و لوسینا

اہل تصوف کو وہ پسند نہیں کرتا، اس دلیل کی بنا پر میں خیال کرتا ہوں کہ مصرع مشہور ع

چوں سنائی ہستم آخر گر نہ ہمچوں صابرم

میں انوری نے اپنے آپ کو حکیم سنائی کا مثیل نہیں کہا ہے بلکہ حکیم سنائی کا۔ ایک قلمی نسخہ نوشتہ ۷۱۴ھ میں یہی مصرع یوں درج ہے ع

از سنائی بیشم آخر گرچہ کم از صابرم

بقول محمد عوفی، سنائی کا پورا نام "الحکیم محمود ابن علی السنائی المروزی" ہے، اور ظہور مروزی نے اس کا مرثیہ لکھا ہے۔

اس کی شاعری پر مخالف معاصرین نے کفر نگاری کا الزام لگایا ہے، متوجی مروزی کہتا ہے ؎

گدیہ و کفر در اشعار شعار ست ترا کفر در مدحی و در گدیہ ہمہ کرانی

کر دیتا تھا۔

غرور جو تلامیذ الرحمان کا طرۂ امتیاز ہے، انوری میں بہت کم پایا جاتا ہے، تفاخر اس کا شیوہ نہیں۔

اگرچہ اس کی عمر درباروں میں اور قصیدہ خوانی میں گزری، جہاں خوشامد کے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا، تاہم خوشامد سے اس کو دلی نفرت ہے۔ انسان، انسان، سب اس کی نظر میں مساوی ہیں اور اپنے جیسے انسان کی منت پذیری اس کے نزدیک بدترین فعل ہے۔

شراب وہ پیتا تھا، اُسے خود اقرار ہے۔ کلیات میں بیسیوں قطعات موجود ہیں جو صرف دوستوں سے شراب منگوانے کی خاطر لکھے گئے ہیں۔

شعرا میں وہ ابوالفرج کا زیادہ مداح ہے اور اسی کی تقلید بھی کرتا ہے۔ اور معاصرین میں عمعق، ادیب، صابر، اور معزی کا ذکر احترام سے کرتا ہے باوجودیکہ خود مُسلّم الثبوت اُستادِ فن بلکہ پیغمبرِ فن ہے، لیکن شعر گوئی اس کے نزدیک ایک ذلیل اور قابلِ نفرت پیشہ ہے۔ شاعر اور حلال خور اس کی رائے میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں، نہیں بلکہ شاعر حلال خور سے بھی زیادہ کثیف ہے۔

علوم کا دل سے شیدائی ہے اور حکمت پر تو جان قربان کرتا ہے۔ قسمت کی لوبھی دیکھیے کہ بوعلی سینا کا متعلم رودکی کا جانشین مانا جاتا ہے لیکن قلبی رجحان کا گلہ کرتا، وہ قدم قدم پر نمایاں ہے، زرق برق درباروں اور گرم نشاط محفلوں میں یکایک وہ ایک آہِ سرد کھینچتا ہے۔ ارسطو اور بوعلی اُس کو یاد آتے ہیں اور دل پکڑ کر رہ جاتا ہے۔

انوری اگرچہ کشتِ میں دریتیوں کا سرتاج ہے، لیکن کعبے کی محبت اس کے دل سے نہیں گئی، شاعری میں اس عزت کے باوجود وہ فردوسی سے مرتد ہے

تاریخ خلاصۃ التواریخ(۱) میں میری نظر سے گزرا ہے موقع یہ ہے کہ عید کا چاند جس کا بیتابی سے انتظار کیا جا رہا تھا نظر آچکا ہے ہلال کو دیکھ کر انوری کہتا ہے

ع این ہم قدح کہ در لب این طاس ست

رشیدی کہتا ہے ع گوئی کہ ز دست پارۂ الماس ست

ادیب صابر کہتا ہے ع شکل مہ نو راست چو نعل کار د لو د

سلطان سنجر کہتا ہے ع نے نے غلطے کتب نقارا داس ست

انوری کی وفات پر اس کے کسی دوست نے ذیل کا قطعہ لکھا ہے ؎

(۱) انوری رفت و آرمید و گزید   بر سر اے پلید عسالم پاک

(۲) دوستاں در عمش ہمی گویند   مارُخ زرد و دیدۂ نمساک

(۳) کاے دریغا کہ چرخ سفلہ نہفت   عالم علم را بشت خاک

انوری کی شاعری

انوری اگرچہ طبعاً علم دوست واقع ہوا تھا، لیکن زمانے کے میلانِ عام اور اپنے عہد کی عیش پرستی اور ہرزہ پسندی علوم کی بے قدری، معاش کی مجبوریاں اور زندگی کی تلخیاں محسوس کر کے علمی مشاغل کو خیرباد کہتا ہے اور شاعری اختیار کرتا ہے، تاہم وہ غالب کا ہمزبان ہو کر بلا خوف تردید کہہ سکتا ہے ؎

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب   شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

اگرچہ شعر نے اس کی روحانی اولوالعزمیوں اور طبعی رجحان کو کوئی تسکین نہیں بخشی کیونکہ وہ اس سے ہمیشہ ملول اور دل گیر نظر آتا ہے۔ اُس کے شریف جذبات اس پیشے کے خلاف ہمیشہ سرگرم پیکار رہیں، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ انوری نے اپنے سرسبز دماغ، عالمانہ روشن تحریر اور نکتہ آفرینی سے

صنعت کفر بشعرا ز تو درا فزود چنانک لق لق از فاضلی و طنطنه از خاقانی

قاضی نور اللہ شوستری شیعہ شعرا کی فہرست میں اس کا شمار کرتے ہیں لیکن کلیات میں کافی سے زیادہ شہادت موجود ہے کہ وہ مذہب سنت و الجماعت کا ایک رکن تھا، اور غالباً شافعی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ مسئلۂ جبر و قدر میں وہ اشاعرہ کا ہم زبان ہے، رویت باری کا وہ قائل ہے، "عدل عمرؓ" قدم قدم پر اس کے قصائد میں پایا جاتا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نہ در خلافت بوبکرؓ دم زنم نہ خلاف نہ در امامت فاروقؓ در مجال و نطق
نہ در کشتن عثمانؓ چو رافضی بدگو نہ در شجاعت حیدرؓ چو خارجی احمق
سر خوارج خواہم شگافتہ چو انار دل روافض خواہم کفیدہ چوں خوزق

ان اشعار پر بھی لحاظ کیا جائے ؎

بسر مصطفیٰؐ شریف قریش کہ ز جمع رسل عزیز تر است
بوفا و صفائے صدق عتیق کہ دل و جاں فروش و شرع خرست
بدلیری و ہیبت عمری کہ ظہور شریعت از عمر است
بحیا و حیات ذوالنورین کہ حقیقت مولف سور است
بکف ذوالفقار مرتضوی کہ بحرب اندروں چو تیر پرست

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے واسطے کہتا ہے ؎

دین بعمرؓ شد قوی گرچہ پس از عہد او باقی ناموس کفر حجر حیدرؓ شکست
معرکۂ کفر دیو طبل عمرؓ بشکند چرخ کہ نظارہ بود دید کہ عسکر شکست

ناظرین کو وہ قصہ یاد ہوگا جس میں عنصری، عسجدی، فرخی اور فردوسی ایک ایک مصرع بہم پہنچا کر رباعی تیار کرتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک قصہ انوری، رشید الدین وطواط، ادیب صابر، اور خود سلطان سنجر کی بابت ایک غیر مطبوعہ

مسیح نفس بھی مردہ قصیدے کے جسم میں روح پھونک کر اس کا دورِ احیا نہ لا سکا
انوری کے دَور میں غزل نے کوئی حقیقی اہمیت حاصل نہیں کی تھی۔
پہلے شعرا کے سامنے جو میدان تھا وہ قصیدے کا تھا۔ اور اسی سرزمین میں
وہ اپنے جوش طبیعت کی جولانیاں دکھاتے تھے۔ یہ عہد قصیدے کی تاریخ کا
زرّیں دَور مانا جانا چاہیے۔ شعرا کثرت سے موجود تھے جن میں اکثر مشہور
و معروف ہیں، مثلاً امیر معزی، ادیب صابر، عبدالواسع جبلی، حکیم روحانی
حکیم سوزنی، فتوحی، سحری، حکیم سنائی اور رشید الدین وطواط وغیرہ وغیرہ
لیکن سب نے اپنے تفنّنِ طبع کے لیے قصیدہ نگاری ہی کو اختیار کیا تھا۔
ان میں جو انوری کے ہم چشم مانے گئے تھے، وہ فتوحی اور سحری تھے۔

ایں کہ پرسد ہر زماں ایں خلق گاو ریش — ؎
کانوری بہ یا فتوحی در سخن یا سحری (فتوحی)

گویا معاصرین کی نظرِ انتخاب میں انوری، فتوحی اور سحری پر قرعۂ فال ڈالا
گیا تھا۔ کوئی انوری کو ترجیح دیتا تھا، کوئی فتوحی کا معتقد تھا اور کوئی سحری
کی افضلیت کا قائل تھا گویا سعدی، امامی اور مجدہمگر کی ترجیح کی بحث بتبدیلِ
اسما ایک صدی پیشتر چھیڑ دی گئی تھی لیکن غور کرو آج فتوحی اور سحری کو
کون جانتا ہے؟ زمانے نے ان کے کلام کی طرح اُن کے ناموں کو بھی صفحۂ ہستی
سے مٹا دیا اور جو تھوڑا بہت ہم اُن کے متعلق جانتے ہیں، انوری کے طفیل
میں جانتے ہیں۔ وہاں دُنیا نے سعدی کے حق میں فیصلہ دیا، یہاں انوری
کے حق میں۔

متاخرین میں بعض نے ظہیر فاریابی کو انوری پر ترجیح دینا چاہی لیکن
ان کی کوشش بارآور نہیں ہوئی خود مولانا شبلی ظہیر کی افضلیت کے قائل

شعر کے درجے کو کئی پایہ بلند اور رفیع کر دیا ہے۔

انوری کا اعجاز اس کے قصائد مانے گئے ہیں۔ متقدمین کے نزدیک محاسنِ قصیدہ گوئی زیادہ تر شان و شکوہ الفاظ، نادر تشبیہات اور صنائع بدائع پر ختم تھیں۔ لیکن انوری کی جدت پسند طبیعت نے اس میں مضمون داخل کیا خیال بندی کا شوخ رنگ چڑھایا اور صنائع کا زور توڑ کر اس کو علمیت کے رنگ میں رنگ دیا فارسی زبان اس کے ہاں ایک نئی کروٹ لیتی ہے، جدید خیالات اور نئے اسلوب وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں، وہ سیکڑوں بندشوں کا مخترع ہے اور اس کے چھوٹے نوالوں کو متاخرین مزے لے لے کر چباتے ہیں۔ قریب قریب ہر شاعر نے اس کے اثرات میں اپنی قندیلِ سخن کو روشن کیا ہے، جن میں ظہیر، ابن یمین، عرفی اور قاآنی قابلِ ذکر ہیں۔ ہمارے لغات کا ایک بڑا حصہ اس کی جدت طرازی کا مرہونِ منت ہے۔

صنائع میں وہ لف و نشر اور تجنیس کی طرف زیادہ مائل ہے، اور کلام حشو یا جملۂ معترضہ کے استعمال میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔ وہ ادائے خیال کے لیے نازک اور خوبصورت لباس کے بجائے سنجیدہ اور متین پیرایہ تلاش کرتا ہے۔

انوری ایران میں ثالث ثلاثہ رسل مانا گیا ہے، اور یہ فیصلہ ابھی تک مسلّم ہے متاخرینِ ہند میں اس کے خلاف بغاوت پھیلانے والوں میں سب سے پہلے ابوالفضل علامی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ابوالفضل کے بعد میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کے مقلد آزاد بلگرامی ہیں اور مولانا شبلی کی رائے حقیقت میں آزاد سے ماخوذ ہے۔ مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کے دور میں قصیدہ گوئی کی حقیقی عظمت مُردہ ہو چلی تھی، اور غزل نے عالمگیر قبولیت حاصل کر لی تھی اِس لیے مذاق میں عام انقلاب ناگزیر ہو چکا تھا عرفی خیا

کرلیا جائے، اس نقطۂ نظر سے ذیل کے اشعار پر ناظرین ایک نظر ڈال لیں ؎

انوری

روائح کرمت ناستیزہ رشئے طبع
خواص بیشکر آرد مزاج کینئے را

ہر چہ مفتی رایت قلم بدست گرفت
قضا برات نویسد جواب فتویٰ را

نسیم باد در اعجاز زندہ کردن خاک
نبرد آب ہمہ معجزات عیسیٰ را

زکنہ رتبت تو قاصر ست قوت عقل
بلے ز نور خبر نیست چشم اعمیٰ را

وجود جود تو رائج نشاد اگر نہ وجود
نہ ہیم ناں رقصامی فروخت احریٰ را

شکوہ مصطفویت آنچنان طریق لعاد
رطا قہا حق براگند لات و عزیٰ را

ظہیر

مزاج کودکی ار رشئے خاصیت بمذاق
ہنور طعم شکری نہاد کسنے را

بدست خویش قلم درکشیدہ مفتیِ عقل
بیک اشارت رایت ہزار فتویٰ را

سخن چہ عرض کنم بر جماعتے کہ زجہل
زبانگ خر نشناسد نطق عیسیٰ را

وجود او کہ جہاں رار ابتدائے ظہور
بجائے نور بصر بود چشم اعمیٰ را

ہزار بار بدیواں رزق رد کردہ
جہاں رہِ ہر بیتا مت برات احریٰ را

اگر صلابت او بانگ بر فلک نزند
بحالی دہد استوار لات و عزیٰ را

ہیں، لیکن انوری اور ظہیر میں کوئی مقابلہ نہیں ہوسکتا۔ ظہیر کی شاعری اس وقت شروع ہوتی ہے، جب انوری کا زمانہ ختم ہوتا ہے۔ ظہیر کے قصائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہیر انوری کا مقلد بھی ہے اور انوری کے جواب میں جو چند قصائد اس نے لکھے ہیں اُن میں کوئی ترقی نہیں دکھائی ہے۔ میں بخوفِ طوالت صرف چند امثال پر اکتفا کرتا ہوں۔

انوری کا ایک قصیدہ ہے ؎

صبا بہ سبزہ بیاراست باغ دنیی را ... نمونہ گشت زمین مرغزار عقبی را

ظہیر نے اسی زمین میں یہ مطلع بہم پہنچایا ہے ؎

سفر گزیدم و بشکست[1] عہد قربی را ... مگر بہ حیلہ بپیچم عنان سلمی را

(ص۳۷ قصاید ظہیر مطبع نولکشور ۱۲۹۷ھ)

میں اُس میں انوری کے مطلع کو ہر اعتبار سے بہتر مانتا ہوں لیکن اس قسم کا مقابلہ شاید بعض ناظرین کی رائے میں نامناسب ٹھیرے۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ دونوں استادوں نے جہاں ایک ہی قافیہ باندھا ہے ان اشعار کا مقابلہ

---

[1] معطوف و معطوف علیہ کی حالت میں یہ تفاوت جو "سفر گزیدم و شکست" کی ترکیب میں بجائے "سفر گزیدم و شکستم" دیکھا جاتا ہے ایک ایسا اسلوب ہے جو سب سے پہلے قرن ہفتم میں دیکھا جاتا ہے۔ انوری کے کلام میں یہ تغیر بہت عام ہے چنانچہ امثال ذیل ؎

(۱) جستم رہا و پیشش دویدم و سلام کرد ... و آوردمش چو تنگ شکر تنگ در کنار ص۱۹۶

(۲) القصہ بازگشتم و آمد سحابہ رود ... دریا کردہ و بار بپیوست از بس انتظار ص۱۹۳

(۳) پنہاں کردم و این شرح ادا کردم و رفت ... جان ازاں رجعت فی الصدر بداد و اشوقا ص۲۵۹

(۴) رفتی و ما تو ہماں کہ جہاں داشت سزد ... گر جہاں را پس از این ناقص جو ایم سزاست ص۵۶

(۵) آوردمش بجائے و لشاند دست پیش ... بر دست بوسہ دادم و در روئے او گلاب ص۲۸۰

انوری | **ظہیر**

بر نوک دگر عمر گرامی مگذارید
خود محنت ما جملہ ز نوک دگر آمد

آں مایہ ندانست کہ بر ہیچ نیاید
ہر کار کہ در معرض نوک دگر آمد

ظہیر، انوری کی متانت اور دقتِ نظر کو نہیں پہنچ سکتا۔ زباں کی صفائی جو ظہیر کا امتیازی جوہر ہے، انوری سے مقابلے کے وقت اس کا صریحی تفوق ثابت نہیں کرتی۔ لیکن جب ہم ان گوناگوں اور مختلف الموضوع مضامین کا خیال کرتے ہیں جو انوری نے اپنے اشعار اور نظموں میں روشناس کیے ہیں تو ظہیر کی شکست ایک بدیہی واقعے کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔

ذیل کے اشعار پر بھی غور کیا جائے جو بلحاظ ترکیب و بندش دونوں شاعروں کے ہاں متحد المضمون مانے جا سکتے ہیں، صرف اس فرق کے ساتھ کہ ایک صبح کا ذکر کرتا ہے اور ایک شام کا۔ اور نگاہِ انتخاب کا فیصلہ پھر انوری کے حق میں ہے۔ ؎

انوری

چوں وقتِ صبح چشمِ جہاں سیر شد ز خواب
گسستہ شد ز خیمۂ مشکیں شب طناب
نمود رشتۂ صورتِ صبح از کنارِ شب
چوں جوے سیم بر طرفِ نیلگوں سراب (۳)

ظہیر

چوں بر زمیں طلیعۂ شب گشت آشکار
آفاق ساخت کسوتِ عباسیاں شعار
پیدا شد از کرانۂ میدانِ آسماں
شکلِ ہلال چوں سرِ چوگانِ شہریار (۵)

انوری کی شاعری میں گوناگوں واقعات اور معاملات پر بحث کی گئی ہے، اس کی تشبیب میں مختلف النوع موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے، بہار، وداع،

انوری

دائے عزّ و جل گوئی از طریق نهاد
اعتدال ہوا دادہ جاں معنے را

بیرید کہ ہنگام صبوح دگر آمد
نسب رحمت وز مشرق علم صبح برآمد

رشید مے اندر افق جام بکوثر
ان لشکر خورشید بہ آفاق برآمد

م تو بسے تربیت نام عمر کرد
ان رشتے کہ عدل تو چو عدل عمر آمد

نہ دیک خروس از پئے بیداری مستاں
بیدیست کہ پیغام نسیم سحر آمد

را امر تو امکان تغیر نہ ہمی شد
دی کہ شاسے ز قضا و قدر آمد

وصاف تو در نسبت آوازۂ ایشاں
وصف نفس عیسیٰ و آواز خر آمد

ظهیر

برائے تحفۂ نظارگاں بیارایم
بہ حلیہ ہائے عبارت عروس معنے را

صبح دگر از مشرق اقبال برآمد
در گلشن ایام نسیم سحر آمد

آں وعدہ کہ تقدیر ہمی داد وفا شد
واں کار کہ ایام ہمی خواست برآمد

شاہنشہ ابی بکر محمد کہ جہاں را
از حضرت او مژدۂ عدل عمر آمد

شمشیر تو در ظلمت شبہائے حوادث
چوں پرتو خورشید و طلوع سحر آمد

سر بر خط حکم تو بنہد ہر کہ یکے روز
در دائرہ حکم قضا و قدر آمد

خصمت کہ پرستندۂ سم خر عیسیٰ ست
اندر نظر عقل چو دجال خر آمد

ناراض ہوتی ہے اور لاحول پڑھتی چلی جاتی ہے۔

حضرت اپنی بے زری پر تاسف کرتے ہوئے گھر آتے ہیں، اندر کی طرف سے دروازے کی دونوں زنجیریں چڑھالی جاتی ہیں۔ کمرے میں اطمینان سے بیٹھ جاتے ہیں، دروازے کی طرف پیٹھ کرلی جاتی ہے، اور دیوار کی طرف منھ، اور کہتے ہیں کہ آج تمام رات مجھے اپنی بے زری پر رونا چاہیے آنسوؤں کا ایسا دریا بہایا جائے جس میں سفینۂ نوح تک غرق ہو جائے، نالے ایسے شرربار ہوں کہ فلک پر جاکر انجم رخشاں کی طرح چمکیں۔

قصہ مختصر حضرت سرگرمی کے ساتھ اس معرکہ خیر کام میں مصروف ہو جاتے ہیں، اتنے میں سپیدۂ سحری چمکتا ہے اور سیمرغ سحر جوئے شیر میں اپنی چونچ ڈال دیتا ہے۔ ان کی آنکھ لگ جاتی ہے خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ خود بدولت جلال الوزرا کے دربار میں کھڑے ہیں، وہ مسند زرتار پر بیٹھا ہے اور ان سے دریافت کرتا ہے کہ حضرت خیر ہے آپ آج کس فکر میں بوتیمار کی طرح خاموش ہیں۔ حضرت جرأت کرکے پیش قدمی کرتے ہیں اور کنیز کے ساتھ اپنے عشق اور شیدائی کا سارا ماجرا سنا دیتے ہیں جلال الوزرا اسی وقت اپنے آدمی کو حکم دیتا ہے کہ جاؤ کنیز کو خرید لاؤ اور لاکر ان کے حوالے کر دو، آدمی جاتا ہے کنیز خرید لاتا ہے، اور ان کے حوالے کر دیتا ہے۔

عین اس وقت ان کی آنکھ کھل جاتی ہے، کیا دیکھتے ہیں کہ نہ جلال الوزرا کا دربار ہے، اور نہ وہ کنیز ہے۔ تنہا پڑے ہیں خواب کی تعبیر کے لیے معبّر کے پاس جاتے ہیں، وہ تعبیر بیان کرتا ہے اور اجرت میں ان کی پگڑی پر قبضہ کر لیتا ہے۔

اس تشبیب میں انوری نے ظریفانہ پیرایہ اختیار کیا ہے۔ اور شروع سے آخر تک اس کو خوب نباہا ہے۔ یہی کیفیت ذیل کی تشبیب میں مشاہدہ کی جاتی ہے

گل و ریاحین کے علاوہ جو ہر ایرانی شاعر کا ایک مقبولہ مضمون ہے انوری کے ہاں کہیں ذکر معشوق ہے، اُس کے فراق کا بیاں ہے یا آمد کا ذکر یا مکالمہ ہے کہیں صبح کا نقشہ کھینچا گیا ہے، کہیں شام کا منظر دکھایا ہے، کبھی سرگرم سفر ہے، دشت و بیاباں کوہ و صحرا کے مناظر پیش کرتا ہے، کہیں شب عید کے نظارے ہیں اور عیدگاہ پہنچنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، کہیں فلکیات کے ذکر میں مصروف ہے۔ بروج اور سبعہ سیاروں پر قلم اُٹھاتا ہے، اور ہر ستارے کا جُدا جُدا حلیہ لکھ رہا ہے۔ یہ موضوع اُس کے ہاں بہت پسندیدہ ہے۔ کہیں زمانے کی ناقدری علم و ہنر کی کساد بازاری کا دکھڑا بیاں ہوتا ہے، تقدیر اور آسماں کی دھاندلیاں دکھائی ہیں، صحن بستان و غدیر، قصر و ایوان اُن کی نقاشی اور مختلف منظروں، شکارگاہوں اور رزم گاہوں کا خاکہ اُتارا ہے۔

صبح کا وقت ہے، صبوحی کی تلاش ہے، اور شراب سے لَو لگ رہی ہے مجلس میں ایک ہندی کنیز دیکھی جاتی ہے، شاعر اُس پر عاشق ہو جاتا ہے، بات چیت کا موقع بھی مل جاتا ہے، عشق جتایا جاتا ہے، وہ مسکراتی ہے اور کہتی ہے، تمھارے کیسہ میں روپیہ بھی ہے، روپیہ سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ آسماں تک کے ستارے توڑے جا سکتے ہیں۔ یہ جواب دیتے ہیں ع

چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

وہ کہتی ہے تو میرا کہا مانو اور میرے خیال سے درگزرو، یہ سُن کر آپ بیتاب ہو جاتے ہیں اور گریہ و بکا شروع کر دیتے ہیں، وہ رحم کھاتی ہے، اور جلال الوزرا کے پاس جانے، قصیدہ سُنانے اور رُپیہ حاصل کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ یہ اس رائے کو پسند تو کرتے ہیں لیکن کہتے ہیں، میں جلال الوزرا کے سامنے جانے کی جرأت نہیں کر سکتا، کنیز یہ بُزدلی دیکھ کر

سلطان شبے بہ لشکر صرصر جہاں بکند — یعنی کہ جور صرصر شبے چون جہان کن است
در حصہ گر نہ سرمہ جرم سپست مانع را — چون آب گیرہا ہمہ پر تیغ و جوشن است
نقش ساقی از بہ عزت جانہ بار تند — عیشش مکن کہ باد در بستان بسرون است
باد صبا کہ محمل سامت سیاست بود — مردم گیاہ شد کہ بہ مردست بر رہ است
از جوشش لتو دیگ ہما تافرومت است — از دود تیرہ بر سر گیتی ہملن است

انوری اس روش خاص کے لیے مشہور ہے، ان حالتوں میں وہ اکثر سنجیدہ اور متین نظر آتا ہے اور اسی عالم میں اس کی جدت طرازی کا اصلی جوہر نمایاں ہوتا ہے۔ میں ایک تشبیب سے اور مثال دیتا ہوں ؎

جرم خورشید چو از حوت درآید بحمل — اشہب روز کند ادہم شب را ارجل
کوہ را از مدد سایۂ ابر دیم است — پُر طرائف شود اطراف چو اموال ثقل
ساعد و ساق عروسان چمن را بینی — ہمہ پر بستہ حلی و ہمہ پوشیدہ حُلل
پیش پیکان گل و خنجر برق از بے آنک — تا بہ سپار بد بکلیں و لئہ لسد جدل
بر محیط فلک از ہالہ سپر سازد ماہ — بر بسیط کرہ از جوید زرہ پوشد تل
وز پئے آن کہ مزاحم نہ کند واسد جوں — شرح بید از ہمہ اعضا ماکنا ید بجل
باد با آب سحر آن کند اندر بستان — کہ کند مار رخ آئینہ بسوہان صیقل
ہر کرا فصل شبے از شغل ماہ بے دا — متحمہ نقش ساتیس درآرد بعمل
مرغ ملبے ستود اکنوں فلک از در رو — راست پونا کہ تو گوئی ہمہ باقہ ارث جمل
میل اطفال سات ارجہت قوت شوت — کرد ویک رشتہ بہ اعلیٰ و دگر در اسفل

لیکن جوش و ہیجان صدمہ اور ارتعاش کی حالت میں اس کی روش ملائم سریع اور سہل ہو جاتی ہے کسی وزیر کی وفات کے موقع پر دیکھا جاتا ہے کہ شاعر فرط غم میں تکلف اور تصنع کے پردوں کو یک قلم اٹھا دیا ہے، اور ایک

عید کی صبح ہے، آپ چند دوستوں کے ساتھ عید دیکھنے کی غرض سے صحرا کا رُخ کرتے ہیں، چونکہ سواری کا شوق ہے اس لیے زیر راں ایک گھوڑا بھی ہے لیکن کمزور دُبلا اور مریل۔ قدم قدم پر گرتا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی گِرتے ہیں، اور اُٹھ کر اُسے اُٹھاتے ہیں اور پھر سوار ہوتے ہیں، مختصر یہ کہ کبھی یہ اُسے اُٹھاتے ہیں اور کبھی وہ انھیں اُٹھاتا ہے۔ اور اس طرح راستہ طے ہو رہا ہے، یار لوگ چھیڑنا شروع کرتے ہیں، ایک کہتا ہے میاں رکابیں ڈھیلی کرو تمھاری ٹانگیں لمبی ہیں، دوسرا کہتا ہے ذرا ایڑ تو لگاؤ دیکھیں تمھارے دُلدُل کی رفتار کیسی ہے۔ یہ چپ ہیں، شرمندہ بھی ہیں اور پریشان بھی۔ کبھی ادھر دیکھتے ہیں کبھی اُدھر جھانکتے ہیں کہ دیکھیں یہ کیا پھبتی سُناتا ہے اور وہ کیا آوازہ کستا ہے۔

اتنے میں ملازم دوڑا ہوا آتا ہے، یہ پوچھتے ہیں، بھئی گھر میں خیریت تو ہے، وہ کہتا ہے کیسی خیریت، تم تو گھوڑا اُڑائے عیدگاہ جا رہے ہو اور اس طرف اصلی عید (معشوق) گھر پہ آئی ہے۔ یہ سُنتے ہی ان پر ایک گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی ہے، اس سے کہتے ہیں، لا، گھر کی کنجیاں تو مجھے دے میں جاتا ہوں ورنہ تو اس مُردار پر سوار ہو جا اور آہستہ آہستہ گھر لے آ۔

قصائد میں بالخصوص اوصاف نگاری میں اس کی طرز زیادہ دقیق اور مشکل ہے۔ میں چند اشعار جو نہ زیادہ مشکل ہیں اور نہ آسان، اس کی ایک تشبیب سے نقل کرتا ہوں، ؎

می ترک اے یار کہ عید ست و بہمن ست — ہنگام بادہ خوردن و شادی ہمین ست

ایام حرّ و حرگہ گرم ست ازیں سبب — خرگاہ آسماں ہمہ در حمرآ دکن ست

الی مدار حسرمن آتش ز دود عود — تا در جہاں ز ہیشہ کافور خرمن ست

ساعہد نیست ایں کہ زالوانِ گل چمن — گوئی کہ کارگاہ حریر ملوّن ست

کسے بچون و چرا دم نمی تواند زد — کہ نقشبند حوادث ورائے چون و چراست
مدبّرست ما چو ازیں حل و عقد چیزے نیست — نصیب ما خوش و ناخوش گر رضا و ہم ہمراست

آیندہ ابیات میں آفتاب غروب ہونے، رات آنے اور ستارے نکلنے کا ذکر ہے اور خلاف معمول تشبیہات سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔

بہار شام ز صحن فلک نمود مرا — عروس چرخ کہ بنہفت روئے در چادر
بداں صفت کہ شود غرق کشتی زرّیں — بطرف دریا چو نگسستہ دار و لنگر
لمر دگنبد خضرا چناں نمود شفق — کہ گرد خیمۂ مینا کشیدہ شقّۂ زر
ستارگاں ہمہ چوں لعبتان سیم اندام — بسوگ مہر برافگندہ نیلگوں معجر
بنات نعش ہمی گشت گرد قطب چناں — کہ گرد حقّۂ سیمیں دوزہ گوہریں زیور
زراں مثال ہمی تافت راہ کاہ کشاں — کہ بر سفید ستان برکشیدہ صبح عبہر
تیغ کوہ نشاید یم شب پروین — چناں کہ در سدرح لاجوردہمت در
سپہر گفتی نقاش نقش مانی گشت — کہ ہر زماں بنگارد ہزار گونہ صور
ز رح حدی بتافت دیکر کیواں — بشکل شمع فسردہ در میاں شرر
ہمی نمود درخشندہ مشتری در حوت — چناں کہ دیدۂ خوباں ز عنبریں معجر
طرف میراں می تافت صورت مریخ — بداں صفت کہ می لعل رنگ در ساغر
ناں کہ عاشق و معشوق در لقا کماں — بتافت تیر درخشاں بدیں برہ اندر
بہم لست ماراں سپہر آئینہ رنگ — زماں زماں نمودے عجائب دیگر

سخن کے محاسن سے

سخن مربی مردست و آستانۂ جاہ — سخن خزانۂ مالست و اوستاد ہنر
زبان ہمیں کہ تو در چشم خلق خوار شوی — شکست سخن کس از آں جا رود بجائے دگر
رخت اگر متحرک شدے ز جائے بجائے — نہ جوہر ار کشیدے و نہ جفائے تبر

سادہ مگر شیریں طرز اختیار کرتا ہے۔ خیالات وہی ہیں جو قدرتی طور پر انسان کے دل میں موجیں مارتے ہیں، جذبات کا ارتعاش اور کیفیت قلب کا اضطراب جو بالکل حقیقی ہے، ہر شعر سے ظاہر ہے۔ تمہید کے چند اشعار پر قناعت کی جاتی ہے:

شہر پُر فتنہ و پُر مشغلہ و پُر غوغاست — سید و صدر جہاں یارب تا داد کجاست
دیر شد دیر کہ خورشید فلک روئے نمود — چیست امروز کہ خورشید جہاں ناپیداست
بارگاہش ز بزرگان و رعایا پُر شد — او نہ بر عادت خود روئے بما کرد چراست
دوش گفتند کہ رنجور ترک بود آرے — یار ما دوش امروز بر آں قول گواست
پردہ دارا تو یکے در تو و احوال ببیں — تا چگونہ است بہش ہست کہ درماں دواست
ور ترا بار بود خدمت ما ہم برساں — مردمی کن مکن ایں کار کہ ایں کار ستماست
ور توانی کہ رہ بار دہی بہ باشد — تا در آئیم و سلامے بکنیم از تہ ماست
ور خیالست کہ خالیست نہ رونق مراد — خود مگو برگ بنوشیدن ایں حال کراست
کہ تو آمد کہ نہ اندیشہ بر آرد در جہاں — کز جہاں آں کہ جہاں صد یک ازاں تو صداست
داں کہ برخاست ازو رسم مدیح تالیست — دامن عمر بیفشاند و یکے رہ برخاست
آفریدہ چہ کند گر نکشد بار قضا — کافرینش ہمہ در سلسلۂ بند قضاست
اصل از بار خدائے اصل اندر بگزشت — گر تو گوئی کہ زمن درگزر وایں داست

اسی طرح جب بحث و استدلال کی کیفیت اس پر طاری ہوتی ہے، وہ اسی سادہ روش سے کام لیتا ہے۔ ذیل میں تقدیر ایزدی کی ہمہ گیری اور انسانی مجبوری کے مسئلے پر گرم سخن ہے:

اگر محول حال جہانیاں نہ قضاست — چرا مجاری احوال برخلاف رضاست
بلے قضاست بہ نیک و بد عناں کش خلق — بداں دلیل کہ تدبیر ہائے جملہ خطاست
ہزار نقش بر آرد زمانہ و نبود — یکے چناں کہ در آئینۂ تصور ماست

در بر سرم نوشته سودای قضای تو / شهری بزار تان، تو چون اوفتاده ای
گر بی تو خواست بود مرا عمر کاشکی / هرگز نبودمی و ز مادر نزادمی ([illegible])

ندان عزمم که دیگر ره بت خانه گیر سدم / دل اندر وصل و هجران بتی بیداد گر سدم
ندی سر بر افرازم نه باده رخ بر افروزم / ره محرابه بر گیرم در طامات بر سدم
گرم یار حرا ماتی نکیش خویش بفریبد / نه بارش که در ساعت چو او زنار بر بسدم ([illegible])

تا رشت دل اندر خم زلف تو نهادیم / بر زلح ز غم عشق تو جو بانه گشادیم
در آرزوی بوسه تو از دست بشتیم / وا اندر طلب وصل تو از پای فتادیم
تو سر سحداودی ما پیر فسرده آر / در بندگی رشته تو چون داو بدا دیم
تا لستهٔ سد اجل خویش نه گر دیم / از بند غم عشق تو آزاد مبادیم
بے بے به اجل هم نرهیم از غم عشقت / ما عشق تو میریم که ما عشق تو زادیم ([illegible])

یار دوش آن صنم عشوه فروش / شهری از ولوله آورده بجوش
صبح دم بود که می ستد بوتاق / چون پر اندوش نه هشیش نه بهوش
دست بر کرده بشو حی از حیب / چادر افگنده به تنگی بر دوش
لاله از تابش می پر پرن پاش / زهره از باد سحر سنبل پوش
دامن از خواب گشاده در نرگس / دام دلها زده از مرد نگوش
پیش کارش قدحی باده بدست / او یکی چنگ خوش اندر آغوش
ای بسا تربت خون گنز عم او / دوش گشته بر آوار نوش
روستائی بچهٔ شهر سوخت / کس درین قصه نه باشد خاموش ([illegible])

ستمگر ویست درون بے خطر بود مردم — کنون که نیست درون بے بہا بود گوہر
محرم خاک و فلک برنگاہ یاد کرد — کہ این کجاست ز آرام و آن کجا ز سفر

دوستوں کی جدائی ؎

مدامم از مژه رنگ رخ طرف خانۂ چشم — بیک شبم ستردن ز روی رخسار غبار
ہزار لقمہ بدندان ربودن از دم تیر — ہزار عقدہ بدندان کشودن از سر مار
بقعر چاہ نشستادن ز آسمان بلند — بفرق بر شدن از دست جانب کہسار
ازین مخاطرہ گر صد ہزار آید پیش — بہ از جدائی یاران ہزار بار ہزار

غزل

انوری کے ہاں تغزل کا ذخیرہ سنائی سے بہتر حالت میں پایا جاتا ہے اگرچہ تصوف کی چاشنی نے ان کی غزل کو زیادہ بامزہ سا دیا ہے انوری کے پاس عشقِ محض ہے جس میں سوز و گداز کی تاثیر غالب ہے، اور ہم یہ جانتے ہیں کہ ایرانی ذہنیت کے نزدیک عشق کا اصلی سرمایہ سوز و گداز ہے، خمریات اور رندی کے مضامین صرف چند غزلوں میں نمودار ہیں وہ تصوف کے کوچے سے قطعاً نابلد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل کے نہال کو سعدی پروان چڑھاتے ہیں لیکن ان سے پیشتر سنائی، انوری، خاقانی، عطار اور مولانا روم کی کوششوں نے اس کی آبیاری میں بڑا کام کیا ہے۔

میں انوری کی غزلوں کے بعض نمونے صرف تاریخی دلچسپی کے واسطے دیتا ہوں، کیونکہ عرصہ ہوا ہم اس پایہ کے مذاق کو خیرباد کہہ چکے ہیں ؎

گر جان و دل بدست غم تو نہ دادمے — پائے نشاط بر سر کیوان نہادمے
گر بیم رنج ہجر تو نیستی مرا — من کارہائے بستۂ خود برکشادمے

کرتا ہے، انوری وہیں بیٹھا بیٹھا بیس بیت کا ایک قطعہ لکھ دیتا ہے میں یہاں بخوف طوالت قطعہ کے پہلے شعر اور آخری دو بیتوں پر قناعت کرتا ہوں ؎

اے برادر گر مزاج از فضلہ بیروں آمدے — آدمی پس یا ملک یا دیو بودے یا پری

خواجہ مجری اے مشامت بوے حکمت یافتہ — گر حکیمی زیں معانی رنگ ہاں تا نادری

آنچہ حالے درجہاں آمد ہمیں ابیات بود — کاندریں عصر بخط خویش بنوشت انوری ۔

یورپ میں کسی سے ملنے جاتے ہیں تو اطلاع کی غرض سے کارڈ بھیج دیا جاتا ہے۔ انوری ایسے موقعوں پر اشعار سے کام لیتا تھا۔ میں ایک آدھ مثال یہاں درج کرتا ہوں ؎

اے خداوندے کہ از ایام اگر خواہی بیابی — ہر لطیفہ خویش دیگر ہر حیثت از خاطر برآید

کمتریں بندگان انوری بر در ستادہ — چوں حوادث بار گردد یا چو اقبال اندرآید

اے خاک درت سرمہ شدہ چشم وفا را — از بس کہ کف پائے تو بر خاک درآید

بر درگہ تو بندہ ستادہ است بحاجت — دستوری تو چیست رود یا کہ درآید ۔

اس کی لطیفہ گوئی کی بعض مثالیں اس سے قبل دی جا چکی ہیں، یہاں چند اور اضافہ کی جاتی ہیں۔

کمال الزماں سحر کے عہد کا نہایت مشہور مغنی ہے، انوری نئے ڈھنگ سے اس کا مرثیہ لکھتا ہے ؎

ہرگز گماں مبر کہ کمال الزماں بمرد — کو روح محض بود بجسم سایہ پذیر

میداں کہ ساکناں فلک سیر گشتہ اند — از مطربی زہرہ ازیں چرخ گوژ پیر

خواہش گری سرود کمال الزماں شدند — کو بود در زمانہ دریں علم بے نظیر

مست از درم درآمد دوش آں مہ تمام — در برگرفتہ چنگ و بکف بر نہادہ جام
گوئی کہ لعل ناب و عقیق گداختہ است — در جام او ز عکس رخ او شراب جام
بنشست بر کنارم و بادہ نوش کرد — آں ماہ سرو قامت و آں سرو کش خرام
با چنگ در کنار مد اندر کنار من — مخمور تا بصبح سپید از نماز شام
در گوشۂ کہ کس نہ بد آگہ ز حال ما — زاں عشرت بغایت و زاں مستی تمام
بے مطرب و ساقی و بے یار و بے حریف — او بود و انوری و مئے لعل والسلام ہما

شعرا غزل کے مقطع میں بالعموم اپنا تخلص لایا کرتے ہیں، یہ دستور سنائی اور انوری کے دور سے پابندی کے ساتھ رائج ہو۔

بدیہہ گوئی اور بذلہ سنجی

انوری کی شہرت کا راز زیادہ تر اس کی بدیہہ گوئی میں مضمر ہو، اس پر اگر اس کی لطیفہ جوابی اور بذلہ سنجی جس کے لیے اس کی موزوں طبیعت ہر وقت حاضر اور آمادہ تھی، اضافہ کی جائے تو اس کی غیر معمولی شخصیت کا جو علم و فضیلت کے اوصاف سے آفتاب نصف النہار کی طرح ضیا بار تھی کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہو۔

یورپ میں موجودہ زمانے میں SCRAP BOOKS کا رواج ہو جنھیں سفینہ یا بیاض کے نام سے پکارا جاسکتا ہو۔ شائقین اپنے احباب اور ملنے والوں سے کوئی نظم یا لطیفہ بطور یادگار اس میں لکھواتے ہیں۔ خواتین میں یہ شوق زیادہ ہوتا ہو، وہ ہر واقف ناواقف سے فرمایش کرتی ہیں، معلوم ہوتا ہو کہ انوری کے عہد میں بھی یہ دستور کسی حد تک جاری تھا۔ ایک دن وہ خواجہ مجری سے ملنے جاتا ہو۔ خواجہ اپنا سفینہ دے کر اس سے نظم کی فرمایش

حسن طلب ؎

شد مدتی کہ عہد زمین بوس تازہ کرد — در خدمت مبارک میمونت انوری
واکنون بر آستانۂ میمونت ور دست — کش آستانہ باد پُر از ماہ و مشتری
از لطف شامل تو طمع دارد این قدر — کاخر چہ می کنی و کجائی، چہ می خوری (۹۴۹)

شراب یا سرکہ ؎

بزرگوارا دانی کہ آمدت نقرس — زہر چہ ترشی من بندہ می بپرہیزم
شراب خواستم و سرکہ کہیں دادی — کہ گر خورم بقیامت مصوص برخیزم
شراب دار تو آخر کجاست، تا قدحے — بگوشش دہی آں قلتباں فرو ریزم (۸۵۳)

ایک خشک جواب ؎

مرا پیام فرستی کہ من بہ پیش تو — چو غیبتم دارم ز من سلام چوں نکنی
کشد پائے بدامن درون سلے شعرا — چو دست تحت تنت از آستین برون نکنی

اخلاقیات

اخلاقی تعلیم کا ذخیرہ انوری کے ہاں کم ہے، لیکن جو کچھ ہے اس پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا کہ اس دائرے میں بھی اُس نے اپنی زبردست شخصیت کی مُہر لگادی ہے اور نئی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا درس جو مذہبیت کے اثر سے معرا ہے اور نہ دوسرے شعرا کی طرح قومی یا ملکی رسوم وقیود کی روایات کا پابجولاں ہے، صرف انسانی آزادی، حرمت نفس اور خودداری کا نصب العین پیش کرتا ہے۔

انوری ادبستانِ فکر کا مؤسس ہے جس نے اس میں ایسی نظموں

گفتند زہرہ را ز فلک دور کردہ ایم — اے رشک جان زہرہ بیا جائے او بگیر

ممالک اسلام میں محتسب کا فرض ہوتا ہے کہ عوام میں ظاہری بداخلاقی اور کھلم کھلا بے حیائی کے جرائم کا انسداد کرے۔ اس قسم کے قانون شکنوں کو تعرض عبرت کسی چوک یا بازار میں سزا دی جاتی تھی۔ شعرا کے طبقے میں محتسب ہمیشہ غیر ہر دل عزیز رہا ہے اور وجہ ظاہر ہے کہ شعرا مذہب سے آزاد ہوتے ہیں اور محتسب مذہب کا حامی۔

انوری بازار میں ایک حسین عورت کو دیکھتا ہے، جس کو محتسب کسی جرم کی پاداش میں سزا دے رہا تھا۔ یہ واقعہ ذیل کے قطعے میں معلوم ہوتا ہے ؎

دی محتسبے براہ دیدم — در دست گرفتہ چوب رزن
مہ روی کہ گرد مے رو — نظارہ برو بام و برزن
پرسیدم از آں میاں یکے را — ق کاں چوب چرا زند براں زن
گفتا سگکے ست روسپی تن — دیں محتسبے ست روسپی زن ([illegible])

پنج ارکان اسلام اور مسئلہ اباحت ؎

یکے و پنج وسی در بیست بیسے — دگر قدرت بود در سنگلے چند
چو زیں بگزشت ما و مطرب و مے — گنہ از ما شدہ عفو از خدا وند ([illegible])

تقاضائے صلہ ؎

شعرے بساں دیدۂ ذرعت یافتم — واں گہ بسوئے صدر کبیری شتافتم
گر پرسدم کسے کہ از جودش چہ یافتی — اے آفتاب خواجہ چہ گویم چہ یافتم ([illegible])

صلہ نہ ملنے کا گلہ ؎

شعر تر دوست مندہ گوید — انعام نصیب غیر باشد
ایں رسم نو آمدہ است امسال — انشاء اللہ کہ خیر باشد

وہ ہمارا پانی پیتا ہے اور ہماری روٹی کھاتا ہے، عشر اور خراج کیا ہے؟ گدائی ہے؛ کیا ایک چیز کے دس نام نہیں ہوتے، مختصر یہ کہ ہر قسم کی ضرورت گدائی ہے اور مانگنے والا عام اس سے کہ حضرت سلیمان ہوں یا قارون، فقیر ہے۔

کسی کو دینا بے شک طریقِ احسان ہے، لیکن نہ لینا اِس سے بھی بڑا احسان ہے، اور مشکل بھی ہے۔ دینے میں جس قدر مروّت ہے نہ لینے میں ہزار درجہ زیادہ مروّت ہے۔ خدا پر بھروسا رکھو اور کسب حلال سے روزی پیدا کرو، جاہل صوفیوں کی طرح روزینہ دار نہ ہو۔"

آدمی کو بے نیاز اور آزاد بنانے کے لیے انوری کی یہ تلقین ہے، اور اس کا آخری قول ہے ؎

آزادگی ست حلۂ مردان و انوری
آن دست گاہ کو کہ من آزاد مردمے سوانح

اور معاملات میں کہتا ہے کہ صبر و شکر ایسی نعمتیں ہیں جو سلاطین کو بھی نصیب نہیں۔ جب ہمیں اس قدر مل رہا ہے جو ہماری ضروریات کو اکتفا کرتا ہے تو اس پر قانع رہنا چاہیے، قناعت بہترین کیمیا ہے۔ تمھارے پاس اوصافِ اضافی مثلاً دولت و مال نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں، کوشش کرو کہ تمھارے طبعی اوصاف یعنی اخلاق دُرست ہوں تمھارا سلوک سب نوع کے ساتھ ایسا ہو کہ وقت پر سب تمھارے رنج کو اپنا رنج سمجھیں۔ دو باتوں میں سے ہمیں ایک کام کرنا چاہیے یا دوسروں کو فائدہ پہنچائیں یا اُن سے فائدہ اُٹھائیں

لیکن اب وقت آگیا ہے کہ میں اس کی اخلاقی شاعری کا نمونہ ناظرین کے سامنے پیش کروں

میں بہت کچھ نشو و نما اور ترقی دی، لیکن جس کو ہماری مشرقی آب و ہوا نے کبھی فروغ اور اشاعت کا موقع نہیں دیا۔ اس میں اس میں شک نہیں اس موضوع کی نشر و اشاعت میں ایک بڑی حد تک انوری کا رہینِ منت ہے۔

انوری کہتا ہے انسان کا اصلی لباس آزادی ہے، لیکن امید و بیم نے خلق کو خلق کا مسخر اور مقید کر دیا۔ ایسے جیسے انسان کے پاس امید لے کر جانا اپنی عزتِ نفس کو خوار کرنا ہے۔ یاد رکھو احسان اٹھانا کاہشِ روح ہے۔ عذاب برداشت کرنا یا جہنم میں پھینک دیا جانا سوال کی ذلت اٹھانے اور کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے ہزار بار قابلِ ترجیح ہے۔

اپنی آنکھوں کے خون میں روٹی ڈبو کر کھانا دوسرے کے گھر سے سرکہ مانگ کر کھانے سے بہتر ہے۔ آدمی کو چاہیے دوسرے کا متوسل اور دست نگر ہو جو شخص کسی کا دست نگر نہیں وہی آدمی ہے ورنہ کس اور خس میں کچھ فرق نہیں۔ تم میں اگر کچھ دینے کی طاقت نہیں تو کچھ پروا نہیں لیکن کوشش کرو کہ لینے کی طاقت برقرار رہے۔ دوسرے کا احسان اٹھا کر اگر تم مال دار بھی ہو گئے تو کیا اس سے تمھیں روحانی نقصان نہیں پہنچے گا۔

آئینِ حکومت ہر قوم کا ذہنی و عقلی نصب العین رہا ہے اور ہر قوم نے اپنی اپنی ذہنیت کے مطابق اس کی حرمت اور تائید میں آرا کا اظہار کیا ہے، لیکن انوری نے انسانی آزادی اور استغنا کے اصول کو اس کے انتہائی مدارج تک پہنچاتے ہوئے اس آئین کو گدائی کی اقسام میں شامل کیا ہے۔ وہ گویا ہے کہ "بادشاہی کیا ہے؟ گدائی ہے"، بادشاہ ہر شخص کا محتاج ہے اس کا سامانِ سلطنت، تمھیں معلوم نہیں، کہاں سے آیا ہے؟ سنو! اس کے گلے کے موتی ہمارے بچوں کے آنسو ہیں، اور لعل و یاقوت ہمارے یتامیٰ کا خون ہے،

حسن معاشرت سے

در جہاں نامرداں دانی کہ چوں باید گذاشت   آں قدر عمرے کہ باید مردم آزادہ مرد
کاسہا در غم او ترکند از آب گرم   فی المثل گر بگذرد بر دامن او باد سرد

سوال و طمع کی ذلت سے

بودن اندر عذاب چوں حر چنیں   یا شدن در جحیم چوں ابلیس
بہتر ست از سوال کردن و طمع   وا ایستادن بہ پیش مرد خسیس

قناعت سب سے بہتر کیمیا ہے

کیمیائے ترا کنم تعلیم   کہ در اکسیر و در صناعت نیست
رو قناعت گزیں کہ در عالم   کیمیائے بہ از قناعت نیست

منت بری کے خلاف تلقین سے

آلودۂ منتِ کساں کم شو   تا یکشبہ در وثاق تو ناں ست
اے نفس بر ستۂ قناعت شو   کانجا ہمہ چیز بیکراں ارزاں ست
تا بتوانی حسد مکن از آنک   کیں صفتِ خلق کاہش جاں ست
زیں سود چہ سود اگر شود اکنوں   در مایۂ نفس عیب نقصاں ست
در عالم تن چہ میکنی ہستی   چوں مرجع تو بعالم جاں ست
چنداں کہ مروت ست در دادن   در ناستدن ہزار چنداں ست

وقت کی قدر سے

روز را رائگاں ز دست مدہ   نیست امکاں آں کہ باز رسد

راحت میں شکر کرنا اور تکلیف میں شکایت کرنا انصاف نہیں ہے

روزے کہ فلک ستادہ دلیش گرفتے   از فصلۂ روز ہر دو ختمے خیب
اکنوں ہمہ شب منتظرم تا بگذرد   شمعے کہ بہر جا چراغے بیدار عسس

صفائی اخلاق ؎

صفه را نقش می بستند استادان چین — بشنو این معنی اگر بی خوشتر حدیثی بشنوی

اوستادی بیمه را کرد همچون آئینه — اوستادی بیمه را کرد نقش مانوی

ای برادر خویشتن را صفه دان همچنان — هم به سقف نیک عالی هم به بنیاد قوی

مانده از آن نیمه پر نقش مثالی سدل — جهد آن کن تا مگر آن نیمه دیگر شوی (ص ۵۳۶)

شاهی و گدائی ؎

آن شنیدستی که روزی زیرکی با ابلهی — گفت کین والی شهر ما گدائی بی‌حیاست

گفت چون باشد گدا آن کز کلاهش تکمه — صد چو ما را روزها و سالها برگ و نواست

گفت ای نادان غلط اینک بدین جا کرده — آن همه برگ و نوا دانی که آنها از کجاست ؟

در و مروارید طوقش اشک اطفال من است — لعل و یاقوت ستامش خون ایتام شماست

آن که تا آب سبو پیوسته از ما خواسته است — گر بجوئی تا بمغز استخوانش نان ماست

خواستن کدیه است خواهی عشر خوان خواهی خراج — زان که گر ده نام باشد یک حقیقت را رواست

چون گدائی چیزی دیگر نیست جز خواهندگی — هر که خواهد گر سلیمان است و گر قارون گداست (ص ۳۳۲)

رنج و راحت کی بے ثباتی ؎

در حدود ری یکی دیوانه بود — روز و شب گردی بسوی دشت گشت

در تموز و در بهار و در خزان — سوی ما از آمدی از سوی دشت

گفتی ای آن که عیش آماده اید — هر زمانی زیر این زرین طشت

قاقم و سنجاب در سرما و جار — توزی و کتان مگر ما هست و بهشت

گر شما را بانوائی در حیه شد — ور چه ما را بی نوائی در چه گشت

راحت هستی و رنج نیستی

بر شما بگذشت و بر ما هم گذشت ص ۶۳

کہتا ہے کہ اس ناکامی کی وجہ یہ نہیں کہ میں تمھارے مقابلے میں زیادہ باکمال ہوں یا تم میرے مقابلے میں بے ہنر ہو، اصلی وجہ قدر دانی ہے، میرے آقا کو میرے ہنر کی قدر ہے اس لیے میرے کام کو رونق ہے، لیکن تمھارے آقا کو تمھارے کام کی کوئی قدر نہیں، وہ یہی سمجھتا ہے کہ تمھارا کام وہی معمولی ہے جو سدا سے ہوتا آیا ہے، پھر وہ یہ بھی خیال کرتا ہے کہ ان عالم لوگوں کے کارنامے بازاری جنس کی طرح بالکل عام ہیں اس لیے وہ کیوں قدر کرنے لگا اس کو تمھاری کاوش جگر کی کیا خبر۔

ناکسے مردک کنّاس ہمی گفتم دوش | توچہ دانی کہ ز عشق تو دلم چوں خستہ است
صنعت پیشۂ ما ہر دو ہمی دانی چیست | آں چرا تیز رود وین زچہ رو آہستہ است
گفت از عیب حسود از ہنر ما نشناس | ایں کہ ما را ز حیا آتش فرقت خستہ است
کارفرمائے دہ رونق کار من و تو | داند آں کس کہ شمے نامی و تو بستہ است
کارفرمائے مرا پایۂ من معلوم است | لاجرم کار من از بہر تقاضا رستہ است
بار چوں گاو خراس از تو دارد پایۂ تو | کارفرمائے ترا دیدہ جہاں بربستہ است
کہ جہاں طل بر داد کاچہ تو ترتیب کسی | کردۂ دائم و پرداختۂ پیوستہ است
یا چناں داند کایں عمر عزیز علما | ہمچو روز و شب جہاں متاع رستہ است
او چہ داند کہ دراں شیوہ چہ خوں باید خورد | کہ ترا از سر بیداد در آں پے خستہ است
انوری ہم رہ تو برتست کہ بر شاخ درخت | عقل داند کہ ستم ہائے تبر از دستہ است

بو علی اور فردوسی سے

انوری بہر قبول خلق تا کے گفت شعر | راہ حکمت رو قبول عامہ گو ہرگز مباش
رفت ہنگام غزل گفتن دگر سردی مکن | راویاں را گرمی ہنگامہ گو ہرگز مباش
تاج حکمت بالباس عافیت باشد بہوش | جاں چو کامل شد طراز جامہ گو ہرگز مباش
درکمال بو علی نقصان فردوسی مگیر | ہر کجا آمد شفا شہنامہ گو ہرگز مباش

(کلیات قلمی)

آں روز ملک را چو دراں شکر نہ گفتم   امروز دریں رشتہ بود گر کمش عیب (بیدل)
یعنی پہلے میں اس قدر مالدار تھا کہ جب دھوپ نہ ہوتی اور آفتاب غائب رہتا تو میں مومی شمعیں جلا لیتا اب اس قدر غریب ہوں کہ گھر میں روشنی کے لیے چاند کا منتظر رہتا ہوں۔

خدا پر بھروسا ؎

خدائے کار چو بر بندہ فرو گیرد   بہر چہ دست زند رنج دل پیر اید
وگر بطبع شود زود بندہ ہیچ خوشے   زہر چہ بیے خوار و نزند بار آید
چو اعتقاد کند کرسش بیاید چیر   خدائے قدرت والائے خویش بنماید
مدست بندہ زعقل و زعقد چیرے نیست   خدائے بندہ کار و خدائے بکشاید (فردوسی)

کوئی واقعہ بیان کر کے اس کی استدلالی قوت کے اعتماد پر اخلاقی نتیجہ ترتیب دینا معلمین اخلاق کا پرانا دستور رہا ہے۔ اس طریق میں وصف یہ ہے کہ مستمع پر اس قسم کی نصیحت کا محض سرسری موعظت کے مقابلے میں زیادہ اثر ہوتا ہے جس طرح ڈاکٹر کڑوی گولیوں کو شکر میں ملفوف کر کے بہ آسانی سے کھلا دیتا ہے اسی طرح معالج اخلاق ان فرضی قصوں کے پردے سے پند و موعظت کی تلخی کو بدرجہا گوارا بنا دیتا ہے۔ انوری کی مثنوی میں یہ وصف زیادہ نمایاں ہے جیسا کہ پر ذیل مثال سے ظاہر ہے یہاں ایک اور مثال دی جاتی ہے جو شاعری کی مذمت سے علاقہ رکھتی ہے۔ انوری کا شمار شعر کے اقالیم ثلاثہ میں کیا جاتا ہے، لیکن با وصف اس کے وہ شاعری کا زبردست مخالف ہے۔ اس کی رائے میں شاعر کا پیشہ خاکروب کے پیشے سے بھی زیادہ ذلیل اور کثیف ہے۔ وہ کہتا ہے میں نے ایک حلال خور سے دریافت کیا کہ بھائی ہمارا تمہارا پیشہ جیسا کچھ ہے، معلوم ہے لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم اپنے پیشے میں کامیاب ہو اور میں ناکام ہوں۔ خاکروب

دور دورِ خشک سال و قحط دین و دانش ست — چند گوئی شیخ بارے کو و بارانے کجاست
من ترا منایم اندر حال صد تو جہل جہل — گر مسلمانی، تو تعیین کن مسلمانے کجاست
آسمان ہیچ کمال از جانب عالم بر کشید — تو رخ می زن که در سی گنج نقصانے کجاست
خاک با طوفاں اگر عسلے و ہر وقت آمدہ است — اے دریغا داعی چوں نوح و طوفانے کجاست [illegible]

منصب ندیمی کی توہین سے

نشاید بہرِ آدابِ ندیمی — دگر رہاں و دل زحمت نہادن
زباں کردن بنظم و نثر جاری — ز خاطر نکتہ ہائے بکر زادن
کہ ناز آمد ہمہ کار ندیماں — بسیلی خوردن و دشنام دادن

مسخروں اور مطربوں کی قدر اور علوم کی بے قدری سے

ای خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم — تا در طلب راتب ہر روزہ نمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز — تا داد خود از ہر کس و ناکس بستانی

کمال کی کساد بازاری سے

ہر کس کہ جگر خورد و مردی ہنر آموخت — در دَورِ قمر گو بنشیں خونِ جگر خور
نزدیک کسانے کہ بصورت چو کسے اند — با صورت ایشاں لقبے برزن و برخور
پیغام برے آر و ہمہ اطلس و خز پوش — یا مسخرہ باش و ہمہ حلوائے شکر خور [illegible]

شعر کی بے قدری سے

خاطرے چوں آتشم ہست و زبانے ہمچو آب
فکرت تیز و ذکا، نیک و شعرے بے خلل
اے دریغا نیست ممدوحے سزا وار مدیح
وے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل [illegible]

مذکورۂ بالا اشعار کی روشنی میں ہم اُن ایام کی اخلاقی پستی اور انتذال کا

شعر اور شرع ؎

کسے کہ مدت سی سال شعر باطل گفت — عدای بر سر کامیش داد پیروزی
کنوں کہ روئے بہ جد جلہ در حقیقت شرع — چہ اعتقاد کنی باز گیر دستش روزی
بروکہ عاقل ازیں اختیار آں بیند — کہ کشت تشنہ بہ بید نہ از بود دوری
ز شعر نقش تو آں ما رہا سے عار کشید — کہ چوں ہلال نطعلی در آمدش کوری
ز شرع حالِ تو آں شعلہ ہائے نور زند — کہ تو بہر فلکے آمدستا لے افروری
تو را لئے شرع بہ آخر ری ہی خطاست — چو عیں شعر بہ آخر ری بیا موری

جس وقت انوری کا آفتاب شاعری طلوع ہوا ہے خراساں کا سیاسی مطلع انتہائی تاریکی میں تھا۔ اس دور انقلاب میں انسانی قسمت کا ساغر آلام و آزار اور شدائد کی شراب سے لبریز تھا۔ عنانِ حکومت غیر متمدن اور وحشی اقوام کے ہاتھ میں چلی گئی تھی جن کے اوضاع و اطوار سباع کے اوضاع و اطوار سے کم نہ تھے۔ پرانے درباروں کے چراغ گل کر دیے گئے تھے، ان کے بجائے ایسے دربار قائم ہوئے تھے جن کے راس الرؤسا اکثر تو کاسہ اور تو کیسہ تھے۔ ان کے مشاغل اور مذاق نہایت پستی کی حالت میں تھے۔ مدیح کا قابل عزت پیشہ اخلاف اور اراذل کے ہاتھ میں چلا گیا تھا، جن کے نزدیک مدیح اور مسخرہ ایک ہی معنی رکھتا تھا۔ اہل علم و ارباب کمال ہر طرف خوار پھرتے تھے اور کوئی پوچھتا تک نہیں تھا۔ ہزال، زنود اور مطربوں کی گرم بازاری تھی۔ انوری ان واقعات اور حادثات عصری کا مرقع اپنی مختلف نظموں میں کافی وضاحت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ چنانچہ

اہل عصر کی بدتمیزی ؎

ربع مسکوں آدمی را بود دام و دو گرفت — کس ہمی داند کہ در آفاق انسانے کجاست

کلیاتِ انوری طبع نول کشور

یہ ہمارے ملک کی بدنصیبی ہے کہ باوجود فارسی زبان کی قدر اور رواج کے فارسی کتب کی طبع کا انتظام ہمارے ہاں نہایت ناقص ہے اس کے لیے ہم یورپ اور ایران میں کافی بدنامی اُٹھا چکے ہیں اور اُٹھا رہے ہیں، لیکن اب تک ہمیں فارسی کتابوں کا صحیح چھاپنا نہیں آیا۔ گزشتہ قرن میں کلکتہ، لکھنؤ، کانپور اور دہلی سے بلحاظ طباعت و صحت اعلیٰ معیار کی کتابیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ مگر ہم نے ایک صدی بعد ترقی معکوس کی ہے اور یہ کہنا مبالغہ میں داخل نہیں کہ موجودہ صدی میں کتاب اسی قدر زیادہ غلط چھپتی ہے جس قدر قرن ماسبق میں صحیح چھپتی تھی۔

کلیات انوری سب سے پہلے تبریز میں سنہ ۱۲۶۶ھ میں چھپا تھا، دوسری مرتبہ لکھنؤ سے سنہ ۱۲۹۷ھ میں نول کشور پریس سے شائع ہوا اسی اشاعت کی دوبارہ تجدید اسی مطبع سے سنہ ۱۲۹۷ھ میں ہوئی۔

منشی نول کشور کی پہلی اشاعت تبریزی نسخے سے منقول ہے، اس کے علاوہ اس میں منشی سرج موہن لال خلف بانو بہاری لال متوطن دہلی کے ایک قلمی نسخے سے بھی امداد لی گئی ہے۔ اِس کلیات میں اہل مطبع ایک عجیب غلطی کے شکار ہو گئے ہیں اس میں بعض ایسے قصائد بھی شامل کر لیے گئے ہیں جو انوری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور نہ انوری کے وطن اور عہد میں لکھے گئے بلکہ ہندستان میں۔

یہ قصائد جن کی تعداد آٹھ دس سے زیادہ نہیں، سلطان شمس الدین التمش سنہ ۶۰۷ھ و ۶۳۳ھ اور اس کے فرزند سلطان رکن الدین فیروز کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک قدیم ہندی شاعر تاج ریزہ نامی کی یادگار ہیں جو بلحاظ زمانہ امیر خسرو دہلویؒ سے مقدم ہے۔ اس عہد کے ہندی استادشعرا کا سراغ

کسی قدر اندازہ لگا سکتے ہیں، ساتھ ہی انوری کے دلی صدمات کا حال بھی معلوم کرسکتے ہیں۔ ایسے خیالات کے مالک کو ہم کسی حالت میں دنی الطبع سفلہ مزاج اور تنگ ظرف نہیں کہہ سکتے۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ مولانا شبلی کی نگاہ میں انوری کے اخلاق کا معیار نہایت پست ہے اس کی ہجویات کی بنا پر مولانا نے اس کی نسبت ایک نہایت مذموم رائے قائم کی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ ہجو اس کے ہاں ایک اتفاق ہے، اس کا اخلاقی معیار معاصرین سے نہایت بلند تھا۔ بیس سال تک وہ ایک ثقہ متین اور سنجیدہ شاعر کی زندگی بسر کرتا ہے، لیکن معاش کی طرف سے ناکام رہتا ہے، اس لیے کہ اس کے اخلاقی تفوق نے اس کے اور اس کے معاصرین کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر دی تھی آخر وہ بیزار معلوم کرلیتا ہے اور آیندہ کے لیے اپنے نصب العین میں تبدیلی کا عازم ہوتا ہے چنانچہ کہتا ہے ؎

چو آنکہ بیفزایدم ز مدح و غزل — چرا با آتش فکرت ہمی بکاہم روح
بیاد بوک و مگر شصت سال بر دادم — مرا خدای بداد است زندگانی نوح
عنان طبع ازیں پس کشیدہ خواہم داشت — اگر گشادہ نہ بینم در قبول و فتوح
وگر عطا ندہندم بر آرم از پس مدح — بلفظ ہجو دمار از سر چنیں ممدوح

یہ قرارداد اس کی اخلاقی بدبختیوں کی بہت سی گرہیں کھول دیتی ہے اور مستقبل اس میں وہی تغیر دیکھتا ہے جو عبید زاکانی بہ اقتضائے وقت و زمانہ انوری سے دو قرن بعد اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ اخلاقی انقلاب آیندہ زندگی میں اس کو کامیابی کی شاہراہ پر لگا دیتا ہے۔

حامی آفاق التمش[1] کہ عزم و حزم او — گرد بر گرد جہاں حصنِ حصیں آوردہ اند ([illegible])

آیش سدی کا ذکر ذیل کے اشعار میں آتا ہے ؂

خسروا از رشک صُور[2] تا کہ بر ایوانِ تست — چیں در آر دست نکورویان چیں آوردہ اند

صحن درگاہت بر بہشت گلستانے شد کرد — خارخائے در دلِ حلد بریں آوردہ اند

شہر را از نقش جہت در دو ریوار بستہ اند — قبہا بر سپہر ہفتمیں آوردہ اند ([illegible])

---

(۲)
ساقی بیا کہ وقت مئے لعل و تش ست — میدان خاک تیرہ کنوں سر گلشن است ([illegible])

یہ قصیدہ غیاث الدین محمد شاہ کی تعریف میں ہے، چنانچہ ؂

عادل غیاث دیں کہ بیک تن گہِ دعا — از بہر قصد جان عدو صد تہمتن ست

فرمان دہ زمانہ محمد شہ آں کہ ملک — از رائے او چو روئے عروساں مزین ست ([illegible])

انوری کے عہد میں دو غیاث الدین گزرے ہیں، پہلا غیاث الدین محمد سلجوقی المتوفی ۵۵۳ھ دوسرا غیاث الدین محمد غوری برادر معظم شہاب الدین غوری، لیکن میں ان دونوں سے اعراض کرکے التمش کے فرزند غیاث الدین کے نام یہ قصیدہ مانتا ہوں۔ ذیل کے شعر میں سیر اور مسہدی الفاظ ہیں، اور ان ہی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ چنانچہ ؂

چیز از مئے قدیم مرا سیر کن برطل — مگذر ازیں حدیث کہ یک سیر و یک من ست ([illegible])

انوری کا ان الفاظ سے واقف ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] صحیح تلفظ التتمش ہے جیسا کہ شعر ہذا میں مذکور ہے، نہ التمش جیسا عام طور پر مشہور ہے
[2] مکانات پر نقاشی کا رواج ایران میں غزنوی اور سلجوقی دور میں عام تھا اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ یہ رسم ہندستان میں بھی آ گئی تھی۔

اگرچہ کافی تعداد میں موجود تھے بہت کم ملتا ہے اس لیے میں اس غلطی کا جس نے ہمیں ہمارے وطن کے ایک قدیم شاعر کا سا دیا، بڑی خوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں۔

اس قسم کی غلطی متاخرین کے ہاتھوں نہیں ہو سکتی، بلکہ قدیم زمانے میں عمل میں آئی ہوگی۔ فہرست (کتب قلمی فارسی) برٹش میوزیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں بھی انوری کے ایک کلیات میں یہی غلطی موجود ہے۔

ذیل میں ان قصائد کی ایک فہرست دی جاتی ہے، جو اس قدیم شاعر کی یادگار ہیں ؎

(۱) مژدہ عالم را ز عالم آفریں آوردہ اند زانکہ منشور از خلیفہ آفریں آوردہ اند
ناصر الاسلام مستنصر کہ طوقِ طاعتش ز آسماں در گردن اہل زمیں آوردہ اند

قصیدۂ ہذا شاعر نے اس وقت لکھا ہے جب سلطان شمس الدین التمش کے پاس خلیفہ المستنصر باللہ ۶۲۳ھ و ۶۲۶ھ کا سفیر دہلی آتا ہے اور اس کی آمد کی خوشی میں تمام شہر میں آئین بندی کی جاتی ہے طبقات ناصری سے معلوم ہوتا ہے کہ سفیر دوم ربیع الاول ۶۲۶ھ کو دہلی پہنچتا ہے۔

قصیدے سے واضح ہوتا ہے کہ تحائف میں بادشاہ کے لیے خلعت اور ایک تاری گھوڑا بھی تھا، طبقات ناصری میں گھوڑے کا ذکر نہیں ہے ؎

شادی عام ست در شہر ایں کہ بہر شہریار خلعتِ خاص امیر المومنیں آوردہ اند
خلعتے یا رب چگونہ چوں عروس آراستہ راست بر بالائے شاہ را آئیں آوردہ اند
مرکبے کاندر روانی آب را ماند رواں یا مگر باد صبا را زیر زیں آوردہ اند
مرکبے ریحاں مبارک، خلعتے میموں چنیں از برائے ظل یزداں شمس دیں آوردہ اند

یہ قصیدہ نظام الملک قوام الدین محمد جنیدی کی تعریف میں ہے جو شمس الدین التمش اور رکن الدین فیروز شاہ کا وزیر رہا ہے۔ اس کا نام ان ابیات میں آتا ہے۔

آصفِ ثانی نظام الملک دستورِ جہاں کز کمالِ کامگاری چوں سلیمان آمدہ است

صاحبِ عادل قوامِ الدین محمد کز شرف چوں محمد زبدۂ ترکیبِ ارکان آمدہ است (ج)

اس کا جنیدی ہونا اس شعر سے ظاہر ہے ؎

گوہرِ آلِ جنیدی در کرامتہائے تو مالکِ دینار شد ہر کو سخن دان آمدہ است (ج)

شاعر اپنی ہندی نژادی کا ذکر یوں کرتا ہے ؎

مولد و منشا مبیں در خاکِ ہندستاں مرا نظم و نثرم بیں کہ بر آبِ خراساں آمدہ است

ص ۸۹

---

(۸) صبح چیرا اینکہ وصفِ آں خط و خد کردہ اند
در رہِ فکرت نو شتن عہد بیعد کردہ اند ص ۱۳۶

یہ قصیدہ بھی نظام الملک جنیدی کی تعریف میں ہے، اور قصیدے کے ذیل میں اس کا نام بھی موجود ہے۔

(۹) بفریاد آمدم ایں جا بفریاد اگر شاہِ جہاں دادم دہد داد ص ۱۲۵

یہ قصیدہ کسی شخص کی شکایت میں لکھا گیا ہے، جس سے شاعر کا جھگڑا ہوتا ہے اور مار پیٹ تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ شاعر نہایت غیظ کی حالت میں ہے اور کہتا ہے کہ اگر بادشاہ نے میری فریاد نہیں سنی تو میں بغداد جا کر امیر المومنین کے دربار میں شاکی ہوؤں گا، اور اپنے آنسوؤں سے بغداد میں ایک سیلاب جاری کر دوں گا وہاں بھی سماعت نہیں ہوئی تو خانہ کعبہ جا کر اور پردۂ کعبہ پکڑ کر خدا کی جناب میں فریاد و زاری کروں گا۔ بعد میں گویا ہے کہ غالباً مجھے اس انتہائی کارروائی پر عمل درآمد کی ضرورت نہیں ہوگی، کیونکہ ہمارا بادشاہ خود

(۳)
ساقی بیار بادہ کہ نوروز عالم ست
روز خجستہ چوں رخ شاہ معظم ست — ص ۸۳

قصیدہ ہا رکن الدین فیروز بن سلطان شمس الدین التمش کی تعریف میں ہے چنانچہ شعر ہے

فیروز شاہ کعبۂ اقبال رکن دیں — کز خاک پائے او اثر آب زمزم ست

---

(۴)
افزود باز رونق ہر مرغزار گل
چوں زر یافت نالۂ ہر مرغزار گل — ص ۲۶۴

یہ قصیدہ بھی التمش کے فرزند غیاث الدین محمد کی مدح میں ہے اور اس کا نام موجود ہے۔

---

(۵)
اے راستی کہ در دل لیل و نہار یافت
تا تا کہ باعتدال مزاج بہار یافت — ص ۸۱

یہ بھی رکن الدین فیروز مذکور الصدر کی ستایش میں ہے اور اس کا نام مذکور ہے

---

(۶)
اے منعم کز دیدہ یاقوت رواں آوردہ ام
بیدلاں را از سخن قوت رواں آوردہ ام — ص ۳۰۷

یہ بھی رکن الدین فیروز شاہ کی تعریف میں ہے۔

---

(۷)
بیدلاں را روئے تو آئینۂ جاں آمدہ است
وز لب و دنداں تو لؤلؤ و مرجاں آمدہ است — ص ۸۶

نظامی گنجوی

قولہ "الیاس یوسف نام، ابو محمد کنیت، نظام الدین لقب، نظامی تخلص
باپ کا نام مؤید تھا۔"

(شعر العجم صفحہ ۲۰۹ طبع المعارف پریس ۱۹۲۰ء)

شیخ نظامی کا نام دراصل الیاس ہے اور اس کے لیے یہ شعر سند ہے۔ لیلیٰ مجنوں ؎

والیاس کالف بری ز لامش ہم با نود و نہ است نامش [1]

(خمسۂ نظامی صفحہ ۲۰ طبع مطبع مظفری بمبئی ۱۳۲۶ھ)[2]

ایک اور شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام اویس بھی تھا۔ لیلیٰ مجنوں ؎

یا رب تو مرا کہ اویس نامم در عشق محمدی تمامم

زاں شہ کہ محمدی جمال است روزیم کن آنچہ در خیال است

(خمسہ صفحہ ۲۰۴)

یوسف ان کے والد کا نام تھا، زکی دادا کا اور مؤید پردادا کا۔ لیلیٰ مجنوں ؎

گر شد پدرم بہ سنت جد یوسف پسر زکی مؤید

(خمسہ صفحہ ۲۰۹)

قولہ "قم کے اضلاع میں تفرش ایک ضلع ہے۔ اصل وطن یہاں تھا، لیکن
چونکہ قم صدر مقام ہے اس لیے انتساب میں تفرش کے بجائے قم کا
نام لیتے ہیں۔" (شعر العجم صفحہ ۲۰۹)

---

[1] الیاس کے اعداد ایک سو دو سے الف اور یا کے اعداد کے اخراج سے ننانوے بچے ہیں۔

[2] اس مضمون کے دوران میں صفحات کے حوالے اسی خمسے سے دیے گئے ہیں۔

جو عادل و منصف ہے، اور وہ رکن الدین والدنیا ہے، یعنی رکن الدین فیروز

---

(۱۰) اے فخر ہمہ نژادِ آدم　　　　وے سیدۂ زنانِ عالم ص ۲۸۱

قصیدۂ ہذا کسی شہزادی کی تعریف میں ہے جس کا خطاب کریمۃ النسا اور نام رضیۃ الدین ہے جیسا کہ ؎

سلطانت کریمۃ النسا خواند　　　　شد ذاتِ شریف تو مکرّم
راضی ز تو اے رضیۃ الدین　　　　حق قادر و ذو الجلال اکرم ص ۲۸۱

بادشاہ سے اس کے تعلقات یوں بیان کیے گئے ہیں۔ ابیات

اقبالِ تو بر فزود ست ہر روز　　　　از دولت خسرو معظم
آں پادشہے کہ خسرواں را　　　　از ہیبت او فرو شود دم
از ورد دعائے تو سحرگاہ (کذا)　　　　بنیاد بقائے اوست محکم ص ۲۸۲

رضیۃ الدین کی سرکار میں شعرا کی آمد و رفت بھی تھی ؎

در مدح و ثنات شاعراں را　　　　تشریف و صلات و خز معلم ص ۲۸۲

میں ایک مدت تک اس قصیدے کو سلطان رضیۃ الدین بنت سلطان شمس الدین التمش کی مدح میں مانتا رہا، لیکن انوری کے ایک قلمی کلیات میں، جس سے گر ستہ، یا لا الحاقی قصائد ترک کر دیے گئے ہیں، یہ قصیدہ داخل ہے۔ اس شہادت کی بنا پر میں اپنے نظریے سے دست کش ہو گیا ہوں، اگرچہ مطمئن نہیں ہوں۔

ہاں مورخین میں ایک اور دستور رہا ہے کہ تاریخ وفات کی بجائے حاضری میں مصنفین کی آخری تصنیف کی تاریخ کو ان کی تاریخ وفات مان لیا جاتا ہے چنانچہ حکیم سنائی، عنصرالمعالی کیکاؤس وغیرہم کے ساتھ بھی سلوک کیا گیا ہے۔

اقبال نامہ میں نظامی نے جہاں حکما کی وفات کے عنوان قائم کیے ہیں وہاں اپنی وفات کا عنوان بھی قائم کر دیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۶۳ سال کی تھی اسی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال فرمایا ہے، مولانا نظامی نے عاشق رسول ہونے کی حیثیت سے اسی عمر میں وفات پانے کی خواہش کی ہے تاکہ موت میں بھی اتباع سنت رسول کی جائے، لیکن ایک امر کی آرزو اور بات ہے اور اس آرزو کا پورا ہونا اور بات ہے ہمارے پاس بس ایسے وجوہ موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندر نامے کے اختتام کے کئی سال بعد تک وہ زندہ رہے ہیں۔

لیکن سال ولادت معلوم کرنے کے لیے ایک یقینی ذریعہ یہ ہے کہ شیخ نظامی لیلیٰ مجنوں میں اپنی عمر ۷ × ۷ = ۴۹ بتاتے ہیں۔ بیت

دیں ہفت ہفت گہی کہ نامم — مجموعۂ ہفت سبع نامم

(خمسہ صفحہ ۲)

چونکہ یہ مثنوی ۵۸۴ھ ہجری میں ختم ہوئی ہے۔ چنانچہ ابیات

کاراستہ شد بہترین حال — در سلخ رجب بہ ثی و فا دال

تاریخ عیاں کہ داشت باخود — ہشتاد و چہار بعد پانصد

(" صفحہ ۴۲)

اس لیے اگر سال عمر انچاس ۵۸۴ھ ہجری سے تفریق کیے جائیں تو ۵۳۵ھ ہجری سال ولادت نکل آتا ہے۔ سال وفات کے متعلق اسی قدر

تفرش[1] کے متوطن تفرش کی طرف ہی منسوب ہوا کرتے ہیں، مثلاً میر عبدالغنی تفرشی، میرزا طاہر تفرشی، امیر قدسی تفرشی، بابا تفرشی وغیرہ، لیکن جو ضعیف روایت نظامی کو تفرش کی طرف نسبت دیتی ہے اصل میں یوں ہے کہ شیخ تفرش کے موضع تامن کے جس کو بتخفیف من "تا" بھی کہا جاتا ہے، رہنے والے تھے، چنانچہ اب بھی اُن کی اولاد وہاں آباد ہے۔

تفرش دہے ہست‘ تا‘ نام او   نظامی از آنجا شدہ نامجو

لیکن خمسہ میں تامن، اور تفرش کی طرف کوئی تلمیح نہیں ملتی اور نظامی گنجہ کے ساتھ اس کثرت سے اپنے آپ کو مضاف کر رہے ہیں کہ اس تعلق کی موجودگی میں کسی اور شہر یا وطن کی طرف نسبت دینے کی گنجایش ہی باقی نہیں رہتی۔

قولہ "سال ولادت کسی نے بیان نہیں کیا لیکن چونکہ بروایت صحیح سن وفات ۵۹۶ھ ہے اور ان کی عمر عموماً ۶۳ برس کی بیان کی جاتی ہے اس لیے سال ولادت ۵۳۳ھ ہجری سمجھنا چاہیے"

(شعرالعجم صفحہ ۲۸۹)

مولانا نظامی کے سال وفات کے متعلق مورخین میں سخت اختلاف ہے۔ چنانچہ تذکرۂ دولت شاہی میں ۵۷۶ھ ہجری، آتش کدے میں ۵۸۸ھ، جہاں آرا میں ۵۹۰ھ ہجری کشف الظنون میں ۵۹۶ھ ہجری، صبح صادق اور شاہد صادق میں ۶۰۰ھ ہجری اور تقی کاشی کے ہاں ۶۰۶ھ ہجری ہے۔

سنہ ۵۹۶ ہجری اصل میں شرف نامے کے اختتام کی تاریخ ہے ہمارے

---

[1] اس کی قدیم شکل طرشش ہے چنانچہ شرف الدین علی وزیر عراق جو جلال الدین ملکوتی کا وزیر ہے طرشی کہلاتا ہے۔

لیکن بعض قدیم نسخوں میں پنجاہ و دو کی بجائے ہشتاد و دو ملتا ہے مگر میرے خیال میں "ہفتاد و دو" زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اس خیال کا موید یہ قرینہ ہے کہ نعت سوم میں نظامی نے ایک موقع پر ۵۷۲ھ کا ذکر کیا ہے۔

پانصد و ہفتاد و دو ایام خواب روز بلند است بمجلس شتاب

پھر اس وقت ان کی عمر چالیس سال سے کم یعنی سینتیس اڑتیس سال کی تھی چنانچہ مخزن اسرار سے

طبع کہ با عقل بہ دلالگیست منتظر نقد چہل سالگیست

مخزن کے انعام کے متعلق سب سے قدیم وہ بیان ہے جو ابن بی بی نے مختصر سلجوق نامے میں دیا ہے۔ میں بعینہٖ یہاں اس کو نقل کرتا ہوں ۔

"ملک فخر الدین بہرام شاہ صاحب سیرت نیکو و علو ہمت و فرط مرحمت بود و در ایام پادشاہی او مملکت ارزنجان در کمال خورسندگی بود و کتاب مخزن الاسرار را نظامی گنجہ بنام او کرد و بخدمتش تحفہ فرستاد پنج ہزار دینار و پنج سر استر راہوار جائزہ فرمود[1]"

انعام کی روایت اس میں شک نہیں نہایت عام ہے لیکن میں نظامی کے ان بیانات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو شیریں خسرو میں محفوظ ہیں اور گزشتہ بیانات کے بالکل منافی ہیں۔ نظامی بار بار امسکر کے حق میں خسرو پرویز کی داد و دہش اور اپنے زمانے کی ناقدر دانی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

چو عالی ہمتی گردن بر افراز طناب ہر زہ از گردن بیانداز
سخنور سندی طبع را دیدہ بردوز رچوں مس قطرۂ دریائی آموز

---

[1] منقول از راحت الصدور مرتبہ ڈاکٹر محمد اقبال حاشیہ صفحہ ۲۷

کہا جا سکتا ہے کہ وہ ۶۰۰ھ ہجری کے بعد تک زندہ تھے۔

قولہ "اس زمانے کے تمام بڑے بڑے سلاطین نے ان کی قدردانی کو لازمۂ سلطنت سمجھا، اور فرمائش کرکے ان سے اپنے نام پر کتابیں لکھوائیں۔ اسباب اس کے مقتضی تھے کہ سب سے پہلے قریبی دربار سے تعلق پیدا ہوتا لیکن یہ سعادت دور والوں کی قسمت میں لکھی تھی۔ سب سے پہلے جس کو یہ عزت نصیب ہوئی وہ بہرام شاہ تھا۔ نظامی نے مخزن اسرار ۵۵۹ھ ہجری میں اسی کے نام پر لکھی اور صلے میں اس نے پانچ ہزار اشرفیاں ایک قطار شتر اور انواع و اقسام کے بیش قیمت کپڑے بھیجے" (شعر العجم صفحہ ۲۹۰)

یہ خیال کہ بہرام شاہ کی فرمائش پر مخزن اسرار لکھی گئی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ نظامی نے اپنی خواہش سے اُسے بہرام[1] شاہ کے نام پر معنون کیا ہے۔ چنانچہ مخزن سے

بر ہمہ شاہاں ز پئے این جمال / قرعہ زدم نام تو آمد بفال

مخزن اسرار کے اکثر نسخوں میں اگرچہ تاریخ تصنیف ۵۵۹ھ ہجری ملتی ہے جیسا کہ مولانا شبلی نے اوپر ذکر فرمایا ہے اور اس کی سند یہ اشعار ہیں۔

بود حقیقت بشمار درست / بست و چہارم ز ربیع نخست

از گہ ہجرت شدہ تا این زمان / پانصد و پنجاہ و نہ افزون بران

---

۱ ملوک ارزنجان کے مفصل حالات تاریخوں میں نہیں ملتے۔ بانی خاندان منگوچک کے بعد اس کے دو فرزند اسحٰق اور داؤد یکے بعد دیگرے برسر حکومت آئے۔ داؤد کا فرزند الملک السعید فخر الدین بہرام شاہ ۵۵۳ھ میں جانشین پدر ہو کر بقولے ۶۱۵ھ میں اور بقولے ۶۲۲ھ میں وفات پاتا ہے۔

شَشلہ روزے سہ وکس کا مکہ از راہ ۔۔۔ سی و شنگ آمد موکب شاہ

قولہ "ان میں علم و فضل کی قدر دانی کے لحاظ سے سب سے ممتاز منوچہر خاقان کبیر جلال الدنیا والدین شاہ اخستان تھا جو سلاطین شروانیہ کا درۃ التاج تھا، یہ خاندان خالص ایرانی نسل یعنی بہرام چوبیں کی یادگار تھا، منوچہر نہایت علم دوست اور علم پرور تھا ۔۔۔ منوچہر نے اپنے ہاتھ سے نظامی کو دس پندرہ سطروں کا خط لکھ کر بھیجا کہ لیلیٰ مجنوں کی داستان نظم کیجیے"

(شعر العجم صفحہ ۲۹۵)

لیلیٰ مجنوں کے لیے خاقان کبیر منوچہر نے فرمایش نہیں کی وہ اس عہد سے ایک دراز مدت قبل وفات پاچکا ہے۔ یہ کتاب منوچہر کے فرزند ابو المظفر جلال الدین اخستان کی فرمایش پر لکھی گئی ہے جو ان دنوں والی شرواں تھا۔ چنانچہ ابیات ؎

خاقان جہاں ملک معظم ۔۔۔ مطلق ملک الملوک عالم
صاحب جہت جلال و تمکیں ۔۔۔ یعنی کہ جلال دولت و دیں
تاج ملکاں ابو المظفر ۔۔۔ زیبندۂ ملک ہفت کشور
شرواں شہ آفتاب سایہ ۔۔۔ کیخسرو کیقباد پایہ
شاہ سخن اخستاں کہ نامش ۔۔۔ مہریست کہ مہر شد غلامش
بہرام نژاد و مشتری بہر ۔۔۔ در صدف ملک منوچہر

(خمسہ صفحہ ۴۲)

قولہ "نظامی نے اس مثنوی کے صلے میں بادشاہ سے خواہش کی

لہ بعض نسخوں میں ہے روزے سہ وکس "الخ بلتا ہے جس کو غالباً مولانا شبلی نے "ہ سی روزے سہ وکس" الخ پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ یہ شعر ایک ماہ میں ختم ہوا۔

کہ چندیں گنج بخشیدم بشاہے — وزاں خرمن نجستم برگ کاہے
بدیں سرگی سخن را راست کردم — نہ او داد و نہ من درخواست کردم
مرا ایں بس کہ پرکردم جہاں را — ولی نعمت شدم دریا و کاں را

(خمسہ صفحہ ۱۸)

مخزن کے بعد ہی شیریں خسرو تصنیف ہوئی ہے اور مخزن کے صلہ نہ ملنے کی شکایت قدرتاً شیریں خسرو میں کی جاسکتی ہے اشعار بالا سے صرف یہی ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ بہرام شاہ نے کوئی صلہ نہیں دیا

قولہ "مخزن کی تصنیف کے وقت نظامی کا سن تقریباً ۲۵ برس کا تھا"

(شعر العجم صفحہ ۲۹۱)

خود نظامی کے اپنے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی عمر چالیس سال سے کسی قدر کم تھی۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں؎

طبع کہ با عقل بدلالگیست — منتظر نقد چہل سالگیست
تا بچہل سال کہ بالغ شود — خرج سر باسق مبالغ شود
یار کنوں بایدت افسوں بخواں — درس چہل سالگی اکنوں بخواں

(خمسہ صفحہ ۱۴)

قولہ "اسی وقت گھوڑے پر سوار ہوئے اور دشت و بیاباں طے کرتے ہوئے قریباً ایک مہینے میں پایۂ تخت میں پہنچے" (شعر العجم صفحہ ۲۹۳)

مولانا نظامی کے بیان سے پایا جاتا ہے کہ اتابک قزل ارسلان گنجہ سے صرف تیس فرسنگ کے فاصلے پر ٹھیرا ہوا تھا جب اس نے نظامی کی طلبی کے لیے اپنا قاصد روانہ کیا۔ نظامی کو یہ فاصلہ طے کرنے کے لیے ایک ماہ کے سفر کی ضرورت نہیں۔ خسرو شیریں؎

دانی کہ چنیں عروس عہدے — باید ز قراں ہیچ عہدے
گر در بدرستش نظر بیاری — تیمار مرا درستش بداری
از راہ نوازش نہانش — رسمے ابدی کنی نشانش
تا حاجتمند کس نباشم — سرپیش و نظر زپس باشم
ایں گفتم و قصہ گشت کوتاہ — اقبال تو باد و دولت شاہ

(خمسہ صفحہ ۲۷)

قولہ "قزل ارسلاں کے مرنے کے بعد اس کا بھتیجا یعنی محمد بن ایلدگز کا فرزند ابوبکر نصرۃ الدین ۵۸۷ھ میں مسند آرا ہوا۔ نظامی کو اس خاندان سے قدیم تعلق تھا اس وقت تک انہوں نے جو کتابیں لکھی تھیں سلاطین وقت کی فرمائش سے لکھی تھیں، لیکن سکندرنامہ اپنی خواہش سے لکھا اور ابوبکر نصرۃ الدین کے نام موسوم کیا۔"

(شعرالعجم صفحہ ۲۹۶)

سکندرنامے کے بعض اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب خود نصرۃ الدین کی فرمائش سے لکھی گئی تھی۔ چنانچہ

نشاط از تو دارد گہر سفتنم — سزاوار تست آفریں گفتنم
خرد کا سمارا زمیں می کند — بریں آفریں آفریں می کند
چو فرماں چنیں آمد از شہریار — کہ بر نام ما نقش بند ایں نگار
بگفتار شہ مغز را تر کنم — بگفت کساں مغز در سر کنم
فرستم عروسے بداں بزمگاہ — کہ و چشم روشن شود بزم شاہ

(خمسہ صفحہ ۱۲)

(زندگی) چو فرمودہ شاہ آراستن — سمن کشتن و سرو پیراستن

کہ ان کے صاحبزادے ولیعہد سلطنت کے ندیموں اور مصاحبوں میں داخل کیے جائیں"

(شعر العجم صفحہ ۲۹۶)

حقیقت یہ ہو کہ نظامی نے لیلیٰ مجنوں میں شاہ اخستاں کے بعد اس کے فرزند کو جس کا نام دادا کے نام پر منوچہر رکھا گیا ہو علیحدہ خطاب کیا ہو جس کے ضمن میں کہا ہو کہ میرے فرزند نے مجھ سے درخواست کی ہو کہ میں اس کو تمھارے حوالے کر دوں تاکہ تمھاری حفاظت میں آجائے اور ہم درس بھی ہو جائے۔ ابیات

آں گوہرِ کانِ کشادہٴ من — پشتِ من و پشت زادہٴ من
گوہر بکلاہ و کاں برافشاند — در گوہرِ کانِ شہ سخن راند
کیں بیکس را بعہد و سوگند — برکش بہ پناہ آں خداوند
بسپار مرا بعہدش امروز — کو نو قلم است و من نوآموز
تا چوں گہرش کمال گیرد — اندر تو ز اقبال گیرد
کاں تخت نشیں کہ اوج سایست — خوردست و لے بزرگ پایست
آں یوسفِ ہفت بزم دہ عہد — ہم والیِ عہد و ہم ولی عہد
نو مجلس و نو نشاط و نو مہر — فرزند شہ اخستاں منوچہر

(خمسہ صفحہ ۲۶)

اور تعریف کے بعد اصل مدعا کا اظہار یوں کیا گیا ہو:۔

دارم بخدا امیدواری — کز غایت ذہن و ہوشیاری
آنجات رساند از عنایت — کآمادہ شوی بہر کفایت
ہم نامہٴ خسرواں بخوانی — ہم گفتہٴ نغز داں بدانی
ایں گنج نہفتہ را دریں درج — یعنی چو مہ دو ہفتہ در برج

اور دو سو اشرفی سالانہ نقد پنشن مقرر ہوگئی۔ ساتھ ہی یہ بھی لحاظ رہے کہ یہ انعام صرف اقبال نامہ یعنی سکندر نامہ بحری کے لیے عطا ہوا ہے، شرف نامہ اس سے تین سال قبل لکھا جا چکا ہے، اس کا صلہ اس انعام میں شامل نہیں جب خود نظامی نے اس عطیہ کو دلی مسرت اور دعا آشنا الفاظ کے ساتھ قبول کر لیا تو ہمیں چاہیے کہ اسی پر قناعت کریں اور مشرقی فیاضی کے خلاف شکوہ سنج نہ ہوں۔ نظامی انعام کے ذکر کو ان ابیات پر ختم کرتے ہیں۔

خدایا جہاں را بدیں گنج بخش   برافروز چوں دیدہ را از درخش
فلک را بحشمت گرایندہ دار   بدو داد و دیں ہر دو پایندہ دار
(اقبال نامہ قلمی)

قولہ "اساتذہ سے میں نے سنا ہے کہ سلاطین وقت نظامی کی اس قدر عزت کرتے تھے کہ ایک بادشاہ نے اپنی لڑکی ان کے بیٹے سے بیاہ دی تھی، میں نے کسی کتاب میں یہ واقعہ نہیں دیکھا، لیکن سکندر نامۂ بحری کے خاتمے سے اس قدر بہ تصریح ثابت ہوتا ہے کہ نظامی نے اپنی صاحبزادی اور اپنے فرزند محمد کو نصرۃ الدین کی خدمت میں بھیجا تھا کہتے ہیں۔

دو گوہر بر آمد ز دریائے من   ز دردانہ افروزئے شاں رائے من
یکے عصمت مریمی یافتہ   یکے در عیسیٰ بر و تافتہ
فرستادہ ام ہر دو را بر در شاہ   کہ یاقوت را درج دارد نگاہ
عروسے کہ دور از در مادر بود   نہ از پردہ دارش اندر بود
خدایا چو آید بر شہریار   چنیں بردگی را چناں پردہ دار
چو من بر دل خاص تو خانہ زادہ ام   جگر بند جاں را فرستادہ ام

سر سری شاہ روشن ضمیر — بہ نیروے فرہنگ فرماں پذیر
یکے سرو پیراستم در بسیج — کہ بر یاد او مے خورد انجمن

(خمسہ صفحہ ۲۵۵)

قولہ کتاب لکھ کر پیش کی تو مقررہ رقم کے علاوہ سواری کا گھوڑا بیش قیمت کپڑے خلعت وغیرہ عطا ہوا۔ (شعر العجم صفحہ ۲۹۶)

اور حاشیے میں اضافہ فرمایا ہے۔

"لیکن تعجب ہے کہ نقد رقم صرف ہزار لکھی ہے۔ اگر یہ ہزار دینار بھی فرض کر لیے جائیں تب بھی اتنی رقم ہے جو نظامی کے شایاں ہے۔ ایک مشرقی بادشاہ کے چہرے پر کھلی ہے۔"

اس کے متعلق شیخ نظامی کا بیان حسب ذیل ہے۔

چو شہ دید در گوہر دل پسند — پسندید و شد کار گوہر بلند
ازاں نقد رومی کہ ماند درست — ہزارم بدیرفتہ بود از نخست
چو من سر ز در خورد او ساختم — بپاسخ ازیں در برانداختم
ہزارم بدیرفتہ را داد زود — بسے چیز ہا بر سرے بر فزود
ز مرکوب و دیبا و صد گونہ چیز — ہماں خلعت پادشاہانہ نیز
دو صد نقد دیگر ز دیواں بہر — نوشتم بادرار دیوان دہر
بداں تا رسامدگاں جو بجو — رساند برسالے ازاں سو بسو

(اقبال نامہ قلمی)

گویا جس وقت بادشاہ نے فرمایش کی تھی اس وقت ایک ہزار اشرفی (درست) صلہ دینے کا وعدہ کر لیا تھا جب کتاب ختم ہو کر پیش ہوئی رقم موعود ان کو مل گیا۔ اس کے علاوہ اسپ و خلعت اور دیبا کے تھان عنایت ہوئے

ں گوہر شناس کہ تارہ روئی سے اقتباس

(خمسہ صفحہ ۲۵۴)

رمعر را تہ کہم گفت کساں معر درسر کہم
سے مداں برم گاہ کز وحیثم روشن شود برم شاہ
ہستاہ را ندہ باد مدیں مہر آفاق فرخندہ باد

(خمسہ صفحہ ۱۲۹)

نہ را دریں درح یتیمی چو مہ دو ہفتہ در برح
ں عروس جہدے باید ز قراں ہیچ عہدے
تس نظر بیاری تیمار برادرش مداری

(خمسہ صفحہ ۲۷)

ت سے جو مولانا شبلی نے نقل کیے ہیں ایک شعر ترک کر دیا
ہر قسم کی بدظنی رفع ہو سکتی ہے وہ بیت یہ ہے -
ـہ دو ہند وے نام یکے مقبل و دیگر اقبال نام

(خمسہ صفحہ ۳۴۱)

ادس کے فرزند محمد اور اقبال سے مراد اعمال نامہ ہیں -
اب (سکندر نامہ) کی تصنیف کے وقت اس کی عمر ۶۳ برس
چانچہ جہاں اور حکما کے مرنے کا الگ الگ عنوان قائم
اپنے نام کی بھی سرخی قائم کی ہے اس کے ذیل میں لکھتے ہیں -
جو ایں داستاں شد تمام بعزم شدن تیز برداشت گام
دو شش بر شصت و سہ سال کہ برعزم رہ بر دہل زد دوال
ں کتاب پر اس کی شاعری اور عمر دونوں کا خاتمہ ہوا سال وفات

آخری شعر سے صاف یہ راز کھل جاتا ہے۔" (شعر العجم صفحہ ۲۹۷)

میں علامہ شبلی کے اس عجیب و غریب انکشاف کو ہرگز ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔ یہ امر میری سمجھ سے باہر ہے کہ نظامی اپنی صاحبزادی کو نصرۃ الدین کے ہاں کیوں بھیجتے اور صاحبزادی وہاں کیا کرتیں۔ اگر کسی رشتہ داری کے خیال سے بھیجی گئی تھیں تو بہتر تھا کہ علامہ شبلی اس کی وضاحت کر دیتے۔ لیکن میں یہ دعویٰ کرنے کے لیے تیار ہوں کہ نظامی کے کوئی صاحبزادی نہیں تھیں ان کے صرف ایک اولاد تھی یعنی محمد جس کے لیے فرمایا ہے بیت

یک دانہ اوّلیں فتوحم یک پیالۂ آخریں صبوحم

ان اشعار بالا سے کوئی ایسا قیاس مترتب ہو سکتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے سکندر نامہ اپنے فرزند محمد کے ہمراہ بھیجا ہے اور یہی سکندر نامہ وہ صاحبزادی ہے۔

دو گوہر سے مولانا نظامی کی مُراد اُن کے فرزند صلبی محمد اور فرزند روحانی سکندر نامہ ہیں۔ "عصمت مریمی" میں بھی شاعر نے پھر اسی نظم کی طرف تلمیح کی ہے گویا فکر بکر کے مصولہ خیال کو "عصمت مریمی" کے حدیدیہ میں ادا کیا۔ عروس سے مُراد وہی نظم ہے اور "مادر" سے مقصد مفروضہ صاحبزادی کی والدہ نہیں ہیں بلکہ شاعر نے اپنی ذات مراد لی ہے جو لوگ نظامی کی شاعری سے واقف ہیں وہ میرے اس بیان سے اتفاق کریں گے کہ شیخ نظامی بعض اوقات اپنے ضمیر یا طبیعت کو عورت فرض کر لیتے ہیں اور اپنی نظم کو عروس کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہاں اس قسم کی بعض مثالیں دی جاتی ہیں

(۱) صمصم سر من ملکہ آتش دل است کہ مریم صفت بکر و آبستن است
تقاضائے آلتو سے یوں آیدش کہ از سنگ و آہن بروں آیدش

اس کا فرزند الملک القاہر عزالدین مسعود اسی سال تخت نشین ہو کر ۶۱۵ھ میں فوت ہوتا ہے (جامع التواریخ) ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ نظامی نے سکندرنامے کو عزالدین مسعود کے نام کے ساتھ بھی منسوب کیا ہے اور اس احتمال کے لیے پوری گنجایش ہے کہ یہ انتساب نصرة الدین ابوبکر کی وفات کے بعد جو ۶۰۷ھ ہجری میں واقع ہوتی ہے، عمل میں آیا ہوگا جب کہ دربار اتابکی سے نظامی کے تعلقات منقطع ہو چکے ہیں۔

قولہ "قصیدے بہت ہیں لیکن ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں، سنائی کا انداز ہے' اخلاق اور تصوف کو ترکیب دے کر کہتے ہیں لیکن سنائی کے بہت پیچھے ہیں، اس لیے مقبول نہ ہو سکے، البتہ ایک قطعہ نہایت صاف شستہ اور پر لطف کہا ہے جس کا آج تک جواب نہ ہو سکا۔

دوش رفتم بخرابات و مرا راہ نبود — می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود
یا نبد ہیچ کس از بادہ فروشان بیدار — یا کہ من ہیچ کسم ہیچ کسم در نگشود
پاسی از شب بگذشت (کذا) بیشترک یا کمتر — رندی از غرفہ برون کرد سر و رخ بنمود
گفت خیر است درین وقت کرا می جویی — بی محل آمدنت بہر چہ بود
گفتمش در بگشا گفت برو ہرزہ مگو — کاندرین وقت کسی بہر کسی در نگشود
این نہ مسجد کہ بہر لحظہ درش بگشایند — کہ تو دیر آیی و اندر صف پیش آیی زود
این خرابات مغان است و درو زندہ دلان — شاہد و شمع و شراب و شکر و نای و سرود
ہرچہ در جملۂ آفاق درین جا حاضر — مومن و ترسا و گبر و نصاری و یہود
گر تو خواہی کہ دمی از صحبت ایشان بخوری — خاک پای ہمہ شو تا کہ بیابی مقصود

عصمت بخاری اور عرفی نے قوافی بدل کر اس کا جواب لکھا ہے لیکن

"میں سخت اختلاف ہے۔ دولت شاہ نے سنہ ۵۹۹ھ ہجری لکھا ہے، لیکن یہ خود نظامی کی تصریح کے خلاف ہے۔ تقی کاشی نے سنہ ۶۰۶ھ لکھا ہے۔ جامی سنہ ۵۹۲ھ بیان کرتے ہیں۔ لیکن اس قدر قطعی ہے کہ سنہ ۵۹۹ھ ہجری کے بعد ان کی وفات ہوئی ہے اور غالباً چھٹی صدی سے آگے نہیں بڑھے"

(شعر العجم صفحہ ۲۹۷ و ۲۹۸)

حکمائے یونان کی وفات کے ذکر کے ساتھ اپنی وفات کا عنوان قائم کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ نظامی نے اسی عمر میں یا چھٹی صدی کے اندر اندر انتقال فرمایا۔ بحیثیت عاشقِ رسول اس میں شک نہیں کہ اس عمر میں انتقال کرنے کے لیے آرزو مند ضرور تھے دوسرے انھوں نے حکمائے یونان کے ساتھ اپنی ذات کو بھی شریک بنانا چاہا ہے۔ جہاں انھوں نے ان حکما کے مقالات کا ذکر کیا ہے اپنے مقالات بھی علیحدہ عنوان کے تحت میں دیدیے ہیں اسی طرح ان کی وفات کے ساتھ اپنی وفات کا عنوان بھی باندھ دیا لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اس عہد سے ایک عرصے بعد تک زندہ رہے۔

بعض سکندر ناموں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ نظامی نہ صرف ساتویں صدی کے آغاز میں موجود تھے بلکہ اس کے پہلے عشرے کا ایک معتد بہ حصہ کم از کم طے کر چکے ہیں۔ وہ اشعار یہ ہیں۔

طرف دار موصل بہ مردانگی — قدر جان شاہان بفرزانگی

سرِ سرفرازان و گردنکشان — ملک عز دیں قاہرِ سرکشان

طغرل دولت چو طغرل تگین[1] — ابوالفتح مسعود بن نور دیں

نور الدین ارسلان شاہ والیِ موصل سنہ ۶۰۷ ہجری میں وفات پاتا ہے

---

[1] طغرل تگین انوری کا ممدوح ہے۔

نظامی کے مقابلے میں عراقی کو اس غزل کا زیادہ مستحق مانا جاسکتا ہو میری دلیل صرف یہی ہو کہ اول تو وہ ایک ایسے نسخے میں ملتی ہو جو اس سے تقریباً چھ سو سال پیشتر کا مرقومہ ہو اور یہ بھی ظاہر ہو کہ کتاب جس قدر قدیم ہو اسی قدر زیادہ معتبر ہو۔ علاوہ بریں اس غزل میں واردات حقیقت، کو مجاز کی زبان میں ادا کیا گیا ہو جیسے خرابات ۔ بادہ فروش ۔ رند ۔ مغاں ۔ شاہد شمع ۔ شراب اور سرود وغیرہ کا حقیقی اطلاق صوفیوں کے نزدیک کچھ اور ہو جو ان الفاظ کے اصلی معنوں سے ظاہر نہیں ہوتا ۔عراقی فرماتے ہیں ۔

اس دیوان کے رسم الخط کی بعض خصوصیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں ۔
جب حرف ماقبل حرف علت ہو یا حرف صحیح متحرک ہو دال کو بالعموم ذال لکھا جاتا ہو مثلاً دیدی، شاد، باد، یابد، آمد اور بداں کو ذیذی، شاذ، باذ، یابذ، آمذ اور بذاں مرقوم کیا ہو۔ است کا الف اکثر اوقات حذف کر دیا گیا ہو مثلاً جوش است جلیست اور سکیس است کو جوشست ،جیرست اور سکیست لکھا ہو۔ آسیہ ۔ جانکہ اور آنکہ کو آسیہ ۔جانک اور آنک عام طور پر لکھا ہو تا و یا کے نقاط پہلو بہ پہلو ایک ہی سطح پر ملا کے نہیں لکھے جاتے بلکہ علیحدہ علیحدہ مختلف سطحوں پر مثلاً ت اور ی کو یوں لکھا ہو 'ب' و 'ی' علاوہ بریں یائے تحتانی کے اوپر نقاط لگانے کی رسم بھی جاری ہو مثلاً دیدی ۔ دمیدی اور عیدی کو دیدی ، دمیدی ، اور حمیدی لکھا گیا ہو۔ کاف بیانیہ ہائے مختفی کے علاوہ یائے تحتانی کے ساتھ بھی لکھا جاتا ہو جیم و کاف و بائے فارسی اور عربی میں کچھ امتیاز نہیں ۔جب با و یا یا نون و تا ساتھ آگئے اُن کے نقاط کو بلا امتیاز ایک ہی جگہ لکھ دیا ہو مثلاً سنگباے اور بیرون کو سکباے اور بیرون لکھا ہو۔ میم و دال مہملہ سین مہملہ و رائے مہملہ پر بعض اوقات التزام دیا ہو اور ہائے ہوز کے سوشہ نہیں دیا جاتا ۔

جواب نہ ہو سکا (شعر العجم صفحہ ۳ و ۱ ۳)

نظامی کے قصائد اگر کبھی انھوں نے لکھے تھے، اب نہیں ملتے۔ آتشکدہ میں صرف دو قصیدوں سے بعض چیدہ اشعار نقل کیے گئے ہیں، یہ قطعہ جس کو غزل کہنا زیادہ صحیح ہوگا اس میں شک نہیں عام طور پر نظامی کی طرف منسوب ہے۔ آتشکدہ میں چنانچہ ان ہی کے نام پر دیا گیا ہے۔ بعد کے مولفین صاحب آتشکدہ کے پیرو ہیں۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ اس باب میں مصنفین کو مغالطہ پیش آیا ہے، راقم کے پاس مولانا عراقی کا ایک دیوان ہے جو کم از کم آٹھویں قرن ہجری کا نوشتہ معلوم ہوتا ہے۔ اس دیوان میں یہ قطعہ جزوی اختلاف کے ساتھ مع عراقی کے تخلص کے موجود ہے جس کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

خراباتی شدم دوش مرا یار نبود	می‌زدم نعره و فریاد و زمن کس نشنود
یا نبد هیچکس از باده فروشان بیدار	یا خود از هیچکسی هیچکسم در نگشود
چونکه یک نیمه ز شب یا کم یا بیش برفت	رندی از غرفه برون کرد سر و رخ بنمود
گفت خیر است درین وقت تو دیوانه شدی	نعره برداشتی آخر نگوئی که چه بود
گفتمش در بگشا گفت برو هرزه مگوی	تا درین وقت ز بهر تو کسی در که گشود
این نه مسجد که بهر لحظه درش بگشایم	تا تو اندر دوی و اندر صف پیش آئی زود
این خرابات مغانست و درو زنده دلان	شاهد و شمع و شراب و غزل و رود و سرود
(سر کوشان عرفانست و سراشان کعبه	عاشقان هیچ حلیله و رقیبان نمرود)[1]
زر و سر را نبود هیچ درین نقد محل	سود شان جمله زیانست و زیانشان همه سود
ای عراقی چه زنی حلقه برین در شب و روز	زین همه آتش خود هیچ نه بینی جز دود

[1] یہ شعر داخل متن نہیں ہے بلکہ بعد میں کسی نے پہلو سے غزل میں ایسے خط میں لکھا ہے جو دسویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

درست یہ ہے کہ دونوں شعر فردوسی کے ہیں اور تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ شاہناموں میں ملتے ہیں۔ ریاض بندہ علی خاں میں فردوسی کے منتخب کلام میں یہ اشعار بھی موجود ہیں۔ اب بھی اگر کسی صاحب کو شبہہ ہو تو ذیل کا لطیفہ مخزن الغرائب[۵۱] سے جو سرخوش[۵۲] کے حالات میں درج ہے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ صاحب مخزن الغرائب سرخوش سے اس کے عجیب انداز خودستائی کی بنا پر ناراض ہیں لکھتے ہیں اور سرخوش کی عبارت نقل کرتے ہیں۔

می گوید "شبے در خواب دیدم کہ روح من در سیر سماوات است بگوشے درگوش من می آید کہ احسنت و آفرین باد بہیچ صورتے بنظر در نمی آید پرسیدم کہ تحسین چہ چیز می کنند۔ گفتند بیتے از ملا نظامی گنجوی مقبول ملاء الاعلیٰ افتادہ کہ گفتہ ع

رستم ستوراں در آں پہن دشت — زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

گفتم شعر خوب بلند است اما رزمیہ است۔ ایں جا چہ مناسبت دارد اینجا باید کہ شعر توحید و نعت درجۂ قبول یابد در خواب خندہ می کنم و می گویم کہ راست گفتہ اند کہ معلوم شد شعر فہمی عالم بالا" اس پر صاحب مخزن الغرائب ذیل کے الفاظ اضافہ کرتے ہیں "دروغ گو را حافظہ نباشد ایں عزیز شعر فردوسی را بشیخ نظامی قرار دادہ و فرشتگاں را بہ نسیان منسوب نمودہ کہ شعر فردوسی را بنام شیخ نظامی گوید"۔

قولہ "۱۴ رمضان ۵۹۳ھ ہجری میں سلطان غیاث الدین کرب ارسلان علاء الدین اقسنقر کی فرمائش سے ہفت پیکر لکھی جس میں بہرام گور کا قصہ ہے۔"

(شعر العجم صفحہ ۲۹۶)

---

۵۱ احمد علی سندیلہ کی تصنیف ہے۔ ۵۲ کلمات الشعرا کا مصنف۔

اگر بینی دریں دیواں اشعار — خرابات و خراباتی و خمّار
بت و زنّار و ناقوس و چلیپا — مغ و ترسا و گبر و دیر و مینا
شراب و شاہد و شمع شبستان — خروش بربط و آواز مستاں
مے و میخانہ و دیر خرابات — حریف و ساقی و مرد مناجات
خط و خال و قد و بالا و ابرو — عذار و زلف پیچاں پیچ گیسو
مشو زنہار ازاں گفتار در تاب — برو مقصود ازاں گفتار دریاب
مپیچ اندر سر و پائے عبارت — بہ بیں اشعار ارباب اشارت
کہ ہر یک را ازیں الفاظ جانیست — بزیر ہر یکے پنہاں جہانیست

جذبات عرفاں کو مجاز کی زباں میں ادا کرنے کا طریقہ سب سے پیشتر سنائی سے شروع ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فارسی میں اس طریق کو مقبول بنانے والے شیخ فریدالدین عطار ہیں۔ ان کے ہاں اسرار عرفاں رندانہ طریق سخن میں ادا کیے گئے ہیں۔ گو یا حقیقت کو مجاز کے پردے میں اور کعبہ کو صنم خانے کے آغوش میں چھپا دیا گیا ہے۔ عطار کے بعد مولانا روم اور ان کے بعد شیخ عراقی یہی رنگ اختیار کرتے ہیں۔ نشۂ عشق ان پر چھایا ہوا ہے۔ رندی اور سرمستی ان کی شاعری کی رُوح ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ غزل اسی قسم کے جذبات سے معمور ہے۔

شیخ نظامی کے رزمیہ اشعار کی مثال میں مولانا شبلی نے ذیل کے دو شعر بھی درج کیے ہیں۔

ز سم ستوراں دراں پہن دشت — زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت
فرو رفت و بر رفت روز نبرد — بماہی نم خوں و برماہ گرد

(شعرالعجم صفحہ ۱۴۴)

نظامی نے یہ کتاب ایک خط کے ساتھ علاء الدین کے یہاں جس وقت وہ
روئیں دژ میں مقیم تھا بھیجی تھی۔

قولہ "قصیدے میں ان کی یہ خصوصیت لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ ان کو
مختلف درباروں سے تعلق تھا اور جس قدر مثنویاں لکھیں سب کسی
نہ کسی فرماں روا کے نام پر لکھیں تاہم قصیدے کو انھوں نے
مداحی سے آزاد رکھا اور یہ بتایا کہ شعر کی اس عمدہ صنعت سے اور بھی
مفید کام لیے جا سکتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ ان کے نقش قدم پر
کوئی نہیں چلا۔" (شعر العجم صفحہ ۲ ۳)

جب مثنوی کے میدان ہی میں شیخ نظامی سلاطین کی مدح سرائی سے
باز نہیں آتے تو قصائد کے میدان میں خدا جانے کیا قیامت ڈھائے ہوں گے۔
خود مولانا شبلی فرماتے ہیں "مثنویوں میں اس زور کی مدحیں لکھیں جن کے
آگے قصائد کی کوئی ہستی نہیں ... بادشاہوں کے سامنے
اپنے آپ کو جس حیثیت سے پیش کرتے ہیں وہی ہوتی ہے جو گدا پیشہ
شاعروں کا انداز ہے۔ یعنی حضور کا نمک خوار ہوں، غلام ہوں، بندۂ درگاہ
ہوں، حضور کی ذرا سی توجہ سے میرے کام بن جائیں گے۔"
(شعر العجم صفحہ ۹۸-۲۹۹)

لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے قصائد لکھے بھی ہیں یا نہیں۔ عوفی کا بیان
ہے کہ مثنویاں یادگار ہیں باقی جنس کلام سُنی نہیں گئی۔ خود نظامی کے بیان
سے معلوم ہوتا ہے کہ غزلیں اور ضرورتاً قصائد بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے
اپنے دیوان کا ذکر بھی کیا ہے لیکن آج سب وغیرہ ناپید ہے۔ (لیلیٰ مجنوں)

گر سار کنم قصائد چیست   او بیس ہد قلائد ست

نظامی نے اس بادشاہ کا نام علاء الدین کرب ارسلان دیا ہے چنانچہ۔

عمدۂ المملکت علاء الدین　　حافظ و ناصر زمان و زمین
شاہ کرب ارسلان کشورگیر　　بہ ز الپ ارسلان تاج و سریر

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لقب "غیاث الدین" اس کے نام سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

یہ علاء الدین امیر مراغہ ہے وہ آقسنقر احمدیلی کے اسلاف سے ہے جس کو باطنیوں نے ۵۲۷ھ میں قتل کیا ہے۔ خود علاء الدین کے متعلق اسی قدر معلوم ہے کہ اتابک نے ۵۷۰ھ میں اس کا محاصرہ کیا تھا۔ راحت الصدور میں اس کو اتابک علاء الدین صدا وند مراغہ لکھا ہے اور سلطان طغرل کے حالات میں دو مرتبہ اس کا ذکر آیا ہے۔

اگرچہ عام خیال ہے کہ بہرام نامہ علاء الدین کی فرمائش پر لکھا گیا ہے لیکن میرا عقیدہ ہے کہ نظامی نے اپنی خواہش سے اس کے نام پر منسوب کیا ہے۔ میرے مؤید یہ اشعار ہیں۔

چوں من الحق شناختم بہ قیاس　　کاہل فرہنگ را تو داری پاس
بحری زرق کیمیا سازاں　　بہ پر پیری فریب طنازاں
نقش ایں کارنامۂ ابدی　　بر تو بستم بہ طالع اسدی

(ہفت پیکر طبع نول کشور صفحہ ۱۱ ۱۳۲۲ہجری)

دیگر۔

ایں چنیں نامہ بر تو شاید بست　　کز تو جائے بلند نامی ہست
چونکہ شد لعل بستہ بر تاجش　　بر تو بستم رہیم تاراجش
گر بسمع تو دلپسند بود　　چوں سریر تو ارجمند بود

(ہفت پیکر صفحہ ۱۱۳ طبع نول کشور ۱۳۲۲ہجری)

ضروریات کے کفیل تھے۔ (لیلیٰ مجنوں)

کو خواجہ حسن کہ حال می بود — حالی شدنش وبال می بود

(خمسہ صفحہ ۲۹)

ازواج کے متعلق یہ یاد رہے کہ ان کی تین بیویاں تھیں اور اگر زائد بھی ہوں تو بحث نہیں۔ لیکن یہ سب کنیزیں تھیں اور سب کا انتقال ان کی زندگی میں ہوا۔ زیادہ بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ مثنویاں بیویوں کے حق میں منحوس ثابت ہوئیں۔ پہلی کنیز[1] جس کو شاہ دربند نے ان کی خدمت میں بھیجا تھا 'شیریں خسرو' کی ولادت پر اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئیں۔ شیریں کی وفات کے موقعے پر شیخ نے ان کا مرثیہ لکھا ہے۔

سبک رو چون بت قبچاق من بود — گمان افتاد خود کافاق من بود
همایون پیکری نغز و خردمند — فرستاده به من دارای دربند
چو ترکان گشته سوی کوچ محتاج — به ترکی داده رختم را به تاراج

(خمسہ صفحہ ۱۱۸)

دوسری بیوی لیلیٰ مجنوں کی تصنیف کے دور میں داغِ مفارقت دے گئیں۔ (اقبال نامہ)

چو در گنج لیلیٰ کشیدم حصار — دگر گوہرے کردم آنجا نثار

(خمسہ صفحہ ۲۶۷)

شرف نامہ کے اختتام کے بعد تیسری بیوی رحلت کر گئیں۔ (اقبال نامہ)

---

[1] مجملاً ان ہی کے لفظ سے معلوم ہوتے ہیں ؎

اگر شد ترکم از خرگہ نہانی — خدایا ترک زادم را تو دانی

(خمسہ صفحہ ۱۱۸)

قزل ارسلان کے دربار میں قصیدہ لکھ کر لے گئے ہیں۔ (خسرو شیریں)

درآمد راوی دو خواند چوں در	تماشے کاں بساط از گنج ستدیر

بہرحال قصیدے جو کچھ لکھے آج نہیں ملتے اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ قصیدوں میں اُن کا انداز مداحیہ تھا یا حکیمیہ۔ ایک قصیدہ جس کی ابتدا یہ مصرع ملک الملوک فضلم بفضیلت معانی الخ اللہ ان کی طرف منسوب ہے۔

نظامی کے حالات

نظامی کے حالات و مقولات سے اگرچہ مجھ کو کافی مراولت نہیں تاہم سرسری مطالعے میں جو جو باتیں میری نظر سے گذریں۔ یہاں ذکر کرتا ہوں۔
شیخ کی کم سنی میں ان کے والد یوسف کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی ایک نصیحت کتاب شیریں خسرو میں قلم بند کی ہے۔

پدر کرمن رواںش باد پُر نور	مرا پیرایہ بید سے داد مشہور
کہ از بید ولتاں بگریز چوں تیر	وطن در کوے صاحب دولتاں گیر

(خمسہ صفحہ ۱۰۳)

والدہ ایک کُرد خاندان کی رئیسہ تھیں اور انہی نے ان کی تعلیم و تربیت کی۔ (لیلیٰ مجنوں)

گر مادر من رئیسۂ کُرد	مادر صفتانہ پیش من مرد
عم مشتر از قیاس خوردا ست	گر داسے فزوں زقد مردا ست

(خمسہ صفحہ)

ایک ماموں بھی تھے جن کا نام خواجہ حسن یا عمر[1] تھا۔ یہ ان کی مشتر

---

[1] لیلیٰ مجنوں طبع نول کشور ۱۳۲۲ ہجری میں خواجہ عمر لکھا ہے۔

ں کی تصنیف کے وقت ان کی عمر چودہ سال تھی

سالہ قرۃ العین بالغ نظرے علوم کو بین

ہفت سالہ بودی چوں گل بہ چمن حوالہ بودی

یار دہ رسیدی چوں سرو بادج سرکشیدی

(خمسہ صفحہ ۲۸)

کی ابتدا کے وقت محمدؐ سترہ سال کے تھے ؛

فصل آوریدن مدت شدہ ہفدہ سالہ مدیساں کہ ہست

سے لباب الالباب میں نظامی کے اشعار ان کے مرثیہ کے

کیے ہیں - جو یہ ہیں ؎

سرجوانِ بہشت آں چناں عارض دآنکہ برجست

سر کردں جوش دورجی ماشدہ رفتی بہ بہشت

دہ تو عمر ہنوز ایں قضا برسرت آخر کہ نوشت

جودے جاں جہاں خاک از دیدۂ من خون آغشت

لت اندر جاگست آب کے بار تواں داد بکشت

(لباب الالباب طبع یورپ صفحہ ۳۹)

ے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمدؐ ہی ہیں جو نوجواں انتقال کرتے ہیں۔

ت کا حادثہ اقبال نامہ کے اختتام کے بعد تصور کرنا چاہیے۔

شا کے متعلے اور عزلت گزینی سے قبل ایک زمانے تک

تے رہے ہیں۔ (بہرام نامہ)

م ماند جو سید لالہ زرد و بنفشہ گشت سپید

ر نا تو مسدی از کلہ داری دگر سدی

میں مرثیہ موجود ہے۔

فلک پیشتر زانکہ آزادہ بود	ازاں پیکر سے مرا دادہ بود
ہماں مہر در مہرگری پیشہ داشت	ہماں کار دانی در اندیشہ داشت
پیادہ بہادہ رخستش ماہ را	درس طرح کردہ بسے شاہ را
خستہ گلے چوں من خوردہ او	سحر من تکس در ہماں مردہ او
چو چشم مراچشمۂ نور کرد	ز چشم منش چشمم بد دور کرد
رسانیدہ چرخ آں جہانش رلود	کہ گفتی کہ تا بود ہرگز نبود
تو مثنوی کاں مرا بود ارد	چگونم خدا داد خوشنود ارد

(خمسہ صفحہ ۲۶۶)

خود فرماتے ہیں کہ بیویوں کے معاملے میں بڑا بدقسمت ہوں جہاں ایک نئی مثنوی لکھنے بیٹھا ایک بیوی کی قربانی دینی پڑی۔

مرا طالع طرفہ ہست از سخن	کہ چوں نو کنم داستاں کہن
در آں عہد کاں شکر افشاں کنم	عروسی شکر خندہ قرباں کنم
مدام کہ با داغ چندیں عروس	چگونہ کنم قصۂ روم و روس

(خمسہ صفحہ ۲۶۶)

اولاد میں صرف ایک فرزند کا ذکر کرتے ہیں جس کا نام محمدؐ تھا۔ اس کے سوا کوئی اور اولاد نہ تھی۔ شیریں خسرو میں سب سے پہلے اس کا ذکر آتا ہے جب سات سال کے تھے۔

ترا ہیں اسے ہفت سالہ قرۃ العین	مقام خویشتن در قاب قوسین
منت پرورد م ونیوی خدا داد	نہ بر تو نام من نام خدا باد

(خمسہ صفحہ ۱۷۸)

اس کو شروع کرتے ہیں اور ترسٹھ سال کے سن میں اختتام کو پہنچاتے ہیں۔
پچاس سالہ عمر کی طرف اشارہ یہ ہی

چو تاریخ پنجہ در آمد بسال   دگر گونہ شد بر تناسدہ حال

(خمسہ صفحہ ۱۲۳)

ستاون سال کی طرف تلمیح شعر ذیل میں موجود ہی۔ اقبال نامہ

ہو رم پنجاہ و ہفت ار قیاس   درم بر برارو ہمہ حق شناس

(خمسہ صفحہ ۳۴۲)

ساٹھ سال کا ذکر یوں کیا ہی۔ اقبال نامہ۔

بہ شصت آمد اندازۂ سال من   نگشت ار خود اندازۂ حال من

(خمسہ صفحہ ۳۴۲)

اور سب سے آخر ترسیٹھ برس کی عمر کا بیان ملتا ہی اقبال نامہ

فروں بود شش مہ ز شصت و سہ سال   کہ برعزم رہ بر دہل زد دوال

(خمسہ صفحہ ۳۴۳)

اس طرح دیکھا جاتا ہی کہ نظامی نے پچیس چھبیس سال خمسہ کی تصنیف پر صرف کیے ہیں لیکن اس سے یہ خیال نہ کیا جائے کہ وہ بغیر کسی اور مشغلے کے مسلسل اسی کام پر مصروف رہے یہ صورت بھی واقع ہوئی ہی کہ ابھی ایک کتاب ختم ہونے نہیں پائی ہی کہ دوسری کی داغ بیل ڈال دی اور پھر دوسری کو چھوڑ کر پہلی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ شیریں خسرو لیلیٰ مجنوں سے اور سکندر نامہ بہرام نامے سے بہت پہلے شروع کیے جاتے ہیں لیکن ان کے اختتام کے ایک عرصے بعد تکمیل پاتے ہیں۔

شیریں خسرو ایک ایسی کتاب ہی جس کی تاریخ تصنیف اچھی طرح

حدمتے مرد وار می کردم — راستی راکنوں بہ آں مردم
رور گارم گرست ولست چیں — عادت رورگار ہست چنیں
ناشادہ شکستہ بودم بال — چوں فتادم چگونہ باشد حال

(خمسہ صفحہ ۱۱)

محزن اسرار کے وقت اس کی عمر از روے حساب سینتیس سال ہونی چاہیے کیوں کہ میرے خیال میں یہ نظم سنہ ۵۷۲-۵۷۳ ہجری میں لکھی گئی ہے تیرپی حسرو کے وقت پورے چالیس سال کے تھے۔ چنانچہ

پس از پنجاہ چلہ در چہل سال — مزن پنجہ بریں حرف ورق مال

(خمسہ صفحہ ۵۹)

دوسرے موقع پر کہا ہے

چو در عہد چہل سال از کم وبیش — رسد گوئی جہاں را آں جہاں پیش

(خمسہ صفحہ ۵۷)

پچاس سالہ عمر کی طرف بھی اس میں اشارے موجود ہیں

مدیں پنجاہ سالہ حقہ باری — مدیں یک مہرہ گل تا چند باری
نہ پنجہ سال اگر پنجہ ہزار است — قلم درکش کہ ہم مایا بدار است

(خمسہ صفحہ ۳۲)

لیلیٰ مجنوں کے وقت انچاس سال کے تھے۔ بہرام نامہ کے وقت جو سنہ ۵۹۳ ہجری میں اختتام پذیر ہوتا ہے اس کی عمر اٹھاون سال کے قریب ہونی چاہیے۔

شرف نامہ ۵۹۷ھ میں اور اقبال نامہ ۵۹۹ھ ہجری میں ختم ہوتے ہیں۔ اس تصنیف نے سب سے زیادہ وقت لیا ہے۔ پچاس برس کی عمر میں

کے لیے منتظر بھی رہے

درین شکو کہ مقصود دل آمد | بکم مدت مرادم حاصل آمد
درنگ از بہر آں افتاد در راہ | کہ تا فارغ شود از شغل با شاہ
فتح ہفت کشور سر بر آرد | سر بہ چرخ را در چنبر آرد
شکوہش چتر بر گردوں رساند | سمندش گرد بر کیواں جہاند

(خمسہ صفحہ ۵۴)

معلوم ایسا ہوتا ہو کہ اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی اور کچھ عرصے کے بعد خود ہی کتاب لے کر اتابک شمس الدین کے دربار میں حاضر ہوئے اور مدعائے دلی ان اشعار میں ادا کیا ۔

بدستوری حدیثے چند کوتاہ | بخوانم من اگر فرماں دہد شاہ
من سست خیز گر پیکاں راہم | حریف حساں بار وہاں شاہم
بعوض بندگی دیر آمدم دیر | اگر دیر آمدم شیر آمدم شیر
چہ خوش گفت آں سخن گوئے جہانگرد | کہ دیر آئے و درست آئے جوانمرد

غیر حاضری کی معافی اس لیے مانگی جارہی ہو کہ گنجہ کچھ عرصے قبل اتابکوں کے قبضے میں آچکا ہی:

زگنجہ فتح خوزستاں کہ کرد است | زعماں تا باصفاہاں کہ خورد است

(خمسہ صفحہ ۵۵)

اور نظامی اس وقت سے اب تک اس کے دربار میں حاضر نہیں ہوئے ہیں ۔ کتاب پیش کرتے وقت کہتے ہیں

دریں اندیشہ بودم مدتے چند | کہ برگے سازم از بہر خداوند
بودم تحفۂ بے پاک و مغفور | کہ تا آرم زمیں را بوسم از دور

معلوم نہیں۔ ایک شعر سے ۵۷۶ھ ہجری دیا گیا ہے

گزشتہ پانصد و ہفتاد و شش سال — نبد بر خط خوباں کس چنیں فال

(خمسہ صفحہ ۱۸۹)

اور خیال کیا گیا ہے کہ یہ خاتمے کی تاریخ ہے لیکن یہ عقیدہ درست نہیں یہ اس مثنوی کی ابتدا یا اس کی پہلی اشاعت کی تاریخ ہے۔ طغرل بن ارسلان ۵۷۱ھ - ۵۸ھ ہجری کی تخت نشینی کے ساتھ ساتھ اس کتاب پر قلم اُٹھایا جاتا ہے:

ملک طغرل کہ دارائے وجود است — سپہر دولت و دریائے جود است
بسلطانی بتاج و تخت پیوست — بجائے ارسلاں بر تخت بنشست
من ایں گنجینہ را در می گشادم — اساس ایں عمارت می نہادم

(خمسہ صفحہ ۵۴)

ابتدا میں اس کا ارادہ تھا کہ ایک نسخہ طغرل کی خدمت میں بھیجیں اور اس سے اتابک شمس الدین ابو جعفر محمد کے نام سفارش کرائیں

بداں لفظ بلند گوہر افشاں — کہ جان عالم است و عالم جاں
اتابک را بگوید کائے جہانگیر — نظامی داں گہے صد گونہ تقصیر
کہ آمد وقت آں کو را نوازیم — بکار افتادۂ را چارہ سازیم
چنیں گوید دو در گوشہ تا چند — سعدائے چنیں بے توشہ تا چند
کنوں عمریست کیں مرغ سحر سنج — بشکر نعمت ما می برد رنج
بداں مرکز سر پر عرش میں است — کہ گر سوا ز لش بر جائے خویش است

(خمسہ صفحہ ۵۴)

کتاب ختم ہونے کے بعد وہ کچھ مدت طغرل کی خدمت میں پیش کرے

انعام میں دے دیا۔ نظامی کی یہ خواہش تھی کہ ایک گانو سلطان دے اور دوسرا شہزادوں سے دلوائے۔

یکے دہ زاں دو دہ را داد باید — دو از شہزادگاں دیگر کشاید

(خمسہ صفحہ ۱۲۵)

دوسرا گانو ان کو شاید کبھی نہیں ملا۔ اسی اثنا میں قزل ارسلان ایک شب اپنے بستر پر مقتول پایا جاتا ہو اس کے جسم پر چھریوں کے پچاس زخم تھے۔ یہ واقعہ بقول صاحب جامع التواریخ شوال ۵۸۷ھ میں پیش آیا،

بسلطانی چو شد نوبت فرو کوفت — عمارتہ از گیتی فرو روفت
شکوہش پنج نوبت بر فلک زد — بعادش گرد ہفت اقلیم را خورد
خروش طبل گفتی تا دو میل است — کہ میدالست کاں طبل رحیل است
بداں اورنگش آرام اندکے بود — چو برقش زادن و مردن یکے بود
بسے ناخوردہ زایام جوانی — چو ذوالقرنین ز آب زندگانی
شہادت یافت از زخم بد اندیش — کہ باشد آں جہالش زیں جہاں بیش

(خمسہ صفحہ ۱۹۳)

قزل ارسلان صرف پانچ سال یعنی سنہ ۵۸۲ ہجری سے ۵۸۷ھ تک حکومت کرتا ہو۔ شاعر نے اس کو پنج نوبت کے نام سے اور اس کے مارے جانے کے واقعے کو 'شہادت یافت' سے تعبیر کیا ہو۔ نصرۃ الدین ابوبکر ۵۸۷ھ دسنہ ۶ ہجری اس کا قائم مقام ہوتا ہو اور شاعر بھی اپنی قصیدے کو اسی نئے اتابک کے ذکر پر ختم کرتا ہو،

گر از دریا سوئے گوہر گرم تند خاے — لب داراں گوہر باد ریاے

بدیں منت حیاے بسکرت انگیز | بساط بوسہ گہ کردم شکر ریز
اگرچہ مور قرباں را نشاید | مگس نزل سلیماں را نشاید
بود آے حزیں در معر میعم | وگر بودے بودے ہم دریغم

(خمسہ صفحہ ۵۶)

چونکہ کتاب قزل ارسلاں کے بڑے بھائی اتابک محمد کے نام معنون کرتے ہیں، قزل ارسلاں سے اس کی معذرت میں کہتے ہیں

کہ گر بودم بخدمت دور یک چند | نبودم فارغ از شغل خداوند
کمر بستم بہ تعلیم فسانہ | بدیں خدمت ترا کردم نشانہ
چو شد پیرایہ در سلک اوراق | مسجل شد بنام شاہ آفاق

اس انتساب کی وجہ صرف یہ ہو کہ چونکہ آپ ہر ایک چیز اپنے بھائی کے نام کے ساتھ نسبت دینے کے خواہش مند ہیں اس لئے میں نے بیتی بی کرکے اس کو انہی کے نام پر معنون کیا

چو دانستم کہ ایں جمشید ثانی | کہ بادش تا قیامت زندگانی
اگر یک برگ گل بیند دریں باغ | بنام شاہ آفاقش کند داغ
مرا ایں رہنمونی سخت فرمود | کہ تا شہ باشد از ایں مدہ خوشنود

(خمسہ صفحہ ۵۷)

اتابک محمد نے شیریں خسرو کے صلے میں دو گاؤں تجویز کیے تھے لیکن ابھی سند تیار نہیں ہوئی تھی کہ اتابک کا ۵۸۲ھ ہجری میں انتقال ہوگیا۔ قزل ارسلاں ان حالات سے واقف تھا لہذا اس نے تخت نشینی کے بعد ایک موقع پر جب گنجہ سے ۳۰ فرسنگ کے فاصلے پر خیمہ زن تھا۔ قاصد بھیج کر ان کو بلایا۔ جب دربار میں آئے بڑا احترام کیا اور موضع حمدونیاں

بیش کی جاتی ہی اور سنہ ۶۰۷ ہجری میں اس کی وفات کے بعد نظامی اسی کتاب کو نورالدین ارسلان شاہ کے نام سے منسوب کرتے ہیں جیسا کہ گزشتہ سطور میں گزارش ہو چکا ہی۔

سنہ ۵۹ ہجری میں عراق میں ایک خوفناک زلزلہ آیا تھا جس سے بے شمار جانیں تلف ہوئیں اور مختلف شہروں کی عمارات کو نقصان پہنچا نظامی اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ (اقبال نامہ)

ازاں زلزلہ کاسماں را درید — شدہ شہرہا در زمیں ناپدید
چناں لرزہ افتاد در کوہ و دشت — کہ گرد از گریبان گردوں گذشت
زمیں گشت چوں آسماں بے قرار — معلق زن از باری روزگار
برآمد یکے صدمہ از نفخ صور — کہ ماہی شد از گوہ ہئے گاو دور
فلک را سلاسل زہم برگسست — زمیں را مفاصل بہم در شکست
جہاں را چناں درہم افشرد سخت — کز افسردگی کوہ شد لخت لخت
زلس گنج کامرور برباد رفت — شب شنبہ را گنجہ از یاد رفت[1]
رحیدان زن و مرد و برنا و پیر — بروں نامد آوارۂ جز فقیر
بکم مدت آں مرز ویران و بوم — نو آباد تر شد ز روم

(خمسہ صفحہ ۲۵۸)

ان کے ہاں طوفانِ باد کی طرف بھی تلمیح ہی۔ قزل ارسلان کی مدح میں اپنی ذات کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں

اگر طوفان بادی سہمناک است — سلیمانے چنیں داری چہ باک است
رحیف این قران مارا چہ بیم است — کہ دارا دادگر داور رحیم است

[1] اس مصرع کا ایک نسخہ یوں بھی ہی "شہنشاہ را گنج از یاد رفت"

خصوصاً وارث اعمار شاہاں | نظر گاہ دعائے نیک خواہاں
مؤید نصرۃ الدین کا فرینش | ز نام او پذیرد نقش بینش
پناہ خسرواں اعظم اتابک | فریدوں وار بر عالم مبارک
ابوبکر محمد کز سر داد | ابوبکر و محمد روشدہ شاد

(خمسہ صفحہ ۹۲-۹۴)

اسی طرح سکندر نامے کی بھی مختلف اشاعتیں مختلف سلاطین کے نام ہیں۔ سب سے قدیم وہ اشاعت ہے جو ملک عز الدین مسعود خلف قطب الدین مودود والی موصل ۵۷۶ھ و ۵۸۹ھ کے نام پر منسوب ہے چنانچہ یہ اشعار

ملک عز دیں آنکہ چرخ بلند | بدو داد اورنگ خود را کمند

اس عقیدے کا مؤید یہ امر ہے کہ نظامی اپنی عمر پچاس سال اور اپنے فرزند محمد کی عمر سترہ سال بتاتے ہیں۔ باپ بیٹوں کی عمر کی طرف اشارے سے ظاہر ہے کہ سکندر نامے کی بنیاد سنہ ۵۸۵-۵۸۷ ہجری کے مابین رکھی جاچکی ہے۔ یہی کتاب بعد میں جلال الدین احستاں کے فرزند سے منسوب ہوئی ہے

اگر شد پسر دستہ احستاں | تو سر سبز بادی دریں گلستاں
گر او داشت از نعمتم بہرہ مند | رساند از رنیعم بچرخ بلند
تو زاں بہتر و برترم داشتی | در باغ بر بستہ بگذاشتی
مرا از کریماں صاحب رہاں | توئی ماندہ باقی کہ باقی بماں

(شرف نامہ خمسہ صفحہ ۱۹۶)

اس کی آخری اشاعت اتابک نصرۃ الدین ابوبکر کی خدمت میں

زریلوار از تو مقصود نیست — کہ پیل تو چوں پیل محمود نیست

اقبال نامہ میں فرماتے ہیں :-

بیاد نظامی بیکے طاس مے — سوری ہم آئین کاؤس کے
شنانی باین طاس طوسی نوار — حق شاہ نامہ ز محمود باز
دو وارث شمار از دکان کہن — ترا در سخا و مرا در سخن
بنامی کہ با دادہ باشد نخست — حق وارث از وارث آید درست

(خمسہ صفحہ ۲۵۹)

ان ابیات سے اگرچہ کوئی نئی اطلاع ہم نہیں پہنچی۔ تاہم اتنا پتا چل گیا کہ نظامی کے عہد میں فردوسی کی ناکامی کا افسانہ عام طور پر رائج تھا اگرچہ سلطان کی پیل بار انعام بخشیوں کے قصّے بھی ساتھ ساتھ مشہور تھے فردوسی کے سلسلے میں اسدی کے ذکر سے یہ بات صاف ہو کہ نظامی کا مقصد صاحب گرشاسپ نامے سے نہیں ہو بلکہ اسدی کلاں سے۔ گرشاسپ نامہ ۴۵۸ھ ہجری میں ابودلف والئ اران کے لیے لکھا گیا ہو اور سلطان محمود سے اس کتاب کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اسدی کلاں کے حق میں محمود کی فیاضی کا قصہ ہم تک نہیں پہنچا ہو اور گردش ایام کے دراز سفر کے مراحل میں تاریخ کی یادداشت سے محو ہو گیا ہو۔

یہ خیال کہ نظامی ہمیشہ گوشۂ عزلت میں مقیم رہے اور سلاطین کے دربار میں نہیں گئے صحیح نہیں معلوم ہوتا[۱]۔ اوّل تو ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیے

[۱] اگرچہ اس عقیدے کے خلاف یہ شعر ہیں۔ بہرام نامہ :-

چوں بعہد خوانی ار بر تو — بر درکس برفتم از در تو
ہمہ را بر درم فرستادی — من ی خواستم تو میدادی

قرانے را کہ با این داد باشد — چو فال او مبارک، باد باشد

(خمسہ صفحہ ۵۷)

دوسرے مقام پر فرمایا ہے

نگہ دارم بہ چندیں اوستادی — چراغے را دریں طوفان بادی

(خمسہ صفحہ ۱۹)

یہ طوفان جس کے سلسلے میں انوری متاخرین میں ناحق بدنام ہے۔ ۲۹ جمادی الثانی ۵۸۲ھ ہجری میں توقع کیا جارہا تھا۔ زیادہ تر اہل تنجیم اس کے قائل معلوم ہوتے ہیں لیکن شعرا بالعموم اس کے معتقد نہیں ہیں۔ مثلاً انوری ظہیر نظامی اور کمال اسمٰعیل۔

سلطان محمود اور فردوسی کے واقعات کی طرف ایک سے زیادہ موقعے پر نظامی نے اشارہ کیا ہے۔ شیرین خسرو میں فرماتے ہیں ؎

گرت خواہم کرد حق شناسی — نخواہی کردن آخر ناسپاسی

وگر با تو رہ بازار گیریم — چو فردوسی ز مزدت بار گیریم

فقاعے را تو دانی سر گشادن — توانی مہر تخ از زر کشادن

(خمسہ صفحہ ۵۳)

بہرام نامے کی تمہید میں اشارہ ہوا ہے :-

در سخا و سخن چو می پیچم — کار بر طالع است من ہیچم

نیست عقربی است یا قوسی — بخل محمود و بذل فردوسی

اسدی را کہ بود او سواحت — طالع و طالعے بہم درساخت

(خمسہ صفحہ ۶)

شرف نامے کے خاتمے میں ممدوح کو خطاب کرتے ہوئے کہا ہے

لیکن عمر کے پچاس مراحل طے کرنے کے بعد بھی کبھی کبھی باہر نکلنے اور لوگوں سے ملنے کا ولولہ دل میں پیدا ہوتا ہے ۔

برون آے زین پردۂ ہفت رنگ   کہ زنگی بود آئینہ زیر زنگ
نہ گوگرد سرخی نہ لعل سپید   کہ جوینده باشد بتو با امید

(خمسہ صفحہ ۱۲۲)

دیگر

توانم در بہر بر دوختن   شرم آمدن مجلس افروختن

(خمسہ صفحہ ۱۲۴)

لیکن پھر اپنے طبعی رجحان سے مجبور ہو جاتے ہیں ۔ (شرف نامہ)

ولیکن درخت من از گوشہ رست   بجا گر علم شود ہیچ سست

(خمسہ صفحہ ۱۲۴)

بعض لوگوں نے اُن کے کلام کی دزدی بھی کی ہے اور لطف یہ ہے کہ اُن کی متاع کے سارقوں نے خود انہیں سارق مشہور کر دیا ۔ (لیلیٰ مجنوں)

دزد درمن بجاے مرد است   بد گویدم این چہ جاے درد است
دزداں چو بکوے دزد پویند   در کوے دوند و دزد گویند
گر دزدی من حلال باشد   بد گفتن من وبال باشد
او دزد و من گرارم از شرم   دزدے محل است آں نہ آزرم
بے بے چو نگد بہ دل نہادہ است   گو خیز و بیا کہ در کشادہ است
گنج دو جہاں در آستینم   در دزدئے مفلسی چہ بینم
واجب صدقہ ام بہ بے دستاں   گو خواہ بدزد و خواہ بستاں

(خمسہ ۲۷)

ایک اور مقام پر فرمایا ہے ۔ (شرف نامہ)

کہ مثنوی نگاری کا سلسلہ وہ اسی عمر کے سینتیسویں سال سے شروع کرتے ہیں۔ اس سے پیشتر آخر وہ کہاں رہے اور کیا کرتے رہے ؟ اگرچہ ظاہر ہے کہ ایسے اعلیٰ دماغ اور روشن طبیعت کا شخص اتنی عمر تک بغیر کسی شغل کے نہیں رہ سکتا۔ بعض ابیات سے جو اس سے پیشتر مرقوم ہو چکے ہیں، پایا جاتا ہے کہ کسی نہ کسی دربار سے ان کا تعلق ضرور رہا ہے۔ سکندر نامہ کے ایک بیت سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے

ز شاہان گیتی دریں عارزرف — کرا بود چوں من حریفے شگرف

زمانۂ عزلت میں بھی سلاطین سے تعلق رکھنا اسی امر کی دلیل ہے کہ ایام شباب میں ایک عرصے تک مجلس سلاطین کے حاشیہ نشین رہے ہیں۔

جیسا کہ ان کے ابیات سے پایا جاتا ہے۔ اتابک محمد اور اس کے بھائی قزل ارسلان کے ہاں حاضر ہوئے ہیں۔ فخر الدین بہرام شاہ کے دربار میں گئے ہیں اور پھر جانے کا قصد کر رہے ہیں کہ اثنے میں دشمن کی فوجوں نے گنجہ کا محاصرہ کر لیا اس لیے انہیں اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا (مخزن اسرار)

بود بسم کہ دریں یک دو ماہ — تازہ کنم عہد زمیں بوس شاہ
گرچہ دریں حلقہ کہ پیوستہ اند — راہ بروں آمدنم بستہ اند
پیش تو از بہر فروں آمدن — خواستم از پوست بروں آمدن
بار چو دیدم ہمہ رہ شیر بود — پیش ولیم دشنہ و شمشیر بود
لیک دریں خطۂ شمشیر مست — بر تو کنم خطبہ سام ملند

(خمسہ صفحہ ۱۲)

تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ طبعاً گوشہ پسند تھے (سیر حاضر)

چو خشک از اف عزلت اگر نتم — نہ تنہائی چو عنقا خو گرفتم

نئی زبان کو مثنوی کے میدان میں کامیابی کے ساتھ برتا۔ صنعت پرستی، نئی نئی ترکیبوں، جدید تشبیہات، کنایات و استعارات نے ان کے کلام کو دقیق اور مشکل کر دیا ہے۔ وہ ایک خیال کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرنا نہیں جانتے بلکہ پیچ دے کر اس کو ایک دل فریب پیرایے میں ادا کرتے ہیں۔ تلاش اور موشگافی قدم قدم پر نمایاں ہے جس کے اثر میں بعض اوقات الفاظ و معنی میں تصادم ہو جاتا ہے اور شعر ایک معما بن کر رہ جاتا ہے۔

آورد کے ذوق میں آمد سے بالکل بیزار ہیں۔ ان کی رائے میں شعر وہی ہے جو بے حد تلاش اور جگر کاوی کے بعد دستیاب ہو۔ (شرف نامہ)

سخن گفتن و نغز جان سفتن است ۔۔۔ نہ ہر کس سزائے سخن گفتن است
بدیں دل فریبی سخنہائے نغز ۔۔۔ بسختی تواں زادن از راہ فکر

(خمسہ صفحہ ۱۲۵)

دیگر (مخزن اسرار)

از پئے لعلے کہ برآرد زکان ۔۔۔ رخنہ بود سینۂ ہفت آسمان
بکر سخن دیر پسند آوری ۔۔۔ تا سخن از دست بلند آوری

(خمسہ صفحہ ۱۳)

دیگر (شیرین خسرو)

سخن کز سر اندیشہ ناید ۔۔۔ نوشتن را و گفتن را نشاید
سخن گوہر شد و گوینده غواص ۔۔۔ بسختی در کف آید گوہر خاص

(خمسہ صفحہ ۵۸)

زر کے عوض کلام بیچنا ان کے نزدیک ذلت میں داخل ہے (مخزن اسرار)

سیم کشانے کہ بہ زر مردہ اند ۔۔۔ سکۂ ایں کار بزر بردہ اند

بریں چار سو چوں ہم دستگاہ — کہ ایں سا ستم بر دردان راہ
چہ دریا چرا ترسم از قطرہ درد — کہ از مرد رہ بیش ازاں دست برد
بیا بان کہ تاراج رہ می کند — مدد ردی جہاں راسہ می کند
برور آشتے بر بیارند گرم — کہ دارد ہمی دیدہ از دیدہ شرم
دبیراں نگر تا برور سفید — قلم چوں تراشند از مشک بید
جہان مرا کا تنکار را بر بد — دگر نخبہ است اگر تا سحار ابرند
بہ ازمن گر ازم کہ خود روزگار — بہر نیک وبد باشد آموزگار

(خمسہ صفحہ ۱۲۲)

کلام پر تبصرہ

نظامی نے اپنی طبیعت کی رنگینی اور مشکل پسندی سے مثنوی گوئی کو ایک ایسے معراج کمال تک پہنچایا ہے جس تک نہ قدما کے پیک تخیل کی رسائی ہوئی اور نہ متاخرین کا طائر وہم پہنچ سکا۔ امیر خسرو اور مولانا جامی نے اس مقام تک پرواز کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن حق یہ ہے کہ نظامی کے ایوان بلند تک نہیں پہنچ سکے۔

منکہ دریں مرحلہ شاں ماندہ ام — قدرے ازاں بیشتر ک راندہ ام

ان کا طرز وہی ہے جو منوچہری۔ قطران تبریزی۔ قوامی مطرزی اور خاقانی کا ہے۔ یہ دبستان شعرا جس کو عراقی دبستان کہا جا سکتا ہے اپنے بلند تخیل، غیر ضروری تکلف، مشکل پسندی، صنائع و بدائع، شوکت الفاظ اور استعارہ گوئی کے لیے مشہور ہے لیکن نظامی کی جدت یہ ہے کہ انھوں نے قصیدے

سکے تاج کی زینت کے لیے وقف کر دیتا ہے۔ باغ سخن کا یہ گلچیں اپنے گلشن کے بہترین پھول جمع کرتا ہے اور ہار بنا کر سکندر کے گلے میں پہناتا ہے۔ آخر یہ کیوں صرف اس لیے کہ ملک کو نظامی کے تقدس کی بہ نسبت عشقیہ افسانوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ یہ فرشتہ خصلت بالآخر اس پست معیار پر اُتر آتا ہے لیکن خدا جانے کس قدر قلق اور قربانی کے بعد فرماتے ہیں شیریں خسرو۔

مرا چوں مخزن الاسرار گنجے — چہ باید در ہوس بیہودہ رنجے
ولیکن در جہاں امروز کس نیست — کہ او را در ہوس نامہ ہوس نیست

(خمسہ صفحہ ۵۸)

مخزن اسرار لکھی، دُنیا نے کوئی صلہ نہیں دیا شیریں خسرو لکھی اور گانوّ مل گیا۔ ضرورت نے اگرچہ انھیں مصلحت بیں بنا دیا تاہم اس خرافات کی فضا میں وہ اپنی معصومیت کو نہ بھولے حسُن و عشق کی معرکہ آرائیوں کے ضمن میں دانش و حکمت کا درس دینا نہیں چھوڑا۔ لیلیٰ کے پیار اور شیریں کی عشوہ گری کے پہلو میں اخلاقیات کے موتی دائیں بائیں بکھیر دیے ہیں اور دُور از کار واقعات کے گرد و پیش میں تہذیب نفس اور تعلیم انسانی کے دقائق اور نکات بیان کیے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ دَیر میں حرم کا اور خرابات میں صومعہ کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ آج اگر کوئی ان موتیوں کو رولنا چاہے اور خمسہ کا انتخاب کرے تو اس سے حکمت و دانش کی ایک بڑی کتاب مدون ہو سکتی ہے بلکہ ان کی معصومیت کے جُرعہ نوشوں نے خلاصہ خمسہ کے نام سے ایک علیحدہ تالیف تیار کی ہے جس طرح نظامی اخلاق اور زندگی کا اعلیٰ معیار متعین کرنے میں پیش پیش ہیں اسی طرح انھوں نے

هرکه در رنگشهٔ چوں دور داد — سنگ شد لعل شد از دور داد
میوهٔ دل را که سخائے دہد — کے بود آسلے کہ سانے دہد

(خمسہ صفحہ ۱۲)

اسی لیے ان کو قصیدہ گو شعرا پسند نہیں ہیں بلکہ خود امیر معزّی کو جو ملک شاہ اور سنجر کے عہد کا ملک الشعرا ہے ناپسند کرتے ہیں۔

(مخزن اسرار)

آنکہ سرش زر کش سلطاں کشید — بار پسیں لقمۂ آہن چشید
وانکہ چو سیماب غم زر نخورد — نقرہ شد و آہن سنجر نخورد

(خمسہ صفحہ ۱۳)

فرماتے ہیں کہ سخن دانی ایک چشمۂ حکمت ہے جس کی خاطر اس چشمۂ پاک کو گندہ کرنا سخت ظلم ہے۔ شعر اسی قسم کا کہنا چاہیے جس کی شرع اجازت دے۔ ان قابل ستایش خیالات کو اپنا بدرقہ بنا کر نظامی شاہراہ سخن پر گامزن ہوتے ہیں۔ اگر ان کا بس چلتا اور فارغ البال ہوتے تو وہ اپنے اعلیٰ معیار معنیٰ پرستی کے مطابق اسی قسم کا ادبیات پیدا کرتے جس کا نمونہ ہم مخزن اسرار میں دیکھتے ہیں اور ممکن تھا کہ اس سے بھی بلند پایہ تصانیف یادگار چھوڑتے۔ ان کی اخلاقی رفعت اور شان تقدس سے اسی طرح کی امید کی جا سکتی تھی لیکن دیکھا جاتا ہے کہ اقتضاے وقت اس طلسم کشاے حقیقت کو شہرستان مجاز کا جس آرا بنا دیتا ہے۔ ضرورت اور مجبوری کا روسیاہ یہ ہاروت فن جو شاہد سخن کو مصطبہ سے آزاد کرکے صومعہ میں آباد کرنا چاہتا تھا، شیریں کے قصر کا مزدور اور لیلیٰ کا محمل آرا بنایا جاتا ہے وہ اپنی قدرت معنی آفرینی کو خسرو کی آرایش دیہیم اور بہرام

اور عشق کے اثرات میں فارسی میں وہ رنگینی پیدا ہو گئی تھی جو فردوسی کے دَور میں نامعلوم تھی نظم و نثر کے ایوان پر صنعت پرستی نے اپنی رنگ آمیزی شروع کر دی تھی۔ منوچہری۔ اسدی۔ قطران۔ انوری نصر اللہ عبد الحمید مستوفی اور قاضی حمید الدین کی سحر کاریوں نے گلزار سخن کو ہر بہشت کر دیا تھا جب نظامی پیدا ہوتے ہیں فارسی کا گلشن پوری بہار پر تھا انھوں نے اس باغ میں جو پھول کھلائے رنگت کے اعتبار سے زیادہ شوخ اور بُو کے اعتبار سے زیادہ دِل رُبا تھے۔ اِس کام کے لیے ان کی طبیعت سے حد موزوں واقع ہوئی تھی۔ نظامی کو ان کی خدا داد ذہانت، علمیت اور بلند تخیل نے اپنے معاصرین پر ایک قابل رشک تفوق بخش دیا ہے۔ صنعت پرستی سے قدرتی لگاؤ رکھتے ہیں۔ خیالات کو رنگین بنانے میں کمال حاصل ہے۔ عین عالم جوانی میں بزم شعر میں آتے ہیں۔ قدر دانی ہاتھ پکڑتی ہے سلاطین عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور معاش کی طرف سے ایک حد تک فارغ البال ہیں اور اسی صنف سخن پر ہاتھ ڈالتے ہیں جس میں نام پیدا کرنے اور سرخروئی حاصل کرنے کی گنجایش دیکھتے ہیں۔ اگر کہیں قصیدے کی بزم میں پہنچتے تو شاید اور معاصرین سے بازی لے جاتے

اِدھر فردوسی کو دیکھیے عین موسم پیری میں یہ پہلوان سخنوری کے میدان میں آتا ہے جوانی جو عمر اور شاعری کا خوش ترین دَور ہے پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ پچاس اڑتالیس برس کی عمر میں شاہنامے کی ہفتخواں میں پہلا قدم رکھتا ہے۔ نامۂ خسرواں اور اس کی پراگندہ داستانوں کی تلاش میں خاصہ وقت صرف کر دیتا ہے۔ ادبیات میں کوئی اعلیٰ نمونہ اس کے پیش نظر نہیں صرف ایک دقیقی اس کی رہنمائی کرتا ہے ورنہ جس طرف دیکھیے سناٹا نظر آتا

اپنی زندگی بسر کی ہے۔

فلاسفہ نے ہر ہر شے کا علیحدہ علیحدہ رب النوع مانا ہے۔ نظامی نے شاعر کے طبعی فیضان یا مبدع فیاض کو مختلف ناموں سے پکارا ہے۔ کبھی اس کو سروش اور ہاتف کہا۔ کبھی سلیمان اور کبھی طغان شاہ۔ کہیں ہاتف دل کہا ہے۔ (شیریں خسرو)۔

مرا چوں ہاتف دل بود دم ساز بر آورد از رواق ہمت آواز

(خمسہ صفحہ ۵۸)

کہیں اس کو خضر کے نام سے یاد کیا ہے۔ (شرف نامہ)

مرا خضر تعلیم گر بود دوش بہ رازے کہ آمد بہ پیرائے گوش

خمسہ صفحہ ۱۲۶

اور اس شعر کی بنا پر سکندر نامے کے شارحین میں وہ قصہ مشہور ہوگیا ہے جس میں نظامی کو حضرت خضر کا شاگرد تسلیم کیا گیا ہے لیکن شعر ذیل سے تمام معما حل ہو جاتا ہے۔ (اقبال نامہ)

ہمانا کہ آں ہاتف خضر نام کہ بار اشکاف است خضرا خرام

(خمسہ صفحہ ۲۸۴)



فردوسی اور نظامی

میری رائے میں فردوسی اور نظامی کا مقابلہ کرنا اور ایک کو دوسرے پر فضیلت دینا سخت ظلم ہے۔ نظامی فردوسی سے پورے دو سو سال بعد پیدا ہوتے ہیں اس عرصے میں فارسی زبان بے حد ترقی کر چکی تھی۔ بدیع الزماں

دام سے نظامی کبھی سبکدوش نہیں ہو سکے اور اس میں بھی شک نہیں کہ شیخ، فردوسی کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ جب کبھی اس کا ذکر کرتے ہیں ایسے الفاظ میں کرتے ہیں جن سے خلوص اور عقیدت ٹپکتی ہے۔ کبھی وہ اس کو دانائے طوس کہتے ہیں کبھی دانائے پیشینہ اور کبھی پادشاہِ شعرا۔ بعض اوقات اپنی مشابہ گرامی کی ادا میں اس کے وارث بن جاتے ہیں اور اپنے ممدوح سے فردوسی کا وہ قرضہ طلب کرتے ہیں جو حسبِ روایتِ شعرا سلطان محمود کے ذمے واجب الادا ہے۔ نظامی کا یہ جوشِ عقیدت اس میں شک نہیں فردوسی کے حق میں اہل سنت و جماعت کے ہاں ایک بڑی حد تک عزت و احترام کا موجب ہوا ہے جو اس لیے بدنام تھا کہ اس نے شاہنامہ لکھ کر مجوسیوں کی خدمت کی ہے۔

متعدد موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ نظامی بلاتکلف فردوسی کے مقولے باندھ جاتے ہیں۔ لیکن مجھ کو افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ نظامی کی تصنیفات سے میری ناآشنائی اس بارے میں زیادہ روشنی ڈالنے سے مجھ کو قاصر رکھتی ہے۔ چند مثالیں بہرحال ہدیۂ ناظرین ہیں۔

(۱) چه خوش گفته است فردوسی طوسی　　که مرگ خر بود سگ را عروسی
(خمسہ صفحہ ۱۹۵)

(۲) مثل زد درین آنکه فرزانه بود　　که بر پایدار هیچ دیوانه دود
(خمسہ صفحہ ۲۵۵)

(۳) مگر آنکه دانای پیشینه گفت　　که بر در نشاید دو سوراخ سفت
(خمسہ صفحہ ۱۲۶)

(۴) چنین زد مثل شاه گویندگان　　که یابندگانند جویندگان
(خمسہ صفحہ ۱۲۶)

ہو اور ہُو کا عالم ہو قدامت کے ددق ہیں۔ ہ نامۂ خسرواں کے ترجمے کے وقت زیادہ تر تحت اللفظی ترجمہ کا پابند ہو جاتا ہو جس کی وجہ سے اکثر وفات شاعری کے حدمات کا خون کرنا پڑتا ہو۔ اس پر تاکید یہ ہو کہ وفات سے پیشتر شاہنامے کے سر پر اختتام کا سہرا بندھا دیکھ لوں۔ سرپرستوں کے ارسے میں بالکل بدنصیب ہو۔ بڑھاپے کے آلام و امراض کے علاوہ افلاس اور تنگ دستی نے بوڑھے شاعر کو علیحدہ پریشاں کر رکھا ہو جواں بیٹے کی وفات اور بھی اس کی کمر توڑ دیتی ہو۔ ان مخالف ہواؤں کے باوجود یہ دُھن کا پکا شاہنامے کی کشتی کو ساحل تک پہنچا دیتا ہو۔ ؂

شوق ہو ساماں طراز نازشِ ارباب عجز
ذرّہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

لیکن ایسے ماحول میں جس کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہو فردوسی اپنی شاعری کے کیا گُل کھلاتا اور کیا گلدستے بناتا۔ ان سب باتوں کے باوجود گر مقابلہ کرنا مقصود ہو تو میں کہتا ہوں کہ فردوسی کے نشتروں کا نظامی کے نشتروں سے مقابلہ کر لیا جائے۔ اس صورت میں دیکھ لیا جائے گا کہ نظامی این ہمہ رنگینی و آرایش، شان و شکوہ و بلند آہنگی و سرمایۂ جانگداری فردوسی کے مقابلہ میں نمایاں طور پر بازی نہیں لے جا سکتے۔ اور میں بتا ہوں فردوسی کا پلّہ پھر بھی بھاری ہو ناصر خسرو کے الفاظ قطران تبریزی کے حق میں، فردوسی بغیر کسی تردد کے نظامی کے لیے استعمال کر سکتا ہو اور کیا اس میں کوئی شک کر سکتا ہو کہ ہم نظامی کی تصانیف سے خالص فارسی نہیں سیکھتے۔

فردوسی کا فیضان نظامی پر اس قدر صریح اور نمایاں ہو کہ اس کے

نظامی کو ان خیالات کا مخترع یا موجد مانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ امثال بالا میں خسرو۔ جامی اور نظامی۔ فردوسی کے خرمن کی خوشہ چینی کر رہے ہیں ذیل میں فردوسی کے اشعار جن سے نظامی کے اشعار ماخوذ ہیں، درج ہوتے ہیں۔

فردوسی

مرادے مرا کاش کے مادرم و گر زاد مرگ آمدے بر سرم

(صفحہ ۲۱۹)

مرا مادرم گر نہ زادے زبن نہفتے زمیں سبک یا مدسخن

(صفحہ ۳۴۸)

مرادے مرا کاش کے مادرم نگشتے سپہر بلند از برم

پدیرفتہ ما دا ترا زندگی ترا شہریاری مرا بندگی

چو دختر ز پہلوئے جیب شد پدید از و راستی در جہاں کس ندید

نظامی

مرا اے کاش کے مادر نزادے و گر زادے بخورد سگ بدادے

دو کار است ما فرد فرخندگی خدا وندی از تو ز ما بندگی

زن از پہلوے جیب گویند برخاست نیاید ہرگز از چپ راستی راست

سخن آرائے کہہ یہ فردوسی کا کس قدر احسان ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے ایک طویل مطالعے کی ضرورت ہے جس کا موقعہ سردست مجھ کو میسر نہیں تاہم بعض امثال یہاں حوالۂ قلم ہیں۔

نظامی	فردوسی
فرستاد نامہ بہر کشورے	نوشتند نامہ بہر کشورے
بہر مرز بانے و ہر مہترے	بہر نام دارے و ہر مہترے

بعض ماہرین فن امیر خسرو اور مولانا جامی کو الزام دیتے ہیں کہ ان بزرگواروں نے مولانا نظامی کے خانۂ شاعری کو بالکل تاراج کر دیا ہے۔ دعویٰ کیا جاتا ہے (خدا کرے اس میں مبالغہ نہ ہو) کہ ان دونوں بزرگوں کی مثنویات میں کوئی ایسی داستان نہیں جس میں نظامی کا مصرع یا شعر بعینہ یا کسی قدر تبدیلی کے ساتھ نہ پایا جائے[۱]۔ امثال میں یہ ابیات نقل کیے ہیں جو معاً نظامی سے ماخوذ بتائے جاتے ہیں۔

نظامی

مرا اے کاش کے مادر نزادے دگر زادے بخورد سگ بدادے

جامی

مرا اے کاش کے مادر نمی زاد وگر می زاد کس شیرم نمیداد

نظامی

دو کار ست از دو فرخندگی خداوندی از تو زما بندگی

خسرو

اے صفتت بندہ نوازندگی از تو خدائی و زما بندگی

نظامی

دل از پہلوے چپ گویند خاست نباید ہرگز از چپ استی راست

جامی

دل از پہلوے چپ شد آفریدہ کس از چپ راستی ہرگز نہ دیدہ

یہ ہماری کوتاہ نظری اور فردوسی کے حق میں بے انصافی ہو اگر ہم

[۱] احسن القواعد صفحہ ۸۵-۱۸۶ مطبع محمدی ۱۹۲۳ء، مخزن الفوائد صفحہ ۷ مطبع سنگین۔ ہفت آسمان صفحہ ۴۶-۴۷ اشاعت ایشیاٹک سوسائٹی بنگال۔

فردوسی	نظامی
...دں من و چوں تو بسیار دید	جہاں در جہاں خلق بسیار دید
...ہرہمی ما کسے آرمید	رمید از ہمہ ما کسے ما رمید
...جہاں ار گماں برتراست	کہ شاہ جہاں ار گماں برتراست
...مارک مشتری افسراست	جہاں کاں گوہر شد او گوہراست
...ے سترسد ریگ دشت گور	یکے گرگ راکو بود سہماک
...فراواں ستارہ چو ہور	ربسیار ریبے گوسفداں چہ باک
...تو ما دا سپہر ملند	بکام تو ما دا سپہر ملند
...سم مداست ما دا گزند	رحیثم مداست ما دا گزند
...ست کیں کودک ارجمند	کہ دانست کیں کودک خورد سال
...سال گردد چو سرو ملند	شود ما بزرگاں چنیں مدسگال
...را ملندی و پستی توئی	پناہ ملندی و پستی توئی
...چہ ہرچہ ہستی توئی	ہمہ نیستند آں چہ ہستی توئی
...ے کہ رزیں ہمہ حایہ کرد	رمانہ دگر گونہ آئیں نہاد
...و سر ماثر سے مایہ کرد	شد آں مرغ کو بیضہ زریں نہاد
...سر دس دور شد آفتاب	چو رخت ار سرکوہ برد آفتاب
...ریار اندر آمد بخواب	سر شاہ شاہاں در آمد بخواب
...ست گیتی و زیں سگ بیست	دریں پردہ بر آسماں جنگ نیست
...دگار رجہاں جنگ نیست	کہ اس پردہ ماکس ہم آہنگ نیست
...بیمہ داشت افراسیاب	بہ بے مار گاہے کہ چوں آفتاب
...رق بمعرب کشیدہ طناب	رمشرق بہ معرب رساند طناب

فردوسی

به آواز گفتند ما بنده‌ایم
به فرمان و رایت سرافگنده‌ایم
بخور هرچه داری فزونی بده
تو رنجیدهٔ بهر دشمن منه
سپاه پراگنده را گرد کرد
زمین آهنین شد هوا لاجورد
زمین گر گشاده کند راز خویش
نماید سرانجام و آغاز خویش
که گردد برادر بهدلیت پشت
تن کوه را خاک ماند مشت
نباشی بس ایمن به بازوی خویش
خورد گاو نادان ز پهلوی خویش
بجنبد زمین تا نگردد هوا
هوا را بخوانم کف پادشا
درشتی ز کس نشنود نرم گوی
سخن تا توانی به آزرم گوی
سپه مار چندان دمد روز جنگ
که از کام دریا برآید نهنگ
ز بهر درم تند و بدخو مباش
تو باید که باشی درم گو مباش

نظامی

نهادند سرها که ما بنده‌ایم
بدین عهد و پیمان سرافگنده‌ایم
بخور چیزی از مال و چیزی بده
ز بهر کسان نیز چیزی بنه
پراگندهٔ چند را گرد کرد
که از آب دریا برآورد گرد
زمین گر بضاعت برون آورد
همه خاک در زیر خون آورد
دو دل یک شود بشکند کوه را
پراگندگی آرد انبوه را
مکن تکیه بر زور بازوی خویش
نگه دار وزن ترازوی خویش
ز شیران بود روبهان را نوا
بجنبد زمین تا نگردد هوا
سخن تا توانی به آزرم گوی
که تا مستمع گردد آزرم جوی
سپه بیشتر چندان بود کینه‌ساز
که از دور دندان نماید گراز
ز بهر درم تند و بدخو مباش
تو باید که باشی درم گو مباش

تنقید شعر العجم

حصّہ دوم

قولہ "اس کے بعد چنگیز خاں کا پوتا ہلاکو بن تولی بن چنگیز خاں تخت نشین ہوا۔ ہلاکو نے محقق طوسی کو وزارت کا منصب دیا، رفتہ رفتہ مسلمانوں نے دربار پر قبضہ کرلیا، یہاں تک کہ اس کا بیٹا نکودار جو آخر شمس الدین وزیر سلطنت کی ترغیب سے مسلمان ہوگیا اور اپنا نام احمد رکھا۔ ترک اِس پر بگڑ گئے اور ارغون خاں (ہلاکو خاں کا دوسرا پوتا) کی افسری میں احمد خاں کو گرفتار کر کے سنہ ۶۸۳ھ میں قتل کردیا"

(شعر العجم حصّہ دوم، صفحہ ۲ معارف پریس اعظم گڈھ)

محقق طوسی کی وزارت کا قصہ کسی اصلیت پر مبنی نہیں، تاریخیں متفق ہیں کہ ہلاکو کا پہلا وزیر امیر سیف الدین بتکچی بہادر بن عبداللہ خوارزمی ہے جو بحیثیت وزیر سنہ ۶۵۳ھ میں ہلاکو کے ساتھ ہی ایران میں آتا ہے اور فتح بغداد کے بعد نجف اشرف کی حفاظت کے لیے ہلاکو سے سو معمولی سپاہی مانگتا ہے۔ سنہ ۶۶۱ھ میں جب ہلاکو برکہ خاں بادشاہ قبچاق کی جنگ کے لیے جاتا ہے، وزیر موصوف دشمنوں کی بدگوئی کی بنا پر خاں کے حکم سے ہلاک کردیا جاتا ہے۔ اس واقعے کے

فردوسی

بنا کردم از نظم کاخے بلند
کہ از باد و باران نیابد گزند
چو دانا ترا دشمن جان بود
بہ از دوست مردے کہ نادان بود

نظامی

نہ حرفے کہ عالم ز یادش برد
نہ باران بشوید نہ بادش برد
دشمن دانا کہ غم جان بود
بہتر از آن دوست کہ نادان بود



جام جم میں ابوسعید کی اس طرح مدح سرائی کی ہے -

دو جہاں را صلائے عید زدند　　سکہ بر نام بوسعید زدند

در چنیں گفتہ ملل دفتری　　مدح این گلّش اولو الامری"

(شعر العجم صفحہ ۲)

مصنف جام جم کے مشہور صوفی ہونے کا اندازہ اس ایک امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ خود علامہ شبلی اس سے ناواقف ہیں - شیخ اوحدی کرمانی (اوحدالدین حامد کرمانی) ۶۹۷ھ ہجری میں بعہد غازان خان وفات پاتے ہیں مثنوی جام جم ۷۳۳ھ ہجری میں تصنیف ہوئی ہے، چنانچہ شعر -

چوں شارع بگرفتم حال　　ہفتصد رفتہ بود سی وسہ سال

(جام جم قلمی)

درحقیقت اس مثنوی کے مصنف رکن الدین اوحدی مراغی ثم الاصفہانی ہیں جو شیخ اوحدالدین کرمانی کے مُرید ہیں اور ۷۳۸ھ ہجری میں انتقال کرتے ہیں -"اوحدی" تخلص انھوں نے اپنے مُرشد اوحدالدین حامد کرمانی کے لقب کی یادگار میں رکھا ہے -

قولہٗ "تاتار کے قتل عام میں جو بے شمار جانیں ضائع ہوئیں اُس نے مسلمانوں کے شجاعانہ جذبات کو فنا کر دیا، اس کا شاعری پر یہ اثر ہوا کہ رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئیں، شاعری کے فرائض پورے کرنے کے لیے متعدد رزمیہ مثنویاں لکھی گئیں مثلاً -

ہمائے ہمایوں خواجوئے کرمانی ' آئینہ اسکندری امیر خسرو سکندر نامہ جامی ' تیمور نامہ ہاتفی ' شاہنامہ قاسم گونابادی اکبرنامہ فیضی - لیکن صاف نظر آتا ہے کہ کہنے والے سر پڑھاتے

بعد صاحب دیوان شمس الدین محمد جوینی منصب وزارت پر سرفراز ہوتے ہیں اور مسلسلاً ۲۲ سال برابر یعنی باقی ایام ہلاکو و کامل عہد اباقا خاں و سلطان احمد اس عہدۂ جلیلہ پر ممتاز رہتے ہیں۔ خود محقق طوسی نے کتاب اوصاف الاشراف صاحب دیوان کے نام پر اور کتاب ترجمۂ ثمرۂ بطلیموس ان کے فرزند خواجہ بہاء الدین محمد حاکم اصفہان کے نام پر لکھی ہے سلطان احمد کا اصلی نام تکدار، تو کدار یا تکودار ہے۔ نہ تکو دار دار۔ وہ ۶۸۱ھ میں قتل نہیں کیا جاتا کیونکہ ۶۸۱ھ میں تخت نشیں ہوتا ہے اور دو سال اور دو ماہ حکومت کرنے کے بعد ہلاک کیا جاتا ہے۔ ترکوں کی مخالفت سلطان احمد کے ساتھ مذہبی بنا پر نہیں تھی، بلکہ زیادہ تر سیاسی تھی۔ اگر مذہب کا سوال درمیان میں ہوتا تو شاید احمد کو تخت ہی نصیب نہ ہوتا کیونکہ وہ تخت نشینی سے پیشتر ہی حلقہ بگوش اسلام تھا اور دربار کے تمام شہزادے اور طاقت ور امیر کافر تھے۔ دوسرے دعویداروں کے باوجود سب کے اتفاق سے سلطان احمد بادشاہ بنایا جاتا ہے۔ ارغون، ہلاکو خاں کا سب سے بڑا پوتا اور اباقا خاں کا فرزند اکبر ہے وہ باپ کے تخت کا دعوے دار رہا۔ احمد نے کئی لڑائیوں کے بعد بصد خرابی بصرہ اس کو گرفتار کیا اور قتل کرنے کے بجائے قید کر دیا۔ ارغون کے طرف داروں نے جن کی ایک طاقت ور جماعت دربار میں بھی موجود تھی، قید کی پہلی ہی رات سازش کر کے اُس کو آزاد کر دیا اور احمد کے طرف داروں کو قتل کر کے ارغون کو بادشاہ بنا دیا۔

قولہٗ "سلطان ابوسعید کے عدل و انصاف اور نظم و نسق کے قواعد اور آئین، مساجد اور مدارس برگزیدہ ہو کر مدتوں قائم رہے، یہاں تک کہ اوحدی کرمانی نے جو مشہور صوفی گزرے ہیں۔ اپنی مثنوی

کی فہرست ابھی نا تمام ہے اور ذیل کے نام اضافہ کرتا ہوں ۔
مفتاح الفتوح امیر خسرو، جس میں جلال الدین فیروز شاہ خلجی کی جنگ کا ذکر ہے۔ خاور نامہ ابن حسام (۸۳۰ھ ہجری)، تغلق نامہ بدر چاچی، جس میں بیس ہزار کے قریب اشعار تھے، فتوح السلاطین عصامی اور بہمن نامہ آذری۔
فتوحات شاہی سستری (۹۴۰ھ ہجری)، شاہ رخ نامہ قاسمی گونا بادی، ظفر نامہ حمداللہ مستوفی ۷۳۵ھ ہجری۔ شہنشاہ نامہ احمد تبریزی ۷۳۸ھ ہجری، ظفر نامہ کے اشعار کی تعداد پچھتر ہزار ہے، یعنی شاہنامہ فردوسی سے بھی پندرہ ہزار اشعار زائد ہیں۔ تاہم مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ "رزمیہ نظمیں ہمیشہ کے لیے معدوم ہوگئیں اور انھوں نے محض شاعری کے فرائض ادا کیے ہیں"۔ خسرو، حمداللہ مستوفی، جامی اور ہاتفی کے لیے یہ کہنا کہ محض سہ چڑایا ہے، کسی حالت میں صحیح نہیں مانا جا سکتا۔ مولانا کے نزدیک رزمیہ شاعری کے ضروری اوصاف یہ ہیں ۔ (۱) واقعہ مہتم بالشان ہو۔ (۲) لڑائی کے ہنگامے کا بیان پُر رعب ہو (۳) جنگ کے ساز و سامان، رزم آزماؤں کی لڑائی کے تمام داؤں پیچ بتائے جائیں۔ وغیرہ۔ میں کہتا ہوں کہ گزشتہ بالا شعرا میں سے ہر ایک نے قریب قریب ان فرائض کو ادا کیا ہے، لیکن پھر بھی مولانا شبلی فرماتے ہیں ۔

اگرچہ شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

"ہمائے ہمایوں" ایک عشقیہ نظم ہے جس میں شہزادہ ہمائے، والیٔ خاور اور شہزادی ہمایوں دختر فغفور چین کے عشق و محبت کا فرضی قصہ ہے،

ہیں، دل میں کچھ نہیں۔" (شعرالعجم صفحہ ۳)

اِس سے پیشتر سامانی، غزنوی اور سلجوقی دوروں کا مذکور ہو چکا ہے۔ اِن دَوروں میں مسلمانوں کے تہذیبی حدمات کا شاعری پر کوئی اثر نہیں دکھایا گیا، جس کا اب تاتاری قتلِ عام سے خاتمہ ہو جانا بیان کیا جاتا ہے۔ مولانا نے اب تک صرف تین رزمیہ کتابوں یعنے شاہنامہ، گرشاسپ نامہ اور سکندرنامہ کا زیادہ تر ادبی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور نہیں یقین نہیں کر سکتا کہ ان کتابوں نے مسلمانوں کے جنگی و قومی جذبات کو برانگیختہ کرنے، یا اُن کے بیدار رکھنے میں کوئی مدد کی ہو، کیونکہ ان کی تمام داستانیں غیر مذاہب کے جنگ آزماؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ رستم سیستانی تھا، کیخسرو کیانی، سکندر یونانی اور نوشیرواں ساسانی۔

فارسی میں رزمیہ شاعری محض اتفاقیہ رائج ہوئی ہے، ایرانیوں کو اپنے قومی افسانے اور تاریخ سے شغف تھا، فردوسی نے اُس کو نظم کر دیا۔ اسدی نے ایک اور داستان جس کے واسطے وہ کہتا ہے کہ فردوسی کو نہیں ملی، گرشاسپ نامے کے نام سے نظم کر دی۔ ملکی و مذہبی اثرات میں ہمارے ہاں تقلید پسندی کارور ہے، چنانچہ اسلامی ادبیات کے تمام دوروں میں یہی ایک اصول یعنے تقلید صراحت کے ساتھ نمایاں ہے۔ شاعر اپنے تفنن طبع کے لیے کسی نہ کسی کا ضرور تتبع کرتے رہے ہیں۔ نظامی کے دَور تک، فردوسی کی تقلید کرتے رہے، چنانچہ بہمن نامہ، شہریار نامہ وغیرہ شاہنامے کی تقلید میں لکھے گئے۔ جب نظامی نے اپنی طرز کا اعلیٰ معیار پیش کیا تو تمام صنعت پرست اُن کی طرف جھک گئے۔

چنگیزیوں کے بعد تو مقابلتاً زیادہ رزمیہ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مولانا

ہے۔ اسلام میں اس کی تلقین کی آیات کلام پاک میں موجود ہیں۔ تصوف نے اپنے اصولوں کو اسی مضمون کی اساس پر قائم کیا ہے۔ ایرانی شعرا میں سب سے پیشتر محمد بن وصیف سجزی اس موضوع کو اپنی شاعری میں روشناس کرتا ہے۔ رودکی، ناصر خسرو، سنائی، انوری اور خاقانی بغیر کسی استثنا کے یہی بولیاں بول رہے ہیں، لیکن یہ فردوسی، خیام اور عطار ہیں جن کے ہاں قدم قدم پر یہی درس عبرت دیا گیا ہے۔ سعدی، ابن یمین اور خواجہ حافظ اس بارے میں کسی خاص امتیاز کے مستحق نہیں۔ درحقیقت اگر کوئی شاعر اس انقلاب سے کسی قدر اثر پذیر ہوا ہے تو وہ کمال اسمٰعیل ہے۔

شیخ فریدالدین عطّار

میں رفع تشکیک کی غرض سے ابتدا ہی میں گزارش کیے دیتا ہوں کہ علّامہ شبلی، شیخ عطار کو بار بار خواجہ عطار لکھ رہے ہیں۔ ہم خواجہ کا لفظ آج کل بھی ہر شخص کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ اُن ایّام میں قدما میں خواجہ کے واسطے کسی قسم کی تعمیم نہیں پائی گئی، وہ خاص خاص طبقے کے لوگوں کے نام کے ساتھ ملتا ہے، مثلاً۔ ارباب مناصب و دبیران سلطانی کے ناموں کے ساتھ۔ علاوہ بریں "خواجہ عطار" کے لقب سے ایک اور بزرگ جو نویں صدی ہجری میں وفات پاتے ہیں ممتاز ہیں، ان کا پورا نام خواجہ علاء الدین عطار ہے۔

تغیر کے واقعہ کے ذکر کے بعد جس کی ناگہانی وفات سے متاثر ہو کر شیخ فریدالدین عطار اپنی دکان لٹا دیتے ہیں، مولانا شبلی فرماتے ہیں —

اس کا زرمیہ نظموں سے کوئی تعلق نہیں۔

قولہ "جنگی حوادث کے فنا ہونے نے طبیعتوں میں انفعالی اثر زیادہ پیدا کیا، جو تصوف کے سوا ایک اور رنگ میں ظاہر ہوا، یعنے غزل گوئی۔ یہ مسلم ہے کہ غزل جس چیز کا نام ہے اس کی ابتدا شیخ سعدیؒ اور ان کے معاصرین سے ہوئی۔"

(شعر العجم صفحہ ۴)

جنگی حوادث کی معدومیت اگر ایران میں غزل کے وجود کی ذمہ دار ہو تو آخر اس عہد کے ہندستان کو کیا ہوا تھا؟ یہ ملک چنگیزی سیلاب سے بالکل مامون رہا ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں بھی خسرو اور حسن دہلوی جیسے غزل گو موجود ہیں۔ تصوف مغلوں کی آمد سے بیشتر اکثر ممالکِ اسلام میں موجود تھا، البتہ ان کی آمد نے اس کی ترقی کی رفتار کو تیز کر دیا اور یہ تصوف ہے، جس نے غزل گوئی کو حقیقی ترقی دی۔

قولہ "کم از کم پچاس ساٹھ لاکھ آدمی ایک دم سے فنا ہوگئے، اس امر نے دنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کا ایسا نقشہ کھینچ دیا جو مدت تک آنکھوں کے سامنے پھرتا رہا، اس بنا پر دنیا کی بے ثباتی کے مضامین زیادہ تر اشعار میں آنے لگے۔ شیخ سعدی، ابن یمین، خواجہ حافظ کے ہاں ان مضامین کی بہتات اسی بنا پر ہے، ان لوگوں نے یہ سماں خود آنکھوں سے دیکھا تھا، وہی زبان پر آیا۔"

(شعر العجم صفحہ ۴)

دنیا کی بے ثباتی، مشرق کے اکثر مذاہب کا ایک وسیع موضوع رہا ہے جس کو ان ممالک کی غیر مستقل طرزِ حکومت نے اور بھی ممتاز حیثیت دے دی

میں اِس قصّے کے لیے کوئی مناسب موقع نظر نہیں آتا، کیونکہ اوّل تو وہ خود ہی ایّام طفلی سے اصحاب ذوق وعرفاں کی صحبت کے مائل تھے دوسرے جہاں تک معلوم ہو سکا کہ مولانا بھی معترف ہیں، شیخ عطار فقر و تصوّف کے ساتھ ساتھ مطب اور دارو خانہ کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے "دل بیار و دست بکار" پر عامل رہے۔

قولہ "خواجہ صاحب کی تحریروں سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس عالم میں انھوں نے مدت تک سیّاحی بھی کی ہو۔ لسان الغیب میں کہتے ہیں۔

"چار اقلیم جہاں گردیدہ ام

سر برآوردہ بہ محسوسیِ عشق   سیر کردہ مکہ و مصر و دمشق

کوفہ و ری تا خراساں گشتہ ام   سیحوں و جیحوں را سریدہ ام

ملک ہندستاں و ترکستاں زمیں   رفتہ چوں اہل خطا از سوئے چیں

عاقبت کردم بہ نیشاپور جائے   اوفتاد از من بعالم ایں صدائے

در نشاپورم بہ کنج خلوتے   ما جدائے خویش کردم وحدتے"

(شعر العجم صفحہ ۱)

میرا عقیدہ ہے کہ مولانا شبلی نے لسان الغیب بچشم خود نہیں دیکھی ہے، بلکہ ابیات بالا مرزا محمّد بن عبدالوہاب کے دیباچۂ تذکرۃ الاولیاء عطّار، مرتبّہ پروفیسر نکلسن سے نقل کر لیے ہیں اور ایسے اشعار کو ترک کر دیا جن سے شیخ عطار کی تشیّع کا گمان ہو سکے۔ مثلاً:-

"شہر نشاپورم تولدگاہ بود   در حرم گاہ رضا ام راہ بود

مرقد اثنا عشر رستم بچشم   می زنم بر دشمنانش سنگ بیتم"

اِس دیباچے میں اِسی لسان الغیب سے میرزا محمّد نے عطار کی شیعیت کے

"لیکن افسوس ہے کہ ہمارے تذکرہ نویسوں نے خود خواجہ صاحب کی تصنیفات نہیں پڑھیں، ان کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے کہ تصوف اور فقر کے کوچے میں آنے کے بعد وہ اپنے قدیم پیشے میں مشغول رہے اور اسی حالت میں اسرار و عرفاں کی حقائق پر کتابیں لکھتے رہے"۔
(شعر العجم صفحہ ۸ مطبع معارف اعظم گڑھ)

میں اس قدر اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ شیخ عطار کی عمر میں تصوف و عرفاں سے ذوق آشنا ہونے کا انقلاب کسی بیرونی تحریک یا واقعے کی بنا پر نہیں ہوا نہ یہ تبدیلی ان کی عمر کے کسی خاص وقت میں ہوئی، بلکہ وہ ابتدا ہی سے بنا بر تقاضائے طبیعت حضرات صوفیہ کے معتقد اور مدارج سلوک و عرفاں کے سالک تھے، چنانچہ تذکرۃ الاولیا کے دیباچے میں ارشاد کرتے ہیں۔

"دیگر باعث آں بود کہ بے سببے از کودکی باز دوستی ایں طائفہ در جانم موج می زد و ہمہ وقتے مفرح دل من از سخن ایشاں بود، بر امید آنکہ المرء مع من احب"۔

(تذکرۃ الاولیا صفحہ ۵ مرتبہ پروفیسر نکلسن)

رہا فقیر کا قصہ، وہ صرف اس کی اپنی نوعیت کی بنا پر تسلیم یا رد کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ خیال کرنا کہ تمام اہلِ تذکرہ اس پر متفق ہیں، صحیح نہیں کیونکہ محمد عوفی اور حمد اللہ مستوفی اس کا ذکر نہیں کرتے عطار کے عہد سے قریباً ڈھائی سو سال بعد سلطان حسین مرزا کے عہد کے مصنفین، جن میں مولانا جامی اور دولت شاہ قابل ذکر ہیں، اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور بعد کے تذکرہ نگاران کے مقلد ہیں لیکن خود مولانا جامی اور دولت شاہ اس قصے کے ضمنی واقعات اور سوال و جواب پر متفق نہیں ہیں بہرکیف میرے نزدیک شیخ عطار کے سوانح

عوام الناس ایک لاکھ کی تعداد میں جمع ہوگئے، اُس کا گھر لوٹ لیا، اُس کے فرزند کو قید کردیا اور قریب تھا کہ اس کی جان ضائع ہو جائے، اتنے میں خدائے تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ایک زبان دکھائی، غیب سے اس کے کانوں میں آواز آئی کہ: اے عطار خوف نہ کھا، اِن ظالموں کے ہاتھوں سے تو فوراً رہا ہو جائے گا۔ اِس الہام کے بعد اس کے پر و بال پیدا ہو گئے اور مصنف شہباز تیر پرواز کی طرح اُڑتا ہُوا لوگوں کی آنکھوں سے غائب ہو گیا۔

بالہامم ندا در داد یزداں	کہ اے عطار تو خود را مترساں
خلاصی ایں زماں از دست ایشاں	ازیں معنیٰ مکن خاطر پریشاں
پریدم از میاں شان چتم کن مار	بالہام الٰہی ہمچو شہباز

(مظہر العجائب قلمی)

اس واقعے کے بعد مصنف وطن سے آوارہ ہوکر مکہ چلا جاتا ہے اور وہاں کتاب لسان الغیب تصنیف کرتا ہے۔

ایں لسان از بہر احمد گفتہ ام	در مقام مکہ اش بنوشتہ ام

(از مقدمہ مرزا محمد قزوینی)

لسان الغیب گویا اس ماحول میں پیدا ہوتی ہے، اب اس کو شیخ فریدالدین عطار کی طرف منسوب کرنا جو مذہب سنت و جماعت کے پیرو ہیں جیسا کہ اُن کی تصنیفات سے ظاہر ہے، میں کہتا ہوں سخت ظلم ہے۔ علیٰ ہذا اس کتاب کی بنا پر شیخ کی سیاحی کا دعویٰ بھی میرے نزدیک ناقابلِ قبول ہے کیونکہ وہ اِس حصۂ ادبیات مجہول سے تعلق رکھتی ہے جو شیخ عطار کے نام پر موضوع ہُوا ہے۔ لیکن اس کے متعلق آئندہ بحث ہوگی۔

نوٹ میں یہ اشعار بھی حوالۂ قلم کیے ہیں ۔

شیعۂ پاکست عطار اے پسر — جز این شیعہ سجان خود مجو
ما ز فاروق التجا کردہ ایم — پے ز بوذر ستمنا بریدہ ایم
بو حنیفہ را ز دست نگذار تو — خود برو اندر پئے کرار تو

(تذکرۂ اولیا طبع بریل ۱۳۲۲ھ ہجری صفحہ یب)

لسان الغیب[1] اگرچہ میری نظر سے نہیں گزری، تاہم اس قدر عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمیں اس کتاب کو عطار کی طرف منسوب کرنے میں بہت کچھ تامل اور تردد سے کام لینا چاہیے۔ یہ کتاب اس قدر نامعلوم ہے کہ جب تک ڈاکٹر ایتھے نے انڈیا آفس کے کتب خانے کی فہرست ترتیب دے کر شائع نہ کی، اس وقت تک کوئی اس سے واقف نہ تھا۔ سب سے پہلے میرزا محمد قزوینی نے اس کا ذکر کیا اور علامہ شبلی دوسرے شخص ہیں جو اس کا نام لیتے ہیں۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لسان الغیب کے مصنف نے اپنی شیعیت کے اظہار میں ایک کتاب مظہر العجائب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے نام پر لکھی تھی، جس میں ان کی مدح میں مبالغے کے علاوہ، نواصب، روافض و خوارج پر، جن سے اس کی مراد اہل سنت و جماعت ہیں، جا و بیجا حملے کیے تھے۔ کسی فقیہ نے جو سمرقندی ہے، مصنف پر رفض کا الزام لگا کر مظہر العجائب کو جلوا دیا اور خود اس پر قتل کا فتویٰ لگا کر سزا دہی کا حکم دیدیا۔

---

[1] اس تنقید کے چند سال بعد لسان الغیب کے دو نسخے میرے ہاتھ آئے۔ اس کے مطالعے کے بعد میں بدستور اپنی رائے پر قائم ہوں کہ لسان الغیب اسی شیعہ مصنف کی تالیف ہے جس نے مظہر العجائب لکھی ہے اور عطار کی طرف اس کا انتساب
[illegible]

ایسا شخص جو مشائخ کی صحبت کا بچپن ہی سے شیفتہ تھا۔ شیخ مجدالدین جو ۶۱۳ھ ہجری میں قتل کیے جاتے ہیں، اپنی وفات کے وقت غالباً جوان ہی تھے۔ اب شیخ عطار تصوف میں اس قدر شہرت اور تصنیفات کے باوجود اسّی سال کی عمر میں ایک جوان شخص کے جو شہرت اور قابلیت میں کچھ بھی درجہ نہیں رکھتا، مرید بنائے جاتے ہیں۔ شیخ مجدالدین کی شہرت ان کے خون ناحق کی وجہ سے ہوئی ہے۔ حمداللہ مستوفی کہتا ہے ۔

"شیخ مجدالدین بغدادی در سنہ ثلث وعشر وست مائۃ بعہد ناصرعلیہ بہ تہمت آنکہ با مادر خوارزم شاہ معاشرت ورزیدہ، بحکم خوارزم شاہ شہید شد۔ بعد از قتلش خوارزم شاہ پشیماں شد، بخدمت شیخ نجم الدین کبریٰ رفت وگفت "چنیں خطائے از من صادر شد، دیت خون او چہ باشد، شیخ گفت "جان من و تو واکثر اہل جہاں بجہت خون او نشاید۔ چون ناکردنی کردہ شد، تدارک نتواں کرد۔"

حقیقت میں عطار کے مرشد ہونے[51] کے مستحق خواجہ ابو الفضل سعدالدین شافعی المذہب ہیں جو وزارتِ خراساں سے دست بردار ہو کر طبقۂ صوفیہ میں شامل ہوتے ہیں اور تیس سال سے زیادہ عرصے تک گوشۂ عزلت میں مقیم رہے ہیں۔ شیخ عطار نہایت پُر جوش اور معتقدانہ الفاظ میں "خسرو نامے" میں منقبت کے بعد اُن کا ذکر کرتے ہیں۔ میں چند ابیات یہاں نقل کرتا ہوں ۔

---

[51] ہفت اقلیم میں، اس سلسلے میں شیخ رکن الدین اکاف کا نام بھی دیا ہے اور مثنویات میں کئی موقعوں پر عطار نے ان کی حکایات درج کی ہیں لیکن شیخ مجدالدین کا نام کہیں نہیں آتا۔

قولہ "خواجہ صاحب نے اگرچہ سب بزرگوں سے فیض اٹھایا تھا، لیکن جیسا کہ دولت شاہ نے لکھا ہے، خرقۂ فقر مجدالدین بغدادی سے حاصل کیا تھا مجدالدین بغدادی قطب الدین خوارزم شاہ کے طبیب خاص تھے۔"

(شعر العجم صفحہ ا)

شیخ مجدالدین بغدادی سے خرقۂ فقر حاصل کرنے کی روایت پر اگر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک کمزور اساس پر قائم ہے تذکرۂ عطار میں ایک فقرہ آتا ہے کہ۔

"ومن یک روز پیش امام مجدالدین خوارزمی درآمدم او را دیدم کہ می گریست گفتم "خیر ست" گفت "زہے سپاہ سالاراں کہ دریں امت بودہ اند بمثابۂ انبیا علیہم السلام کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" پس گفت "ازاں می گریم کہ دوش گفتہ بودم کہ خداوندا کار تو بعلت نیست، مرا ازیں قوم یا از نظارگیاں ایں قوم گرداں کہ قسمے دیگر را طاقت ندارم، می گریم کہ بود کہ مستجاب شدہ باشد۔"

(تذکرۃ الاولیا صفحہ ۶ طبع لیڈن)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ امام مجدالدین خوارزمی جو عالم ہیں اور شیخ مجدالدین بغدادی جو نجم الدین کبریٰ کے مرید ہیں ایک ہی شخص ہیں۔ دوسرے شیخ عطار جو کہا جاتا ہے ۵۱۳ھ ہجری میں ولادت پاتے ہیں شیخ مجدالدین سے عمر میں بہت اقدم ہیں شیخ مجدالدین کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ علاء الدین محمد خوارزم شاہ (۵۹۶ھ ہجری و ۶۱۷ھ ہجری) کے عہد میں ہوئی ہے اب کیا عطار اسی ترا سی سال تک بے پیرے رہے ؟ بالخصوص

قزوینی نے، جو مسٹر براؤن کے شاگرد ہیں، ایک محققانہ دیباچہ لکھا ہے" (شعرالعجم صفحہ ۱۱ و ۱۲)

عطار کا یہ تذکرہ جس کا مولانا ذکر فرماتے ہیں، حقیقت میں پروفیسر نکلسن نے مرتب کرکے ۱۹۰۵ء میں شائع کیا ہے۔ علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی، پروفیسر براؤن کے شاگرد نہیں ہیں، بلکہ شریکِ محنت فاضل۔ جن سے براؤن استفادہ کرتے رہے ہیں۔

قولہ "صوفیانہ شاعری کے چار ارکان ہیں سنائی، اوحدی، مولانا روم اور خواجہ فریدالدین عطار" (شعرالعجم صفحہ ۱۲)

اس فہرست میں اوحدی کے نام کا داخلہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اوحدالدین کرمانی شاعر نہیں ہیں نہ اوحدی اُن کا تخلص ہے۔ اگر مولانا شبلی کی مراد اوحدی مراغی سے ہے تو اُن کے پایہ کے، بلکہ ان سے بہتر درجہ کے صوفی شعرا کا نام لیا جاسکتا ہے۔

شیخ عطّار کے حالات

تذکرہ نگاروں نے بہت کم حالات دیے ہیں اور جو کچھ دیے ہیں، شبہ سے خالی نہیں کیونکہ اُن کے نام پر اور لوگوں نے کتابیں تصنیف کرکے اس کے حالات کے مرقع کو اور بھی دھندلا سا دیا ہے۔ ان کا نام محمد ہے، فریدالدین لقب فرید اور عطّار تخلص ہے۔

من محمد نامم و این شیوہ بیر ختم کردم چوں محمد اے عزیز

(مصیبت نامہ قلمی)

خدا را آنکہ محبوب و حبیب است | ابو الفضل جہاں پیر لبیب است
دل دیں خواجہ سعد الدین کہ امروز | دل اوست آفتاب عالم افروز
خراساں را ورا رست داشت بالش | ولے اندا خت او تا بر د سالش
خوابراہیم ادہم ملک بگزاشت | کہ چوں نسبتی خلافت یک شو انگاشت
سریک موے او عالم ندانند | کہ داند قدر او ادہم ندانند
بحق امروز قطب اولیا اوست | حریم خاص را خاص خدا اوست
گر او تادند گر ابدال امروز | از و دارند کشف حال امروز
چو بود او در شریعت شافعی دوست | طریقت را علی الحق شافعی اوست
شدہ سی سال تا وے بر سحبا | بخلوت روئے آوردہ است تنہا
خدایا قادری د می توانی | با و رح ہمت خویشتن رسانی
مرا در حرص او خوشہ چیں دار | ز نور او دلم را راہ بیں دار
کہ تا ایں بندہ ہم پیئے برپئے شاں | بیا ید مار بر درگاہ سلطاں

(خسرو نامہ عطار صفحہ ۴۵ طبع مرشد لکھنؤ)

آخری دو شعروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عطار خواجہ سعد الدین کے مُرید ہیں۔

شیخ مجد الدین اور قطب الدین خوارزم شاہ معاصر ہیں ہیں قطب الدین خوارزم شاہ (سنہ ۴۹۱ و سنہ ۵۲۱ ہجری) خوارزم شاہیوں کا دوسرا سلطان ہے اور جس پادشاہ کے حکم سے شیخ مجد الدین ہلاک ہوئے، وہ علاء الدین محمد خوارزم شاہ (سنہ ۵۹۶ ہجری و سنہ ۶۱۷ ہجری) ہے۔

قولہ "فقرا کا ایک تذکرہ لکھا ہے، جو تذکرۃ الاولیا کے نام سے مشہور ہے اور حال میں مسٹر براؤن نے اس کو شائع کیا ہے۔ عبدالوہاب

مستوجب حد گردد و عار جہاں — بر حد ز دلش ترک رہا چیں آرد

(از دیوان قلمی)

دیگر

کافر رہ خطا شماری ماند — در راہ حقیقی نہ مجاری ماند
یا آنکہ مرا ریش شہید انہ سود — یا خود ز خطا کافر عاری ماند

اُن کا خاندان نہایت مذہبی تھا اور مذہبی ماحول میں ان کی تربیت اور نشو و نما ہوئی۔ شیخ کے والد کا بڑی عمر میں انتقال ہوتا ہے۔ اسرار نامہ میں ان کی وفات کا ذکر آتا ہے۔

بپرسیدم در آمدم از پدر من — کہ چونی؟ گفت چونم اے پسر من
ز حیرت پائے از سر می ندانم — دلم گم گشت دیگر می ندانم
نگردد ایں کمان کار دیدہ — ساروے چوں بپیرے کشیدہ
چنیں عالم کہ دریا میزند جوش — ز چونم قطرۂ بر ناورد جوش
بدو گفتم کہ چیزے گوے آخر — کہ سرگرداں شدم چوں گوئے آخر
جوابم داد کاے واسدہ فرزند — بفضل حق بہر ساے بہرمند
ز غفلت خود بخائیدم ہمہ عمر — چہ گویم تا تو خائیدم ہمہ عمر
بآخر دم چنیں گفت آں نکوکار — کہ یارب مر محمدؐ را نگہ دار
پدر ایں گفت و مادر گفت آمیں — دراں پیں رو جدا شد جان شیریں
خدایا گفت ایں ہر دو گرامی — بفضلت بہر بر نہ برسامی
اگرچہ گردنم زیر گنا ہست — دعاے ایں دو پیرم عذر خواہست
بہ میں یارب دو پیر ناتواں را — بدیشاں بخش حال ایں جواں را

والدہ سے بے حد محبت کرتے تھے، جو زہد و اتقا میں لاثانی تھیں۔

وطن نیشاپور ہے کیونکہ اس کا معاصر محمد عوفی اس کو نیشاپوری بیان کرتا ہے۔ خود عطار نے اپنے وطن کا ذکر نہیں کیا جس شعر میں نیشاپور کا ذکر کیا ہے اس سے اس کی وطنی خصوصیت واضح نہیں ہوتی:-

بود محبوسے بہ نیشاپور در   روز ندیدم در جہاں رنجور تر

تاریخ ولادت ۵۱۳ھ ہجری بتائی جاتی ہے لیکن یہ قرین قیاس نہیں، کیونکہ اُس کے ہاں ایسے بزرگ جو اُس کے قریب العہد ہیں، ایسے ہیں جو سنجر متوفی ۵۵۲ھ کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا ذکر شیخ عطار بصیغۂ ماضی بیان کرتے ہیں مثلاً سلطان سنجر، ہستی ندیمۂ سنجر، عباسہ ایک ماجدا خاتون جن کا سلطان سنجر معتقد ہے۔ خواجہ رکن الدین اکاف اور احمد غزالی۔ سب سے حیرت خیز امر یہ ہے کہ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں اپنے کسی معاصر کا ذکر نہیں کرتے۔ البتہ مظہر العجائب میں شیخ مجدالدین اور شیخ نجم الدین کبریٰ کا ذکر آتا ہے، لیکن میں اس تصنیف کو شیخ عطار کی تسلیم نہیں کرتا۔ البتہ اس کی شاعری کا زمانہ معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس دو ذرائع ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ منطق الطیر کے بعض نسخوں میں اس کی تاریخ تصنیف ۵۸۳ھ ملتی ہے، چنانچہ -

روز سہ شنبہ بوقت استوا   بیستم روز سے بُد از ماہ خدا

پانصد و ہفتاد و سہ بگذشتہ سال   ہم ز تاریخ رسول ذوالجلال

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عطار اس سن میں تصنیف و تالیف میں مشغول ہیں۔ دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ خروج مغول کے متعلق اُن کے ہاں ایک دو حوالے ملتے ہیں مثلاً -

ہر کو بخلاف نیست بر دین آرد   در وقت زکوٰۃ بر چین چین آرد

ہر دکان کسے پرّد پریدیم | ہر کم کاں کسے پوید دویدیم
گہے با رند در میخانہ بودیم | گہے از رخ بر در میخانہ سودیم
گہے زنار ترسایاں ببستیم | گہے در دیر ترسایاں نشستیم
گہے با کافراں در جنگ بودیم | گہے با آتش اندر سنگ بودیم
گہے سجّادہ بر دوش آوریدیم | گہے در بحر دل جوش آوریدیم
گہے سر بر سرِ زانو نہادیم | گہے در پاؤ ہو اندر فتادیم

ان کی طبیعت میں انتہائی مسکنت اور کسرِ نفسی جاگزیں تھی۔ ایک دن ایک دوست نے اُن سے بیان کیا کہ فلاں شخص بطریقِ حلال روزی کماتا ہے یعنی یہودیوں سے جزیہ وصول کرکے اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اس سے اچھی کمائی اور کیا ہوسکتی ہے۔ شیخ نے فرمایا کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا، صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں سگِ دوجہاں ہوں، اگر سو یہودی بھی مجھ سے جزیہ لیں تو کم ہے" —

رفیقے گفت با من کاں فلانے | حلالے می خورد قوت جہانے
کہ جزیہ از یہوداں می ستاند | دراں جا می خورد بہ زیں کہ داند؟
بدو گفتم کہ من آں می ندانم | من آں دانم کہ از سگ جہانم
کہ باید صد جہودِ بس پریشاں | کہ تا خواہند از من جزیہ ایشاں

(کلیاتِ عطار۔ الٰہی نامہ صفحہ ۸۷۸۔ نول کشور)

ان کا پیشہ طب تھا اور ساتھ ہی دار دوا خانہ کھول رکھا تھا اور مطب بڑی رونق پر تھا۔ ایک حکایت میں کہتے ہیں:- "ہمارے شہر میں ایک مالدار بخیل بیمار تھا، جس کے پاس پچاس ہزار دینار نقد موجود تھے۔ مجھے اُس کے علاج کے لیے ایک آدمی لینے آیا۔ میں نے جا کر دیکھا کہ جس

انھوں نے بھی درازعمر پائی اور اٹھائیس برس تک بے چادر اور بے موزہ رہیں اور ترک دُنیا کرکے، گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر، دن رات عبادت الٰہی میں مصروف رہیں۔ خسرو نامہ میں اُن کے مرثیے میں فرماتے ہیں:۔

مرا گر بود اُستے در زمانہ   بمادر بود او رفت از میانہ
اگرچہ رابعہ چندیں نبود   ولیک ایں تا بہ آں تیر بر بود
سود او زن کہ مرد معنوی بود   سحرگاہاں دعائے او قوی بود
بسال بست و ہشت اکنوں بہ یادت   کہ بے چادر نہ موزہ بود عادت
ز دنیا فارغ و دولت گزیدہ   گرفتہ گوشۂ و عزلت گزیدہ
چناں پُشتم قوی داشت آں ضعیفہ   کہ ملک شرع را دوئے خلیفہ
اگرچہ عنکبوتے ناتواں بود   ولیکن بر سرم پہلواں بود
نہ چنداں ست بر جانم غم او   کہ بتواں کرد ہرگز ماتم او
چو محرم نیست ایں غم با کہ گویم؟   مرا او بود محرم تا چہ گویم
اگر بر سم ماہ یا او بگویم   ہمے کز مرگ او آمد بر ویم

(خسرو نامہ مطبع ثمر ہند صفحہ ٦٠٢)

خسرو نامہ انھوں نے ساٹھ سال کی عمر کے کئی سال بعد لکھا ہے اس عمر میں بھی وہ والدہ کو اِس طرح یاد کرتے ہیں جیسے کوئی بچہ کر رہا ہو، لیکن یہ سب اسی مذہبی تعلیم کا نتیجہ ہے جس کی فضا میں عطار نے پرورش پائی تھی۔

عطار اس قدر گم نام رہنا چاہتے ہیں کہ باوجود تصنیفات کثیرہ اپنے ذاتی حالات بہت کم دیے ہیں۔ اسرار نامہ میں اپنی زندگی کے بعض پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے غزا میں شریک ہونے کا اتفاقیہ ذکر کر دیا ہے۔

(۴) چوں بهفتاد سیدی وایں نیست عجب
عجب اینست که ایں نفس تو هردم تراست (دیوان قلمی)

) مرگ درآورد پیش وادی صد ساله راه   عمر تو انگشت ست در سر هفتاد داد
(دیوان قلمی)

۶) گر وصل ست باید اے پیر نود ساله   هم خرقه سوزانی، هم قبله گردانی
(دیوان قلمی)

تمام عمر گوشۂ قناعت میں بسر کردی اور آستانۂ ملوک سے کوئی سروکار نہیں رکھا ۔

چه خواهم کرد طول و عرض دنیا   کنون دی سما وارض دنیا
مرا ملکے که من دارم بسنده است   دگر در بایدم چیزے بسنده است
چو در ملک قناعت پادشاهم   توانم کرد دائم هرچه خواهم
(کلیات الٰہی نامہ صفحہ ٩٣٣)

دوسرے موقعے پر فرماتے ہیں ۔—

شکر ایزد را که ادباری نیم   بستهٔ هر ناسزاواری نیم
من زکس بر دل گرانے ننهم   نام هر دونے خداوندے نهم
نے طعامے ہیچ ظالم خوردہ ام   نے کتابے را تخلص کردہ ام
(منطق الطیر کلیات صفحہ ١١٦٢ ۔ نول کشور)

ایک اور مقام پر فرمایا ہے —

نے ز ہمت میل ممدوحے مرا   نے ز طلعت خلوت روحے مرا
نے ہوائے لقمۂ سلطاں مرا   نے قفائے سیلیٔ درباں مرا
(منطق الطیر۔ کلیات ۔ صفحہ ١١٦٣)

کا پیر فرتوت ہے جو بوجہ مرض بالکل گھُل چکا ہے اور موت کے گھ
اس کے پہلو میں ایک سربمہر عرق گلاب کا شیشہ رکھا ہوا تھا
سے کہا کہ شیشہ کھول کر تھوڑا سا گلاب مریض پر چھڑک دو۔
نیم غشی کی حالت میں تھا، فوراً آنکھ کھول دی اور کہنے لگا
مہ چھڑکنا! میں اس کے صرف کیے جانے کے مقابلے میں ایسا
ہوں۔ بوڑھا بخیل یہ الفاظ ختم کرنے بھی نہ پایا تھا کہ اُس کا دم نکل
حکایت کا ابتدائی شعر ہے :۔

لئیم ما بخیلے گشت بیمار کہ نقدش بود بیحد مدا

(اسرار نامہ صفحہ ۱۷۷ طبع طہران

تصنیفات میں ساٹھ برس کی عمر سے لے کر نوّے سال تک
اشارے ملتے ہیں ۔

(۱) سی سال بصد ہزار تگ دو دیدیم تا از رہ فو در گہت
سی سال دگر گرد درت گردیدیم چو یک رہِ بام و

(کلیات۔ مختار نا

(۲) اگر من لیست را سا رم کمالے چو سالم شصت شد سود
مرا در شست افتادہ است ہفتاد چنیں صیدے کرا در د
رشست کماں پیرے نبود راست رشصت من کماں کو ر
ازاں شست کماں قوت نبودش ازیں شصت کماں دل می

(اسرار نا

(۳) تو غافلی و ہفتاد لیشت تو چو کماں
تو حرص خمسہ و عمرت چو تیر رفتہ زشست (دیوا

سال تو چار است بوقت شمار — چار تو چل باد و چلت باد چار
نام تو شد یوسف مصر وفا — باد لقب دولت دیں را ضیا
من کنم از جامۂ حکمت نگار — بہر تو ایں مایۂ حکمت نگار
گرچہ ترا نیست کنوں فہم تند — چوں بحد فہم رسی کار بندا

فرماتے ہیں، جب تک تمھارے منہ پر خط نہ نکل آئے گھر سے باہر قدم مت دھرنا۔

تا نشود برقع رخسارے تو موے — پا منہ از خانہ ببازار و کوے
سلسلہ شد قدم خویش باش — جنس نشیں حرم خویش باش
ہیچ گہ از صحبت ہم خانگاں — رخت مکش بر در بیگانگاں

تعلیم اور مکتب نشینی کے سلسلے میں جو نصیحتیں کی ہیں، ان کے ضمن میں کہا ہے کہ اُستاد کی مار کھانا اگرچہ سعادت ہے، لیکن تم کوشش کرو کہ اس سعادت سے محروم رہو۔

سیلئ او گرچہ فضیلت دہ است — گر تو بسیلی نرسانی نہ است

قرآن پاک بچپن ہی میں حفظ کر لیا کیونکہ بچپنے میں جو چیز یاد ہو جاتی ہے انسان بڑا ہو کر نہیں بھولتا۔

حرف نوشتہ بدل طفل خورد — گر لک نسیاں نتواند سترد

خط پاکیزہ لکھنے کی کوشش کر اور شعر گوئی اگرچہ ایک قسم کا کمال ہے لیکن اس میں عیب بھی ہیں۔ گاہے ماہے لکھو تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن میری طرح اس کو اپنا پیشہ نہ بنا لینا

ورچہ شد گہ گہے اندیشہ اش
کوش کہ چوں من نکنی پیشہ اش

دربارداری کے سلسلے میں اس قدر کہا جاسکتا ہے کہ کسی بادشاہ کی مدحت میں عید کی مبارک باد کا ایک قصیدہ لکھ کر لے گئے ہیں۔ اس کا نام کہیں ظاہر نہیں کرتے، لیکن وہ بادشاہ بھی اُنھیں کے ڈھب کا معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے تیس ماہ برابر روزے رکھے ہیں اور شیخ مبارک باد میں قصیدہ لکھتے ہیں اور ردیف بھی روزہ لاتے ہیں۔ مدح نگاری چونکہ اُن کو راس نہیں ہے اس لیے اِس قصیدے میں ایسے ہنر خام پیدا کیے ہیں کہ قصیدے کا جوہر شناس اُن کو دیکھ کر دنگ رہ جائے گا۔ گریز کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

خدایگان فلک قدر آنکہ ہر رمضان — زجوان او بکشاد است قرص مہر روزہ
سہ ماہ روزہ چو او داشت بر روزہ او — مدام در دو جہاں گشت نامور روزہ
زبہرہ روزۂ شہ بہ سپہر جست ساعت — کہ بوکہ نہ بکشاید بدین قدر روزہ

دعا کے وقت کہا ہے :۔

خدایگانا شعر لطیف را عطار — ردیف کرد بمدح تو سر بسر روزہ
بسم کہ ختم سخن بر منش زہرہ کر است — کہ صد سخن بکشاید بدیہہ بر روزہ
ہمیشہ تا شب و روز است عید و روزہ باد — ہزار عیدت و عیدیت باد ہر روزہ

(دیوان قلمی)

بلبل نامہ عطار کی تصنیف مانا جاتا ہے، جو بحر ہزج، مسدس، محذوف میں ہے۔ اس کے حاشیے پر بحر منسرح میں مثنوی کے کچھ اشعار ملتے ہیں۔ جس میں شاعر اپنے فرزند ضیاء الدین یوسف کو پند دیتا نظر آتا ہے۔

اے شب امید مرا ماہ تو — دیدۂ بختم بجمالت گرد
اربیں سی روز بر آید ہلال — روے نمودی تو بسال شصت سال

بے تعصب گرد و بے تقلید شو — ترک سود و عرفت توحید شو

چوں صحابہ یک بیک آزادہ اند — در ہدایت چوں نجوم افتادہ اند

گر کسے در یک تن آں قوم پاک — کرد طعنے بر ستارہ ریخت خاک

(مصیبت نامہ قلمی)

اور حضرت ابوبکرؓ کے حق میں لکھتے ہیں ۔

از صحابہ سی ہزار و سہ ہزار — از میاں حالش کردند اختیار

او کجا در بند آب و جاہ بود — کآب و جاہ او ہمہ اللہ بود

آں کہ از عرش و فلک فارغ بود — شک نباشد کز فدک فارغ بود

(مصیبت نامہ قلمی)

منطق الطیر میں پھر یہی استدلال پیش کیا گیا ہے ۔

اے گرفتار تعصب آمدہ — دائما بُغض و پُرحسد آمدہ

گر تو لاف از عقل و از لب میزنی — پس چرا دم از تعصب می زنی

در خلافت میل نیست اے بے خبر — میل کے آید ز بوبکرؓ و عمرؓ

میل اگر بودے درآں دو مقتدا — ہر دو کردندے پسر را پیشوا

بہتریں چوں ہر دو تو دانستہ تر — کی تواں گفتن ترا صاحب نظر

کے روا داری کہ اصحاب رسول — مرد ناحق را کنند از جاں قبول

یا نشاندستند بجائے مصطفیؐ — از صحابہؓ نیست ایں باطل روا

اختیار جملہ شاں گر نیست راست — اختیار جمع قرآں پس خطاست

بلکہ ہر چہ اصحاب پیغمبر کنند — حق کنند و لائق و در خور کنند

گر کسی معزول یک تن راز کار — می کنی تکذیب سی و سہ ہزار

خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ کے بارے میں کہتے ہیں ۔

مختلف ملل ناموں کے خاتمے میں اشعار[۵] بالا سرسری نظر سے گزرے ہیں تاہم مجھ کو یقین نہیں آتا کہ یہ عطار کے قلم سے نکلے ہوں۔

مذہباً سنت جماعت میں اور ظن غالب ہے کہ حنفی ہیں قریب قریب اپنی ہر تصنیف میں اصحاب اربعہؓ کی مدح میں قلم اٹھایا ہے۔ قاضی نور اللہ شوستری اور میرزا محمدؒ بن عبدالوہاب قزوینی ان کو شیعہ تسلیم کرتے ہیں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ان بزرگوں کا یہ عقیدہ محض ایسی تالیفات پر مبنی ہے جو بعد میں شیخ عطار کی طرف منسوب کردی گئی ہیں۔ ورنہ عطار نے ایک سے زیادہ موقعے پر اصحاب ثلاثہ کے مخالفوں کو تشنیع کی ہے۔ اُن کے نزدیک چاروں صحابہ کا رُتبہ برابر ہے ۔

دوئی مانند کجا در چار راہے خام — یکے بینی در آغاز و در انجام
گر این ہر چار را با ہم نداری — تو یک عالم نہ دو عالم نداری

(خسرو نامہ صفحہ ۴۱ و ۴۲، طبع مشہد)

مصیبت نامے میں تعصب کرنے والوں کو خطاب کرکے فرماتے ہیں ۔

اے تعصب مند بدعت کردہ بند — چند گوئی چند از ہفتاد و اند
در سلامت ہست صد فرقت ز تو — لیک ہفتاد و دو در علت ز تو
ہست کیش و راہ ملت بے شمار — تا تو بشماری بسالی روزگار
گر تو ہستی پس رو صدیق را — یا علی آں عالم تحقیق را

---

۵ نظر ثانی کرتے وقت معلوم ہوا کہ ملل نامہ کے اشعار مذکورۂ بالا مولانا جامی کے قلم سے نکلے ہیں اور ان کی مثنوی تحفۃ الاحرار (مقالہ ہفتم در سود اول فرزند ارجمند) میں موجود ہیں۔ ضیاء الدین یوسف جامی کے فرزند کا نام ہے انہی کے نام پر نصاب ضیائی مولانا جامی نے تصنیف کیا ہے۔

چو برخیزی عصمی حمیرائے — که روشن روست چون فردوس باغے
عجم را اول جهود و گبر بودند — از و گوئے مسلمانی ربودند
کسے کافتادش ایمان از عمرؓ یافت — ز مهر او چرا امروز سر تافت

(خسرونامہ قلمی)

کلام پر تبصرہ

سادگی اور سلاست شیخ عطار کے کلام کا سب سے نمایاں وصف ہے، ان کا اصلی مقصد شاعری نہیں ہے، بلکہ شعر کو اپنے خیالات وجذبات و واردات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ محاسنِ شاعری کا کہیں نام کو بھی سراغ نہیں۔ سیدھی سادی زبان میں جو کچھ کہنا ہوتا ہے کہہ گزرتے ہیں تصنع اور آورد کا سایہ تک نظر نہیں آتا۔ الفاظ کی تلاش یا ان کے انتخاب کی ضرورت انہیں کبھی محسوس نہیں ہوتی اور مضامین ہیں کہ بادل کی طرح اُمڈے چلے آتے ہیں۔ لکھنے سے نہ اُن کا قلم تھکتا اور نہ دماغ خستگی محسوس کرتا ہے عطار پرگوئی کے لیے مشہور ہیں اور خود انہیں اس کا اعتراف ہے، بلکہ شکایت ہے کہ میں ایک مضمون کی خواہش کرتا ہوں اور ایک کے بجائے دس آجاتے ہیں

چنانم قوت طبع است در فکر — که یک معنی بخواهم صد دهد دیگر
در اندیشه چنان مست و خرابم — که دیگر می نیاید هیچ خوابم
نیابم خواب شب بسیار واندک — ازین پهلو همی گردم بدان یک
همی رانم معانی را ز خاطر — که یک دم خواب یابم تو که آخر
یکی را گر برانم ده برآید — هزارا گر برانم نه سر آید

در عمرؓ گر میل بودے ذرۂ | کی پسر کشتے برحم درہ
گر خلافت برخطا می داشت او | ہفدہ من دلہے چرا می داشت او
چون بجامہ دست دادش نے گلیم | بر مرقع دوختہ پارہ ادیم
آنکہ ریباں شاہیے حیلے کند | کی رواداری کہ او میلے کند
آنکہ گاہے خشت وگاہے گل کشد | این ہمہ سختی نہ بر باطل کشد
گر خلافت بر ہوا می راندے | خویشتن بر سلطنت بنشاندے
شہر ہاے منکراں ہنگام او | شد تہی از کفر در ایام او
گر تعصب می کنی از مہر آں | نیست انصافت بسیر از قہر آں

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق گویا ہیں -

چند گوئی مرتضیٰ مظلوم بود | از خلافت راندن محروم بود
چون علیؓ شیر حق است و تاج سر | ظلم نتواں کرد بر شیر اے پسر
مرتضیٰ ناسے مکن از خود قیاس | زاں کہ در حق غرق بود آں حق شناس
گر چہ تو بُز کیسہ بودے مرتضیٰ | جنگ جستے پیش حسبے مصطفیٰ
او نہ تو مردانہ تر آمد بسے | پس چرا جنگے نکرد او با کسے
گر نہ حق بود صدیقؓ اے عجب | او چو بر حق بود حق کردے طلب
پیش حیدر چیل امیر المومنین | چون نہ بر سوال دین جستد کین
لاجرم چون دید حیداں جنگ و شور | دفع کرد آں قوم را حیدر بزور
آں کہ با دختر تو اند جنگ کرد | داند او سوئے پدر آہنگ کرد
اے پسر تو بے نشانی از علیؓ | عیں ولام و یا ندانی از علیؓ

حضرت عمرؓ کے حق میں کہتے ہیں -

اگر بہ دل بہ عار و وقت عار نیست | ترا در راہ دیں آشفتہ کار نیست

مقبول بنانے والے فریدالدین عطّار ہیں۔ غزل میں عشق کی چاشنی کا رنگ عطار سے پیشتر موجود تھا۔ مگر جوشش و سرمستی، محویت و استغراق عطار سے قبل نامعلوم کیفیت تھی سنائی تصوف کے کوچے میں آنے کے باوجود بھی راہ خشک رہے، ان کے ہاں شریعت پہلے ہے اور طریقت بعد میں مثلاً فرماتے ہیں —

در راہ دیں تواں آمد صحرائے بیار آمے   یعنی کی رسد مردم گر رہا کردہ براسما

دیگر

چو حال اردیں قوی کردی تن ار خدمت مرتن کن
کہ اسپ عاری آں بہتر کہ بار گستواں بیسی

دیگر

دولت دیں لی و برحال نقش حکمت دو حش
نوح و کشتی لی و در دل عشق طوفاں داشتن

لیکن عطّار رہدیت سے گزر کر، عشق و محویت اور فنا کی منازل میں مقیم ہیں۔ چنانچہ

گر سر عشق خواہی ار کفر و دیں گزر کن
کانجا کہ عشق آمد چہ جائے کفر و دیں است

دیگر

لب دریا ہمہ کفر است و دریا جملہ دیں داری
ولیکن گوہر دریا ورائے ایں و آں باشد

دیگر —

ز کفر و دیں و ز نیک و ز بد ز علم و عمل
برون گزر کہ برون زیں ہمہ مقامات است

زاں معنی کہ دارم در ضمیرم   خدا داند کہ در گفتن اسیرم

(اسرار نامہ۔ صفحہ ۴ — ۱۹۵ طبع طہران)

بزرگوئی کے باوجود اعلیٰ درجے کی پختگی موجود ہے۔ گھلاوٹ اور تاثیر غالب ہے۔ تمام کلام صاف اور ہموار ہے اور حشو و زوائد سے پاک خیالات متین اور سنجیدہ ہیں جن میں خلوص اور پاک اعتقادی کی لہر شروع سے آخر تک دوڑ رہی ہے۔ انھیں اوصاف نے انھیں ایران کے مشاہیر اور اعلیٰ اساتذہ کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ اُن کے اپنے زمانے میں ایک بڑی جماعت ان کی شیدائی اور معتقد تھی۔ اپنے ایک دوست کا ذکر کرتے ہیں جس کی فرمائش پر انھوں نے خسرو نامہ تصنیف کیا ہے کہ اس کو ان کا پورا مختار نامہ، سو قصیدے، ایک ہزار غزلیں اور قطعات یاد تھے۔ اس ایک بیان سے ان ایام میں عطار کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قدما کے مقابلے میں انھوں نے غزل کو بے حد ترقی دی ہے۔ جو غزل صاف نکل آتی ہے وہ سعدی کی غزل کے ہم پلّہ ہے۔ غزل میں ھوں نے رندی اور مستی کے مضامین روشناس کر دیے ہیں۔ خمریات ں خیّام کا سا رنگ ہے، لیکن اُس کے ہاں شراب محض ہے اور ان کے ل شراب معرفت ہے۔ اس میدان میں وہ صوفیا کے ہی عمر مرسل شمار دلے چاہییں۔ حقیقت کو مجاز کی زبان میں بیان کرنے کی بنیاد حکیم سائیؔ ڈالتے ہیں لیکن یہ عطار ہیں جو اس بنیاد پر عالی شان عمارت ار کرتے ہیں۔ مے و جام، پیمانہ و مے خانہ، رند و خرابات، زنار و بت، ترسا لمستہ جو فارسی غزل گویوں کے دستمایۂ ناز ہیں۔ اصل میں ان کے

واردات عشق

ترسا بچہ ام افگند از زہد برسوائی — اکنوں من و زنارے در دیر بتنہائی

شیخ رہ دیں بودم، در پایۂ یقیں بودم — سجادہ نشیں بودم، سر دفتر دانائی

امروز اگر ہستم دُردی کش سرمستم — در بتکدہ بنشستم دیں دادہ بترسائی

نہ محرم ایمانم، نہ کافر ہمی دانم — نہ اینم و نہ آنم، درماندہ رسوائی

دوش از غم کفر و دیں یعنی کہ نہ آں و ایں — بنشستہ بُدم غمگیں شوریدہ و سودائی

ناگہ ز دروں جاں در داد ندا جاناں — کاے عاشق سرگرداں تا چند ز شیدائی

رو بے دوا گر از ما ماندی تو چنیں تنہا — باز آکہ سوے دریا چوں گوہر دریائی

ہرچند کہ بے دردی، گر محرم ما گردی — حالی شو اگر مردی، تا محرم ما آئی

عطار چہ دانی تو، ویں قصہ چہ خوانی تو — گر ہیچ سمائی تو ایں جا شوی آں جائی

دیگر

دوش آمد آں صنم آفتاب روے — سرمست گشت ہمچو مہ اندر میاں کوے

گفتم "مگر عزیمت شکار کردۂ" — گفتا "بلے تو تیر بیا ماکے بگوے"

چوں ساعتے برآمدہ من نیز در شدم — او در دروں حلق رنداں گمشت و گوے

دیدم بناز تکیہ زدہ برکنار حوض — ہمچوں گلے کہ بو زدہ برکنار جوے

می کرد آب پاش ز اندام او خجل — می برد شراب از لب او رنگ سبوے

گیسوے مشکبوے سیہ در شکستہ بود — موے میانش گم شدہ اندر میاں موے

چوں دید کاب دیدۂ من گرم می رود — شستے گلم مداد کرد مت از دولت اوے

دست از دلم بشستم و آں گاہ گفتمش

کاے جاں مارہیں از دل عطار را بگوے

اسی غزل کے باقی اشعار بھی ملاحظہ ہوں، خصوصاً مطلع جو بالکل حافظ کے رنگ میں ہے:-

بیا کہ قبلۂ ما گوشۂ خرابات است
بیار بادہ کہ عاشق نہ مرد طامات است

مگو ز خرقہ و تسبیح زانکہ این دل مست
میان بستہ بزنار در خرابات است

چہ داند آنکہ نداند کہ چیست لذت عشق
ازان کہ لذت عاشق ورای لذات است

مقام عاشق و معشوق از دو کون بروست
کہ حلقۂ در عشاق تا سماوات است

بنوش دُرد و صفا شو اگر بقا خواہی
کہ زاد راہ فنا دُردی خرابات است

بکوے نیستی فرد شو چنانکہ برہائی
کہ گرد دائرۂ نیستی ہمیں اثبات است

ز ہر دو کون فنا شو درین رہ اے عطار
کہ فانی رہ عشاق باقی الذات است

الغرض عشق و سرمستی اور فنائیت کا حد سے عالم ہے۔ یہ اشعار بھی پیش نظر رہیں

گم شدم در خودی دائم کجا پیدا شدم — شبنمی بودم ز دریا غرقہ در دریا شدم
سایۂ بودم ز اول بر زمین افتادہ خوار — راست کان خورشید پیدا گشت ناپیدا شدم

دنیا میں آکر بستر غفلت اور محو خواب ہو گیا ہی حالانکہ اس کا بار گراں ہی، اس کی منزل دراز ہی اور موت اُس کی گھات میں ہی۔ کہتے ہیں انسان کا دیباچہ وصمت حیات خون و خاک ہیں۔ وہ خون جو رحم مادر میں قرار پکڑتا ہی اور وہ خاک جو بعد حیات اس کو جگہ دیتی ہی۔ انسان اگر دیدۂ غور سے اس پر نگاہ ڈالے تو مشرق سے مغرب تک اس کو نظر آئے گا کہ چپّہ چپّہ مقام پر اس کے ایسے جنس محوِ خواب عدم ہیں ۔

کز شرق تا بہ غرب سراپاے خفتہ اند   خرد و بزرگ و پیر و جوان شہ و گدا

دیگر ۔ زیر خاک از حدِّ مشرق تا بہ مغرب خفتہ اند

سفلہ و آزاد و شہری و غریب و شیخ و شاب

زمانہ ماہ نو کی داس (درانتی) بناتا ہی اور اس داس سے اس بے بس گھاس یعنے انسان کو کاٹتا اور چھانٹتا رہتا ہی ۔

چو داس ماہ نو از مہر آں ہمی آید   کہ تا بجو ستم بر خلق می زند رقما

گیا ہمی دمد از خاک گور و غم اینست   کہ نیست ہیچ غمے داس را ز رنج گیا

فردوسی بھی خیال ان الفاظ میں ادا کرتا ہی ۔

بیابان و آں مرد با تیز داس   گیاہ تر و خشک از و در ہراس

تر و خشک را او ہمی بدرود   وگر لابہ سازی ہمی نشنود

دروگر زمانست و ماچوں گیا   ہمانش نبیرہ ہمانش نیا

ایّام حیات میں جو لوگ گلاب کی طرح شگفتہ تھے اب ان کی خاک پر ابر گلاب برساتا ہی، سنبل کی طرح جن کی زلفیں تابدار تھیں خاک نے ریک لے، نہ وہ عارض چھوڑے اور نہ وہ زلفیں۔ اس خاک پر اتراتے نہ چلو کیوں کہ تمھارا راستہ حسینوں کی آنکھوں پر سے گزرتا ہی لالہ میں جو یہ سُرخی

وحدت وجود۔ ان سے پہلے فارسی نظم میں اس کا بہت کم سا چلتا ہو۔

(مستزاد) :-

نقد قدم از مخزن اسرار برآمد چون گنج عیاں شد
خود بود کہ خود بر سر بازار برآمد بر خود نگراں شد
در کسوت ابریشم و پشم آمد و پنبہ تا حلق پیوستہ
خود بر صفت حبہ و دستار برآمد بس ہمگاں شد
در موسم نیساں رسما شد سوے دریا در کسوت قطرہ
در بحر بشکل دُر شہوار بر آمد در گوشِ بتاں شد
در عین بتاں خواست کہ خود را بپرستد خود را بپرستید
خود گشت بت و خود بپرستار برآمد خود عین بتاں شد
خود بر سر خود تیغ جفا رد بسر قہر خود مرہم خود جست
خود بر صفت خستہ بیمار برآمد خود فاتحہ خواں شد
خود رم شد و مے خورد و ساغر شد و ساقی خود پیر خرابات
خود مے شد و خود از خم خمار برآمد خود کوزہ کشاں شد
اشعار معیدار اگر چشم سرت ہست را ریست بہفتہ
آنچہ نزبان از دل عطار برآمد ایں بود کہ آں شد

قصائد اکثر برباد ہوگئے، اب جو ملتے ہیں تیس چالیس سے زیادہ نہیں ان میں دنیا کی بے ثباتی اور انسانی زندگی کی ناپائداری کی تمام دلائل لاکر ہم کو روحانیت کی طرف دعو کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ہم سب فانی ہیں اور دورانِ حیات میں عاجز و ناتواں۔ افلاک و ایام کی آغوش میں بسنے والا انسان جو تقدیر کی زنجیروں میں سخت جکڑا ہوا ہو

وقت یہی رنگ اختیار کیا ہے مثلاً

یک شربت آب خوش نتواں خورد درجہاں
کیں کوزہ را ز خاک تن دوستاں ماست

(بیاض سیدہ علی خاں)

قصہ مختصر، اس قسم کا استدلال ہے جو عطار ہم کو دنیا سے دل گیر اور اُداس بنانے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ یہ خیالات اگرچہ جدید نہیں کیوں کہ اُن کو قریب قریب ہر ایرانی شاعر کے ہاں دیکھا جاتا ہے لیکن ان کے ہاں یہ خیالات محض اتفاقیہ ہیں اور کوئی مقصد و غایت نہیں رکھتے مگر عطار کے ہاں وہ ان کے فلسفۂ تصوف کی مبادیات میں داخل ہیں سالک کو دنیا کی طرف سے برداشتہ خاطر کرنے کے بعد وہ حقیقت کی دعوت دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے دل کی صفائی اور طہارت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، یہ بات اشک گرم اور آہ سرد سے حاصل ہوگی یعنے شب زندہ داری اور نالہ و زاری سے۔

بادہاں خشک و چشم تر قناعت کن ازانک
ہر کہ قانع شد بخشک و تر شہ بحر و براست

دیگر۔

باشک گرم و دم سرد جود کن چو بے حشک
کہ معتدل تر ازیں نیست ہیچ آب و ہوا

عطار نے انسانی زندگی کی بے اعتباری اور بے حقیقتی پر نادر مضامین نکالے ہیں، فرماتے ہیں —

قطرۂ بیش نہ چند ز خود اندیشی   قطرۂ نیست اگر گم شد اگر دریا شد

دیکھتے ہو یہ تمھارے عزیزوں ہی کا خون ہے جو خاک پر بہایا گیا۔ اس موقع پر عطار بالکل خیام کی بولی بولنے لگتے ہیں ۔

وان کہ رویش ہمچو گل شگفتہ بودے این زمان
از می دیرد برارد زیر سر خاکش گلاب
وان کہ زلفش ہمچو سنبل تاب در سر داشتے
خاک تاریکش بہ سر گرانست بے زلف بہ تاب

دیگر

حملۂ زیر زمین گر بحقیقت نگری — شکل طرۂ مشکین دل بیوں شکراست
چشم دل باز کن از مردمی نیک بدان — مردم چشم بتانست کہ تا رہگذر است

دیگر

از غبار خاک رہ مشتاں سر دست لے عزیز
زاں کہ آں فرق عزیزاں بدکہ ایں جا شد غبار
خون دلہاے عزیزاں ست در گل ریختہ
آں ہمہ سرخی کہ می بینی بروے لالہ زار
حملۂ زیر زمین در خاک برہم ریختست
زلفہاے تابدار و لعلہاے آبدار

دیگر

صبح در صحن آمد بہ بیش من آں جم — کہ بودہ ام تن مردے ز مردمان کبار
ہزار بار جم و گودرز کردہ اند مرا — ہنوز تلخ مزاجم ز مرگ شیریں کار
(دیوان قلمی)

* خیام کا یہ انداز عطار کو بے حد پسند ہے۔ غزلیات میں بھی بعض

تا کہ ببستہ باغ را صد دیبہ فوطہ پوش کرد | از پئے رہبری او طرۂ یاسمن نگر
خیز و بیا و وقت گل بادہ بدہ کہ عمر شد | چند غم جہاں خوری شادی این و آن نگر
تا گل پادشاہ وش تخت نہاد در چمن | لشکریان باغ را خیمہ بہ بستن نگر

پادشاہ اور لشکریان باغ سے یکایک منہ موڑ کر پھر وہی قدیمی سرود فنا چھیڑ دیا ہے —

اے دل خستہ عمر شد تجربہ گیر از جہاں | زندگیٔ بدست کن مردن مردوں نگر
از سر خاک دوستاں موج دریغ می زند | ہر گرہ در خاکشاں حسرت تن بہ تن نگر
فکر کن و بچشم دل حال گزشتگاں ببیں | ریختہ زیر خاکہا طرۂ پر شکن نگر
از سر خاک دوستاں سبزہ دمیدہ چوں گیا | ماتم خویشتن بگیر مردن خویشتن نگر

غزلیات و قصائد کے مقابلے میں ان کی رباعیات کا درجہ بلند ہے، تمام مختار نامہ سرتاسر رباعی ہے، جس میں پانچ ہزار رباعیاں ہیں۔ اصل میں چھ ہزار تھیں لیکن ایک ہزار خود مصنف نے کمزور سمجھ کر نکال دیں۔ ان کے علاوہ چار سو کے قریب اور رباعیاں دیوان میں شامل ہیں۔ مختار نامہ کلیات کے ساتھ نول کشور کے ہاں چھپ گیا ہے۔

کامل بننے کی تلقین —

گر خاص نۂ تو عام می باید بود | ور پختہ نۂ تو خام می باید بود
در کفر نۂ تمام و در ایمان ہم | در ہر چہ دری تمام می باید بود

یہی خیال مثنوی میں یوں ادا ہوا ہے کہ ایک ترسا زادہ مسلمان ہو گیا دوسرے دن شراب پی کر مست ہو گیا۔ اس کی ماں نے ملامت کی اور کہا کہ اے فرزند تیرے فعل سے حضرت عیسیٰؑ ناخوش ہوئے اور حضرت محمدؐ خوش نہیں ہوئے۔

بود و نابود تو یک قطرۂ آبست ہمی
کہ ز دریا بکنار آمد و در دریا شد
(بیاض سدہ علی خاں)

خسرو نامہ میں کہتے ہیں:-

درآمد پشۂ از لاف سرمست
دمے بر روی کوہ قاف بنشست
چو برجست و از انجا عزم شد
چہ افزود اندراں کوہ و چہ کم شد

فردوسی کے ہاں یہ خیال بہتر پیرایہ میں ادا ہوا ہے -

یکے مرغ بر کوہ بنشست و خاست
بر آں کہ چہ افزود ازاں کہ چہ کاست
تو آں مرغی و ایں جہاں کوہ تست
چو رفتی جہاں را چہ اندوہ تست
(بیاض سدہ علی خاں)

مختار نامہ میں یہی مطلب یوں ادا ہوا ہے -

خلقے کہ دریں جہاں پدیدار شدند
در خاک بعاقبت گرفتار شدند
چندیں غم خود مخور کہ ہمچوں من و تو
بسیار درآمدند و بسیار شدند
(کلیات عطار صفحہ ۹۹۵ طبع نول کشور)

قصائد اگرچہ اکثر زہد و حکمت و پند و موعظت کے مضامین پر شامل ہیں لیکن ذیل کے اشعار میں کسی قدر رنگ بدلا ہے اور نظارۂ گل و ریاحین میں مصروف ہیں -

باد شمال می وزد جلوۂ یاسمن نگر
وقت سحر ز عشق گل بلبل نعرہ زن نگر
سبزۂ تازہ روئے را لوحط جوئبار بیں
سنبل شاخ شاخ را مور خفتہ چمن نگر
سوسنۂ لطیف را ہمچو عروس بکر بیں
باد مشاطۂ لعل را جلوہ گر سمن نگر
نیرسیۂ سرفگندہ را در غم عمر رفتہ بیں
سوسن شیر خوار را آمدہ در سخن نگر
لعبت شاخ ارغواں طفل زباں کشادہ بیں
ناوک تیر رخ نوشاں عجیبۂ بدن نگر

دیگر

قومے کہ بخواب مرگ سر بار نہند تا حشر ز قال و قیل خود بار رہند
تا کے گوئی کہ کس خبر باز نہ داد چوں بے خبر اند چہ خبر باز دہند

دیگر

بس عمر عزیز اے دل مسکیں کہ گزشت بس کافر کفر و مومن دیں کہ گزشت
اے مرد خرد حساب کن تا چند مد چندیں کہ در آمدند و چندیں کہ گزشت

دیگر

بر بستر خاک خفتگاں می بینم در زیر زمیں نہفتگاں می بینم
چنداں کہ بصحرائے عدم می نگرم نا آمدگاں و رفتگاں می بینم

جس چیز نے اس کی شہرت کو بال پرواز دیے، وہ اُن کی مثنویاں ہیں۔ ان میں اخلاق اور تصوف کو ملا کر لکھا ہے۔ ان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حکایات کے بڑے شائق ہیں۔ تمام مثنویوں میں قدم قدم پر حکایات موجود ہیں۔ چونکہ غیر معمولی حافظے کے مالک ہیں اس لیے اخبار و قصص انبیا و اولیا و سلاطین و مشاہیر کثرت کے ساتھ مستحضر ہیں اور جو نکتہ یا مسئلہ بیان کرنا چاہتے ہیں اس کے مناسب حال اس ذخیرے سے حکایت لے آتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ایک حکایت پر بس نہیں کرتے بلکہ اس موقعے کے مناسب متعدد قصّے اور چٹکلے بیان کر جاتے ہیں۔ قصہ گوئی کا چسکا اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ حمد و مناجات جیسی مقدس زمینوں میں بھی قصّہ نقل کرنے سے باز نہیں آتے۔ یہ سب کچھ سہی تاہم ہر شعر صدق و اخلاص اور تاثیر کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ حمد و منقبت و مناجات ایسی دھوم دھام سے لکھتے ہیں کہ فارسی گویوں میں کوئی بھی ان کی ٹکر کا نہیں۔ اور رسولؐ کے تو عاشق زار ہیں۔ روضۂ رسولؐ

یکے ترسا مسلماں گشت پیر در — نمی خوردن شد آں جاہل دگر روز
چو مادر مست دید او را بہ دردی — بدو گفت اے پسر آخر چہ کردی
کہ شد آزردہ عیسیٰؑ رود از تو — محمدؐ ناشدہ خوشنود از تو
محبت دار رہ رفتن نکو نیست — کہ ہر ذرہ سراپا مرد او نیست
نمردی رو دریں دنیا کہ ہستی — کہ نامرد نیست در دیں بت پرستی

ترغیب عمل ۔ رباعی

اے رہ رفتن ہنوز می اندیشی — بر نیست کہ در مسور می اندیشی
مردان جہاں ہزار عالم رفتند — تو ہر دو قدم ہنوز می اندیشی

دیگر

تو بیکاری و ہمچنیں خواہی بود — اما ہمہ ذرات جہاں در کارند

حکیم خیام کی تقلید ۔ رباعی

لالہ رخ چو ماہ می بینم من — سبزہ خط سیاہ می بینم من
واں کاسہ سر کہ بود پیمانہ غرور — پیمانۂ خاک راہ می بینم من

دیگر

ہر گورہ کہ بیچود بہ دہاں بار بہم — گوید بشنو تا خبرے بار دہم
من ہیچو تو بودہ ام دریں رہ صد بار — اے نیست ہمی گردم و نے بار بہم

دیگر

ہر ذرہ کہ در وادی و در کہسار یست
از پیکر برگشتۂ آثار یست

واں ہر صورت کہ بر درے و بر دیوار یست
از روئے خرد بصورت دلدار یست
(کلیات صفحہ ۹۹۵)

دلی آرزو بیاں کرو تاکہ میں اُسے بر لاؤں۔ چنانچہ پہلے نے عرض کی کہ پریوں کے بادشاہ کی لڑکی سے میری شادی ہوجائے۔ دوسرے نے کہا میں جادوگری سیکھنا چاہتا ہوں، کیونکہ اس فن کا جاننے والا بڑا طاقتور ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جادو کے زور سے کبھی پرندہ بن جاؤں اور کبھی ہاتھی۔ تیسرے فرزند نے یہ استدعا کی کہ مجھ کو جام جہاں نما مل جائے جس کے ذریعے سے دُنیا کے تمام راز معلوم کرسکوں۔ چوتھے کی یہ خواہش تھی کہ مجھ کو آب حیات مل جائے۔ پانچواں حضرت سلیمانؑ کی انگشتری کا متمنی تھا اور چھٹا کیمیا کا طالب تھا۔ خلیفہ ان کی ہر خواہش کو ہوا و ہوس پر مبنی کہہ کر مسترد کردیتا ہے اور مختلف حکایات سے اُن کے نقائص پر استدلال کرتا ہے۔ یہ مثنوی بائیس مقالوں میں ہے اور کلیات عطار کے ساتھ نول کشور کے مطبع میں چھپی ہے۔

اسرارنامہ بھی مختلف مقالوں میں جن کی تعداد بیاں نہیں ہوئی سالک کے لیے عام اخلاقی پند و نصائح ہیں جو مختلف حکایات پر شامل ہیں۔ حمد و نعت و منقبت اصحاب اربعہ کے اشعار جو اس مثنوی کے دیباچے میں پائے جاتے ہیں، درحقیقت خسرونامہ کی پہلی اشاعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب اسرارنامہ تصنیف ہوا یہی اشعار اس کے ساتھ بھی لگا دیے گئے بعد میں ایک دوست کی فرمایش پر جب خسرونامہ کا اختصار کیا تو حمد و نعت وغیرہ کے جدید اشعار کہہ کر اس میں اضافہ کر دیے۔ اسرارنامہ طہران میں ۱۲۹۸ھ میں چھپ چکا ہے۔ مطبع والوں نے یہ ستم ظریفی کی کہ منقبت اصحاب ثلاثہ کے تمام اشعار خارج کر دیے۔

مصیبت نامہ آج تک نہیں چھپا۔ میں جس نسخے سے کام لے رہا ہوں

کی یاد میں لکھتے ہیں ۔

منم در فرقت آں روضۂ پاک | کہ بر سر می کنم از آرزو خاک
اگر روزے در آں میداں درآیم | چگوئی زیں نمط چوگاں برآیم
بیآہے بگسلم سد جہاں را | حوطے سازم از خاک تو جاں را

(اسرار نامہ صفحہ ۲۷)

مختصر یہ کہ پاکی، پاک اعتقادی اور پاک گوئی ان کا اصلی جوہر ہی اور یہی وصف اُن کے کلام میں نمودار ہی۔

مثنویوں کی زباں بہت صاف اور سلجھی ہوئی ہو۔ عطار جس تیزی سے نظم لکھتے ہیں اکثر لوگ اس تیزی کے ساتھ نثر نہیں لکھ سکتے۔ اگر فکر و تلاش سے قلم کو روک کر لکھتے تو بڑوں بڑوں سے ماری لے جاتے۔ صرف خسرو نامہ میں ذرا قلم کو روکا ہو اور نظامی سے ڈانڈا میڈا ملا دیا ہو۔

منطق الطیر میں منازلِ سلوک یعنے طلب، عشق، معرفت، استغنا، توحید، حیرت، فقر و فنا، بیاں کی ہیں۔ اس کے لیے پرندوں کا ایک فرضی قصہ لکھا ہو کہ ایک روز پرندے جمع ہوکر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ دنیا میں ہر قوم کا کوئی نہ کوئی بادشاہ ہوتا ہو اس لیے ہمیں بھی کسی کو اپنا بادشاہ مان لینا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے قرعۂ انتخاب عنقا کے نام پڑتا ہو۔ اب سارے طیور ہدہد کی رہنمائی میں عنقا کی تلاش میں نکلتے ہیں اور اس سفر میں مذکورۂ بالا منازل سلوک ان کو پیش آتی ہیں۔ عطار کی مثنویوں میں منطق الطیر سب سے زیادہ مقبول ہو اور متعدد بار چھپ چکی ہو۔

الٰہی نامہ کے دوران میں یہ قصہ بیاں ہوا ہو کہ کسی خلیفہ کے چھ فرزند تھے۔ ایک روز خلیفہ نے ملا کر اُن سے کہا کہ تم ہر ایک اپنی اپنی

کیونکہ اس شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اشتر نامہ مصیبت نامہ سے پیشتر نظم ہو چکا ہے۔ خسرو نامہ پر نظر ثانی کے وقت عطار نے دیباچے میں اپنی مثنویوں کا ذکر کیا ہے، چنانچہ –

مصیبت نامہ زاد رہروانست الٰہی نامہ گنج خسروانست
جہاں معرفت اسرار نامہ است بہشت اہل دل مختار نامہ است
مقامات طیور اما چنانست کہ مرغ عشق را معراج جانست
چو خسرو نامہ را طرزے عجیب است ز طرز او کہ و مہ را نصیب است

(خسرو نامہ صفحہ ۵۲، ۵۳ مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۹۵ھ)

اس فہرست میں سب سے اوّل مصیبت نامے کا نام ملتا ہے، لیکن اشتر نامہ جو شعر بالا کی رو سے مصیبت نامے سے اقدم ہے، شامل نہیں۔ جہاں مصنف نے اپنی اس قدر مثنویاں گنائی ہیں، اشتر نامے کو کیسے فراموش کر جاتے اگر وہ اس وقت تک لکھا جا چکا تھا۔

خسرو نامہ عطار کی شاعری کی بہترین مثال ہے وہ ایسے وقت کی یادگار ہے جب اُن کی شاعری جوان تھی۔ اس کتاب کی دو اشاعتیں ہیں، پہلی اشاعت چونکہ طویل تھی اس لیے ایک دوست کے کہنے پر اس کو مختصر کر دیا۔ اختصار کے علاوہ اکثر موقعوں پر مناسب اصلاح و ترمیم بھی کی اور حمد و نعت اور منقبت کے جدید اشعار لکھ کر شامل کر دیے چنانچہ –

چو او در حقِ ایں قصہ نکو گفت چناں کردم ہمی القصہ کو گفت
بروں کردم از آں جا ابتدائے برآوردم زنیک نکتہ بنائے
خدا و نعت و توحیدے بگفتم بسے از درّ حکمت بیش سفتم
وگر چیزے طرازش را بیاں داشت مگر داشیدم از طرزے کہ آں داشت

(خسرو نامہ صفحہ ۵۱ و ۵۲، طبع نولکشور لکھنؤ)

وہ میرے عزیز دوست پروفیسر سراج الدین ایم اے ایم۔او۔ایل کے مملوکہ کلیاتِ عطار میں شامل ہے۔ عطار کے جس قدر کلیات معلوم ہیں ان میں یہ نسخہ سب سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کی تاریخ کتابت ۷۳۵ھ ہے۔

مصیبت نامے میں چالیس مقامات ہیں جن میں سالک فطرت تمثیلاً حاروں فرشتگان عظام عرش، کرسی، لوح محفوظ، قلم، بہشت و دوزخ آسمان، آفتاب و ماہتاب، اربع عناصر، کوہ و دریا، جماد و نبات، حیوان، وحوش و طیور، شیطان جن، انسان، ساتوں انبیاء کرام، حس و خیال، عقل، دل اور روح کے پاس جا کر ہر ایک سے فرداً فرداً تلاش حقیقت اور رہبری کا سوال کرتا ہے سب کے سب عجز کے قائل ہوتے ہیں اور روح آخر کار اس کا بیڑا پار کرتی ہے۔ ضمن میں بیسیوں حکایات نقل کر دی ہیں خاتمے میں اشتر نامہ کی طرف شعر ذیل میں اشارہ ملتا ہے۔

سختئے افلاک ہمتواند کشید نظم اشتر نامہ تولے فرید

یہ شعر مع اس کے ساتھ جو قطعہ[۱] ہے اگر الحاقی ہو تو کوئی تعجب نہیں

---

[۱] وہ قطعہ حسب ذیل ہے:۔

شاد باش اے شاہ دیوان سخن درّ دریا سے سخن کان سخن
داد داری در سلوک و سیر راہ لاجرم در ملک نطق پادشاہ
نامہ اسرار معنی چوں توئی آسمان شعر را شعریٰ توئی
شعر خواں گفت سحر است ایں حلال مادر از منطق عین الکمال
نور جاں ہا در سواد جامہ است سوز دلہا در مصیبت نامہ است
سختی افلاک ہمتواند کشید نظم اشتر نامہ تولے فرید
حسرت ملک سخن عطار شد زانکہ خوشبو چوں گل و گلزار شد
روح پاکش غرق رحمت باد دور ہم لبیس و ہم دش دیوان دور

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عطار کے کسی مداح نے یہ قطعہ لکھا ہے اور کاتب نے لکھتے وقت اس کو شامل متن کر لیا

عشقیہ مثنویاں فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں ان میں خسرو نامہ کو دوسرے نمبر پر جگہ ملنی چاہیے۔ خسرو نامہ مطبع محمد لکھنؤ میں (۱۲۹۵ھ) چھپا ہے۔ مطبع والوں نے ایسے اشعار نکال دیے ہیں جو منقبت اصحاب ثلاثہ، امام بوحنیفہ و امام شافعی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی تعداد اسی کے قریب ہے۔

مثنویات عطار کے تاریخی مواد سے متعلق بھی یہاں چند الفاظ کہنے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ عطار بالعموم اپنی حکایات ایسے مآخذ سے لیتے ہیں جو تاریخی اشخاص اور ان کی سرگزشت سے علاقہ رکھتے ہیں۔ اس لیے ان مثنویات میں تاریخی دل چسپی کا جدید ذخیرہ موجود ہے۔ مثلاً سلطان محمود غزنوی سے متعلق شیخ عطار نے متعدد قصے[1] ایسے دیے ہیں جن کی رو سے سلطان کی سیرت و اخلاق کے ایسے پہلو پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے جس کو اس کے مورخین نے بالکل فراموش کر دیا ہے۔ مورخین اُس کی جنگ آرائی، فتحیابی، دینی جوش وغیرہ کے خط و خال کو بڑے جوش و خروش سے بیان کرتے ہیں، لیکن اس کے ذاتی حالات، جذبات و خیالات، عادات اور خو بو پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ شیخ اس معاملے میں ایک حد تک ہماری امداد کرتے ہیں۔ اُن کے بیانات میں محمود خدا ترس، درویش دوست، دل سوز، جفاکشی کا عادی، فیاض اور زندہ دلی کا شائق انسان ہے جو جلال و طنطنۂ سلطنت کو فراموش کر کے نجی زندگی میں عام انسانوں سے سطح مساوات پر ملتا ہے۔ اُن کی تکلیف اور مصیبت کا اُس کے دل میں درد ہے اور امداد کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔ فیاض اس قدر ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ لطیفوں اور چٹکلوں پر دیناروں کی تھیلیاں

[1] راقم نے اس سلسلے میں ایک علیحدہ مضمون لکھا ہے دیکھو اورینٹل کالج میگزین بابت ماہ فروری ۱۹۲۵ء۔

اس مثنوی میں قیصر روم کے فرزند شہزادہ خسرو اور خورستان کی شہزادی
گل رخ کے عشق کا قصہ ہے۔ خسرو عین ولادت کے وقت اس کی سوتیلی والدہ
کے خوف سے ماں کے آغوش سے جدا کیا جا کر ایک وفادار کنیز کے ساتھ
رخصت کر دیا جاتا ہے۔ یہ دایہ خورستان پہنچ کر فوت ہو جاتی ہے اور ایک باغبان اس کی
پرورش اپنے ذمے لیتا ہے۔ خسرو بہت جلد والئ خوزستان کے فرزند بہرام کا جلیس
اور ہم مکتب ہو جاتا ہے۔ بہرام کی بہن گل رخ خسرو پر عاشق ہو جاتی ہے۔ جب گل رخ کی
کی شادی والئ اصفہان کے ساتھ ہو جاتی ہے خسرو اصفہان پہنچ کر گل رخ کو لے کر فرار ہو جاتا
ہے۔ والئ اصفہان جب گل رخ کے واپس لانے کے لیے تعاقب کرتا ہے حسا
موقع پا کر گل رخ کو چرا کر ایک صندوق میں قید کر دیتی ہے اور صندوق لے کر
صفہان کے ارادے سے روانہ ہوتی ہے۔ راستے میں دریا میں طوفان آتا ہے
ور کشتی ڈوب جاتی ہے۔ صندوق ایک چین کا ماہی گیر دریا سے نکال لیتا ہے
ل رخ اس طرح بچ کر اور کئی مصیبتیں جھیلنے کے بعد شاہ چین کے محل میں
پہنچ جاتی ہے اور کافور کی معرفت خسرو کو اپنی موجودگی کی اطلاع دیتی ہے۔ خسرو
ں کو لینے کے لیے آ جاتا ہے اور ان کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ اس قصے کے ضمن
ں مصنف نے بزم و رزم، دریا، پہاڑ اور جزیروں کے منظر خوب بیان کیے
ں۔ شیخ عطار جو اور تصانیف کے دوران میں محض ایک صوفی باصفا اور زاہد
لک کے لباس میں نظر آتے ہیں، اس مثنوی میں اپنی طبیعت کی رنگینی
تخیل کی بلندی کا ایک اعلیٰ نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ انھوں
، اپنی شاعری کا معیار اس نظم میں اس قدر بلند کر دیا ہے کہ ہم اس تصنیف
فیر کسی پس و پیش کے نظامی کی شیریں و خسرو کے پہلو میں جگہ دے سکتے
، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ساتویں صدی ہجری تک جس قدر

محبوب بنادیا تھا بلکہ اس کے یہی خسروانہ افعال تھے جنھوں نے وفات کے بعد بھی اس کی یاد کو تازہ اور اُس کے نام کو محترم بنا دیا تھا۔

محمود اور ایاز کے قصے جو سلجوقی عہد کے بعد فارسی ادبیات میں عالمگیر شہرت حاصل کر لیتے ہیں ان میں سے اکثر کے راوی شیخ عطار ہیں۔ خود مولانائے روم نے ایک سے زائد حکایت عطار سے لی ہے بلکہ ایک موقعے پر تو حوالہ بھی دے دیا ہے۔

شعرا کے متعلق بھی عطار بعض جدید اطلاع بہم پہنچاتے ہیں۔ فردوسی کے سلسلے میں اُن کے ہاں دو بیان ہیں۔ پہلا یہ کہ سلطان نے شاہنامے کے صلے میں پیل بار انعام بخشا لیکن شاعر نے بلند حوصلگی کی بنا پر قبول نہیں کیا۔

اگر محمود احیار عجم را | مداد آں پیل ولشکرواں درم را
اگر تو شعر آری فیل وارے | نہ یابی یک درم در روزگارے
چو آں گر پیل دارش کم نہ ارزید | مرشاعر فقاعے ہم نہ ارزید
زہے ہمت کہ شاعر داشت آنگاہ | کنوں سگر کہ چوں برگشت از راہ

(الٰہی نامہ۔ کلیات صفحہ ۹۳۴، نول کشور)

دوسرا یہ ہے کہ شیخ الاکابر شیخ ابوالقاسم طوسی نے فردوسی کے جنازے کی نماز پڑھنے سے انکار کر دیا۔ رات کو شیخ نے خواب میں دیکھا کہ فردوسی جنت میں موجود ہے۔ شیخ کو بڑی حیرت ہوئی پوچھا کہ تمھاری بخشش کیوں کر ہوئی۔ فردوسی نے جواب دیا کہ ایک شعر توحید کی بنا پر بخش دیا گیا۔

اسی واقعے کی طرف ایما کرتے ہوئے خاتمۂ مصیبت نامہ میں لکھا ہے۔

می باید ستد محمد اللہ نزدر | ہمچو فردوسی ربیتے در تنور
ہمچو فردوسی فقع خواہم کشاد | چوں سنائی بے طمع خواہم کشاد

رساتا ہی۔ اُس کے کان نصیحت سننے کے لیے ہر وقت آمادہ ہیں۔ ادنیٰ ادنیٰ انسان اس بڑے آدمی کو کڑوی کڑوی باتیں سنا سکتا ہی۔ بہرام گور کی طرح شکار کا بے حد شائق ہی۔ صحراؤں میں شکار کے پیچھے گھوڑا ڈال دیتا ہی اور لشکر سے جدا ہو کر کہیں کا کہیں نکل جاتا ہی۔ دیہاتیوں اور صحرائیوں کا ناخواندہ مہمان بنتا ہی کبھی کسی بوڑھے خارکش کی امداد کے لیے جو سنسان بیابان میں گدھے پر کانٹے لادنے کے واسطے کسی ہمدرد انسان کی مدد کا منتظر ہی، بڑھتا ہی، کانٹوں میں ہاتھ ڈالتا ہی اور گدھے پر رکھوا دیتا ہی۔ کبھی کسی ضعیف عورت کی دری گا گٹھڑ جو سر پر لیے جا رہی ہی اور تھک گئی ہی، لے کر اپنے گھوڑے پر رکھ لیتا ہی، پھر بڑھیا کے چھیڑنے کے لیے گھوڑا تیز کر دیتا ہی۔ بڑھیا پیچھے رہ جاتی ہی، غل مچاتی ہی اور سلطان کو روز قیامت اور پل صراط کی یاد دلاتی ہی۔ محمود یہ ڈرانے والے الفاظ سن کر سہم جاتا ہی۔ کبھی کسی ماہی گیر لڑکے کے ساتھ نصف کا شریک بن کر مچھلی کا شکار کھیلتا ہی اور دوسرے دن لڑکے کو بلوا کر اپنے برابر تخت پر بٹھا لیتا ہی۔ کبھی کسی بوڑھے ہیزم فروش سے جا کر خود ہیزم خریدتا ہی، بوڑھا لکڑیوں کی قیمت "دو جو سیم" بتاتا ہی۔ محمود سونے کے سکوں کی تھیلی سے ایک ایک سکہ نکال نکال کر بوڑھے کے ہاتھ پر رکھتا جاتا ہی اور پوچھتا جاتا ہی کہ ان میں سے کون سا سکہ "دو جو سیم" کے برابر ہی۔ بوڑھا سر ہلاتا جاتا ہی اور ہر سکہ کو بڑا بتاتا ہی۔ آخر سلطان تھیلی پھینک کر کھڑا ہو جاتا ہی اور کہتا ہی کہ اچھا یہ تھیلی لے جاؤ اور اپنے "دو جو سیم" لے کر باقی کل واپس کر دینا۔ شیخ ابو الحسن خرقانی سے ملنے جاتا ہی اور اُن کے ساتھ بھی شوخیوں سے باز نہیں آتا۔ ان حکایات پر نظر ڈالنے سے کو معلوم ہوتا ہی کہ یہ محمود کی شمشیر نہیں تھی جس کے کارناموں نے اسے

بحر علم دارم صد کتب میں   در و بہا دہ ام اسرار لب میں
لیکن دولت شاہ اور صاحب ہفت اقلیم نے صرف چالیس کتابیں اور رسالے ان کی طرف منسوب کیے ہیں۔

دولت شاہ نے شیخ کی مصنفات کے یہ نام دیے ہیں۔

(۱) تذکرہ الاولیا (۲) اسرار نامہ (۳) الٰہی نامہ
(۴) مصیبت نامہ (۵) اشتر نامہ (۶) مختار نامہ
(۷) جوہر الذات (۸) وصیت نامہ (۹) منطق الطیر
(۱۰) بلبل نامہ (۱۱) گل و ہرمز (۱۲) سیاہ نامہ
(۱۳) ہیلاج نامہ (۱۴) اخوان الصفا (۱۵) حیدر نامہ

صاحب ہفت اقلیم نے ذیل کی فہرست دی ہے:-

(۱) الٰہی نامہ (۲) اسرار نامہ (۳) مصیبت نامہ
(۴) وصلت نامہ (۵) بلبل نامہ (۶) پند نامہ
(۷) جواہر نامہ (۸) بے سر نامہ (۹) خسرو نامہ
(۱۰) ولد نامہ (۱۱) حیدر نامہ (۱۲) اشتر نامہ
(۱۳) جوہر الذات (۱۴) مظہر العجائب (۱۵) منطق الطیر
(۱۶) گل و ہرمز (۱۷) شرح القلب (۱۸) تذکرۃ الاولیا
(۱۹) اخوان الصفا (۲۰) دیوان (۲۱) لسان الغیب (اگرچہ فہرست میں نام شامل ہیں، لیکن انتخاب کلام دیا ہے)

قاضی نور اللہ شوستری کے ہاں یہ نام آتے ہیں -

(۱) منطق الطیر (۲) الٰہی نامہ (۳) بلبل نامہ
(۴) مظہر العجائب ـــــــ

رابعہ ست کعب القصداری کے درد ناک حالات[1] سے متعلق جو روداد کی معاصر شاعرہ ہی عطار ہم کو بالکل جدید اور تفصیلی اطلاع دیتے ہیں۔

(دیکھو الٰہی نامہ صفحہ ۱۸ ۔ ۹۲۷)

علیٰ ہذا فخر الدین اسعد گرگانی اور سبب تالیف ویس و رامین کے سلسلے میں الٰہی نامہ صفحہ ۲۱ ۔ ۲۰ ۸ میں ایک دل چسپ حکایت آتی ہی جو ہمارے لیے جدید معلومات کا حکم رکھتی ہی۔

شعرا میں ازرقی ، انوری ، اتہامی ، عنصری اور خاقانی کا نام مصیبت نامہ میں آتا ہی۔ ان کے علاوہ سلطان سنجر اس کی بہن صفیہ، نظام الملک، خواجہ رکن الدین اکاف سے متعلق ان کے ہاں جدید اطلاع موجود ہی اور مشائخ کے حالات و مقولات کے لیے تو یہ مثنویاں بے حد ضروری ہیں ۔

تصنیفات شیخ فریدالدّین عطّار

شیخ عطار کی تصنیفات کی بابت عجیب و غریب بیانات دیے گئے ہیں۔ بعض نے ایک سو کتابوں کا اُن کو مالک مانا ہی۔ سب سے قدیم بیان وہ ہی، جو مفتاح الفتوح " تالیف سنہ ۸۸۶ھ میں ملتا ہی ، وھو ہذا ۔

حدا و ندش نوشتہ صد مجلد ہمہ علمے کہ او نامد مخلد

شین ضمیر شیخ کی طرف راجع ہی۔ "مظہر العجائب" میں بھی یہی تعداد بتائی گئی ہی، چنانچہ ۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو اورینٹل کالج میگزین بابت ماہ مئی ۱۹۲۵ء جہاں راقم نے رابعہ پر ایک علیحدہ مضمون لکھا ہی۔

(۱۰) ہفت وادی (۱۱) اشتر نامہ (۱۲) پند نامہ (۱۳) دیوان۔

کلیات کے علاوہ اس کتب خانے میں یہ کتابیں اور ہیں:۔

(۱۴) اسرار نامہ (۱۵) بلبل نامہ (۱۶) بے سر نامہ (۱۷) وصلت نامہ۔

اسی کتب خانے کے فہرست نگار مولوی عبد المقتدر صاحب نے ذیل کی فہرست علاحدہ دی ہے۔

(۱) اسرار نامہ (۲) الٰہی نامہ (۳) مصیبت نامہ
(۴) جوہر الذات (۵) اشتر نامہ (۶) مختار نامہ
(۷) حیدر نامہ (۸) بے سر نامہ (۹) سیاہ نامہ
(۱۰) منطق الطیر (۱۱) گل و ہرمز (یا) خسرو نامہ (۱۲) پند نامہ
(۱۳) وصلت نامہ (۱۴) وصیت نامہ (۱۵) بلبل نامہ
(۱۶) اسرار الشہود (۱۷) گل و خسرو (۱۸) مظہر العجائب
(۱۹) خیاط نامہ (۲۰) کنز الحقائق (۲۱) ہفت وادی۔
(۲۲) لسان الغیب (۲۳) مفتاح الفتوح (۲۴) منصور نامہ
(۲۵) کنز البحر

انڈیا آفس لائبریری کے ایک کلیات نمبری ۱۳۱ میں مثنویات ذیل شامل ہیں:۔

(۱) اشتر نامہ (۲) خسرو و گل (۳) بلبل نامہ
(۴) پند نامہ (۵) منطق الطیر (۶) ہفت وادی
(۷) بے سر نامہ (۸) کنز الاسرار (۹) دیوان
(۱۰) وصلت نامہ (۱۱) مفتاح الفتوح (۱۲) اسرار نامہ
(۱۳) کنز الحقائق (۱۴) الٰہی نامہ (۱۵) مصیبت نامہ

حاجی خلیفہ کے ہاں ذیل کی کتابیں ہیں ۔

(۱) اسرار نامہ (۲) الٰہی نامہ (۳) بلبل نامہ
(۴) پند نامہ (۵) تذکرۃ الاولیا (۶) جوہر الذات
(۷) حیدر نامہ (۸) خسرو نامہ (۹) شتر نامہ
(۱۰) منطق الطیر (۱۱) مصیبت نامہ (۱۲) مظہر العجائب
(۱۳) وصلت نامہ۔

ڈاکٹر اسپرنگر کی فہرست کتب خانۂ اودھ میں یہ کتابیں مذکور ہیں :۔

(۱) دیوان (۲) حقائق الجواہر، اس کا پہلا شعر ہے ؎

اے حد لئے سر جوہر الساں توئی کاشف راز حقائق جاں توئی

(۳) بے سر نامہ (۴) مصیبت نامہ (۵) اسرار الشہود
(۶) جوہر الذات (۷) اشتر نامہ (۸) خسرو نامۂ کبیر
(۹) خسرو نامۂ صغیر (۱۰) مظہر العجائب (۱۱) منطق الطیر
(۱۲) بلبل نامہ (۱۳) وصلت نامہ (۱۴) پند نامہ
(۱۵) خیاط نامہ (۱۶) کنز الحقائق (۱۷) ہفت وادی
(۱۸) الٰہی نامہ (۱۹) اسرار نامہ

گیارہویں قرن ہجری کا ایک کلیات[۱] کتب خانۂ بانکی پور پٹنہ میں ہے، جس میں حسب ذیل کتابیں ملتی ہیں :۔

(۱) جوہر الذات (۲) مظہر العجائب (۳) منطق الطیر
(۴) حلاج نامہ (یا) منصور نامہ ۔ (۵) مصیبت نامہ (۶) لسان الغیب
(۷) خیاط نامہ (۸) مفتاح الفتوح (۹) کنز الحقائق

---

[۱] فہرست بانکی پور، نمبر ۲۶، صفحہ ۶۳۔

سنہ ۱۲۸۹ ہجری میں نول کشور نے جو کلیات چھاپا ہے، اس میں کتب ذیل شامل ہیں :-

(۱) جوہر الذات، (جلد اول صفحہ ۲ - ۲۹۸، ایضاً جلد دوم، صفحہ ۳ - ۵۸۲)
(۲) ہیلاج نامہ، صفحہ ۵۸۴ - ۷۷ (۳) الٰہی نامہ، صفحہ ۶۷۷ - ۹۴۳
(۴) مختار نامہ صفحہ ۹۴۶ - ۱۰۴۷ (۵) منطق الطیر، ۱۰۵۰ - ۱۱۶۵
(۶) بلبل نامہ، صفحہ ۱۱۶۸ - ۱۱۸۴ (۷) نزہت الاحباب، صفحہ ۱۱۸۶ - ۱۱۹۵
(۸) مفتاح الفتوح، صفحہ ۱۱۹۸ - ۱۲۲۱ (۹) بے سر نامہ، صفحہ ۱۲۲۴ - ۱۲۲۹
(۱۰) پند نامہ، صفحہ ۱۲۳۲ - ۱۲۵۷ -

کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد کی فہرست میں عطار کی ایک اور تصنیف ملتی ہے، اس کا نام "آغاز عشق" ہے۔ مطبع مسیحائی نے ایک اور مثنوی موسوم بہ اسرار نامہ طبع کی ہے۔

اس طرح عطار کی تصنیفات کی فہرست حسب ذیل ہوئی۔

(۱) آغاز عشق (۲) اسرار نامہ (۳) اسرار نامہ، (مطبع مسیحائی پریس)
(۴) اشتر نامہ (۵) اسرار الشہود (۶) احوال الصفا (۷) الٰہی نامہ
(۸) بے سر نامہ (۹) بلبل نامہ (۱۰) بید نامہ (۱۱) تذکرۃ الاولیا
(۱۲) جوہر الذات (یا) جواہر نامہ (۱۳) حلاج نامہ (یا) منصور نامہ۔
(۱۴) حقائق الجواہر (۱۵) حیدر نامہ (۱۶) خسرو نامہ (یا) گل و ہرمز۔
(۱۷) خیاط نامہ (۱۸) دیوان (۱۹) سیاہ نامہ (۲۰) شرح القلب۔
(۲۱) کنز الاسرار (۲۲) کنز البحر (۲۳) کنز الحقائق (۲۴) لسان الغیب
(۲۵) منطق الطیر (۲۶) مصیبت نامہ (۲۷) مختار نامہ (۲۸) مظہر العجائب
(۲۹) مفتاح الفتوح (۳۰) نزہت الاحباب (۳۱) وصیت نامہ

(۱۶) لسان الغیب (۱۷) جوہرالذات (۱۸) مظہرالعجائب۔

اسی کتب خانے میں ایک نسخۂ عطار[۵۱] ہے، اس کی تاریخ کتابت ۸۰۰ھ و ۸۱۲ھ ہجری کے درمیان ہے۔ اور مثنویات ذیل پر شامل ہے:۔

(۱) اشترنامہ (۲) اسرارنامہ (۳) خطبۂ الٰہی نامہ (۴) بلبل نامہ (۵) مصیبت نامہ (۶) وصلت نامہ

پروفیسر سراج الدین (آذر) کے کلیات میں یہ کتابیں ہیں۔

(۱) جوہرالذات بر متن (۲) دیوان بر حاشیہ (۳) مختارنامہ، حاشیہ (۴) دیباچہ گل و ہرمز، اشاعت اول (حاشیہ) (۵) منطق الطیر، حاشیہ (۶) ہیلاج نامہ، متن (۷) اسرار نامہ، حاشیہ (۸) اشترنامہ، متن (۹) الٰہی نامہ، حاشیہ (۱۰) مصیبت نامہ، متن (۱۱) وصلت نامہ، حاشیہ حاشیے کے اشعار نقل ہونے سے رہ گئے ہیں (۱۲) گل و ہرمز، متن (۱۳) بلبل نامہ، حاشیہ (۱۴) نزہت الاحباب، حاشیہ (۱۵) مفتاح الفتوح حاشیہ، صرف دیباچہ منقول ہے۔

عطار کے معلومہ کلیات میں یہ نسخہ سب سے قدیم ہے اور صحت کے اعتبار سے متوسط درجے کا ہے۔ اس کی تاریخ کتابت ۸۵۷ھ ہجری ہے۔

نسخۂ عطار[۵۲]، (ضمیمہ فہرست کتب فارسیہ برٹش میوزیم لائبریری) سنہ ۸۸۹ ہجری کا نوشتہ ہے، اس میں یہ کتابیں داخل ہیں۔

(۱) مختارنامہ (۲) الٰہی نامہ (۳) منطق الطیر (۴) مصیبت نامہ (۵) اسرارنامہ (۶) وصلت نامہ۔

---

[۵۱] فہرست انڈیا آفس نمبر ۱۰۳۴، صفحہ ۶۱۸۔

[۵۲] نمبر ۲۳۶، صفحہ ۱۵۹

معما ہے کہ اس کا نام 'آثار عشق' کیوں رکھا گیا۔

(۲) اسرار الشہود

ڈاکٹر اسپرنگر فہرست نگار[۵۱] کتب خانہ اودھ اور مولوی عبد المقتدر خاں فہرست نگار[۵۲] کتب خانہ بانکی پور اور مطبع خادم التعلیم لاہور (جس نے ۱۸۹۴ء میں اس کو طبع بھی کر دیا ہے) عطار کی تصنیف بیان کرتے ہیں اور بعض قلمی نسخوں میں بھی عطار کی طرف منسوب ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ شیخ شمس الدین محمد لاہجی اسیری نوربخشی شارح گلشن راز کی تصنیف ہے جو سید محمد نوربخش کے مرید ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۸۴۲ھ کے گردو پیش میں لکھی گئی ہے۔ مطبوعہ کتاب کے صفحہ ۹ پر علیحدہ عنوان کے تحت میں مصنف اپنے پیر کی مدح شروع کرتا ہے جس میں اشعار ذیل آتے ہیں :۔

آں محمد نام عیسیٰ مرتبت | ملک معنی را سلیماں منزلت
آمدہ از غیب نامش نوربخش | نور بخش خورشید نامش نوربخش

صفحہ ۱ پر ایک شعر میں اس کا تخلص اسیری موجود ہے۔[۵۳]

ہر یکے در دُور خود گشتہ جدید | چوں (اسیری) دیدہ آزادی رقید

صفحہ ۹۲ پر ایک حکایت میں مصنف اپنے بعض حالات دیتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب جذبۂ عشق الٰہی اس پر غالب آجاتا ہے، ایک ابدال

---

۵۱ فہرست صفحہ ۳۸ ۵۲ فہرست صفحہ ۶۴

۵۳ جناب نوربخشی بر پروفیسر محمد شفیع ایم اے نے ایک نہایت فاضلانہ مضمون اورینٹل کالج میگزین (بابت سنہ ۱۹۲۵ء) کے پہلے اور دوسرے نمبر میں لکھا ہے میں نے بہت اسی مضمون سے حاصل کیا ہے۔

(۳۲) وصلت نامہ (۳۳) ولد نامہ (۳۴) ہیلاج نامہ (۳۵) ہفت وادی۔

مذکورۂ بالا مختلف فہرستوں سے یہ امر منکشف ہوتا ہے کہ شیخ عطار کا کلام خود اُن کے اپنے زمانے میں مدوّن نہیں ہوا تھا۔ ان کی وفات ایسے زمانے میں ہوئی جب کہ چنگیزی طوفان ایران کو زیر و زبر کر رہا تھا، اس لیے اس عہد میں بھی اِس کے جمع کیے جانے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ آٹھویں صدی کی کوئی چیز کسی کتب خانے میں موجود نہیں، نویں صدی کی متعدد چیزیں ملتی ہیں۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں عطار کی تصنیفات اہل ذوق جمع کرنے لگے ہیں۔ اور چونکہ کوئی قدیم کلیات موجود نہیں، اس لیے اپنے اپنے مجموعوں میں مختلف مثنویاں جمع کر رہے ہیں اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان مجموعوں میں مختلف چیزیں شامل ہو گئی ہیں۔ کلیات ایک طرف نسخے اور بیاضیں ایک دوسرے سے نہیں ملتے نہ اُن میں کسی ترتیب کا لحاظ ہو جیسا اور شعرا کے کلیات میں دیکھا جاتا ہے۔ اِس انتشار اور ابتری کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ عطار کے کلیات میں دیگر شعرا کی تصنیفات سہواً شامل ہو گئیں۔ دوسرا یہ ہوا کہ بعض لوگوں نے خاص خاص مقاصد کو مدنظر رکھ کر اپنی تصنیفات شیخ کے کلام میں شامل کر دیں۔ اس لیے ضروری ہوا کہ ایک سرسری نظر ایسی کتابوں پر ڈالی جائے میرا تبصرہ انھیں کتابوں پر محدود ہوگا جو میری نظر سے گزر چکی ہیں۔

(۱) آغاز عشق

کتب خانۂ آصفیہ، حیدر آباد دکن، کی فہرست میں یہ کتاب درج ہے جس کا نمبر ۱۵۵ ہے۔ فہرست نگار نے اس کا نام "آغاز عشق" رکھا ہے۔ درحقیقت یہ کوئی نئی مثنوی نہیں ہے بلکہ عطار کے خسرو نامہ کا ابتدائی حصّہ ہے۔ یہ ایک

نام آں کہ جاں را نور دیں داد — خرد را در خدا دانی یقیں داد

ملکہ یہ اور اسرار نامہ ہے جو بحر رمل مسدس میں ہے، اس کے پہلے دو شعر ہیں

افتتاح نامہا از نام تو — ہر دو عالم خرمن از وسق ارحام تو

آں خداوندے کہ در عرض خود — ہر زباں خود را بہ نعتے وا نمود

اور خاتمے کا بیت ہے -

دیدۂ حق بیں اگر بودے مرا — او رُخ از ہر ذرہ بنمودے مرا

یہ کُل آٹھ صفحوں کا رسالہ ہے اور ۱۲۶۶ھ میں مطبع مسیحائی میں چھپ چکا ہے اُستادانہ کلام ہے۔ مسائل تصوف کو مختصراً چھیڑا گیا ہے کہ دنیا میں خدا کے سوا کچھ نہیں۔ ذرات عالم اُس کے مرآت ہیں اور اسی کے عشق میں مٹ ہیں۔ عجز و انکسار راہ راہ عشق ہے، طالب کو بہشت بہشت اور کونین سے کوئی سروکار نہیں۔ از روئے معنی انسان جانِ عالم ہے اور اُس کا دل لوح محفوظ ہے نور و ظلمات کا زرح انسان ہے اور انسان ہی مقصود عالم ہے انسان اگر اپنی حقیقت شناخت کر لے تو کائنات کی حقیقت معلوم کر سکتا ہے۔ دل جام جم اور عرش رحمانی ہے، عشق کیا ہے؟ یہی قطرے کا دریا بن جانا!

عشق چوں قطرہ دریا ساختن — از دو عالم نا خدا پرداختن

شیخ عطار کے مقابلے میں اس کی زبان زیادہ صاف اور رنجی ہوئی ہے۔ محض اہلِ مطبع کی شہادت پر اس کو عطار کا کلام نہیں مانا جا سکتا، کیونکہ نہ وہ کسی کلیات میں شامل ہے اور نہ کوئی تذکرہ نگار اس کا ذکر کرتا ہے علاوہ بریں حاجی خلیفہ غالباً اسی مثنوی کو مولانا جلال الدین رومی کی طرف منسوب کرتا ہے۔

(کشف الظنون صفحہ ۹۵ جلد اول طبع مصر ۱۳۱۱ھ ہجری)

سے اپنے آئندہ پیر سید محمد نور بخش کا ماننے کو اصفہان سے روانہ ہوا ہے۔

صبح دم یہاں رو بیش ٠ اقرا ... ہمرہ ... کعبہ صادق وصف
آمدم بیرون زشہر اصفہان ... یک تن تنہا پیادہ ہر آن
تا ما از دوستان بے مرد ... مانہ آید و کارم در شود

مقصد یہ سفر سوۂ ماہ رجب سنہ ۸۴۲ھ کو اختیار کرتا ہے۔

سال تاریخش بود سے کیف وکم ... ہشت صد و چہل و دو سے بیش وکم

(صفحہ ۹۴)

سید محمد نور بخش بانئ فرقۂ نوربخشیہ (سنہ ۷۹۵ ہجری و ۸۶۹ ہجری) قاین میں ولادت پاتے ہیں اور خواجہ اسحٰق ختلانی کے مرید ہیں، جو سید علی ہمدانی کے مرید تھے۔ خواجہ نے آپ کو "نور بخش" کا خطاب عطا کیا، ختلان میں ایک ہنگامے کے موقعے پر خلیفۃ المومنین بنا دیے جانے پر شاہرخ بادشاہ نے آپ کو ہرات میں قید کر دیا، ۸۲۶ھ میں آپ نے بھاگ کر اس قید سے رہائی پائی اور ایک عرصے تک بغداد بصرہ اور کردستان میں سیاحت کے بعد آپ نے گیلان میں سکونت اختیار کی اور شاہرخ کی وفات پر رے تشریف لے آئے جہاں تا حینِ وفات قیام پذیر رہے۔

(۳) اسرار نامہ

یہ وہ اسرار نامہ نہیں ہے، جو عطار نے سحر ہرج سدس میں لکھا ہے اور عام فہرستوں میں اُس کا افتتاحیہ ہے[۱]

---

۵ پروفیسر آور کے کلیات میں پہلے دو شعر یوں ہیں ۔
بنام آن کہ از خاک آدمی کرد ... زکیسے درد دوے آدمی کرد
جہاں داری کہ جاں را او دیں داد ... خرد را در خدا دانی بصر داد

'نام وے' ہے۔

اس مثنوی میں حمد و نعت کے بعد حضرت علیؓ کی منقبت علیحدہ عنوان سے چلتی ہے۔ "سبب نظم کتاب" میں شاعر کہتا ہے کہ میرے چند دوستوں نے اسرار طاعت کے متعلق مجھ سے سوالات کیے، میں نے ان کی فہم کے مطابق جوابات کو نظم کر دیا اور اس کا نام کنز الحقائق رکھ دیا۔ میرا مقصد نظم کہنے سے اظہار لیاقت نہیں۔ چھ ماہ کے عرصے میں جب کہ سنہ ۷۰۹ ہجری تھا، یہ کتاب ختم ہوئی

مرا مقصود ازیں حرف معرفت نیست | خدا داند کہ اظہار صفت نیست
ز ہجرت ہفصد و نہ شد، نہادم | اساسش را بہ شش مہ نظم دادم

اس مثنوی کے بعض زیر بحث عنوان یہ ہیں ۔

تحقیق ایمان و اسلام۔ شہادت۔ طہارت۔ صلوٰۃ۔ زکوٰۃ۔ روزہ حج۔ جہاد۔ نفس۔ شیطان۔ عشق۔ دُنیا۔ بہشت و دوزخ۔ جان۔ عیسیٰ و دجّال۔ تناسخ۔ وتحقیق۔ عہد مہدی۔ آب حیوان۔ صراط وغیرہ۔

نسخہ ہذا مہر والہ گجرات میں سنہ ۱۰۲۸ ہجری میں نقل ہوا تھا، جیسا کہ ورق اوّل کے صفحۂ الف کے ایک فقرے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مصنف کا نام اسی صفحے میں عبارت ذیل میں یوں لکھا ہے ۔

"کنز الحقائق پہلوان محمود بن پوریائے ولی"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کا نام پہلوان محمود ہے۔ عبارت مقولۂ بالا کا راقم خواہ محب اللہ ہو جس کی مہر پاس ہی لگی ہوئی ہے یا کوئی اور شخص، مگر اس میں شک نہیں کہ وہ مصنف کی شخصیت سے بخوبی واقف تھا، کیوں کہ اس مثنوی کے ساتھ ہی مثنوی "گلشن راز" اسی کاتب کے

(۴) کنز الحقائق

اکثر تذکرہ نگار اس تصنیف کے متعلق خاموش ہیں۔ نویں صدی کے کلیات میں شامل نہیں، لیکن دسویں اور گیارہویں قرن ہجری کے کلیات میں موجود ہے چنانچہ لیبئے انڈیا آفس کی فہرست[۵۱] میں اور ریو برٹش میوزیم کے ضمیمہ فہرست[۵۲] کتب فارسی میں اور مولوی عبد المقتدر خاں بانکی پور کی فہرست[۵۳] میں اس کو عطار کی تصنیف مانتے ہیں اور شعر ذیل افتتاحی بیان کرتے ہیں ۔

نام آں کہ جاں را نور دیں داد ‌‌‌‌‌‌ خرد را در خدا دانی یقیں داد

لیکن یہ شعر اسرار نامۂ عطار کا افتتاحیہ ہے ڈاکٹر اسپرنگر نے کتب خانہ اودھ کی فہرست[۵۴] میں اور آئیوانف نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست[۵۵] میں حسب ذیل افتتاحی لکھا ہے ۔

بنام آنکہ اول کرد و آخر ‌‌‌‌‌‌ بنام آں کہ باطن کرد و ظاہر

کنز الحقائق کا میرے پاس بھی ایک نسخہ ہے، جس کا پہلا شعر اسپرنگر اور آئیوانف کے نقل کردہ شعر کے مطابق ہے۔ فہرست نگاروں نے اسی تاب کا ایک اور شعر نقل کیا ہے یعنی ۔

چو گفتم اندرو چندیں دقائق ‌‌‌‌‌‌ نہادم نام او کنز الحقائق

شعر خفیف سے اختلاف کے ساتھ میرے نسخے میں موجود ہے پہلے مصرع میں 'اندرو' کی بجائے 'اندریں' اور دوسرے میں 'نام او' کی جگہ

---

۵۱ صفحہ ۶۱۵، نمبر ۱۳۱ ‌‌‌‌‌‌ ۵۲ نمبر ۲۳۵، صفحہ ۱۵۹

۵۳ صفحہ ۶۸ ‌‌‌‌‌‌ ۵۴ صفحہ ۳۵۶ ‌‌‌‌‌‌ ۵۵ صفحہ ۲۱۲، نمبر ۷۷۴

گر در صف ما مورچه گیرد جائے   آں مورچه شیر گردد از دولت ما

(جلد سوم صفحہ ۱۹۱)

مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر اس کتاب کو عطار[51] کی تصنیف نہیں مانا جاسکتا۔

(۵) مفتاح الفتوح

اکثر کلیات میں موجود ہے اور تمام فہرست نگار عطار کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی دیباچہ تذکرۃ الاولیاے عطار، طبع یورپ میں، انڈیا آفس کے ایک نسخے سے جس کا نمبر سہواً ۵۵۹ دیتے ہیں، اشعار ذیل نقل کر کے بیان کرتے ہیں کہ وہ کسی ریحانی کی تصنیف ہے -

سال ششصد و ہشتاد و دو و چار[52]   شہور سال را بد آخر کار
ز ذوالحجه گذشته شد ده و پنج   که مدون کردم اندر دفتر ایں گنج

(صفحہ یو)

"مفتاح الفتوح" دراصل رسالوں کے ایک مجموعے کا نام ہے جس کو ریحانی مذکور نے ایک منظوم دیباچے اور اس تعلق کے ساتھ کہ وہ شیخ عطار کے روحانی فیضان اور انھیں کے طرز میں لکھ رہا ہے، شائع کیا ہے۔ اس کا

---

[51] والہ داغستانی ریاض الشعرا میں پہلوان محمود کے متعلق بیان کرتا ہے کہ ان کا تخلص قتالی ہے، پدر محترم کی تقلید میں کشتی گیری کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ صاحب ... کے ساتھ ریاضت روحانی میں ... کے سرکردہ اور ... کاملوں سے ... میں ... تعلق رکھتے ہیں ... سنہ ۷۰۳ میں تصنیف کی۔ سنہ ۷۲۱ ہجری میں انتقال کیا اور ... ۱۶ ... میں ... ہیں۔

[52] ... اور ... کسور ... کلیات میں ... ملے۔

قلم کی لکھی ہوئی ملتی ہے۔ اس پر محب اللہ نے صاف لکھا ہے "گلشن بارس محمود چلستری د سنہ ۱۷ ہجری این درنظم سعدہ" باوجودیکہ دونوں مثنویوں میں مصنفین کا نام "محمود" عام ہے۔ اور دونوں اسی رسالے سے تعلق رکھتی ہیں لیکن وہ مغالطہ نہیں کرتا پہلے کو پہلوان محمود کہتا ہے اور دوسرے کو محمود چلستری۔

کنز الحقائق کے متن کی شہادت بھی محب اللہ کے بیان کی مؤید ہے۔ مصنف نے ایک سے زیادہ موقعے پر اپنا نام محمود دیا ہے۔ مثلاً حمد کے خاتمے کا یہ شعر۔

خدا وندا بحق نیک مرداں   کہ مارا عاقبت محمود گرداں

تحقیق صلوٰۃ کے ذیل میں یہ بیت آتی ہے۔

بروحاں پدر بشنو ز محمود   کہ بیش از حقیقت نیست مقصود

در زکوٰۃ کے ذکر میں۔

بیاموز از مدالی این طریقت   ز محمود (از) زکوٰۃ (دین) حقیقت

بہشت اور دوزخ کے بیان میں۔

بہشت دوزخت کہ مقصود   کہ بشناسی ہمی گفت محمود

یاد رہے کہ حاجی خلیفہ کے ہاں بھی یہ کتاب پہلوان محمود خوارزمی کی بیان کی گئی ہے (کشف الظنون جلد اوّل صفحہ ۲۲۳ طبع مصر)

فرہنگ آنند راج میں انجمن آرائے ناصری کے حوالے سے لفظ ست" کی تشریح میں اسی شاعر کی ایک رباعی درج ہے، یہاں اس کو پہلوان مشہور بہ پوریائے ولی خوارزمی لکھا ہے۔ رباعی۔

آنہم کہ پیل برنتابد لت ما   بر چرخ رسد لوت شوکت ما

پر لکھے ہیں، نہ انھوں نے کسی سے پڑھا اور نہ کسی سے تعلیم پائی، جو کچھ لکھا الہام خداوندی سے لکھا ۔

نکردم نے اجازت کار ہرگز — مگویم ایں سخن زنہار ہرگز
خداوندش نوشتہ صد مجلد — ہمہ علمے کہ او ماند مخلّد
نہ زکس خواندہ نے از کس شنیدہ — بالہام از خدا بروے رسیدہ

(کلیات صفحہ ۱۲، نول کشور)

میں اس فکر میں رہا کہ دیکھیے غیب سے کیا اطلاع دی جاتی ہے آخر ایک روز مجھ پر یہ حالت طاری ہوگئی، اس نے خودی کے عالم میں دیکھتا ہوں کہ آنحضرت ارشاد فرماتے ہیں "اے مسکیں تو آرائش لفظ و عبارت کے درپے نہ ہو اور معنی کو ضروری سمجھ کر انھیں کی تقریر پر اکتفا کر"۔

دریں اندیشہ بودم گاہ و بے گاہ — کہ تا خود چوں کند از غیبم آگاہ
بخود بودم فرو رفتہ یکے روز — بدم در سینۂ تاب و جگر سوز
در آں دم حالتے دیدم نہانی — کہ شد بر خاطرم کشف معانی
در آں حیرانی و حیرت کہ بودم — بسمع دل از آں حضرت شنودم
کہ اے مسکیں نگہ دار ایں اشارت — مدہ آرایش لفظ و عبارت
تو تقریر معانی کن دریں کار — بہ جان و دل معانی دوست تا یار

(ایضاً صفحہ ۱۲۱)

اب میں جان و دل سے ان کے ارشاد کا پابند ہوگیا اور جو کچھ لکھتا ہوں اُن ہی کے فیضان میں لکھتا ہوں اور میں تو محض بہانہ ہوں، شعر گوئی اُن کے طرز کے بغیر نہ صرف بے لطف بلکہ بے کار ہے۔ اب جو نکہ آنحضرت نے اجازت دے دی ہے، میں بڑی تیزی کے ساتھ شعر لکھ سکتا ہوں اور میری

دعویٰ ہو کہ "شیخ نے خواب میں آکر مجھ کو اس تصنیف کا حکم دیا" لیکن رسم اس قدر بدعقیدہ واقع ہوا ہو کہ اس ادّعائے فیضان میں سرقے کا پہلو دیکھتا ہو۔ بات یہ ہو کہ اس رحمانی نے ایک منظوم دیباچہ لکھ کر شیخ عطار کی پوری کلیات پر قبضہ کرلیا ہو، کیونکہ مفتاح الفتوح کی جس قدر غزلیات ہیں دیوان عطار سے اُڑائی گئی ہیں اور دلاوری یہ کی ہو کہ عطار کا تخلص تک بحال رہنے دیا ہو، ساتھ ہی پردہ دری کے خوف سے یہ ہدایت کردی ہو کہ کتاب کو اغیار کی نگاہ سے دُور رکھا۔ ۔

وصیت کردم اے یار یگانہ کہ از ما سار پوشی ایں ترانہ

وہ اپنے دیباچے میں لکھتا ہو کہ "میں نے ایک شب ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا، اُنھوں نے فرمایا کہ تم اپنے دوستوں کے لیے ایک رسالہ نظم کردو اور اس کا نام مفتاح الفتوح رکھ دو۔

مرا گفتا چو بر خیزی تو از خواب کتابے جمع کن از بہر احباب
سخن گو اندرو روشن بہ برہاں تو مفتاح الفتوحش نام گرداں

(کلیات ۱۲ (نول کشور)

جب میں بیدار ہوا تو کاغذ، قلم، دوات لے کر لکھنے بیٹھا، لیکن کچھ نہ لکھ سکا۔ اس کوشش میں دو ہفتے گزر گئے اور میں نے اپنے آپ کو اس کام کے بالکل ناقابل پایا۔ بھلا کہاں تم اور کہاں یہ قیل و قال، اور نہ میری یہ مجال کہ بغیر اجازت کے کوئی کام کروں، اس لیے مناسب ہو کہ اس کوشش سے دست بردار ہو جاؤں۔ آں حضرت[۱] نے سو مجلدات ہر علم

۱؎ آں حضرت سے مراد شیخ عطار ہیں گویا انھیں کے ارشاد اور فیضان سے کتاب مفتاح الفتوح تالیف ہوئی ہو۔

اور منصور سے مقدم مانا گیا ہے۔ گویا ایک طرف وہ بایزید اور امام جعفر صادق متوفی سنہ ۱۴۹ ہجری کے اور دوسری طرف شیخ ابو سعید ابو الخیر متوفی سنہ ۴۴۰ھ کے ہم عصر مانے گئے ہیں اور ان کی عمر ۳۷۰ سال بتائی گئی ہے —

شیخ لقمان آں زمان با بایزید   بود باقی تا بدور بوسعید

عمر او صد بود و هفتاد و سه سال   دائما در قرب بود و در وصال

(مثنوی بہلول صفحہ ۲، نولکشور)

اس کتاب کے خاص مضامین یہ ہیں۔ حمد و نعت، تخلیق آدم، حکایت بلال، حکایت اندر دست رموز، حکایت سلطان محمود (سلطان ایک ویرانے میں جاتا ہے وہاں ایک دیوانہ رہتا ہے۔ معلوم ہوا کہ شیخ لقمان سرخسی ہیں جو حسین سے ملے آئے تھے، اس نے انا الحق آشکارا کہا تھا۔ جب لقمان پہنچے وہ مر چکا تھا اور فرشتے اس کو غسل دے رہے تھے اور جنازہ کے بعد ایک سبز صندوق میں رکھ کر آسمان کی طرف لے گئے، وغیرہ وغیرہ)، حکایت بہلول در بغداد، حکایت آوردن بایزید پوستین امام جعفر صادق (امام جعفر شیخ بایزید کے ہاتھ اپنا پوستین لقمان سرخسی کے لیے بھیجتے ہیں) حکایت منصور (منصور نامہ والی حکایت ہے اور آئندہ اوراق میں مذکور ہے) حکایت فتح سومنات (جب محمود نے ایک لاکھ فوج کے ساتھ سومنات پر حملہ کیا، مشرک قلعہ بند ہو کر لڑے اور سنگ باری سے سلطانی فوجوں کا بے حد نقصان کیا، محاصرہ چھ ماہ تک قائم رہا لیکن عقدۂ مقصود نہ کھلا۔ ایک دن سلطان نے جناب الٰہی میں دعا کی۔ اسی حالت میں اس پر بے خودی طاری ہو گئی، عالم رویا میں دیکھتا ہے کہ ایک نورانی صورت بزرگ تشریف لائے، ایک خشت ان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ خشت انھوں نے قلعے کی دیوار پر کھینچ

طبیعت سے اعلیٰ شعر ڈھلنے لگے ہیں ۔

سخن گفتم سرم مقادر ایشں | سرم با داد اے خاک پا یش
سخن ر آسماست اے مردیگانہ | بہانہ دان مرا اندر میانہ
سخن لے طرز او بے یار آید | اگر گوئی نگارے بار باید
اجازت چونکہ شد از حضرت پاک | ہمی گویم سخن گستاخ و چالاک
چو از حضرت اجازت شد بہ ما کم | نکو آید سخن از طبع پاکم

(کلیات صفحہ ۱۴۱، طبع نول کشور)

اس دیباچے کے بعد غزلیات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، جس کی تمام غزلیں دیوان عطار سے لی گئی ہیں۔ تعجب ہے کہ یہ مقدس سرقہ اب تک طشت از بام نہیں ہوا۔

(۶) وصلت نامہ

اس کے کئی نسخے نویں قرن کے لکھے ہوئے آج بھی موجود ہیں۔ معلومہ نسخوں میں سب سے قدیم وہ ہے، جو انڈیا آفس[۹۱] کے کتب خانے میں ہے اس کی تاریخ کتابت ۸۱۲ھ ہجری ہے۔ فہرست نگار عطار کا تسلیم کرتے ہیں ڈاکٹر اسپرنگر نے ایک مقام پر شیخ عطار[۹۲] کا بیان کیا ہے، دوسرے موقعے پر شیخ بہلول[۹۳] کا لکھا ہے۔ نول کشور نے مثنوی شیخ بہلول کے نام سے اس کو چھاپ بھی دیا ہے اور سنہ ۱۲۹۷ ہجری میں بار دوم طبع کیا ہے۔ ابتدائی شعر ہے ۔

ابتدا اوّل بنام کردگار | خالق ہفت و شش و پنج و چہار

شیخ لقمان سرخسی اس کتاب کی مرکزی شخصیت ہیں، جن کو بایزید حمید

۹۱ فہرست صفحہ ۶۱۸، نمبر ۱۰۳۴ ۹۲ فہرست کتب خانہ اودھ صفحہ ۳۵۵
۹۳ فہرست کتب خانہ اودھ صفحہ ۳۷

پھر کر بولے ابوسعید! میں نے تجھے بھی دیا ہے۔ اب لقمان اُٹھے اور ابوسعید کا ہاتھ پکڑ کر لے چلے، راستے میں پیر ابوالفضل حسن ملے، کہنے لگے اے ابوسعید تمہارا راستہ ادھر نہیں ہے۔ اِس پر لقمان ابوسعید کا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دے کر چلتے بنے" (تذکرۃ الاولیائے عطار صفحہ ۳۲۴، جلد دوم)

امام جعفر صادق کا بایزید کے ہاتھ شیخ لقمان کے لیے پوستین بھیجنا تاریخی لحاظ سے ناممکن ہے۔ جعفر صادق اور شیخ لقمان کے زمانوں میں جو فرق ہے، ظاہر ہے۔ نہ لقمان کی درازی عمر کے متعلق کوئی روایت موجود ہے۔ رہا سومنات کا واقعہ، اس کے متعلق شیخ عطار اپنے تذکرے میں صاف صاف لکھتے ہیں کہ فتح سومنات شیخ ابوالحسن خرقانی کے خرقے کی برکت سے حاصل ہوئی تھی جو شیخ نے بروقت ملاقات سلطان کو دیا تھا۔ اُن کے الفاظ ہیں ـــ

"پس سلطان برفت بغزا، درآں وقت سومنات شد، بیم آں اُفتاد کہ شکستہ خواہد شد۔ ناگاہ از اسپ فرود آمد و بگوشۂ شد و روے بر خاک نہاد و پیراہن شیخ را بر دست گرفت و گفت الٰہی بحق آبروئے خداوند ایں خرقہ کہ مارا بریں کفار ظفر دہی کہ ہرچہ از غنیمت بگیرم بدرویشاں دہم۔ ناگاہ از جانب کفار غبارے و ظلمتے پدید آمد، تاہمہ تیغ دریک دیگر نہادند و می کشتند و متفرق می شدند تا لشکر اسلام ظفر یافت۔ وآں شب محمود بخواب دید کہ شیخ می گفت آبروئے خرقۂ ما بردی بردرگاہ حق، اگر دراں ساعت درخواستی جملۂ کفار را اسلام روزی کردے۔"

(تذکرۃ الاولیائے صفحہ ۲۰-۲۱ جلد دوم مرتبۂ نکلسن)

اس بیان کی تائید تاریخ فرشتہ و تاریخ ساکتی وغیرہ سے ہوتی ہے۔ اب شیخ عطار وصلت نامہ میں (اگر وہ اس کے مصنف ہیں) اسی واقعے

ماری جس سے دیوار ٹوٹ گئی۔ اتنے میں شاہی لشکر میں ایک شور مچ گیا سلطان کی آنکھ اِس شور سے کُھل گئی، ایاز خاص نے آکر دیوار ٹوٹنے کی مبارک باد دی اور کہنے لگا کہ غیب سے ایک خشت آکر ایسی لگی کہ دیوار ٹوٹ گئی۔ سلطان نے فرمایا وہ خشت میرے پاس لاؤ جب لائی گئی تو دیکھا کہ اس پر حضرت لقمان سرخسی کا نام کندہ تھا۔ سلطان شکریے میں شیخ سے ملنے جاتا ہے، لقمان محمود سے پیشین گوئی کرتے ہیں کہ مجھ سے ڈھائی سو برس بعد شیخ محمد پیدا ہوں گے) حکایت شیخ محمد مذکور و مرید او ابوبکر، حکایت زنانِ ضعیف، حکایت لو در و صحابی، مسرل خوف در حاجکاسب یحییٰ علیہ السلام وعیسیٰ علیہ السلام مہر لباس و ہیبت، حکایت بایزید و سائل، مسرل انس وجلیس، حکایت درویش مسافر و ابوسعید، مسرل جمال باجلال، حکایت لقمان و پیر بخارا، درمناجات ختم کتاب

وصلت نامے کے ان بعض بیانات سے جن کو اُوپر درج کر آیا ہوں، واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب شیخ عطار کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتی، کیونکہ اس میں خوارق کی ایسی فضا پیدا کر دی گئی ہے جو عطار کی طبیعت کے بالکل ناموافق ہے۔ اس کے اکثر بیانات افسانوی حیثیت رکھتے ہیں اور تذکرۃ الاولیاء عطار کے بیانات کے خلاف ہیں۔ مثلاً شیخ لقمان سرخسی کو جو وجاہت یہاں دی گئی ہے، وہ تمام روایات کے خلاف ہے۔ شیخ عطار نے شیخ ابوسعید ابوالخیر کے حالات میں اُن کے متعلق اِس قدر لکھا ہے کہ "وہ عقلائے مجانین میں سے تھے ایک روز پوستین کے پیوند لگا رہے تھے کہ شیخ ابوسعید (جو ابھی طالب علم تھے) آنکلے، لقمان نے کچھ نجاست ان پر پھینک دی، انھوں نے خوشی سے اس کو برداشت کر لیا۔ اِس پر لقمان نے کہا لڑکے! میں تجھے اس پوستین کے ساتھ سی دوں؟ ابوسعید نے جواب دیا آپ کی خوشی۔ پھر کچھ ٹانکے

بر سرِ بہلول از قدم تا سر کلاه　　رحمت کرده است یزدان رہنما (کذا)

محو گردان اے خدا بہلول را　　وا رہان از خویش این کول را

(ایضاً صفحہ ۳)

بلکہ شیخ بہلول نے ایک مقام پر شیخ عطار کی منطق الطیر سے ایک شعر بھی نقل کر دیا ہے اور حوالہ بھی دے دیا ہے۔ کہتے ہیں

آن چنانکہ گفت عطار امین　　در کتاب منطق الطیر از یقین

سایہ در خورشید گم گردد مدام　　خود ہمہ خورشید گردد والسلام

(ایضاً صفحہ ۲۹)

یہ حوالہ پروفیسر آذر کے کلیات (نوشتہ ۸۵۷ھ) میں موجود ہے صرف اس قدر فرق ہے کہ شعر عطار میں 'گردد' کی بجائے 'بینی' ہے کلیات عطار طبع نول کشور (صفحہ ۷۷، منطق الطیر) میں بھی ملتا ہے۔ لہذا میں اس شہادت پر انداز کلام و بیان کی بنا پر (جو عطار سے بالکل مختلف ہے) وصلت نامہ کو شیخ بہلول کی تصنیف مانتا ہوں یہ بھی واضح رہے کہ وصلت نامہ کے بعض جدید نسخوں میں ایک دو شعر ایسے بھی ملے ہیں جن میں عطار کا تخلص موجود ہے، مثلاً پروفیسر آذر کے وصلت نامہ مشمولہ کلیات (۸۵۷ھ) اور مثنوی شیخ بہلول (نول کشور) میں ایک شعر ہے۔

درد آمد ہمسر راہ عیان　　عاشق بے درد کے ماند روان

(صفحہ ۲۶)

گیارہویں صدی کے ایک قلمی نسخے میں اس کو یوں بدل دیا ہے -

درد آمد بر در راہِ عیان　　عاشقِ عطار بیتک در جہان

لیکن یہ ایک شاذ نادر مثال ہے اور یہیں عطار کے تخلص کی موجودگی

کو غیر ذمہ دارانہ طریقے پر لقمان سرخسی کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔

پیر بخارا کی حکایت بھی اسی قسم کے خوارق سے لبریز ہے، پیر یہ معلوم کر کے کہ شیخ لقمان سرخسی نماز نہیں پڑھا کرتے، ان کی ہدایت کے لیے بخارا سے روانہ ہوتے ہیں مگر اس شان کے ساتھ کہ وہ اپنے مریدوں کے شیروں پر سوار ہیں اور کوڑوں کے بجائے ہاتھوں میں سانپ ہیں، لقمان نے حسب اندروے کشف معلوم کیا کہ پیر بخارا اس ہول کے ساتھ اُن کی ہدایت کے لیے آتے ہیں تو یہ بھی ایک دیوار پر بیٹھ کر اُن کے استقبال کو روانہ ہوئے

میں کہتا ہوں کیا یہ خرافات عطار کی طرف منسوب کی جا سکتی ہیں

یہ افسانے ایسے عہد کی یادگار ہیں جب دنیا میں انقلاب مغول کے بعد اوہام پرستی اور جوش عقیدگی کی لہر دوڑ گئی ہے، پاک باز اور فرشتہ صفات صوفیوں کی جگہ اوباش اور عیار لے لیتے ہیں اور بزرگوں کی کرامات و خوارق کی تشہیر سے اپنی دکان فروشی کرتے ہیں۔ لقمان سرخسی کی شعبدہ بازیوں کی نمائش سے جو ہم "وصلت نامے" میں پڑھتے ہیں، عطار کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ قصے صرف لقمان کی قبر کے مجاور کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

وصلت نامے کے مختلف اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مصنف شیخ بہلول ہیں، چنانچہ۔

نام او کردم تو وصلت نامہ بس   زانکہ وصلت دیدہ ام از خویشتن
ہر کہ می خواہد کہ او واصل شود   در رہ بہلولش ہمہ حاصل شود

(مثنوی حضرت شیخ بہلول صفحہ ۴ طبع نول کشور ۱۲۹۷ھ)

گفتۂ بہلول از جانان بود   ہر چہ گوید آیت و برہان بود
گفتۂ بہلول را توحید داں   دانشش در ترک و در تجرید داں

(ایضاً صفحہ ۲۹)

وصلت نامہ اس کی طرف منسوب کرتے ہوئے فہرست برٹش میوزیم میں
لکھا ہے کہ اُن کا انتقال ۵۷۰ ہجری سے پیشتر ہوا ہے۔ (ریو) کے ذہن میں
غالباً شیخ بہلول دریائی ہیں، جو شاہ حسین مشہور بہ لال حسین کے پیر تھے۔ شیخ

(صفحہ ۱۶ کا بقیہ حاشیہ)

گفت وصلت نامہ را عطار پیر — ختم گرداں یا الٰہی دستگیر

کو بالکل اُڑا دیا ہے اور (۵) اس کے مقابل شعر کے مصرع –

درد بہلولیش ہمہ حاصل شود

کو تعلیب کر کے مصرع –

درد بہلولش اگر حاصل شود

میں تبدیل کر دیا گیا ہے (۶) مختصر یہ ہے کہ شیخ بہلول بہت چالاک سارق ہے، لیکن اُس
کی دلاوری ان اشعار میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے –

آں چنانم گفت عطار ایں — در کتاب مظہر از نور یقیں

سایہ در خورشید گم گردد مدام — خود ہمہ خورشید گردد والسلام

قطرہ اندر بحر دریا او فتد — در در خورشید والا او فتد

[یہ مصرع اصل میں یوں ہے –
"ذرہ بر خورشید والا او فتد"]

(محمود شیرانی)

گفتۂ عطار خود از مہر بود — لیک اندر صد لباس سحر بود

گفتۂ بہلول ازعاماں بود — ہر چہ گوید آب بریاں بود

گفتۂ بہلول را توحید داں — دائما در ترک و در تجرید داں

(۷) مثنوی ہذا مخصوص حلاج کے افسانے سے تعلق رکھتی ہے۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۸)

سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے۔ عطار کے نام پر وصلت نامہ کے انتساب کی غلطی نویں صدی ہجری سے پیشتر واقع ہوئی ہے اُس وقت سے اب تک یہ مثنوی شیخ ہی کی مانی جاتی ہے اور یہ بات کاتبوں کے ذہن میں ہمیشہ موجود رہی ہے، اس لیے تعجب نہیں اگر کسی دل چلے کاتب نے اس پر عطار کے نام کی مُہر لگانی چاہی ہو۔ خوش قسمتی سے پروفیسر آربری کا وصلت نامہ ایسی تقلیب سے پاک ہے اگرچہ "گفتۂ بہلول ار جانان بود الخ" اور اس کے ہم ردیف شعر میں غلطی سے بہلول کی بجائے عطار لکھا گیا ہے، لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ سہو ہے۔

رہے شیخ بہلول، مجھ کو افسوس ہے کہ میں سردست اُن کا سراغ نہیں لگا سکتا وہ کوئی غیر معروف شخص معلوم ہوتے ہیں۔ (ریو) نے ایک دیوان اور

سلہ میں یہ مضمون (تصنیفات عطار) ختم کر چکا تھا کہ پروفیسر آربری نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی فہرست "مجموعۂ کرزن" مرتبۂ ڈبلیو آئیوانو جو اسی سال چھپی ہے، نہایت مہربانی کرکے میرے پاس بھیج دی۔ فہرست مذکور میں (صفحہ ۱۶۴) ایک وصلت نامہ نمبر ۲۰۶ نوشتہ سنہ ۱۰۶۶ ہجری کا مذکور آتا ہے، اُس کے حاشیے پر مصنف کا نام شیخ الشیوخ شیخ بہلول مرقوم ہے۔

فہرست نگار کا بیان ہے کہ (۱) حاشیے کے علاوہ متن میں کئی موقعوں پر بہلول تخلص ملتا ہے (۲) ایسے اشعار کی جگہ جن میں عطار کا تخلص آتا ہے، خالی چھوڑ دی گئی ہے (۳) وصلت نامہ کے اڑتالیسویں شعر ـ

عاشقا این دم در آ در بزم جاں   تا بیابی سرّ عشق لامکاں

کو افتتاحیہ بنا دیا گیا ہے۔ (۴) دیباچے کے آخری شعر ـ

(باقی بر صفحۂ آیندہ)

(۷) منصور نامہ (یا) حلّاج نامہ

انڈیا آفس، بوڈلیں اور بانکی پور کے کتب خانوں میں موجود ہے اور فہرست نگار تینوں کی تسلیم کرتے ہیں، عاشر کا شعر ہے:-

بود منصور اے عجب شوریدہ حال در رہِ تحقیق او را صد کمال

اکثر نے 'منصورا' کو الف کے اسقاط کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ مثنوی علیحدہ چھپ بھی گئی ہے اور قلمی بھی ملتی ہے۔ اس میں منصور کے خلاف فتویٰ لگنے اور دار پر چڑھائے جانے کے حالات درج ہیں جو ہیلاج نامے سے ملتے جلتے ہیں۔

لکھا ہے کہ وہ پچاس سال تک اسرار پوش رہا، پھر اُس نے "انا الحق" کا نعرہ لگا کر اپنا راز فاش کر دیا۔ اہل تقلید نے فتویٰ مانگا، تین سو ستر عالموں نے کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ بغداد میں ایک سنسنی پھیل گئی۔ جب خلیفہ کو اس امر کی اطلاع ہوئی، اگرچہ منصور کا دوست تھا کیونکہ اس کی کئی تصنیفات پڑھ چکا تھا لیکن عوام اور جہلا کے خوف سے اُس نے منصور کے قید کیے جانے کا حکم دے دیا۔ جب منصور قید خانے میں لایا گیا، جیل میں اس وقت چار سو قیدی تھے۔ منصور نے آتے ہی اُن سے کہا کہ تم اپنے اپنے گھر چلے جاؤ۔ قیدی بولے۔ ہم لوگ بھاری بھاری زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کیسے جا سکتے ہیں؟ منصور نے اُن کے قریب آکر اپنا ہاتھ ہلایا، قیدیوں کی بیڑیاں کٹ کر گر گئیں۔ اُس وقت قیدیوں نے عرض کی قید خانے کے دروازے بند ہیں ہم باہر نہیں نکل سکتے۔ منصور نے ایک اشارہ کیا اور دیواروں میں چار سو رخنے نمودار ہو گئے۔ قیدی ان منفذوں سے باہر

محمود المعروف بہ محمد بیر نے اپنی مثنوی "حقیقت الفقرا" میں جو شاہ حسین کے حالات و کرامات میں ہے لکھا ہے کہ شیخ بہلول شاعر بھی تھے اور مثنوی "آداب" اُن کی یادگار ہے

نظم آداب نقشِ درو دست میاں ہمچو آیات مصحف از عثمان

لیکن ان کا انتقال سنہ ۹۸۳ ہجری میں ہوتا ہے ۔

چوں شد او واصل حرائے احد بود ہشتاد و سہ دگر نہ صد

اسی صدی میں ایک اور بہلول ملتے ہیں جن کا پورا نام فریدالدین احمد جہاں گیر ہے اور بقول "گلزار ابرار" ۹۴۷ھ میں وفات پاتے ہیں لیکن یہ تلاش بے سود ہے، کیونکہ ہمیں جس بہلول کی ضرورت ہے، وہ کم از کم آٹھویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں ۔

(صفحہ ۷/۱ کا بقیہ حاشیہ)

میں ان بیانات کے پڑھنے کے بعد بھی (جن کے ذکر کرنے میں تقدیم و تاخیر کا گنہگار ہوں) اپنے قدیمی نظریے پر قائم ہوں اور اب بھی مصر ہوں کہ مثنوی ہذا عطار کے شایانِ شان نہیں، نہ وہ اُن کے انداز میں مرقوم ہوئی ہے۔ اس کی اکثر حکایات عامیانہ وضع کی ہیں، جن کا عطار کے قلم سے نکلنا دشوار ہے۔ نمبر (۴) میں جو شعر درج ہے الحاقی ہے، نہ کلیات آذر میں موجود ہے، نہ دل کشور کی مثنوی میں۔ اُس کی زبان کی خامی میرے بیان کے بغیر ظاہر ہے۔ نمبر (۵) میں مصرع کو "در دِ بہلولیش ہمہ حاصل شود" پڑھنا شعر کو مہمل بنا دینا ہے (۶) شیخ بہلول کے خلاف سرقہ کا الزام بے حقیقت ہے، بلکہ میں یہ کہوں گا کہ ایسی خام اور سقیم نظم کا عطار کی طرف منسوب ہونا سخت ظلم ہے (۷) کتاب میں منصور کی صرف ایک حکایت ہے، زیادہ حکایات شیخ لقمان سے متعلق ہیں۔ پوری فہرست مضامین گزشتہ سطور میں آچکی ہے۔

رار کہتا ہی، اس کے بعد میں دار کے لیے تیار ہوں۔ دوسرے دن شیخ کبیر آگئے اور سیدھے منصور کے پاس گئے۔ ملامت کے لہجے میں کہنے لگے "اے توحید پرست! تو نے سرِّ حق کو کیوں فاش کیا، تو پچاس سال صاحبِ اسرار رہا، اب کیا ہو گیا کہ اس قدر بے خود ہو گیا"۔ منصور نے کہا "تم کو معلوم ہی کہ بحر معنی بے نہایت ہی اور انا الحق تو اس کی ایک ادنیٰ سی موج ہی تم سے لوگ اگر فتویٰ مانگیں تو دے دینا"۔ شیخ کبیر نے جواب دیا "میں فتویٰ نہیں دے سکتا"۔

شیخ گفتا آں چہ گفتی بے رواست من ہمی دانم کہ ذات تو خداست
چوں دہم فتویٰ رحل وارگماں من عیاں دیدم خدا را ایں زماں

منصور نے کہا خیر میرے کہنے سے دے دینا۔ شیخ کبیر اس کے بعد چلے آئے۔ عوام نے فتویٰ طلب کیا، شیخ نے کہا منصور نے کہلا بھیجا ہی کہ میں واجب القتل ہوں، مگر میری رائے ہی کہ وہ اہل ظاہر کے نزدیک واجب القتل ہی مگر باطن کے حال سے میں واقف نہیں۔ اس کے بعد سب لوگ جمع ہو گئے۔ منصور آیا اور سولی پر چڑھ گیا۔ انا الحق کے نعرے لگانے لگا۔ حالت یہ ہوئی کہ سنگ، وحشت، دار اور رسن تک سے انا الحق کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ظالم نے آکر اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔ منصور نے اپنا لہو بھرا ہاتھ چہرے پر مل لیا۔ شبلی نے دریافت کیا کہ تم نے ہاتھ منہ پر کیوں ملا؟ اس نے جواب دیا میں نماز عشق ادا کرنا چاہتا ہوں اور یہ اس کا وضو ہی۔ شبلی نے پھر سوال کیا کہ تصوف کا کوئی رمز بیان کرو۔ اس نے کہا اپنے آپ کو سب سے کمتر دیکھنا۔ پھر پوچھا کہ طریق عشق کا پتا دو۔ منصور کا جواب تھا:-

نکل گئے۔ قید خانے کے مہتمم نے جب یہ کیفیت دیکھی آکر اس کے قدموں میں گرگیا۔ منصور نے اس کو بھی چلے جانے کا حکم دیا۔ داروغۂ جیل کے جانے کے بعد منصور مناجات الٰہی میں مشغول ہوگیا۔

شبلی جنید کے پاس گئے اور منصور کے قید ہونے کی اطلاع دی جنید اپنے شاگردوں کو لے کر قید خانے پہنچے۔ وہاں جاکر دیکھا کہ مخلوق کثرت سے جمع ہو رہی ہے۔ اجازت لے کر اندر گئے اور منصور کو ملامت کرنے لگے کہ تم نے یہ کیا دیوانگی اختیار کی ہے، جو بات تم کہتے ہو وہ ہمارے پیشوا رسول اللہ نے بھی نہیں کہی، انا الحق کہنا کفر محض ہے۔ منصور نے جواب دیا تم ان اسرار سے بے خبر ہو، رسول اللہ نے "من رآنی" فرمایا "لی مع اللہ" کہا، خود خدائے پاک نے "نحن اقرب" فرمایا۔ تم مبتلائے تقلید ہو، واصلین کے مرتبے کیا جانو۔ اس پر ملاقات ختم ہوئی اور جنید باہر آگئے۔ لوگوں نے اُن سے فتویٰ طلب کیا، انھوں نے کہا میں ظاہر پر حکم دیتا ہوں باطن سے واقف نہیں۔ بعد ازاں شبلی منصور کے پاس گئے، کہنے لگے اے شیخ تو نے اپنا راز کیوں فاش کر دیا، اگر سر کی خیر چاہتے ہو تو سر کا ترک کہو۔ جواب میں منصور نے کہا میں منصور نہیں ہوں، بلکہ ـــ

من خدایم من خدایم من خدا ۔۔۔ فارغم از کبر و کین و از ہوا

اوّل و آخر ظاہر و باطن میں ہوں۔ میں سِرّ توحید کو آشکار کرنے آیا ہوں تاکہ بقائے حق میں باقی رہوں، مصطفٰے میرے پیشوا ہیں اور راہ یقین کے رہنما ہیں لیکن تم ان عوامیوں سے میرے لیے ایک روز کی مہلت مانگ لو، کیونکہ میرا ایک مخلص دوست جس کا نام شیخ کبیر (عبداللہ خفیف) ہے، کل تک یہاں پہنچنے والا ہے اور مجھ کو اس سے ایک ضروری

کی جاتی ہے، جس میں منصور قیدیوں کو رہا کرکے اور داروغۂ قید خانے کو روانہ کرکے قید خانے میں تنہا مناجات میں مصروف ہوجاتا ہے۔ مناجات کے اختتام کے بعد باقی حکایت کو ختم کیے بغیر منصور نامہ شروع ہوجاتا ہے اور منصور نامہ کے ختم پر اشتر نامہ بھی ختم ہوجاتا ہے۔ بہرحال منصور نامہ کو علیحدہ تصنیف ماننے میں ہم حق بجانب نہیں، اگرچہ وصلت نامے کا ایک حصہ ہونے کی حیثیت سے شیخ بہلول کی تصنیف ہے۔

(۸) بے سر نامہ

امین احمد رازی کی فہرست میں شامل ہے۔ تمام فہرست نگار عطار کا مانتے ہیں اور چھپ بھی چکا ہے، اس کا پہلا شعر ہے —

بس لغیر تو نہ بینم در جہاں ❊ تا درا پروردگارا جاوداں

یہ ایک ترجیع بند ہے اور ہر بند کے ترجیعی ابیات یہ ہیں:—

من خدایم من خدایم من خدا ❊ فارغم از کبر و کینہ و ز ہوا

سر بے سر نامہ را پیدا کنم ❊ عاشقاں را در جہاں شیدا کنم

بے سر نامہ میرے خیال میں کسی علیحدہ وجود رکھنے کا مستحق نہیں، اس کی تعمیر کا اکثر مواد منصور نامہ سے لیا گیا ہے فرق یہ ہے کہ منصور نامہ کا موضوع منصور ہے، لیکن بے سر نامہ میں یہ منصب شیخ عطار کو دیا جاتا ہے جو کبھی صیغہ متکلم اور کبھی صیغۂ غائب میں دکھائے گئے ہیں بے سر نامہ میں اصل قصے کی ترتیب، واقعات کی کوئی پروا نہیں کی گئی ہے اور نہ نفس قصے سے سروکار رکھا گیا مقصد صرف اتنا ہے کہ منصور کا درجہ عطار کو دیا جائے اور حدیث دار و رسن کی تجدید کی جائے۔ اس کتاب کو شیخ عطار کی طرف منسوب کرنا اسانی

گفت عشق این حالو و گردن دل بعد از آتش اندر سوختن

ان الفاظ کے ختم ہونے پر اس کا سر کاٹ دیا گیا۔ جب سر کٹ کر گرا، اُس سے انا الحق کی آواز برابر آ رہی تھی۔ تب منصور کے جسم کو جلا دیا اور ہوا اُس کی خاک اُڑا کر پانی میں لے گئی۔

منصور نامہ میں یہ قصہ ہے، جو مختصراً یہاں بیان ہوا۔ اِس مثنوی کے ہیلاج نامہ سے جہاں یہی قصہ ایک دراز طریقے پر بیان ہوا ہے، قدیمی تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ منصور نامہ درحقیقت کوئی علیحدہ مثنوی نہیں، بلکہ وصلت نامے کی ایک حکایت ہے، جو مطبوعہ وصلت نامے میں صفحہ ۱۴ سے شروع ہو کر صفحہ ۲ پر ختم ہو جاتی ہے۔ نول کشور نے ۱۲۹۷ھ میں وصلت نامے کو بار دوم چھاپا ہے، لیکن اس کا نام مثنوی حضرت شیخ بہلول رکھا ہے پروفیسر آدر کے وصلت نامے مشمولہ کلیات میں بھی یہ حکایت موجود ہے۔

منصور نامہ کے متعلق ایک حیرت خیز امر یہ ہے کہ وہ اشتر نامہ شامل کلیات پروفیسر آدر میں بھی موجود ہے، جہاں جاتے پر "در رفع شدن ہستی منصور و پیدا شدن حق و ختم کتاب" کی سرخی کے تحت میں پوری حکایت درج ہے۔ آخر سے تقریباً ایک صفحہ جو اصل قصے سے علاقہ نہیں رکھتا یا تو کاتب اتفاقیہ ترک کر گیا ہے، یا مختصر کرنے کی غرض سے نکال دیا گیا ہے یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ آیا منصور نامہ اصل میں وصلت نامہ کا ایک حصہ ہے، یا اشتر نامہ کا۔ اس کے متعلق میرا عقیدہ ہے کہ وہ فی الواقع وصلت نامہ کا ایک جزو ہے اور اشتر نامہ میں اُس کا ایراد غیر موزوں واقع ہوا ہے کیونکہ عین منصور نامہ کے قبل قریب قریب منصور کی یہی حکایت ایک وسیع پیمانے پر شروع

بے سرنامہ	منصور نامہ
(۸) بعد سیچہ سال او اسرار یافت	(۱۳) بود بیچہ سال او اسرار پوش
از فریدالدین لقب عطار یافت	ناگہاں از وے برآمد صد خروش
(مد ستنتم بے سرنامہ قلمی)	(مثنوی[1] حضرت شیخ بہلول صفحہ ۱۴ طبع نول کشور سنہ ۱۲۹۷ھ)
(۷) مردماں گفتند این چہ کردۂ	(۱۴) شبلیس گفت این زماں چہ دیدۂ
روے خود در خوں چرا آلودۂ	دست در ساعد چرا مالیدۂ
(۸) گفتم این دم می گزارم من نماز	(۱۵) گفت اینداَم می گزارم من نماز
پس بخوں سازم وضوئے پاکباز	پس وضو سازم بخوں اے پاکباز
(۹) این نماز عشق را آنجا وضو	(۱۶) کیں نماز عشق را این جا وضو
راست باید جز بخوں خو برد	راست باید جز بخوں اے خوبرو
(۱۰) بعد ازاں گفتند مرا اے مرد کار	(۱۷) بعد ازآں شبلی بگفت اے مرد کار
از تصوف این زماں رمزے بیار	از تصوف این زماں رمزے بیار
(۱۱) گفت کمترین کہ می بینی بہ بیں	(۱۸) گفت کمترین کہ می بینی بہ بیں
تا ترا در راہِ حق باشد یقیں	تا ترا در راہ حق باشد یقیں
(۱۲) بار دیگر گفتم اے صاحب نظر	(۱۹) بار دیگر گفت کاے صاحب نظر
از طریق عشق دہ ما را خبر	از طریق عشق دہ ما را خبر
(۱۳) گفت این جا لس بود گردن زدن	(۲۰) گفت عشق این جا بود گردن زدن
بعد ازاں بر سوختہ آتش زدن	بعد ازاں آتش اندر سوختن

[1] میرے پاس منصور نامہ علیحدہ بھی ہے، مگر قلمی ہے، اس لیے اس کے اشعار مثنوی شیخ بہلول مطبوعہ سے نقل کر رہا ہوں۔

ہم دستور یہ سیدا د توڑ ما ہو اس کے اثبات کے لیے ہم کو کسی کد و کاوش اور تحقیق و تلاش کی ضرورت نہیں ۔ اس قدر جاننا کافی ہو کہ بے سر نامہ منصور نامہ کی ایک مسخ شدہ شکل ہو ۔ فارسی ادبیات میں ایسے دلیرانہ سرقے کی مثال مشکل سے ملے گی ۔ میں بخوف طوالت بے سر نامے کے سارے گورکھ دھندے کو لکھنا نہیں چاہتا ، صرف بعض امثال پر قناعت کرتا ہوں ۔

بے سر نامہ	منصور نامہ (از ابتدائے حکایات)
(۱) بود عطار بے عجب شوریدہ حال	(۱) بود منصور بے عجب شوریدہ حال
در رہ تحقیق او را صد کمال	در رہ تحقیق او را صد کمال
۲) حال او حال عجب بود اے پسر	(۲) حال او حال عجب بود اے پسر
بے چو حال ایں کساں بے خبر	نے چو حال ایں خسیساں بے خبر
۳) در رموز سرّ حق بے پردہ بود	(۳) او رموز سرّ حق بے پردہ بود
نے کہ ہمچوں ما و تو در پردہ بود	نے کہ چوں ما راہ را گم کردہ بود
۴) او یقین خویش حاصل کردہ بود	(۵) او یقین خویش حاصل کردہ بود
در یقین خویش واصل گشتہ بود	در یقین خویش واصل گشتہ بود
۵) در علوم دیں وقوفے داشت او	(۸) در علوم دیں وقوفے داشت او
ہیچ علمے را فرو نگذاشت او	ہیچ علمے را فرو نگذاشت او
۶) عالماں از علم او در ماندہ اند	(۹) عالماں از علم او در ماندہ اند
عارفاں از عرف او وا ماندہ اند	عارفاں از عرف او وا ماندہ اند
۰) عاشقاں از عشق او حیراں شدند	(۱) عاشقاں از عشق او حیراں شدند
ہر دم از نوع دگر بریاں شدند	ہر دم از نوع دگر بریاں شدند

منصور نامہ	بے سر نامہ
لاجرم در صد ہزاراں پردۂ	لاجرم در صد ہزاراں پردۂ
(۱۷) وانگاہے کردۂ ایں حرقہ را	(۱۱) وانگاہے کردہ ایں حرقہ را
می دریی ہر زماں ایں فرقہ را	می دریی ہر زماں ایں فرقہ را
(۱۸) در خودی خود شد گرفتار آمدی	(۱۲) در خودیٔ خود گرفتار آمدی
لاجرم در عین پندار آمدی	لاجرم در عین پندار آمدی
(۱۹) راہ تجرید و فنا راہ تو نیست	(۱۳) راہ تجرید و فنا راہ تو نیست
تو سخن کم گو کہ کان راہ تو نیست	تو سخن کم گو کہ کان راہ تو نیست
(۲۰) رو کہ در تقلید ماندی مبتلا	(۱۴) رو کہ در تجرید ماندی مبتلا
سر توحید از کجا و تو کجا	سر توحید از کجا تو از کجا
(۲۱) رو کہ راہ بے نشان راہ تو نیست	(۱۵) رو کہ راہ بے نشان راہ تو نیست
عقل تو از راہ معنی در شکست	عقل تو از راہ معنی در شکیست
(مثنوی شیخ بہلول، صفحہ ۱۷۔ بیت ۵ تا ۲۱)	(سد ہشتم۔ بے سر نامہ قلمی)

بے سر نامہ کے کل دس سد ہیں۔ نول کشور کے بے سر نامہ (مشمولۂ کلیات) کے سدوں میں بے ترتیبی ہے اور متن بھی بے حد غلط ہے، اس لیے میں نے بے سر نامہ قلمی مملوکۂ پروفیسر آذر سے کام لیا ہے۔

(۹) خیاط نامہ

اس کی ابتدا ہے ۔

نام آں کہ ہستی رو نشاں یافت نفس ناطقہ ۔ زور جاں یافت

اور کتاب کا نام اس بیت میں واقع ہوتا ہے ۔

بے سر نامہ	منصور نامہ
(۱۴) این کہ گفتم این چنین شد حال من	(۲۲) این بگفت و این چنین شد حال او
منتشر شد در جہاں احوال من	منتشر شد در جہاں احوال او
(بسد دہم)	(صفحہ ۱۸ - بیت ۱۴ - ۲۲)
(۲) پیشوائے ماست ہمچوں مصطفیٰ است	(۵) پیشوائے ما ہمہ چوں مصطفیٰ است
لا جرم تو آنچہ گوئی کے رواست	لا جرم آنچہ تو گفتی بیت راست
(۳) بعد ازاں عطار گفت اے کور کر	(۸) بعد ازاں منصور گفتش شو بدر
وز رموز سرّ عشق اے بے خبر	از رموز سرّ معنیٰ بے خبر
(۴) تو بہ بیدے صورتے در ماندۂ	(۹) تو بہ ہر صورت وا ماندۂ
کے تو حرف حق احمدؐ خواندۂ	کے تو ہرگز حرف احمد خواندۂ
(۵) "لی مع اللہ" گفت احمدؐ درمیاں	(۱۰) "من رآنی" گفت احمد درمیاں
تو کجا دانی کہ ہستی بے نشاں	تو کجا دانی کہ ہستی بے نشاں
(۶) راز من گفتست احمدؐ از صفا (کذا)	(۱۱) "لی مع اللہ" گفت احمدؐ از صفا
تو کجا دانی کہ ہستی بے وفا	تو کجا دانی کہ ہستی بے وفا
(۷) تو بصورت ہمچو کافر ماندۂ	(۱۳) تو بصورت ہمچو کافر ماندۂ
واصل حق را تو کافر خواندۂ	واصل حق را تو کافر خواندۂ
(۸) خرقۂ ناموس را پوشیدۂ	(۱۴) خرقۂ ناموس را پوشیدۂ
وانگہے سالوس را کوشیدۂ	وانگہے سالوس را کوشیدۂ
(۹) بت پرستی می کنی در زیر دلق	(۱۵) بت پرستی می کنی در زیر دلق
می نمائی خویش را صوفی بخلق	می نمائی خویش را صوفی بخلق
(۱) تو بسلوک راہ را گم کردۂ	(۱۶) تو سلوک راہ خود وا کردۂ

کے بجائے سنہ ۹۹ ہجری دی گئی ہے، چنانچہ خاتمے کے چار بیت یہاں نقل کر دیے جاتے ہیں -

گناہ من فزوں از کف دریاست فزوں تر ہم ز اوراق شجرہاست
گناہ ترستی از حد بروں است کہ من از سینہ سی گویم فزوں است
بیامرزد فقد آں ستودہ حق دہد ایں نسخہ را با سلک رونق
ساند نفع ہم بر خاص و عام ایں کہ در ہشصد و نہ شد تمام ایں

بہلول کی حکایت کے آخر میں بھی شاعر اپنا تخلص لایا ہے -

نصیحت ہائے مسکین ترستی را نگوش خود نگیرد مرد دانا
بنادان ہر چہ می گوئی دریغ است ازاں کہ آفتابش زیر میغ است

اس نسخے کی ابتدا میں نثر کا ایک دیباچہ بھی ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے -

'الحمد للہ رب العالمین، والعاقبۃ للمتقین ولا عدوان إلا على الظالمین - قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حفظ على أمتي أربعين حديثا مما يحتاجون إليه كتبه الله فقيها عالماً - در امید این وعدہ ہر کہ یاد دہد امت من (کذا) چہل حدیث را کہ دراں خیر کہ محتاجند آدمیان آں خیر را، بوی رسد خدائے تعالیٰ ویرا فقیہ عالم'

پہلے صفحے میں اسی طرح سے کئی حدیثیں نقل ہیں اور ان کا فارسی ترجمہ بھی ساتھ ساتھ دے دیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ساتھ والا ورق موجود نہیں ہے، جس میں دیباچے کا بقیہ حصہ ہونا چاہیے۔ تاہم اس قدر صاف سمجھ میں آتا ہے کہ مصنف نے اس مثنوی میں چہل حدیث بیان کی ہیں اور احادیث کے مناسب حال حکایات بھی درج کر دی ہیں۔ بہر حال "کنز الاسرار" شیخ عطار کی کوئی

جوہر کاغذ بہ آدم نوک خامہ — نوشتم نام ایں حیاط نامہ

اکثر فہرست نگار مثلاً اسپرنگر، ایتھے، عبدالمقتدر خاں اور آئیوانف شیخ عطار کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن حاجی خلیفہ (کشف الظنون جلد اوّل صفحہ ۳۴۶ طبع مصر سنہ ۱۳۱۱ ہجری) اس کو حیاط کاشانی کی تصنیف بیان کرتا ہے۔ فہرست نگار حیاط کو بہ تخفیف تشدید 'یا' پڑھتے ہیں، لیکن بیت مذکورۂ بالا میں یا پر تشدید موجود ہے۔ مجھ کو اس مثنوی کے مطالعے کا موقع نہیں ملا۔

(۱۰) کنز الاسرار

اسٹورٹ نے اس کا نام "کنت کنزاً مخفی" لکھا ہے۔ ڈاکٹر ایتھے نے 'کنز البحر' ایک اور نام بتایا ہے۔ اس کے خاتمے میں یہ شعر آتا ہے۔

رساند نفع را بر خاص و عام ایں — کہ در شش صد بود بہ شد تمام ایں

اگرچہ نسخوں میں "شش صد بود بہ" ملتا ہے لیکن ڈاکٹر ایتھے نے اس کو سہو کاتب پر محمول کر کے اس کا نسخہ 'پنج صد بود بہ' یا 'شش صد بوادہ' تجویز کیا ہے[۵۱] جو قابلِ قبول نہیں۔ میرزا محمدؒ کہتے ہیں "وایتہ در فہرست کتب فارسیہ دیوان ہند — بیت کنز الاسرار را محمل بر غلط بودن نسخہ کردہ است و ایں سہو است — وایں — کتاب از عطار نیست — و کنز الاسرار معلوم نیست از کیست[۵۲]" آئیوانف اس معاملے میں میرزا محمدؒ سے بالکل متفق ہے کنز الاسرار کا میرے پاس بھی ایک نسخہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف کا تخلص تربتی ہے، اس نسخے میں تاریخ تصنیف سنہ ۶۹۹ ہجری

---

[۵۱] فہرست کتب فارسیہ انڈیا آفس نمبر ۱۳۱ (۸)

[۵۲] مقدمہ اسعادی تذکرۃ الاولیائے عطار صفحہ لو۔

سے پرانے برٹش میوزیم[۵۱] اور بانکی پور[۵۲] کے کتب خانوں میں ہیں، ان پر کوئی تاریخ نہیں، لیکن فہرست نگاروں کی رائے میں گیارھویں صدی کے نوشتہ ہیں، اس سے گمان گزرتا ہے کہ "مظہر العجائب" گزشتہ تصنیفات کے مقابلے میں سب سے کم عمر ہے۔ تمام فہرست نگار حسب معمول عطار کی تصنیف مانتے ہیں۔

جب میں اس کتاب کے تبصرے کے لیے آمادہ ہوا تو لاہور میں اس کا ایک نسخہ تک موجود نہ تھا، مجبوراً میں نے پروفیسر سراج الدین آذر کی خدمت میں دستگیری کی التجا کی، انھوں نے کوشش کرکے کچھ ہی عرصے میں تین نسخے مہیا کر دیے، میں ان کی اس مہربانی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان میں سے ایک نسخہ یار علی نے کلکتہ[۵۳] میں ۱۵ جمادی الاوّل سنہ ۴۲ عالمگیری مواقع ۱۱۱۲ھ میں نقل کیا تھا۔ اس نسخے کے ۶۶۲ صفحات اور فی صفحہ تیرہ، چودہ، پندرہ یا سولہ سطریں ہیں، اس لیے اشعار کی تعداد تخمیناً نو یا دس

---

۵۱ ایڈ نمبر ۶۶۲۱، صفحہ ۵۷۹، جلد دوم فہرست کتب فارسیہ۔

۵۲ نمبر ۴۶ صفحہ ۶۵ (۲) فہرست کتب فارسیہ۔

۵۳ سنہ ۶۱۷ع مطابق سنہ ۱۱۱۲ھ کے قریب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دیہات سوتانٹی کالی کٹا اور گوبند پور شہزادۂ عظیم الشان صوبہ دار بنگال سے خرید کر کلکتہ کی بنیاد ڈالی۔ تعجب ہے کہ ایسے ابتدائی زمانے میں مسلمان کاتب کلکتے پہنچ جاتے ہیں مگر تاریخ جلوس عالمگیری اور تاریخ ہجری آپس میں مطابق نہیں ہیں یعنی سنہ ۴۲ جلوس عالمگیری سنہ ۱۶۹۹ع مطابق ۱۱۱۲ھ کے مطابق ہے، جب کلکتے کا دنیا میں وجود ہی نہیں تھا سنہ ۱۱۲ ہجری میں اورنگ زیب زندہ نہیں تھا وہ سنہ ۱۱۱۸ ہجری میں وفات پا چکا ہے اگر کاغذ، خط اور سیاہی کی شہادت کا لحاظ کیا جائے تو نسخۂ ہذا کی تاریخ تیرھویں قرن ہجری کی ابتدا میں ماننی پڑے گی۔

علاقہ نہیں رکھتی ۔

۱۱۔ وصیت نامہ

دولت شاہ نے شیخ کی تصنیفات کی فہرست میں اس کو شامل کیا ہے[۵۱]۔ اسٹیورٹ نے اپنی فہرست میں اس کا نام 'اوسط نامہ' بتایا ہے[۵۲]۔ پروفیسر[۵۳] شیرانی نے 'مثنوی مصباح' لکھا ہے اور فہرست نگار عطار کی تصنیف مانتے ہیں۔ اس مثنوی کا پہلا شعر ہے :۔

اے سامت کار ہا را افتتاح   نیست بے نام تو درامرے فلاح

لیکن اس مثنوی کے ایک شعر سے جو پروفیسر شیرانی نے فہرست کتب[۵۴] فارسیہ ریاست کپور تھلا ۲۵-۱۹۲۴ء میں نقل کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۸۲۵ ہجری کی تصنیف ہے' وہ یہ ہے ۔

چوں گزشت از ہجرت خیرالانام   ہشت صد و بیست و دو ایں شد تمام

اس لیے نہیں ماننا چاہیے کہ اس کتاب سے عطار کو کوئی تعلق نہیں ۔

(۱۲) مظہرالعجائب

دولت شاہ اس تصنیف سے واقف نہیں ۔ امین احمد رازی قاضی نوراللہ شوستری اور حاجی خلیفہ اس کا ذکر کرتے ہیں ۔ معلومہ نسخوں میں سب

---

[۵۱] تذکرۂ دولت شاہ صفحہ ۱۹۰ مرتبۂ پروفیسر براؤن۔

[۵۲] منقول از فہرست کتب فارسیہ انڈیا آفس۔

[۵۳] دیال سنگھ کالج لاہور میں عربی اور فارسی کے پروفیسر اور پنجاب یونیورسٹی میں لیکچرر ہیں۔

[۵۴] صفحہ ۴ ۱ و نمبر ۱۰۴۔

مانز نقطے ہم زشتلی گویمت سرے از اسرار علمی گویمت
(ص ۵۸۵)

سے دوبارہ رمل کی طرف مراجعت کی جاتی ہے اور خاتمے تک یہی وزن رہتا ہے۔[1]

چند کلمے جوہر الذات اور مظہر العجائب کے تعلقات کی نسبت کہے مناسب معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ دونوں کتابوں میں زبان اور مضمون کے لحاظ سے کوئی اتحاد نہیں، تاہم صاحب "مظہر العجائب" مصر ہے کہ جوہر الذات میری تصنیف ہے، قدم قدم پر اس کا اعلان کرتا ہے اور سینکڑوں موقعوں پر دونوں کتابوں کا نام ساتھ ساتھ لاتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ اگرچہ میں نے سو کتابیں لکھی ہیں، لیکن "جوہر" اور "مظہر" ان میں نہایت قیمتی اور چوٹی کی کتابیں ہیں۔

جوہر ذاتم جہاں را جاں بود زانکہ او از معنیٔ قرآں بود
مظہرمن راز انساں الغیب داں اوست اسرار دو عالم را زباں (ص ۱۲)
رمظہر گردی تو انسان کامل رجوہر ذات می گردی تو واصل (ص ۵۳۲)
مظہرم می خوان وجوہر گوشدار تا بیابی در معنیٔ بے شمار (ص ۱۲۴)

ان بیانات سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کتابیں ایک ہی مصنف سے علاقہ رکھتی ہیں، لیکن ان کی زبان، انداز کلام اور تاریخی معلومات پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کتابوں کے مصنف دو مختلف شخص ہیں، مثلاً الفاظ "حقیقت" اور "خاگاہ" وغیرہ جو صاحب جوہر کے لیے عصائے پیری کا حکم رکھتے ہیں، مظہر میں مطلق غیر حاضر ہیں۔ بعض باتیں ان میں مشترک ہیں، مثلاً مظہر میں "انا" کا استعمال جا بجا موقعوں پر نظر آتا ہے، مگر

---

[1] ایک مقام پر چند صفحات کے لیے بحر بدل دی گئی ہے۔ اس قسم کی اور مثالیں بھی ہوں تو کوئی تعجب نہیں

ہزار کے درمیان ہوگی۔ ابتدا کا شعر ہے۔

آفریں، جاں آفریں جاں جاں   زاں کہ ہست او آشکارا ہم نہاں

چونکہ کتاب چھپی نہیں ہے، اس لیے اِس کے بعض عنواں یہاں نقل کیے جاتے ہیں:-

درمیاں کتاب جوہر الذات۔ روایت نجم الدین کبریٰ، در آمدن سید کائنات حجرۂ علی علیہ السّلام۔ گفتن شیخ نجم الدین کبریٰ را حال خود۔ سپردن پدر شیخ را بمعلم، دیدن شیخ پیر سالک و رسیدن بسید ناصر، آوردن جبریل بیلے سرد سید کائنات، در آتش رفتن بو در عماری با امیرالمؤمنین، در واقعۂ پیر سالک کہ پیش شیخ آمد۔ قصۂ جنگ خندق، شکستن ایاز گوہر را بفرمان سلطان محمود، قصۂ سید با تیر و غلام، درمیان اہل مناصب۔ قصۂ شقیق بلخی و امام موسیٰ کاظم و ہارون الرشید۔ قصۂ پادشاہ احمد۔ قصۂ خواجہ اسرار و امام ابوبکر۔ قصۂ حکیم و پیر عراقی۔ پند دادن شیخ حسین فرزند را، قصۂ پادشاہ عادل و امیراں ظالم۔ قصۂ عیارانِ خراساں و بغداد۔ سوال کردن پیر سالک از عطار بسوال از شیخ شبلی در واقعۂ خواجہ نیشاپوری و رفتن شیخ۔

اس کتاب[۵] کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ دو بحریں ہیں، یعنی صفحہ ۷۴۴ تک بحر رمل مسدس میں اشعار ملتے ہیں اور شعر :-

گنہگارم ز فعل بد گنہگار   خدا وندا توئی دانائے اسرار

کے بعد سے بحر ہزج میں طبع آرائی کی جاتی ہے، اور بیت۔

---

[۵] علّامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے مقدمۂ تذکرۂ "عطار" میں اور پروفیسر براؤن نے جلد دوم "تاریخ ادبیات ایران" میں شیخ عطار کے اکثر حالات اسی کتاب کے حوالے سے نقل کر کے اس کو ایک باعث اعتبار دے دیا ہے۔

رو تو ایں معیت اما مطہرہ مد — تا شوی در ملک معنی سربلند
زانکہ حیدر در درون یار گفت — ہم ابا منصور ہم ما دار گفت

باستمش، بمعنی سکونت ۔

اے برادر علم معنی دانش است — زاں مراد در کوئے معنی باشش است
ہرکرا باشد سعادت رہنموں — جائے باشش باشدش شاید درون

زایدہ، بجائے زائیدہ ۔

خود نظامی بود از من زایدہ — دادہ ام او را بمعنی فائدہ

قولہ = مضارع ۔

اگر من راستی گویم بلولند — طریق راستی را کے مولند

رافض بجائے رافضی ۔

اے منافق تو مرا رافض مخواں — زانکہ ہستم من محب خانداں
ہرکہ رافض خواندم ملعون شود — ہمچو سگ دائم سرش در خوں شود

روافض، بجائے رافضی ۔

زنادانی روافض خوانیم تو — ز دین مصطفےٰ میرانیم تو

خارج بجائے خارجی ۔

ازیں مردم بسے دیدیم خارج — ازاں کردیم شاں از دوست خارج

تذکیرہ، بجائے تذکرہ ۔

کتابے را کہ آں تذکیرہ نامست — مراد را شربت کوثر بجامست

دیگر

بیان علی خواہی بدانی — بذکر اولیا تذکیرہ خوانی

بعض اسالیب ایسے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی مولانا

جوہر کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ادائے مضمون میں دونوں کتابوں میں بے ترتیبی اور طوالت کا ڈھنگ موجود ہے۔ دماغی قابلیت اور شاعری کے لحاظ سے دونوں مساوی ہیں، صرف اتنی سی کا فرق ہے ایک ہی لفظ یا فقرے کی تکرار سے اشعار کی ابتدا ہونا جو "جوہر الذات" کا جو ایک پہلو ہے، "مظہر" میں اس سے بھی وسیع پیمانے پر نظر آتا ہے۔ ناصر خسرو کو دونوں کتابوں میں ایک قابل عزت حیثیت حاصل ہے۔ "جوہر" میں حضرت علیؑ کا ذکر نہایت احترام اور توقیر کے ساتھ ملتا ہے، لیکن وہ عقیدت اور خلوص غیر حاضر ہے جو مظہر میں نمودار ہے یہاں حضرت علیؑ کو وہی رتبہ حاصل ہے جو "جوہر" میں منصور کو دیا گیا ہے۔ تاہم صاحب مظہر العجائب کہتا ہے:۔

از برائے روح احمد جوہرم وز برائے روح حیدر مظہرم

اس سے میں خیال کرتا ہوں کہ مصنف مظہر العجائب نے غالباً "جوہر الذات" کو دیکھا تک نہیں، کیونکہ یہ کتاب جس کا "ہیلاج نامہ" ایک سلسلہ ہے، درحقیقت منصور کے لیے لکھی گئی تھی "جوہر الذات" میں رواداری کی روح موجود ہے اور تمام فرقوں حتیٰ کہ گبر و ترسا و یہود کو بھی مساوی مان لیا گیا ہے۔ "مظہر" میں مذہبی جوش غالب ہے اور مصنف سوائے اپنے عقیدے کے لوگوں کے سب پر تبرا بھیجتا ہے۔ "جوہر" میں منصور کی طرح دار پر چڑھائے جانے کی آرزو بے حد زبردست ہے، لیکن صاحب مظہر کو عام انسانوں کی طرح اپنی جان عزیز ہے۔

یہاں مظہر کی بعض خصوصیات لسانی بیان کی جاتی ہیں۔

اما بمعنی ما:۔

آں الم ئے کو حق اسرار گفت ہم انا منصور ہم ما دار گفت ص۱۵

کتاب ہذا کے دوران میں مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے ہیں -
اپنے نام کے لیے کہا ہو :-

ہست نام من محمدؐ با فرید   گشتہ عطارے معانی بر مزید
من زباب علم عطار آمدم   لاجرم گویاے اسرار آمدم

اور حسینی ہونے کا دعویٰ ہو -

حسینی ام اران نام من کیمیی   بریدی، کشتی، درعوں کشیی

جاے ولادت نیشاپور اور تونی الاصل ہیں -

جود مرا مولد نیشاپور بود   لیک اصل من زکوہ طوز بود

دیگر

اصل من از تون و نیشاپور جاے   باشدم در مشہد سلطاں سراے

دیگر

اصل من از تون و نشاپور دہری   جاک طوس است جوہرم از علی

ایام طفلی میں جب تون میں قیام تھا، برابر آٹھ ماہ تک شدید بیماری میں مبتلا رہے، مرض روز بروز ترقی کرتا گیا، حتیٰ کہ والدین اُن کی زندگی سے مایوس ہوگئے، کفن آگیا اور قبر تیار ہوگئی - یہ بوجہ اشتدادِ مرض بیہوش تھے - اس عالم میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ آئے اور محبت کے لہجے میں ان سے کہا - میاں لڑکے ڈرو مت ! ہم تمھیں اچھا کرنے کے لیے آئے ہیں تم زندہ رہوگے اور تمھارا کلام بہت مقبول ہوگا - اس کے بعد آگے بڑھ کر اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا اور فرمانے لگے - صاحبزادے ! تم ہمارا نام بھی جانتے ہو ؟ سنو ! میں علی ہوں، تم مجھ کو تون، طوس، کاشان، حلہ، نیشاپور سبزوار، روم، نجف، آمل اور ساری میں تلاش کرنا - مریض نے ایسا سر

روم مصنف کے زیر مطالعہ رہی ہے۔

(مظہر العجائب) (مثنوی معنوی۔ طبع نول کشور سنہ ۱۹ء)

"استوں بجائے ستوں۔

چار یار ند لیک در مذہب یکند گرچہ تقلید ست استوں جہاں

چار استوں شریعت پیشکند ہست رسوا ہر مقلد را امتحاں (ص۵۶۲)

خانۂ در شرع احمد ساختند بر پئے عیر است سراد بہر من

چار استوں اندرو پرداختند خانۂ سمع و بصر استوں تن (ص۵۵۴)

اشکست بجائے شکست۔

گفت ایں در راچرا اشکست تو اے در از اشکست خود سر مرں

بعد ازیں خواہد شدن اشکست تو کز شکستش روستی خواہد شدن (ص۱۲)

اشگاف بجائے شگاف۔

مرا خود طاقت اشگاف بود پس کنیزک آمد از اشگاف در

چیں رحبسے بر او الطاف بود دید خاتوں را بمرد زیر خر (ص۱۴۴)

اس کے علاوہ سلطان محمود کے حکم سے ایاز کے گوہر توڑنے کی حکایت دونوں مثنویوں میں عام ہے۔ مولانا رومؒ کی غزل کا ایک مشہور شعر ہے۔

من ز قرآں برگزیدم مغز را پوست را پیش سگاں انداختم

مظہر العجائب میں یوں آتا ہے۔

روز قرآں مغز گیرد پوست ماں پوست را انداز پیش کرگساں

شیخ عطار کی عادت کے برخلاف مصنف مظہر العجائب اپنے متعلق بہت کچھ کہنے سننے کا عادی ہے، چنانچہ سب سے زیادہ حکایتیں اس نے اپنے ہی متعلق لکھی ہیں۔ یہاں وہ حستہ حستہ حالات دیے جاتے ہیں، جو

تم کو چاہیے کہ عرفانیات میں اُس کو درس دو، نہ رہبانیت میں۔ ہم نے اُس کو علم سلطانی، الماس حکیمی، حرز حیدری، تحفت اولیا، تاج اصفیا، تنزل کشف اور نورس عرف، عطا کیا ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ جب میں نے اُستاد سے یہ خواب سُنا، میرے جسم میں ایک بجلی سی دوڑ گئی، میں ولایت کے لیے بے تاب ہوگیا اور مختصر یہ کہ جب مرشد نے بدرجۂ غایت مجھ کو وارفتہ دیکھا، ارشاد کیا کہ علوم صوری کو دل سے بھلا دو، میں حکم بجا لایا اور پورے ایک چلّے شیخ کی خدمت میں رہا اور اپنے مقصد پر فائز ہوگیا۔ بعد میں اجازت لے کر رخصت ہوا اور عزلت نشیں ہوگیا۔ اس حکایت کی ابتدا ہے۔

چوں پدر ایں بندہ را تعلیم کرد   اوستادم ہم مرا تعظیم کرد

ایک موقعے پر کہتے ہیں کہ میں نے سات سو دس کتابیں پڑھی ہیں تب کہیں جاکر علم الٰہی حاصل ہوا۔

ہفصد و دہ من کتب را خواندہ ام   تا معانی جدا دانستہ ام (ص۲۹۳)

دوسرے موقعے پر یہ تعداد ایک ہزار تنائی ہے۔

دو ہزار صد خود کتاب اولیا را   دوبارہ خواندہ ام خود اولیا را

ایّام طفلی میں سترہ سال تک مشہد میں رہے اور مزار امام رضا پر راتوں کو اوراد و وظائف پڑھتے رہے۔ آخر روح امام نے اُن کا مقام نیشاپور تجویز کیا۔

بوقتِ کودکی من ہفدہ سال   بمشہد بودہ ام خوش وقت و خوشحال

بحالِ کودکی بر آستانش   بسے با خواندہ ام ورد زبانش

مرا از روح او آمد ندا   دگر گفتا کہ نیشاپور است ترا جا

جس رسالے میں "مظہر" لکھی جارہی تھی، اُس وقت ایک سلطان

حضور کے قدموں پر رکھ دیا آنحضرت کے جانے کے بعد پسینہ آیا اور خدائے پاک نے صحت عطا کر دی۔ اس حکایت کا پہلا شعر ہے ۔

من بدم در تون بوقت کودکی گشتہ بیمار و گرستہ از خودی (ص۱۳۴)

ایک حکایت میں بیان کرتے ہیں کہ جب والد نے مجھ کو تعلیم کے لیے بٹھایا تو میرا اُستاد بھی میرا ادب کرتا تھا، وہ ایک فاضل شخص تھا، حکمت لقمان و تصوف میں کامل۔ حضور روحانی طریقے سے امام صدر سے سیکھی تھی۔ نجم الدین کبریٰ کئی مرتبہ اُس سے ملنے آئے، لیکن وہ فخر الدین (رازی) سے ناخوش تھا۔ تین سو ساٹھ عارف اس کی خدمت گزاری میں مصروف رہتے تھے۔ ایک روز یہ اُستاد جس کا نام زبان پر لانا گستاخی سمجھتا ہوں کہنے لگا کہ میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ دروازے سے کوئی شخص اندر داخل ہوا جب قریب آیا تو میں نے پہچان لیا کہ رسول اللہؐ ہیں میں دوڑ کر آپ کے قدموں میں گر گیا، جب میں نے جو دیکھا تو آپ کے ہمراہ حضرت علیؓ بھی تھے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا: جانتے ہو میرے ساتھ کون ہیں؟ میں نے عرض کی: اے ختم الانبیا پہچانتا ہوں، یہ وہی ہیں جو میرے ایمان ہیں اور آپ کے بعد امام کل، تمام آفاق انہی کی ذات کے پَرتو سے روشن ہے۔ تمام نبیوں کے امام اور پیشوا یہی ہیں، آدم یہی ہیں اور عیسیٰ ابن مریم اور منصور بھی یہی ہیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا، تم تو اولیاؤں کی سی باتیں کرتے ہو۔ اُس کے بعد ارشاد فرمایا کہ صبح کے وقت تمہارے پاس ایک امیر مع ایک بندے کے آئے گا، اس کو تم جام اسرار پلا دینا، کیونکہ وہ عطار ہوگا اور عالم پر ہمارے اسرار ڈالے گا۔

او بود عطار و عطر اشتاں شود بوئے مشکش ہمہ در جاں بود

اُس نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ بغداد میں میرا گزر ہُوا - کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص سربسجدہ ہے اور چاروں طرف خلائق کا ہجوم ہے، وہ شخص مناجات میں مشغول تھا - جب مناجات ختم ہوئی، افسر نے جلاد سے کہا بڑھو اور اپنا کام کرو - جلاد اس کو ایک بلند طاق پر لے گیا اور وہاں سے گرا دیا، وہ شخص گر کر مرگیا اور اس کی لاش آگ میں جلا دی گئی - میں نے مقتول پر وجہ سیاست دریافت کی مجھ سے کہا گیا کہ دجلے کے کنارے کچھ لوگ جمع تھے، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے عقیدے اور مسلک کے مطابق گفتگو کر رہا تھا - کسی نے کہا سب کی اصل حضرت آدم ہیں - دوسرے نے کہا رسول اللہؐ ہیں - ایک نے کہا نبوت کو فضیلت ہے - دوسرے نے کہا نبوت پر ولایت کو شرف حاصل ہے - اس پر سوال اُٹھا کہ ولایت کس کا حق ہے - مقتول نے کہا حضرت شاہ ولایت کا، جو افضل ہیں، اور جو اس پر یقین نہیں رکھتا، کافر ہے مصنف کی دینی حرارت ذیل کے اشعار سے واضح ہوتی ہے -

خود خدا لعنت کند بر جان زدہ　　　راہ دینت بیشکے شیطاں زدہ
زاں ہمی دانی امام خویش را　　　بیشکے افتادی از مادر خطا
بستر مادر ترا خود پاک نیست　　　گر ترا مردود گویم باک نیست

(صفحہ ۸۰)

جب لوگوں نے اُس سے ایسی باتیں سُنیں، زد و کوب کی، ہاتھ باندھ دیئے اور شیخ (قاضی) کے پاس لے گئے شیخ تمام گفتگو سُن کر سخت طیش میں آیا، بولا کہ یہ شخص رافضی ہے، کیونکہ باجماع اہل سنت، ولایت پیغمبر کا حق ہے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ خلیفہ تھے ولی نہیں تھے -

این ولایت حق پیغمبر بود　　　پیش اہل سنت این باور بود

ابوالقاسم حکمراں تھا۔ امرا نے اُس کو ظلم کے راستے پر چلایا۔ اس کے بیرلے اُمرا کو سمجھایا۔ لیکن انھوں نے بادشاہ کو ظلم سے نہیں روکا۔ شیخ ناراض ہو کر چلے گئے۔ کچھ عرصے بعد سلطان نے کسی ملک پر چڑھائی کی، اس ملک کے ایک حقیر سردار نے اس کو اور اس کے لشکر کو تباہ کر دیا۔ اسی سلسلے میں ترکوں کے متعلق ایک پیشین گوئی کی ہے کہ میرے بعد ترک دنیا کو ویران کر دیں گے اور بہت جلد بعد اُن کی سلطنت بھی تباہ ہو جائے گی:۔

بعد من ترکاں کنند عالم خراب   بس دل مسکیں کہ سازندش کباب

بر مدار و سلطنت شاں در جہاں   عاقبت ویراں شود شاں خانماں

(صفحہ ۳۳۹)

متعدد موقعوں پر ناصر خسرو کا ذکر کیا ہے، بلکہ اُس کی حمایت بھی کی ہے:۔

ناصر خسرو کہ اندوہے گرفت   رفت او خود گوشۂ کوہے گرفت

ناصر خسرو ز سر آگاہ بود   لے چو تو خود مرتد و گمراہ بود

ناصر خسرو بحق پی بردہ بود   ازمیان خلق بیروں رفتہ بود

یار او یک عارہ بود و تار بود   او بود و یار حق درکار بود

اس حکیم کی ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک روز ایک پیر سالک مجھ سے ملنے آیا۔ اثنائے گفتگو میں میں نے اس سے کہا کہ کوئی عجیب قصّہ آتا ہو تو سناؤ۔ پیر سالک نے کہا کہ آج میں وہ قصّہ سناتا ہوں جو میں نے ایسے سالک سے سنا ہے جو حکیم ہونے کے علاوہ منصور حسینی کی طرح شاہ تھا (یعنی شاہ ناصر خسرو)۔

اں کمال حکمت او آگاہ بود   او چو منصور حسینی شاہ بود

(۴۶۲)

شاعر کئی موقعوں پر اپنی تصنیفات کا ذکر کرتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں نے سو کتابیں لکھی ہیں :-

دگر علم دارم صد کتب من　　　　　درو بہادہ ام اسرار بس من

(صفحہ ۳۶)

کہتا ہے، پہلے تین کتابیں لکھیں، پھر ایک، پھر تین۔

باوّل سہ کتب تفسیر کردم　　　　　بآخر یک کتب تحریر کردم

جواہر نامہ با مختار نامہ　　　　　دگر شرح القلب من رہ بردہ نامہ

ترا معراج نامہ پیش حق خواند　　　　　جواہر نامہ ات جود این سلق خواند

ترا مختار نامہ چوں بہشت است　　　　　بشرح القلب دیباچوں کنشت است

د بعد این کتب خواں سہ کتب را　　　　　کہ تا گردد وجودت جو دمصفا

بوصلت نامہ داں وصل معانی　　　　　ز بلبل نامہ ما وا معانی

ز ہیلاجم جہاں در گردش آمد　　　　　فلک از قدرتش درگردش آمد

(صفحہ ۳۵۷)

ایک مقام پر سولہ کتابوں کے نام گنائے ہیں یعنی - (۱) مظہر (۲) وصلت نامہ (۳) ہیلاج نامہ (۴) اسرار نامہ (۵) منطق الطیر۔ (۶) خسرو گل (۷) الٰہی نامہ (۸) پند نامہ (۹) مصیبت نامہ (۱۰) بلبل نامہ (۱۲) تذکرۃ الاولیا (۱۳) معراج نامہ (۱۴) مختار نامہ (۱۵) جواہر نامہ (۱۶) شرح القلب۔

بداں خود را کہ در مظہر تو بینی　　　　　ز وصلت نامہ نام اظہر تو بینی

بداں خود را کہ ہیلاجم چنیں گفت　　　　　کہ از اسرار نامہ در تواں سفت

بداں خود را کہ مرغ لا مکانی　　　　　کتاب طیر ما را آشنا تی

گر خلیفہ بود، کے بود او ولی   دین ولایت راسی دارد سی

لیکن دیکھو میں بھی اُس کو کیسی سزا دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر اور خچر پر بیٹھ کر بارگاہ خلافت کی طرف روانہ ہوا۔ حاجب نے شیخ کی آمد کی اطلاع خلیفہ کو دی۔ خلیفہ نام سنتے ہی اپنی جگہ سے اُٹھا اور استقبال کر کے لایا۔ شیخ نے تمام ماجرا بیان کیا۔ خلیفہ نے کہا یہ تو ایک خفیف معاملہ ہی۔ میں نے ایسے ہزاروں انسان قتل کیے ہیں، فرزندانِ علی تک کو نہیں چھوڑا۔ اُسی وقت ایک ترک امیر کو، جس کا نام "اصیل مردگیر سمرقندی تھا" حکم دیا کہ جاؤ پہلے اس مجرم کو قتل کرو اور پھر اس کی لاش کو جلا دو۔ شیخ نے اس موقعے پر یہ اضافہ کیا کہ تمھیں اِس کارِ نیک میں بڑا ثواب ملے گا۔

جب ناصر خسرو نے یہ ماجرا سُنا، اس کو بے حد رنج ہُوا، تب اُس نے بد دعا کی ۔

چوں بدید آں ناصر خسرو چناں   گشت بینائی و دانائے گماں
گفت یارب تو بحق حق بس   دور گرداں شاں زصدق جزبس

ناصر خسرو کا بیان ہی کہ میں ایک شب اپنے گوشے میں ملول و غمگین بیٹھا تھا کہ اتنے میں غیب سے میرے کانوں میں آواز آئی کہ خدا کا عذاب اس شہر پر نازل ہونے والا ہی، تو یہاں سے نکل جا۔

یک شبے بودم بکنجے دردمند   نادل مجروح و جاں مستمند
یک ندا آمد بگوشم کاے حکیم   خیز رو زیں شہر من بیروں سلیم
کز خدا آمد بلائے بے حساب   اوّلش رنج آید و آخر عذاب

میں علی الصبح اس شہر سے نکل کھڑا ہوا۔ آخر شہر میں ایسی وبا پھوٹی نہ شاہ بچا، نہ اُس کا لشکر اور نہ وہ شیخ ۔

جوہر ذاتم عجائب بودہ است — ہمچو اشتر نامہ مستی کردہ است
گر تو از مرغ حقائق بے بری — منطق الطیرم بخواں تا بشنوی
رو تو اسرار ولایت گوش کن — وآں گہے جام مودت نوش کن
رو مصیبت نامہ را از سر بخواں — تا شود حاصل ترا مقصود جاں
گر تو از خسرو یکے گل داشتی — بلبل مسکیں خود بگذاشتی
گر الٰہی نامہ را گیری بگوش — جام وحدت را بگیری نوش نوش
گر تو پندم را بیابی در جہاں — رو عزیزش دار ہمچوں جان جاں
رو بذکر اولیا مشغول شو — وآں گہے چوں تذکرہ مقبول شو

(صفحہ ۱۳ ۱۴)

کہا ہے کہ میں نے بہت کتابیں لکھی ہیں لیکن مظہر العجائب کو سب پر فوقیت ہے

کتب (من) بسیار دارم در جہاں — لیک مظہر را عجائب بک داں (ص ۱۴۳)
کتب بسیار دارم گر بخوانی — از دنیا و عقبیٰ را بدانی
بداں کیں مظہرم جان کتبہا است — درو اسرار دین حق ہویدا است (ص ۲۵۷)

ان کو عباسیوں نے بہت ملایا اور زمرۂ علما میں رکھنا چاہا لیکن یہ گئے نہیں۔ وجہ ظاہر ہے، یہ حق گو تھے اور وہ حق بات نہیں سنتے تھے۔

مرا عباسیاں بسیار خواندند — مرا در عالماں خود نشاندند
(کذا۔ نشاندند؟)

اگر من راستی گویم ملولند — طریق راستی را کے قبولند
(صفحہ ۵۸۳)

ایک حکایت میں جو صفحہ ۴۷۶ سے شروع ہو کر صفحہ ۵۷۹ پر ختم ہوتی

مداں خود را و خسرو داں توکل را | الٰہی نامہ گفتست این معما
مداں خود را کہ پیدم شفیقست | مصیبت نامہ ات این دم رفیقست
مداں خود را کہ بلبل نامہ داری | باشتر نامہ کے معنا نہ داری
مداں خود را اگر تذکیرہ داری | جمیع اولیا را دیدہ داری
مداں خود را کہ این معراج نامہ | بہشتم آسماں دارد نشانہ
مداں خود را کہ این مختار نامہ است | دو عالم را ازو ہم دام و دامست
مداں خود را جواہر نامہ کن گوش | بشرح القلب من فی الحال مدہوش

(صفحہ ۴۵۶)

کتابوں کی تعداد سولہ ہوتی ہے، لیکن سترہ بتائی ہے۔

مداں خود را کہ این ہفدہ کتب را | نہادم بر طریق علم اسما

(صفحہ ۴۵۶)

اور تمام اشعار کی تعداد دو لاکھ دو ہزار اور ساٹھ بیاں کی ہے۔

شمار بیت اینہا را بگویم | من از گفت معانی تخم رویم
دو لیست و دو ہزار و شصت بیت است | زیادہ یا کمی میداں کہ قید است

(صفحہ ۴۵۶)

یہ تعداد مبالغے سے خالی نہیں، کیونکہ شرح القلب اور تذکرۃ الاولیا نثر کی کتابیں ہیں اور معراج نامہ ایک ایسی کتاب ہے، جس سے نہ تذکرہ نگار واقف ہیں اور نہ فہرست نگار۔ کوئی تعجب نہیں اگر اس سے سرنامہ مراد ہو۔ رہیں باقی تیرہ کتابیں، ان کے ابیات کی تعداد کسی حالت میں اٹھاسی ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔

مظہر کے دیباچے میں ان کتابوں کے نام یہ ہیں ۔

یتیم داں تمام سید گانم | کشیدند و سپار یکتائے نامم
تا آخر مرتضیٰ دریافت ما را | نکرد او دفع از ما ایں بلا را
بحق بود و بحق درخواست کرد او | ہمہ طفل و سیاستم راست کرد او
مرا نگذاشت او از بد ایں قوم | رہا کردے مرا او داد ایں لوم
مرا او داد جاں تو دریں دہر | مرد بر جاں دشمن نوش چوں زہر

(صفحہ ۴۷)

یہی شکایت دوسرے موقعے پر یوں دُہرائی ہے -

اے منافق آں چہ با من کردۀ | کلبۂ ما مثل گلخن کردۀ
جان و مالم را بتاراج سگاں | دادۀ تا خاطرت گیرد اماں
قصد کشتن نیز کردی لیک شاہ | داد اندر کوے خود ما را پناہ
روسیہ گشتی بدست ہیچ ما بد | زاں ترا شیطان ملعون خویش خواند
کردۀ عطار را تو قصد خوں | کردۀ خود را تو از رحمت بروں
بہر خصم مرتضیٰ ما را کشتی | در دو عالم خویش را رسوا کشتی

(صفحہ ۴۴۶)

دشمنوں نے ایک بار ان کے قتل کے لیے وسیع پیمانے پر تیاریاں کیں اور ان کو مع فرزند کے گرفتار کیا۔ ایک لاکھ کی تعداد میں جمع ہوگئے جن میں فاضل شیوخ و قاضی و اکابر سے لے کر بازار کے دکان دار تک شامل تھے۔ ہر ایک اُن کے خون کا پیاسا تھا۔ بالآخر دریا میں پھینک دیا اس بے بسی کے عالم میں انھوں نے خدا کی طرف رجوع کی۔ الہام ہوا کہ اے عطار مطلق خوف نہ کر تو دشمنوں کے بیچ سے رہا ہو جائے گا۔ قدرت الٰہی ملاحظہ ہو کہ اُس ہجوم میں سے

ہو' کہا ہو کہ ایک پیر سالک نے آکر مجھ سے تیس سوال کیے اور اُن کے جواب طلب کیے۔ میں یہ سوالات سُن کر حیران رہ گیا دل میں کہنے لگا کہ الٰہی! ان سوالوں کا جواب کیونکر دے سکوں گا۔ مجھ میں یہ توفیق نہیں اور یہ ظالم تمام اسرارِ غیب مجھ سے دریافت کر رہا ہے ان سوالوں کا جواب ہاتفِ غیبی ہی دے سکتا ہے۔ میں اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ ہاتف تشریف لایا اور اس نے مجھ کو ان کے جوابات تعلیم کر دیے۔ جب پیر سالک نے مجھ سے جوابات سُنے' بولا کہ اگر یہ حال ہے تو مجھ کو دنیا سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے' میرا اصل مقام عقبیٰ ہے۔ یہ کہہ کر اُٹھا اور جان دے دی ؎

مرا از خود ہمیں معنی تمام است   مرا عقبیٰ بایں معنی مقام است

قدم در راہ نہاد او جان داد   بمعشوق حقیقی او روان داد

یہ قصہ عطار کے توبہ کر لے اور اُن کے کوچۂ تصوف میں آنے کے قصّے سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اور ممکن ہے کہ تذکرہ نگاروں نے اُلٹا سیدھا تراش کر اسی کو اور عرض سے استعمال کر لیا ہو' یا یہ قصّہ اُس قصے کی بنیاد پر تراشا گیا ہو۔

متعدد موقعوں پر دشمنوں کے جور و تشدد' اُن کے مذہبی عناد وغیرہ کا ذکر آتا ہے حبِ مرتضیٰ کی بنا پر ظالموں نے ایک مرتبہ کامل سال بھر قید رکھا اور مکان لوٹ لیا۔ آخر حضرت مرتضیٰؑ نے رحم کیا' قید سے رہائی مل گئی اور جائداد بحال ہو گئی۔

تو ای عطار کردی ظلم بسیار   کہ داری در دل خود حب کرار

ز مہر این مرا یکسال در بند   بکردند آن لعینان در کمر بند (کذا)

ز مہر این تمام ملک و مالم   بغارت بردہ او ناخورد سالم

چو یونس حق ترا از بطن ماہی   رہا دو کرد آزاد از تباہی
تمام ملک از شیخان فاضل   ز قاضی و اکابر ہم ز کامل
تمام خلق، عام و خاص بازار   ہمہ گشتند بر قتلم روادار
ہمہ در قتل و خونم میل کردند   مرا با یور اندر حبیل کردند
دریں حالت سیاستی در فتادم   در توبہ بر دیم بر کشادم
ز حق جستم خلاصی بے خلقاں   نہ بیں از حق تعالیٰ لطف و رباں
بالہامم ندا در داد یزداں   کہ اے عطار تو خود را مترساں
خلاصی ایں زماں از دست ایشاں   ازیں معنی مکن خاطر پریشاں
بالہام الٰہی ہچو ست ہساز   پریدم ازمیاں شاں چشم کن باز

(صفحہ ۴۰۱-۴۰۲)

مظہر العجائب[1] کے جلائے جانے کا اشارہ کئی موقعوں پر موجود ہے تعجب

---

[1] مظہر کے جلائے جانے کا ذکر لسان الغیب میں بھی ملتا ہے۔ میں میرزا محمد کے مقدمے سے اشعار ذیل نقل کرتا ہوں ۔

زاں بسوزی مظہرم کاں اسم اوست   غافل از سر خدا و دید دوست
اے سمرقندی حذر از سوزشش   چوں کنی زآتش دریں جا پرسشش
نیست حق باد بر سوزندہ آتش   چونکہ یزداں از در خود راندہ اش
تو یزید عصر مائی اے پلید   می کنی نقص حسین ایں جا پدید
اے سمرقندی مکن ایں کار تو   می رسی خویش را در نار تو
مظہرم گوئی بباید سوختن   چشم مظہر خواں بباید دوختن
در جہاں خواہد مظہر را کساں   بر تو خواہد کرد لعنت دیگراں

(مقدمہ تذکرۂ عطار، ص یب)

ہتھیار کی طرح اُڑتے ہوئے نکل گئے۔ سلہ

تو لے ناپاک کردی جور بسیار	ہمی اندیشی تو از جور عطّار
چہ حاصل کردی از جور چنیں تو	چہ کردی بہر دوں ماتگیں تو
جزائے تو خدا در حشر بدہاد	کہ خواہم کرد از تو پیش حق داد
ازیں ظلمے کہ بر عطار کردی	علیؓ را تو زخود بیزار کردی
بہ بہر مرتضیؓ کردی بما جور	جہود اں فخر دارند بر تو اے کور
کہ حیدر را چرا تو دوست داری	ز بہر ایں بریدم جوں سراری
خلاصم کرد حیدر از بلایت	کشتم از دوش صورت ایں روایت
قریب صد ہزار آدم دریں باب	ھگرد مدت ترا عطار در آب

سلہ میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے لسان الغیب سے جو اسی شاعر کی تصنیف ہے، بعض ایسے ابیات نقل کیے ہیں جو اس واقعے پر مزید روشنی ڈالتے ہیں ۔

بر سر مسند براق ترکماں	در چنیں ظلمے کشادہ اور زباں
بر سر من کردہ ترکاں اتفاق	تا بہ پیر دوں کہ دارد او نفاق
اے فقیہہ ایں جا کمیں بیچیدۂ	ہوئے در حوں میں سوختۂ
قصد جان و مال و عرضم کردۂ	پارۂ حسام بمن سریدۂ
در بدر از دست تو افتادہ ام	در توکل دل بجاناں دادہ ام
گرد عالم گشتہ ام از دست تو	گفتہ ام بیداد بے را کو مکو
جمع گشتند خلق بہر قتل ما	جرم عطار است حب مرتضیٰؓ
عاقبت مارا ز دست ایں سگاں	حق خلاصی داد از وہم و گماں
بعض حیدر سود سودائے فقیہہ	آں زیاں حاست باشد لائے سفیہ

(مقدمہ تذکرۂ عطار ص یا)

کرتا ہی اور ساتھ ہی گویا ہی کہ میں حضرت علی کو وصی مانتا ہوں اور شیعہ نہیں ہوں۔

من بدیں اہل سنت رفتہ ام | بر طریق اہل سنت بودہ ام
که عطار است سنی نیست شیعہ | بودہ او بدیں با مطیعم (کذا)
منم سنی و اسرارم عیانست | جہاں اندر جہاں اندر جہانست
ولیکن پیرو میر ما علیؓ است | ار آں کو وارث علم نبیؐ است
دگر او را وصی دانم بحکمت | نبودہ در جہاں خود عدل و ظلمت

(صفحہ ۴۳)

دیباچے میں اگرچہ شیخین کے لیے اُس نے ایک شعر لکھا ہو۔

از طہور مصطفیٰ آگاہ شو | با ابوبکرؓ و عمرؓ ہمراہ شو

لیکن جو مذہبی ماحول اس کتاب میں پیدا کیا گیا ہو، سنی معتقدات کے عین منافی ہو، بلکہ یہ سنی ہیں جو اِس کی سب دشتم کے آماج ہیں شاعر نے اپنی لعنت اور دشنام کے تمام تیر پوری طاقت کے ساتھ اُن پر برسائے ہیں، وہ سنیوں کو اپنی تمام بدقسمتی کا ذمہ دار سمجھتا ہو۔ اُنھوں نے اُسے قید کیا، گھر لوٹ لیا اور قتل کرنا چاہا۔ وہ تقلید اور چاروں مصلّوں سے سخت بیزار ہو، چاروں اماموں کی تضحیک کرتا ہو۔ اُس کے نزدیک چاروں مصلّوں کو ماننے والے مردود ہیں، ع -

چار دیدں کار مردوداں بود

اہل سنت کو اُن کے دشمن ناصبی کہتے ہیں (جو دراصل خوارج کا نام تھا) مصنف بھی ان کو اسی نام سے پکارتا ہو، لیکن جائے حیرت یہ امر ہو کہ وہ ان کو خارجی بھی کہتا ہو اور رافضی بھی، مزید براں منافق مقلد، پیروان معاویہ، عباسی، تقلیدی اور راویوں کے پیرو بھی کہتا ہو۔

ہو کہ ابھی مظہر ختم بھی نہیں ہوئی ہو کہ دشمن اُس کے جلانے کے منصوبے کر رہے ہیں، حالانکہ شاعر اُس کے چھپانے میں بہت کچھ اہتمام کرتا ہوگا۔

سوری مظہر عطار را تو | وگر نوری نگیری مار را تو
کلام و ہم حدیث و اسم حق را | سوری و نداری ہیچ پروا
تو سوری اسم ایشاں ہم سوزند | قفاے ظلم و جور و مکر دورند (ص ۲۱)
ساداتی سوری مظہرم را | درو بینی چو نام حیدرم را (ص ع)

علیٰ ہذا مختلف مقامات پر اپنے ناظرین کو ہدایت کرتا ہو کہ مظہر کو نا اہلوں اور خارجیوں سے محفوظ رکھنا۔

من نمایم جملہ اسرارت تمام | لیک ایں مظہر نہاں باشد عام
کس نما اہلاں کتا نم را نہاں | زانکہ دیدم من درو حق را عیاں
جوہر و مظہر بکسے باز نہ | خود درا سر ویش از اسرار نہ
تا نیفتد او بدست خارجی | منکر مظہر باشد خارجی
بعد من گر خوانی ایں مظہر تمام | ریہارستش تو نگہ دار از عوام

اور مظہر کے خوش نصیب کاتب سے وعدہ کیا ہو کہ میں تجھے ساتھ لیے بغیر بھی جنت میں قدم نہ رکھوں گا۔

با عد الستم بمعنے عہد تو | بے تو باشد خود بہشتم ناکو
بے تو اے کاتب نہ باشم در بہشت | زانکہ ایں مظہر شدستم سرنوشت (ص ۱۹)

اور ساتھ ہی اس کتاب میں اعتقاد نہ رکھنے والوں پر دوزخی ہونے کا فتویٰ لگا دیا ہو۔

ہر کہ شک آرد بمظہر دوزخیست | زانکہ ایں مظہر نشان جنتیست (ص ۶۲)

مصنف مذہباً اپنے آپ کو اہل سنت والجماعت کا ایک رکن بیاں

بوحنیفہؒ گفت کیں دیں اہل است — پیش من دین سنی خود مجمل است

من زہم احیائے دین مصطفیٰ — زانکہ علم من ندارد خود فنا

شافعیؒ گفتا کہ قول من حق است — پیش من گفت سنی خود مطلق است

ہر چہ گویم از روایت راست است — ایں معانی از دل من خاست است

احمد حنبلؒ بگفت قول من — بہتر است از قول دیگر در سخن

گفت من چوں گفت پاکاں دانش است — آں زماں بود کہ بیروں از تن است

گفت مالکؒ آں امام راست گوے — بودہ ام در علم شرع عشق راست پوے

من بہ شرع مصطفیٰ در تاختم — ہم چو عیسیٰ در رہش جریا ہمہ

(صفحہ ۳۲۸)

مظہر جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اعزاز میں لکھی گئی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تمام کتاب اُن کے عشق و وجدان

صفحہ ۴۵۲ کا بقیہ حاشیہ —

چرا چوں چرخ مقلوبی تو داری — دگر مطلب چو مطلوبے تو داری

چو داری شافعیؒ و بوحنیفہؒ — توئی ہم مالکؒ دیں ہم حلیمہ

دگر ایں داری اما آں نداری — دلے داری ولیکن جاں نداری

چو ایشاں اند ہر دو چشم دیں را — سہ سر ایں دو چشم راہ بیں را

(خسرو نامہ قلمی)

مطبوعہ خسرو نامہ سے یہ اور منقبت اصحاب ثلثہ کے اشعار، اہل مطبع نے خارج کر دیے ہیں، میں نے پروفیسر آذر کے کلیات سے اس کو نقل کیا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ شیخ عطار اپنی مثنویات میں ائمہ اربعہ کا نہایت احترام سے ذکر کرتے ہیں اور ان کی حکایات بھی نقل کرتے ہیں۔

جو لوگ دین علیؓ کے پیرو نہیں ہیں اور چار مذہب کے ماننے والے ہیں، شاعر کے نزدیک وہی رافضی ہیں ؎

هرکه در دین علیؓ نبود درست   رافضی خوانم من او را از نخست

دیگر

می‌دانستی که رافض کیست اے سگ   نگویم تا نبود خود شک این رگ
روافض آن که دین شرع ندارد   بکوے مرتضیٰ این ره ندارد
روافض آن که دین غیر دارد   بکوے غیر حیدر سیر دارد
روافض آن که از توحید دور است   به علم چار مذہب خود صبور است
ناصبی با دینِ سگ بے دین شده   او و سر تا پائے خود سگین شده
این جماعت دشمنان حیدرند   پیش ما لائق به تیغ و خنجرند

(صفحہ ۳۲۰)

چار مذہب

خانۂ دینِ[1] نبیؐ کرده خراب   خوں مومن ریختن دیده صواب
چار مذہب هر ایشاں ساختند   دین ایشاں را برون انداختند

---

[1] اس نقلی عطار کے مقابلے میں اصلی عطار کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

جہاں را ہم امام و ہم خلیفہ   کرامی دانی الا بوحنیفہؒ
جہاں علم و دریائے معانی   امام اول و نعمان ثانی
چراغ امت آمد آں سرافراز   چراغے کو عدو را می نہد کار
قضا کردند روئے خوش ناگاہ   نہ میدید حق آسماں و دل آگاہ
نبیؐ بہاد گفتے حملہ رحمت   حصۂ بوحنیفہؒ کرد قسمت
گر بعد از ہر کوئی حاصلے نیست   چو کوفت حرحزہ سرلے بیت

شاہ جبرائیل و میکائیل ہم — شاہ اسرافیل و عزرائیل ہم
زانکہ حیدر در درون یار گفت — ہم انا منصور و ہم نا دار گفت
ہم ازو یعقوب و ہم موسیٰ شنید — ہم ازو عطار و ہم کبریٰ شنید
ہم ازو جبریل و ہم آدم شنید — ہم ازو عیسیٰ بن مریم شنید
ہم ازو سیّد بمعراج حق شنید — ہم ازو ایں جملۂ عالم شنید

شاعر کے نزدیک ولائے علیؑ کے بغیر نجات ناممکن ہے۔

گر ترا عمرے دو صد باشد بسال — ور دریں عمرت نخوانی علم قال
روزہ گر داری تو خود عمر دراز — ور نشب دائم گزاری تو نماز
بے ولائے او نیابی ہیچ نور — رو سیہ باشد ترا خود در حضور

اگرچہ بارہ اماموں کا قائل ہے اور ان کی مدح بھی دیباچے میں موجود ہے۔ تاہم امام جعفر صادق کا زیادہ گرویدہ معلوم ہوتا ہے اور متعدد مقامات پر اپنے آپ کو جعفری[1] کہتا ہے۔

---

[1] شیعوں میں ایک فرقہ جعفری بھی ہے، جو امام حسن عسکری کے بعد اُن کے بھائی جعفر کی امامت کا قائل ہے۔ لیکن اثنا عشری اس امام کو کذاب کہتے ہیں (از مرآت المذاہب) بعض نے لکھا ہے کہ حسن عسکری لاولد فوت ہوئے اور نہ ان کا کوئی فرزند محمد نامی پیدا ہوا، اس لیے جعفری امام مہدی کی ولادت کے منکر ہیں (مذاہب الاسلام صفحہ ۴۴) ہمارا مصنف بہرحال امام حسن عسکری کے بعد (حسن کو غلطی سے ابوالحسن عسکری، شعر۔

بوالحسن داں عسکری را در جہاں — بوالحسن داں مہر او در جان جان

لکھتا ہے) غیبت امام مہدی کا قائل ہے، چنانچہ۔

یا الٰہی مہدیے از غیب آر — تا جہانے عدل گردد آشکار

اس لیے اس کا شمار اثنا عشریوں میں ہونا چاہیے، جو اپنے مذہب کو حضرت امام جعفر کی طرف منسوب کرکے اپنے آپ کو جعفری بھی کہتے ہیں۔

سے معمور ہو۔ شاعر نے ان کی تحمید اور تمجید میں ایسی مبالغہ آمیز زبان استعمال کی ہو جس سے خود رسول اللہؐ کے امتیاز یکتائی کو صدمہ پہنچے کا خطرۂ عظیم ہو۔ حضرت علیؓ کا مرتبہ تمام مقدس ہستیوں، فرشتوں اور انبیاؤں سے بالا بالا ہو الوہیت کے اگرچہ تمام خطابات ان کو نہیں دیے گئے "تاہم" بعد از خدا بزرگ توئی " میں تو کوئی گنجایش احتمال نہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہمی اسرار عرفاں مرتضایست | ہمی درجان منصور او خدائیست
خدا او را ولی اللہ خوانده | برفعت مصطفیٰ اش شاه خوانده
بہر قرنے بروں آید بلونے[1] | ازو آباد میداں ایں دوکوے

(صفحہ ۲۵۲)

گفت پیغمبر کہ شاہی راں تست | مظہر سر الٰہی جان تست
در ہمہ روئے زمیں او مقتدا است | ایں ہمہ درشان شاه اولیاست
شاه عشق و شاہ موسیٰ، شاه طور | شاه سرور، شاه اکبر، شاه نور
شاه یوسف، شاه یعقوب است و خضر | شاه الیاس است در دریاے جزر
شاه اسمٰعیل و ابراہیم دان | یا چو اسحٰق و چو ہارون کش بخوان
شاه بوده با جمیع انبیا | ہم بہمه بوده معنیٰ رہنما
شاه بوده با محمد در عیاں | ہم بہمه دیده ہمه سر نہاں
شاه با عیسیٰ است و با روح اللہ است | رفته او بر عرش علیین در است

[1] اس شعر سے واضح ہوتا ہو کہ مصنف حلول کا معتقد ہو اور خود اس کو اعتراف ہو کہ اس پر اس قسم کے الزام لگائے گئے ہیں :-

"تا نگویدت دعوی یا حلول | تا نگویدت چو راہش بوالفضول
بعض گوید اتحادی بوده است | یا کیش ملحداں ہم رہ بسته است"

طوطاں خیری بالکل مفقود ہوجائے اور معمولی ترکیب اور بندش کی لغزشیں جملوں کی بے ربطی اور الفاظ کے بے محل استعمال کا مرتکب ہو، وزن و قوافی کے معمولی قواعد کو بالائے طاق رکھ دے نظم میں اس قدر اختلال اور لغزش الشہ اختلال دماغ کی طرف منسوب کی جاسکتی ہے، یہ اضمحلال طبیعت کی طرف عطار کی یہ تصنیف بہت کچھ مولانا مولانا آزاد کے دور جنوں کی یادگار "جانورستان" اور "بیاک و نمناک" سے مماثل ہے لیکن میں اس نظریے کا بھی معتقد نہیں کیونکہ شاعر اپنی تصنیف کی خامیوں سے باخبر ہے اور رفع اعتراض کی بے سود کوشش کرتا ہے اس کی صرف نحو کے متعلق ایک بے باکانہ انداز میں کہتا ہے۔

جوہر و مظہر باہل دل دہم صرف و نحوش را باہل گل دہم

دوسرے موقعے پر کہا ہے -

جوہر میں بیست شرح نحو و صرف را کہ او در نقطہ گشتست حرف

گویا وہ اپنی ذات کو ان فنوں کے ضوابط کی پابندی سے بالا سمجھتا ہے۔

یہی نہیں ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ :- میں نے یہ کتاب عام زبان میں اس لیے لکھی ہے کہ عوام الناس اس سے مستفید ہوں - میں اس کو نفیس عبارت میں لکھ سکتا تھا لیکن عامۃ الناس اس کے سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ۔

من ایں مظہر بلفظ عام گفتم گہے پختہ و گاہے خام گفتم
کہ ہم خلق درد سے جوش برآید زجہل و کبر خود بیروں بہ آید
وگرنہ خود بالفاظ شریفش ہمی گفتم کہ می آمد شریفش
ولے درویش از و محروم می ماند ہمیں خادم مخدوم می ماند

اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ شخص کوئی بہروپیا ہے جس نے خاص مقاصد کو مدِنظر رکھ کر شیخ عطار کا سوانگ بھر لیا ہے۔ چونکہ اس کے پاس

من طریق جعفری دارم چو ماست | خوردہ ام از ساقی کوثر شراب
مرد آں است کو بدیں جعفر است | یا چو سلماں او بدیں حیدر است
اے ترا نشناختہ جز جعفری | ایں معانی را زفہم ما بری
راہ حق چوں راہ جعفر راست است | خارجی از من چہ جنت خواستست
ایں کتب دارد لباس جعفری | معرفت گفتہ با اہل معنوی
ترا مظہر زجعفر داد پیغام | ترا مظہر ز لطف اوست العام

مظہر کو عطار کی طرف منسوب کرنے میں کئی امور دامنگیر تامل ہیں جن کو مختصراً ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

(۱) اُس کی زبان جس کا میرزا محمد قزوینی بھی[1] دبی زبان سے اقرار کرتے ہیں، عطار کے حقیقی کلام سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ ان کا خیال ہے کہ طبیعت میں یہ اضمحلال بڑھاپے کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے، لیکن میری سمجھ سے باہر ہے کہ ایک مشاق شاعر جو مدت العمر نغز گوئی کے لیے معروف ہو انحطاط و پیری کے دور میں اس قدر سٹھیا جائے کہ معمولی جملوں میں صرف و نحو کی غلطیوں کا ارتکاب کرے۔ اس کی سیراب طبیعت کی تمام روانی اور

---

[1] میرزائے موصوف کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

"یکے از تالیف آخری عطار مظہر العجائب است و در مقدمۂ ایں کتاب حال کتب مصنفاتش را کہ از جملہ تذکرۃ الاولیا ست نام می برد و اشعار ایں کتاب بالنسبۃ لسائر اشعار عطار تفاوت واضح دارد در پستی و سستی و قدرے رکاکت۔ و ہر کس منطق الطیر و الہٰی نامہ و خسرو و گل و دیوان عطار را مطالعہ کردہ باشد، برائے او قدرے مشکل ست اعتقاد کند کہ صاحب مظہر العجائب با آنہا یکے بودہ است و ظاہرا علت ایں انحطاط و جمود طبع است در سن کہولت" (مقدمۂ تذکرۂ عطار ص ط۔ی مرتبہ پروفیسر نکلس)۔

عطار حسین بن منصور کے حالات ایک معقول پیرائے میں اپنے تذکرے میں لکھ چکے ہیں، جس میں انھوں نے حسین کے متعلق صوفیوں کی تمام روایات کو جمع کر دیا ہے، لیکن عطار کا یہ مثنیٰ جو تذکرۃ الاولیا کی تصنیف کا مدعی بھی ہے، تذکرے کے بیانات کے بالکل برعکس ایک طویل حکایت منصور کے متعلق لکھتا ہے جس میں شقیق بلخی جاکر خلیفہ ہارون الرشید کو سمجھاتے ہیں کہ تم نے چونکہ منصور کو قتل کرا دیا ہے اور وہ حضرت موسیٰ کاظم کا آدمی تھا اس لیے تمھیں چاہیے کہ اب جاکر حضرت امام سے اس قتل کی معافی مانگو۔ ہارون الرشید پر شیخ کی نصیحت کا اس قدر اثر ہوتا ہے کہ سیدھا حضرت موسیٰ کاظم کی خدمت میں پہنچتا ہے، معذرت خواہ ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اب تک آپ کی طرف سے غافل رہنے کی معافی مانگتا ہوں، آیندہ آپ جو حکم دیں گے بسر و چشم بجا لاؤں گا۔ آپ حقیقت میں ہمارے پیشوا ہیں کیونکہ آپ ہی نقد خیر المرسلین ہیں اور میرا ملک درحقیقت آپ کا ملک ہے۔ جس طرح منصور کے الفاظ آپ کے الفاظ تھے ۔

من ترا دانم کہ ملکم حق تست گفتۂ منصور ہم از حق تست

دشمن آپ کی تاک میں تھے اور منصور کو بھی اسی لیے لٹایا گیا کہ وہ آپ کے محبت کیشوں میں تھا اور آپ کی درگاہ پر سجدے کیا کرتا تھا وہ برابر پانچ سال تک میرے کان بھرتے رہے کہ جب منصور امام کے آستانے پر پہنچتا ہے، سیکڑوں سجدے[1] کرتا ہے۔

دیگر آں کہ چوں برون آید ز پیش سر بہد بر آستاں صد بار بیش

---

[1] صوفیوں نے جو صاحب الزماں کے نائب مان لیے گئے ہیں، سجدے کی رسم کو رواج دیا، کوئی تعجب نہیں اگر اس قسم کے قصوں سے اس رسم کی حرمت سوائی گئی ہو

نہ عطار کا دماغ ہے نہ ان کی طبیعت اور نہ علمیت، اس لیے یہ تمام اضمحلال ہے اور اسی لیے خیالات میں اس قدر ابتذال اور عبارت میں خامیاں ہیں، جس کے پڑھنے سے طبیعت متنفر ہو جاتی ہے۔ ایک شخص عطار کا تخلص اختیار کرنے اور اس تخلص کی رٹ لگانے سے (جیسا کہ مصنف اس تصنیف کے دوران میں دیکھا جاتا ہے) عطار نہیں بن سکتا۔

(۲) تاریخی لحاظ سے نظر ڈالتے ہوئے متعدد خامیاں اور پائی جاتی ہیں۔ مشاہیر کے زمانوں اور اُن کے سنین وسال سے بے خبر معلوم ہوتا ہے۔ شیخ نوری کو عطار کا ہم عصر خیال کر کے ایک حکایت تراشتا ہے، جس میں شیخ نوری اُس کے گھر آتے ہیں اور حرب صفین و نہرواں کی تاریخ سناتے ہیں۔

خواجۂ نوری ہما ہم خانہ شد　　　از وجود ناقصاں بیگانہ شد
علم معنی از وجودش ہمچو نور　　　شعلہ می زد بر طریق کوہ طور
یک شبے در پیش من آں بحر راز　　　از حکایات جہاں می گفت باز
از معانی و مشائخ در علوم　　　از احادیث نبی و از نجوم
گفت و گوئے بود مارا و ہم　　　از مقالات صحابہ بیش و کم
گفتمش از حرب صفیں گو سخن　　　در مصاف نہرواں ہم یاد کن

حالانکہ شیخ نوری جنید کے ہم عصر ہیں اور سنہ ۲۹۴ ہجری یا سنہ ۲۹۵ ہجری میں وفات پاتے ہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ شاعر اُن کو ایک حکایت میں شیخ شبلی کے وعظ میں بھی حاضر پاتا ہے۔

حسین منصور کا اُس نے نیا نام رکھا ہے یعنی منصور حسینی ۔

جام اسرار معانی نوش کن　　　ہمچو منصور حسینی جوش کن
از کمال حکمت او آگاہ بود　　　ہمچو منصور حسینی شاہ بود

الا اے در تعصب حاجت رفته — گناه خلق ما دیوانت رفته
بنادانی وسے پُر زرق و تزویر — گرفتار علیؑ گشتی و بوبکرؓ
گہے ایں یک بود نزد تو مقبول — گہے آں یک بود از کار معزول
گر ایں یک نہ گر آں دیگر تراچه — گر تو چوں حلقۂ نہ در تراچه
همه عمرت دریں محنت نشستی — مدامم تا خدا را کے پرستی
ترا چند از هوا راه خدا گیر — هدایت گر ازیں ره سد مرا گیر
یقیں دانم که هستی در ایش حلقه — یکے گردد ز هفتاد و دو فرقه
چگویم جمله از زشت از نکو بید — چو نیکو بنگری جویلسے ادیسه
خدایا نفس سرکش را زبوں کن — فضولی از دماغ ما بروں کن
دل ما را بخود مشغول گرداں — تعصب را ز ما معزول گرداں

(۴) ایک نہایت عجیب بات یہ ہے کہ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں کبھی کوئی لغو دعوے نہیں کرتے، نہ انھیں الہام ہوتا ہے، نہ کرامت کے مدعی ہیں حتیٰ کہ اپنے مرشد کی طرف بھی کوئی کرامت منسوب نہیں کرتے۔ اگرچہ دیگر مصنفین کے نوشتہ ایسے قصے اپنے تذکرے اور دیگر تصنیفات میں ذکر کر جاتے ہیں۔ اس سے ہم اُن کی طبیعت کی متانت اور واقعیت پسندی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر کوئی وصف اُنھوں نے اپنی طرف منسوب کیا ہے، تو یہ ہے کہ "دنیا میں ذلیل ترین ہستی میں ہوں" ستیہ سن کر اس کی طبیعت مطلق بدل جاتی ہے اور اخلاق میں اس قدر اعتدال پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر قسم کی غیر ذمہ دارانہ فعلیاں اللہ فریبی کے لیے شروع کر دیتے ہیں۔ اُن کا اُستاد اُن کی تعظیم اس لیے کرتا ہے کہ رسول اللہؐ اس کو خواب میں آکر ہدایت کر گئے ہیں، ایک لاکھ انسان اُن کے قتل کے لیے جمع ہو جاتے ہیں لیکن یہ اپنی

سے اپنی تصنیف میں اس مذہب کی تمام روایات و معتقدات کا ماحول پیدا کرنا بہت دشوار تھا۔ یہ بات وہی شخص کر سکتا ہے، جو ابتدا ہی سے اس مذہب کا پیرو ہو۔ اس کی تردید میں شاید یہ کہا جائے، جیسا میرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے کہا ہے کہ عطار نے تقیہ کر لیا تھا اور لوگوں نے خیال کر لیا کہ عطار عمر بھر شیعے کے پردے میں زندگی بسر کرتے رہے، ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے میرزا محمد[۵۱] معترف ہیں کہ یہ کتاب نجم الدین کبریٰ کی وفات کے بعد لکھی گئی ہے، جو ۶۱۸ھ ہجری میں تاتاریوں کے ہاتھ سے شہید ہوتے ہیں۔ تاتاریوں کو اگرچہ ہم اپنے نقطۂ نظر سے وحشی کہنے کے عادی ہیں، لیکن انتظامی قابلیت کا وصف ان میں بڑی حد تک موجود تھا۔ انھوں نے آتے ہی اپنی سیاسیات کو مدنظر رکھ کر سنیوں کی کثیر تعداد کے برخلاف شیعہ جماعت کی، جو قلیل تعداد میں تھی، مراعات اور تقویت شروع کر دی تھی، اس لیے میں نہیں سمجھ سکتا کہ چنگیزیوں کے عہد میں عطار کے لیے اصول تقیہ کی پابندی کی کیا ضرورت تھی۔ عطار جیسا کہ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے، نیشاپور میں مقیم تھے اور نیشاپور تاتاریوں کے قبضے میں تھا۔ میں نہیں جان سکتا کہ تقیہ کا انتساب ایک ایسے صوفی کی طرف جو ہمیں بے تعصبی اور رواداری کی تلقین کرتا ہے اور اپنی وسیع مشربی سے ہفتاد و دو فرقے کی نجات میں یقین رکھتا ہے کس قدر صحیح مانا جا سکتا ہے۔ ہمیں اسرار نامہ کے یہ اشعار[۵۲] یاد رکھنے چاہییں، جو تلقین ان میں ہے اُس کی آج بھی ضرورت ہے:—

---

۵۱ تذکرہ صفحہ یہ۔

۵۲ گزشتہ صفحات میں بعض ایسے اشعار نقل کر آیا ہوں جن میں عطار نے متعصبین سے خطاب کیا ہے اُن پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

اس کے وجود سے ناواقف ہے۔ وہ ایک فرضی تصنیف "معراج نامے" کا ذکر کرتا ہے، جس کے وجود سے کوئی شخص واقف نہیں۔ جوہر الذات اور ہیلاج نامہ کے تعلق سے مطلق بے خبر ہے۔

(۷) اِس کا دعویٰ ہے کہ جوہر الذات میری تصنیف ہے اور اس دعوے کی تصدیق کی غرض سے دونوں کتابوں کا ذکر ساتھ ساتھ کرتا ہے لیکن جوہر الذات ہرگز ہرگز اس کی تصنیف نہیں ہوسکتی، کیونکہ زبان و انداز کلام اور موضوع کے اختلاف کے علاوہ مصنف جوہر، ہیلاج نامہ میں کہتا ہے کہ یہ میری آخری کتاب ہے ۔

کتاب آخر است این نامدانی اگر تو زہرہ داری این بخوانی

جوہر کا مصنف ثانی المنصور ہے۔ اِس کا عقیدہ ہے کہ ہیلاج کے ختم ہونے کے بعد اس کی شہادت کے سوا کوئی مرحلہ باقی نہیں رہتا۔

مگو ہیلاج و آں گہ جاں برافشاں دل و جاں در رہ جاناں برافشاں (ص۲۱۷)

اور خود منصور کا بیکر مثالی اِس کو اسی قسم کی ہدایت دیتا ہے، جو ہم جوہر الذات کے سفر سے میں آئندہ دیکھیں گے لیکن بعد میں یہ تبدیل عطار منصور کا عاشق زار اور شہادت کا طلبگار ایک بیاسوانگ بھرتا ہے، مظہر العجائب پر قلم اُٹھاتا ہے، لسان الغیب نظم کرتا ہے، حُبِّ علی اور بغض ناصبی کا وعظ کہتا ہے۔ عطار نہ ہوئے مداری کا تماشا ہوگیا! مصنف جوہر، جوش شہادت میں، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں دیکھا جا چکا ہے، بے تاب ہے، لیکن مصنف مظہر جب ایک لاکھ آدمی اِس کے قتل کرنے پر مستعد ہوتے ہیں! ایک سحرے کے ذریعے سے اپنی جان بچاتا ہے، اس لیے ضروری ہوا کہ دونوں کتابوں کے مصنفین کو دو مختلف اشخاص تسلیم کیا جائے ۔

کرامت سے مار ملند پرواز کی طرح اُڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں اور جائے حیرت یہ امر ہو کہ اپنے بڑے معرے کے باوجود اُن کے دشمن اُن کے دشمن رہتے ہیں اور بدستور درپئے آزار ہیں۔ایک پیر سالک آکر تیس سوال دریافت کرتا ہو، یہ اپنے آپ کو اُن کے جوابات کا نااہل پاکر بہت حقیف ہوتے ہیں۔ لیکن ہاتف غیبی عین وقت پر آکر جوابات تعلیم کر دیتا ہو۔میں پوچھتا ہوں کیا یہ تصنیف عطار کی طرف منسوب کی جا سکتی ہو؟

(۵) مصنف کی طبیعت پر بجائے صوفیانہ ترک و تجرید و فنا، مذہبی ملکہ فریقی جذبات زیادہ غالب ہیں۔جس طرح عشق علی کرم اللہ وجہہ اس کے قلب میں موجزن ہو، بغض نواصب بھی اسی طرح جوش و خروش کے ساتھ لہریں مار رہا ہو۔اس کی زبان اس قدر عامیانہ اور بازاری ہو کہ عطار جیسے فرشتہ صفت انسان کی طرف منسوب کرنا من قبیل محالات ہو۔کیونکہ یہ نقطۂ نظر صوفیانہ معتقدات و احساسات کے بالکل منافی ہو۔

(۶) وہ مدعی ہو کہ میں نے سو کتابیں لکھی ہیں، لیکن اپنی تصنیفات کی زائد سے زائد جو تعداد دی ہو، سولہ ہو، اور یہ وہی کتابیں ہیں جو اور ذرائع سے بھی ہم کو معلوم ہیں۔پھر پھیر کر کئی موقعوں پر انہی ناموں کو دہراتا ہو۔اب اگر یہ اصلی عطار ہوتا تو زیادہ نہیں، کم از کم باقی کتابوں کے نام ہی بتا دیتا۔عطار کی تصنیفات سے اس کی بے خبری کا یہ عالم ہو کہ دیوان عطار سے ناواقف محض ہو۔وصلت نامہ شیخ بہلول کو عطار کی تصنیف مانتا ہو۔ تذکرۃ الاولیا اور شرح القلب کے متعلق اس کو یہ علم نہیں کہ وہ نثر میں ہیں یا نظم میں، اس لیے ان کے اشعار کی تعداد اپنے مفروضہ شمار دو لاکھ دو ہزار اور ساٹھ میں شامل کر لیتا ہو لیکن دیوان کے اشعار کو داخل نہیں کرتا کیونکہ

مرتضی دیدی کہ سرباجوں گرفت — صد تمن جان بداں افزوں گرفت

(۹) شیخ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں، اگرچہ انوری و خاقانی کا ذکر کرتے ہیں لیکن شیخ نظامی کے نام سے واقف نہیں۔ تاہم مصنف مظہر العجائب (جو اسم با مسمی مظہر العجائب ہے) ان کا ذکر کرتا ہے، جیسا کہ -

گہ نظامی را بیاری در سخن — گہ نظامی گوئی من لدن
گہ ہمی گوئی نظام دین منم — گہ قرار عرش علیین منم

بلکہ ایک موقعے پر ایک بے معنی دعویٰ کیا ہے کہ نظامی نے مجھ سے روحانی استفادہ کیا ہے -

خود نظامی بود از من زائیدہ — دادہ ام او را سخنہا فایدہ

کیا یہ بے حقیقت لاف نظامی کے شعر

مرا خضر تعلیم گر بود دوش — برازے کہ آمد بدیرینہ گوش

کی تشریح ہے؟

(۱۰) ہمارا مصنف پیشین گوئیاں کرنے کا نہایت مشتاق ہے۔ ترکوں کے کے متعلق اُس کی ایک پیشین گوئی گذشتہ صفحات میں مرقوم ہو چکی ہے یعنے

بعد ازیں ترکاں کنند عالم خراب — پس دل مسکیں کہ سازندش کباب

ظاہر ہے کہ شاعر اس بیت میں چنگیزی طوفان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ چونکہ اس عہد سے پہلے مغول دنیائے اسلام پر چھا چکے ہیں، اس لیے اس بہروپیے نے یہ پیشین گوئی جڑ دی -

اسی طرح ناصر خسرو کی بددعا سے شہر بغداد میں دنیا کے پچھلے خلیفہ اور اس کے لشکر کے تباہ ہونے کا ذکر کرتا ہے -

بعد ازاں آں شاہ با لشکر تمام — جملہ مردند و نماند از خاص و عام

(۸) مظہر العجائب میں ایک دلچسپ لفظ "تومن" یا "تومان" ملتا ہے۔ اس لفظ کی موجودگی دلالت کرتی ہے کہ یہ کتاب عطار کے عہد سے بہت بعد لکھی گئی ہے کیونکہ لفظ تومان چنگیریوں کے ساتھ ساتھ ایران میں آتا ہے اور سب سے پہلے بحیثیت فوجی اصطلاح رواج پاتا ہے۔ "جہانکشائے جوینی" پہلی کتاب ہے، جس میں یہ لفظ ملتا ہے۔

"تمامت خلائق را دہ دہ کردہ و از ہر دہ یک نفس را امیر دیگر کردہ و از میان دہ امیر یک کس را امیر صد نام نہادہ و تمامت صد را در زیر فرمان او کردہ و بدیں نسبت تا ہزار شود و بدہ ہزار رسند، امیرے نصب کردہ و او را امیر تومان خوانند"۔ (جہانکشا، صفحہ ۲۳، جلد اول)

"چنگیز خان توربائے تقشی را با دو تومان لشکر مغول نام زد کرد تا از عقب او از آب سند گذشت"۔ (جہانکشائے جوینی صفحہ ۱۱۲)

بعد میں مالیات کی اصطلاح بھی بن گیا مثلاً -

"و حقوق دیوانی آں ولایت با آنچہ داخل آں تومان است، پانزدہ تومانی و یک ہزار یا نصد دینار است"۔ (نزہت القلوب حمد اللہ مستوفی صفحہ ۱۴۴، طبع ملک الکتاب)

عطار کا اس لفظ سے آشنا ہونا، اول تو بعید ہے اور پھر اس کا اس طرح استعمال کرنا کہ گویا فارسی کا روزمرہ ہے اور بھی مشکل ہے۔ امثال ذیل ملاحظہ ہوں -

صد تومان بالشت ایں جو قیمتش جو نگشتی و سرو جز منتش (ص۱۴۳)
مال عالم داشت گوید صد تومن لیک پوشش شاں بودہ دربدن (ص۹۳۶)
در آں عصر او دو مہ میرش بود سالے او دو ساعت بیش رس بود

یہ بھی ایک قسم کی پیشین گوئی ہے۔ حافظ سے مُراد خواجہ حافظ شیرازی متوفی سنہ ۷۹۲ ہجری ہیں۔ اور قاسم سے مراد شاہ قاسم انوار ہیں، جو ۸۳۵ھ یا ۸۳۷ھ ہجری میں انتقال کرتے ہیں۔

جو شخص ماضی کے مشاہیر کے ناموں اور اُن کے سِن وسال میں فاحش اور یاس انگیز اغلاط کا مرتکب ہو، وہ مستقبل کی تاریک لوح کے اسرار کیا پڑھ سکے گا۔ اس لیے ہمیں مصنف مظہر العجائب کے دعوئے غیب گوئی کو یک قلم ترک کر کے اصل حقیقت کو بے نقاب کر دینا چاہیے کہ یہ کتاب ایک افترائے عظیم ہے جو فرشتہ صفت عطار کے نام پر باندھی گئی ہے۔

مولانا روم، خواجہ حافظ اور شاہ قاسم انوار کے ذکر سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب نویں صدی ہجری کے منتصف اول کے خاتمے کے بعد کسی وقت لکھی گئی ہے، بلکہ میں دسویں قرن کے ربع اوّل میں اس کا زمانہ ماننے کے لیے آمادہ ہوں اور میرے وجوہ یہ ہیں -

(۱) اس کے قلمی نسخے گیارہویں صدی سے پُرانے نہیں ملتے۔

(۲) مصنف اپنے آپ کو میر حسین منصور کو حسینی کہتا ہے اس لفظ کا رواج نویں صدی میں کم، لیکن دسویں صدی میں بہت زیادہ ہو جاتا ہے جو صفوی اس کے استعمال کو فروغ دیتے ہیں۔

(۳) سجدے کی رسم جس کا منصور کے قصے میں ذکر آتا ہے، صفوی عہد میں غالباً رواج پاتی ہے۔

(۴) سنیوں کے خلاف اس کتاب میں جو تشدد کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے، ایسے زمانے میں ممکن ہے جب کہ ملک میں شیعہ حکومت برسر اقتدار ہو۔

الغرض شاہ اسمٰعیل صفوی سنہ ۹۰۷ ہجری۔ سنہ ۹۳۰ ہجری کا عہد اس

آں ملا برجان اہل نعی بود داں کہ از حوش ما براسعی بود و صہ

یہ دنیا نہیں ہے بلکہ ہلاکو کے حملۂ بغداد کی طرف تلمیح ہے۔

(۱۱) ایک اور پیشین گوئی کی ہے کہ میرے بعد ایک درویش روم میں ہوگا جو میرے عقائد کی شراب سے سرشار ہوگا اور میرا خرقہ پہنے گا، تم کو چاہیے کہ اس کے ہاتھ سے جام وحدت نوش کرو۔

شمۂ از آں بہ بعد من بروم عارفے گوید بہ اصل ہر علوم
گر تو اہل وحدتی رو گوش کن جام وحدت را از دستش نوش کن
از ہماں جامے کہ من نوشیدہ ام در ہماں خرقہ کہ من پوشیدہ ام
او بپوشد او بپوشد شمس دیں ایں معانی را بود سر پوشش دیں

(صفحہ ۶۲-۶۳)

مولانا جلال الدین رومیؒ کی طرف اس سے زیادہ صاف اور صریح تلمیح ہو بھی نہیں سکتی شمس دیں سے مراد شمس تبریز ہیں۔

(۱۲) اگر اب بھی اس جعلی عطار کے متعلق شبہ ہے تو ذیل کے ابیات پر غور کر لیا جائے۔

گر تو لے شاعر بہ بینی مظہرم در تحوانی یکز ماے جوہرم
آں زماں معلوم گردد شعر تو خط و حالے خود بیانی اندرو
شعر حافظ جواں از ما قاسم بیں زانکہ ایشاں بد ما ملا قریں
بعد من اسرار ایشاں گوش کن رود حسب عشق شاں می نوش کن

۱؎ تعجب ہے کہ ایسی صریح شہادت کو صرف نظر کر کے جو اس تصنیف کی مجہولیت کے حق میں موجود ہے، علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی دنیا کو عطار کے متعلق اور تقیہ اور جمود طبع کا افسانہ سنا رہے ہیں۔

انھیں حیدری سانچے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اُن کی تصنیفات جو ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک ہیں، یہ ہیں ۔

(۱) اسرار نامہ (۲) الہٰی نامہ (۳) پند نامہ (۴) تذکرۃ الاولیا (۵) خسرو نامہ (۶) دیوان (۷) شرح القلب (۸) منطق الطیر (۹) مصیبت نامہ (۱۰) مختار نامہ۔

رہیں باقی پچیس کتابیں، ان میں تیرہ غیر عطار ثابت ہو چکی ہیں۔ باقی کتابیں یہ ہیں ۔

(۱) احوال الصفا (۲) اشتر نامہ (۳) بلبل نامہ (۴) حقائق الجواہر (۵) حیدر نامہ (۶) سیاہ نامہ (۷) لسان الغیب ۔ (۸) کنز البحر (۹) مرہبت الاحباب (۱۰) وصیت نامہ (۱۱) دلر نامہ (۱۲) ہفت وادی۔

ان میں اُشتر نامہ، بلبل نامہ، مرہبت الاحباب اور ہفت وادی، میری نظر سے گزر چکی ہیں، لیکن اُن کا تبصرہ بعض وجوہ کی بنا پر سردست ملتوی کرتا ہوں، لسان الغیب اور حیدر نامہ اگرچہ میری نظر سے نہیں گزریں، لیکن یہ دونوں کتابیں علی الاعلان مجہول مانی جاسکتی ہیں۔ یہی کیفیت حقائق الجواہر کی ہے۔ کنز البحر اور کنز الاسرار اصل میں ایک ہی کتاب ہے ۔

(۱۲ - ۱۳) جوہر الذات و ہیلاج نامہ

اگرچہ مصنف ان کو علیحدہ علیحدہ کتابیں مانتا ہے لیکن میں اتحاد مضمون ورماں کی بنا پر دونوں کا تبصرہ ایک ہی ساتھ مناسب سمجھتا ہوں۔ اشتر نامہ، جوہر الذات اور ہیلاج نامہ ایک ہی شخص کی تصنیف معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں مثنویوں سے اکثر تذکرہ نگار واقف ہیں اور فہرست نگار بالاتفاق

تصنیف کے لیے بہت موزوں معلوم ہوتا ہے جب کہ مذہبی لحاظ سے ایران نئی کروٹ لے رہا تھا، جدید سیاسی انقلاب نے مذہب اثنا عشری کو صدر میں جگہ دے دی تھی، سنی بزور شمشیر شیعہ بنائے جا رہے تھے، اُن کے علما قتل کیے جا رہے تھے، جس نے انکار کیا تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ زندہ ایک طرف، مُردوں کی قبریں اُکھڑوا کر پھنکوا دی گئیں اور ان کی ہڈیوں کو جلا دیا گیا۔ اصحاب ثلثہ کے خلاف نفرت کی آگ چاروں سو مشتعل تھی، حضرت فاروق رضی اعظم جن کی بدولت ایران نے نعمت دین اسلام حاصل کی تھی آج انھیں کے نام پر لعنت و نفرت کی آوازیں مسجد و منبر سے بلند ہو رہی تھیں۔ شاید اسی موقعے کے لیے شیخ عطار نے اپنی الہامی زبان میں اشعار ذیل لکھے تھے۔

عجم را اوّل جہود و گبر بودند ازاں گوئے مسلمانی ربودند

کسے کا عدل او ایماں اثر یافت زمہر او چرا امروز سرتافت

(خسرو نامۂ عطار)

جب زندہ سنّیوں کو بزور شمشیر شیعی بنایا جا رہا تھا تو کوئی تعجب نہیں اگر مردہ سنّی مشاہیر کو بزور قلم ذاتی یا مذہبی اغراض کی بنا پر اسی مذہب کے دائرے میں لانے کی کوشش کی گئی ہو چنانچہ مظہر العجائب اور لسان الغیب اسی قسم کی کوشش کا نتیجہ ہیں۔

عطار اگرچہ کسی نئے مذہب کے بانی نہیں اور نہ کسی جدید فرقے کے پیشوا ہیں، لیکن دیکھا جاتا ہے کہ اُن کی شہرت سے فائدہ اُٹھانے کی غرض سے مختلف فرقوں نے ان کو اپنی اپنی اخوت کا رکن بنانے کی کوشش کی ہے۔ جوہرالذات میں وہ بانی المنصور کی حیثیت سے دکھائے گئے ہیں مظہرالعجائب میں ایک اثنا عشری شیعہ کے لباس میں پیش کیے گئے ہیں۔ حیدر نامہ میں

آگاہی دل در اسرار و از تقلید دور شدن، صفت وصل و از کل وغیرہ وغیرہ

جلد دوم ـ سوال از منصور در سرّ آدم، صفات جان و دل، صفات عناصر، قصۂ منصور و اعیان او، صفات فیض و حکمت حکما، عین ذات و صفات و قدرت و قوت اسرار الٰہی، در آگاہی دادن دل در عین مرسل، جوہر حقیقت صفت دنیا، کشف اسرار حقیقت در نمود صور، در صفت حضرت محمد علیہ افضل الصلوٰۃ گنج جان و دل، صفات حضرت پیر دانا، صفت معراج عین العیان، صفت کنت کنزاً مخفیاً، در عیان جام منصور، سوال از منصور در عیان عشق و جواب او، عیان در دنیا و دار منصور، اسرار حسین منصور، در تفسیر اللہ نور السمٰوٰت والارض، در عیان دیدار صورت و معنی سرّ منصور، سوال صاحب راز از منصور، در واصل شدن سالک و اعیان منصور، سوال از ابلیس و جواب دادن او، سوال از حسین منصور در اسرار ابلیس، حکایات ابلیس و اسرار وے وغیرہ وغیرہ۔

ہیلاج نامہ ـ در اسرار عشق بہر نوع، نموداری ہیلاج، جواب منصور شیخ جنید را، فنا و بقائے کل، جواب منصور در خطاب حق عز وجل، عیان جان، حقائق اسرار، سلوک سالک، نموداری عشق، شریعت و طریقت و حقیقت جملہ یکیست، کشف حجاب، نموداری یقین، موتوا قبل ان تموتوا، اذا تمّ در رہ شریعت، اسرار دل و جان و تفسیر قرآن، حکایت حقیقت منصور، جواب منصور شبلی را، سوال بایزید از منصور و جواب وے، نموداری سرّ توحید، گریستن بایزید بر حالت وے خودی منصور، اسرار گفتن منصور بر دار، سخن گفتن شیخ جنید و شیخ کبیر در کار منصور، نکوہش کردن علمائے مغرور منصور را و جواب آن، جواب شیخ جنید شیخ کبیر را، عین الاعیان توحید، سوال جنید از منصور در حقیقت شرع و جواب آن، سخن گفتن منصور با شیخ کبیر اسرار گفتن

عطار کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اُن کے قدیم نسخے دو ہیں، جو نویں قرن[1] ہجری کے نوشتہ ہیں اور کئی کتب خانوں میں ملتے ہیں۔

جوہر الذات ایک ضخیم مثنوی ہے جو نول کشور کے مطبوعہ کلیات کی پوری پہلی جلد پر محیط ہے، اس کی دو جلدیں اور ۵۸۲ صفحات ہیں ہیلاج نامہ ص ۵۸۳ سے شروع ہو کر ص ۷۷۰ پر ختم ہوتا ہے۔ فی صفحہ بیالیس ابیات ہیں، اس حساب سے دونوں مثنویوں کے اشعار کی تعداد بتیس ہزار کے قریب ہے

جوہر الذات کے بعض ممتاز عنوان یہ ہیں —

جلد اوّل :- تکریم بنی آدم۔ امامت امیر المومنین علیؑ، حکایت پیر، توحید صرف و لقائے کل، خطاب پدر و پسر و مقالات ایشاں، حکایت پیر، رو گرداندن شیطان، در مشقت کشیدن آدم از شیطان و شرف انسان، اسرار قربت شیطان، تخلیق آدم فی صورت الرحمٰن، و ہو معکم اینما کنتم، پیدا آوردن حوّا از پہلوے آدم، اسرار اعیان کل، رفتن ابلیس در بہشت بہ تلبیس در دہان مار، مباحات شیطان، اسرار یافتن حضرت علی کرم اللہ وجہہ و در چاہ گفتن، اسرار نے، اسرار نفس مردم، سوال امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ و جواب دادن نے در اسرار ہا، مکر شیطان با آدم، وحدت صرف و یکتائی ذات و صفات، سوال از منصور و جواب او، تقریر شیخ ابوسعید مہنہ، نگاہ کردن درویش در کواکب و جواب ہاتف، در بیان نشانی حسین منصور، مباحات شیخ اکافی، در التماس کردن جامہ کل از شیخ حسین منصور، در سر نگاہ داشتن، سوال از حسین منصور و جواب دادن او۔ حکایت مرد با کبار، در اثبات ذات کل،

---

[1] سب سے پرانا نسخہ وہ ہے جو پروفیسر آدر کے کلیات نوشتہ ۸۵۵ھ ہجری میں شامل ہے۔ دوسرا نسخہ برٹش میوزیم میں آر (۳۵۳) ہے جو ۸۶۸ھ ہجری کا نوشتہ ہے۔

دیگرے گوی میم کہ چوں منصور عطار　　　نخواہم سر بریدن رود ناچار (ص۳۳)
دیگرے شدستم کشتہ چوں منصور اسرار　　　مرا آویختن اندر سر دار (ص۶۶)
اس کا خیال ہے کہ جب جوہرالذات کو پورا کر کے ہیلاج نامہ ختم کر چکوں گا

تب مجھ کو پارہ پارہ کیا جائے گا ۔

جواہر نامہ باقی چند ماند است　　　زبہر ایں دلم در بند ماند است
رسانی ایں تمام آخر بپایاں　　　دگر ہیلاج شرح ذات جاناں
بگوئی بعد جوہر آشکارا　　　کنند آں زماں ہر پارہ پارہ

(ص۳۲۵)

اس شہادت کی بشارت حضرت علیؓ نے خواب میں آکر مصنف کو

دی ہے ۔

شبے دیدم جمال جان و دلبش　　　شدم افتادہ اندر خاک پایش
ازو پرسیدم از عالم سراسر　　　مرا بر گفت اندر خواب حیدرؓ
بگفتم رازہا در خواب آں شاہ　　　مرا از کشتن او کرداست آگاہ
مرا گفتا کہ اے عطار ماندہ　　　زشرع عشق بر خوردار ماندہ
بسے گفتی زما ایں جا حقیقت　　　سری بردی ما راہ شریعت
حقیقت بر تو ایں در برکشادیم　　　ترا گنج یقیں در دل نہادیم
مکش رنج ایں زماں چوں گنج داری　　　ما در عشق جاں کی پائے داری
اگر خواہند کشتن آخر کار　　　کہ کردی فاش ایں جا گاہ اسرار
کسے کو راز گوید حقیقت　　　بگیرندش او را در طبیعت
حقیقت گفت منصور آں خود دید　　　دریں جا گہ جہانے رسک دید

(صفحہ ۶۹۱)

منصور با شیخ کبیر، راز گفتن حمید با شیخ کبیر از ہوا داری منصور، اسرار گفتن عبدالسلام در حضور منصور، اسرار گفتن عبدالسلام با شیخ حمید، در ہوا داری شیخ کبیر با منصور، سخن گفتن شیخ کبیر با منصور از ہوا داری قصاص، فریدالدین عطار در ہوا داری خود و اسرار منصور۔

ان سرخیوں کو پڑھ کر ناظرین یہ خیال کریں گے کہ بڑے جلیل القدر اور اہم مباحث ان کے تحت میں مذکور ہوں گے، لیکن ایک عنوان کے ذیل میں آدمی دس صفحے پڑھ جائے اور پھر بھی یہ نہ کہہ سکے کہ اس نے کیا سیکھا اور بعض اوقات تو سرخیاں بالکل برائے بیت ہیں۔

مصنف اپنا نام فریدالدین محمد بیان کرتا ہے۔

حقیقت بس محمد نام دارم — ازو پیدا حقیقت کام دارم
فریدالدین محمد ہست نامم — محمد دادہ این جا جملہ کامم (ص ۳۷)

وہ اپنے تخلص "عطار" کے ذکر کرنے کا بے حد شائق ہے، کتاب کا کوئی صفحہ ایسا نہیں، جس میں تخلص مذکور نہ ہو۔

جواہر الذات میں بیان کیا ہے کہ میں اشترنامہ میں بعض اسرار بیان کر آیا ہوں۔

ز اشترنامہ سر کار دیدی — حقیقت دیدہ و دیدار دیدی (ص ۳)

لیکن یہ کتاب اس سے افضل ہے۔

ز اشترنامہ این بہتر نمودم — ز ہر دو عالم این برتر نمودم (ص ۴۶)

اکثر مقامات پر وہ اپنے قتل اور منصور کی طرح دار پر چڑھائے جانے کی پیشین گوئی کرتا ہے۔

جواہر ذاتش سر گو آشکارا — چو جوہر کرد یا رب پارہ پارہ (ص ۳)

چو جوہر نامہ کردم فاش آخر — نمودم صورت نقاشش آخر
بکلّی در شستم زار مانده — ضعیف و ناتوان و خوار مانده
دریں اندیشہ کہ از مادہ جوہر — چہ اسرار آید ایں جاگاہ ظاہر
نظر کردم یکے دیوانہ دیدم — ز علم صورتے بیگانہ دیدم
کہ آمد پیش من ایں عاشق زار — لب از ہم برکشا دو گفت اسرار
زبانے بود ایں جا ساکن و خوش — دگر آورد سر بیروں ز آتش
مرا گفتا چرا در غم نشستی — درے بر روئے خود بر بستی
نہ وقت آمد کہ دیگر راز گوئی — دگر اسرار جاناں باز جوئی
تو ایں دم عاشقی و راز دیدہ — جمال دوست در خود باز دیدہ
طلب کردی و دیدی روئے مطلوب — رسیدی ایں زماں در ذات محبوب
چرا فارغ نشینی زود برخیز — دگر در عشق و ذوق فقر آویز
چو کردستی دریں جا عاشقی ترک — سحر گشتی نماند ستت دگر برگ
کنوں باید کہ گوئی سرّ اسرار — حقیقت فاش گردانی دگر بار
تمام من کتابے نغز آری — دگر ہوشے دگر با مغز آری
تمامِ من دہی بنیاد ایں جا — دہی امروز ایں جا داد ما را
خدایم ایں زماں من واقف خود — دروں جاں توئی من واصف خود
بدو گفتم کہ اے جاں چیست نامت — کہ حق داد است ایں جاگاہ کامت
جوابم داد من منصور حلاج — مرا ماست درآفاق ہیلاج
کنوں بنویس مر اسرار ما را — نگہ میدار مر گفتار ما را
دروں جاں تو مائیم گویا — توئی از من شدہ در عشق گویا
بگفت ایں، آں گہے بر دیگر آمد — جہانے دردل تارتکم آمد

مختصر یہ ہے کہ مصنف بے شمار موقعوں پر اپنے قتل و شہادت کی غیب گوئی کرتا ہے۔ اس کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ وہ مظہر منصور یا نمودار منصور ہے۔ ہیلاج نامہ کے دیباچے میں کہتا ہے کہ جب میں جواہر نامہ کو ختم کر چکا، اس فکر میں مبتلا ہوا کہ دیکھیے آیندہ کیا اسرار ظاہر ہوں۔ اسی فکر میں ایک روز گوشۂ تنہائی میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں میری نگاہ ایک دیوانے پر پڑی جو چپ چاپ آکر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور پوچھنے لگا کہ اس قدر خاموش اور ملول کیوں ہے؟ جس کا تو طالب تھا وہی مطلوب سامنے کھڑا ہے، تو نے سب سے قطع تعلق کر لیا ہے اور تیری شہادت کے سوا اب کوئی مرحلہ باقی بھی نہیں رہا، لہذا تجھے لازم ہے کہ کشف اسرار کرے اور حقیقت کے پردے اٹھا دے، اس کتاب کو تو میرے نام پر لکھ۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ آپ کا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا میں منصور حلاج ہوں، اور عالم میں ہیلاج کے نام سے معروف ہوں۔ تیری جان میں میں ہی گویا ہوں اور میری ہی وجہ سے تجھ کو گویائی حاصل ہے، یہ کہہ کر میرے قریب آیا، میرے ہاتھ اور سر پر بوسے دیے اور میرے سر پہ اسرار کا تاج رکھ دیا۔ اس وقت میں نے آنکھ اٹھا کر ہیلاج کو دیکھنا چاہا لیکن وہ غائب ہو چکا تھا اور مجھ کو ایک نشانی دے گیا تھا، یعنی میرے سر پر ایک کلاہ چھوڑ گیا تھا۔ جب مجھے ایسی ٹوپی مل گئی ہے تو جس قدر فخر کروں بجا ہے۔ اسرار حلاج کی یہ آخری کتاب ہے جو میں لکھ رہا ہوں، اس میں معنے کے بے شمار حوالے ہیں[1]

[1] اس قصے پر غالباً وہ روایت جو نفحات الانس (ذکر عطار) میں ملتی ہے کہ نور منصور ڈیڑھ سو سال بعد عطار پر تجلی کرتا ہے، تاثیر پاتی ہے یا یہ قصہ اس روایت کی بنیاد پر نشوونما پاتا ہے۔

مصنف اس کو پچاس بیت میں ادا نہیں کر سکتا۔ اس کا ہر دوسرا مصرع برائے بیت ہوتا ہے۔

قدم قدم پر کسب حقیقت و اسرار کا مدعی ہے، لیکن اگر اسرار بیان کرنے کا یہی ڈھنگ ہے، جو اس نے اختیار کیا ہے تو ایسے بیان کرنے سے اس کا بیان نہ کرنا بہتر ہے ؎

کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا میرے بیان سے
اک مرغ ہے جو مست لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

لیکن پیشتر اس کے کہ میں اور امور کی طرف توجہ کروں مجھ کو چند الفاظ اس کی زبان اور طرز کے متعلق کہنے ضروری ہیں —

خاص خاص روز مرے، محاورے، خیالات، الفاظ اور بندشیں مل کر بحیثیت مجموعی، کسی مصنف کی شخصیت یا اُس کے انداز تحریر کو قائم کرتے ہیں اس نقطۂ نظر سے ہمارا شاعر ایک طرز خاص کا مالک ہے، جو اس کو نہ صرف عطار سے بلکہ دیگر شعرا سے بھی ممیز کرتی ہے۔ اس کے ہاں حقائق و اسرار کے بیان کرنے کی خاص خاص اصطلاحیں ہیں جو دیگر مصنفین نے کم استعمال کی ہیں۔ مثلاً:-

دید، دید دید، بود، بود بود، بود نبود، واصل دیدار، سر اسرار، جان، جان جان، کل، لقا، عیان، عکس عیان، عیان عیان، عیان در عیان، عیان عشق، عین الیقین، موادار، حقیقت (ذات مصطفوی) شریعت (قول و فعل او) یک رنگی، بے نشانی، نقش، نقاش، نقش طبیعت، جانان، شاہ، دار طبیعت، عین طبیعت، قربت لا، دار، اعیان ذات، عین تمام، وصال کل، عیان یار، در دجود مردان، عین پرگار، مغز پوست،

بدادم بوسہ بر دست و بر سر — نہادم بر سر او اسرار افسر
نظر کردم پس آں گہ سوی بالا — کہ تا بینم مبارک روی بیلا
ندیدم ہیچ صورت در میانہ — مرا بخشید آں گہ یک نشانہ
کلاہی بد نشانی بر سر ما — کہ آں باشد بعالم افسر ما
بخود گفتم کہ ہاں برخیز و خوش باش — کہ سود است اینک روی لعاق
سرافرازی کن اے بے سرو در آخر — کہ ایں جا نیستت ہم سر در آخر
کتاب آخر است ایں تا بدانی — اگر تو رہبرہ داری ایں بخوانی

(ہلاج نامہ قلمی - کلیات پروفیسر آذر)

یہ مثنویاں عطار کی دیگر تصنیفات مثلاً الٰہی نامہ، اسرار نامہ منطق الطیر اور مصیبت نامہ کے ساتھ کوئی نسبت نہیں رکھتیں۔ عطار اگرچہ پُرگو ہیں، تاہم ان کے ہاں زبان کا لطف اور متانت کافی مقدار میں موجود ہے، اُن کا قاعدہ ہے کہ جس مسئلے کو چھیڑتے ہیں، اسی کو پیش نظر رکھ کر اور غیر ضروری امور سے بچ کر ایک خوش مذاقی کے ساتھ اپنے ضروری دلائل اور آرا بیان کر دیتے ہیں۔ مصنف جوہر الذات اس بارے میں عطار کے بالکل برعکس ہے، وہ سب کچھ کہہ جاتا ہے لیکن نفس مضمون کو تشنہ چھوڑ جاتا ہے، پھر اُس کے بیان کرنے کا ڈھنگ عجیب و غریب ہے ہر مضمون کے متعلق ایک پُراسرار فضا پیدا کر دیتا ہے ہر چیز اس کے نزدیک ایک راز ہے خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ وہ اس کے گرد اسی طرح گھومتا ہے، جس طرح ایک بلی کسی چوہے کے گرد دبوچنے کے بجائے چکر لگاتی رہے۔ جن اسرار کے انکشاف کا وہ دعویٰ کرتا ہے بجائے اس کے کہ اُن کا حل سوچے، یا اُن کے حل کی کوشش کرے، ان کا وظیفہ یا ورد شروع کر دیتا ہے۔ جو بات آسانی سے پانچ شعروں میں کہی جا سکتی ہے، ہمارا

جمالِ من ندیده غافلا تو درین خانگاه لے بے حاصلا تو (ص ۱۹۴)
شد این خانگاه اندر آخر کار اگرچه برکشید او رنج و تیمار
در آخر گشت این خانگاه واصل شدش مقصود این خانگاه حاصل (ص ۱۹۸)
مرا این جایگه او مشغول کرد دمادم پیش حلقائم محل کرد (ص ۱۹۵)
ترا این کلش این جایگه خوش آمد ازاں اصلت ز باد و آتش آمد (ص ۱۸۹)
ز تیر عشق این جایگه بدرد پس آنگه بودت این جایگه سوزد (ص ۱۰۳)

"بے" جو ماضی ناتمام اور حال کی علامت ہو، اصل فعل سے دُور لایا جاتا ہو۔

چرا چون بیخبری در خاک فانی ازاں می رہ سپردی و ندانی (ص ۲۳)
دروست روشنائی دارد این جا دروست می جدائی دارد این جا (ص ۲۴)
بخواہی یافت آخر می رہائی چرا بے چارہ در قید ہوائی (ص ۳۴۳)
بخورشید می تابان ساشد ندیدی این ترا تا داں ساشد (ص ۳۴۸)
نمی دانی کہ می آخر چہ بودت زہے حیف این گفت و شنودت (ص ۱۲۸)

'من'، 'تو'، 'او' اور 'ما' وغیرہ معمولی معنوں میں لائے گئے ہیں۔

تو دارم در جہاں و کس نہ دارم کہ عمرے سوے دیدت می گزارم (ص ۲۱۶)
چو من دیدی مست شمایم اینجا ر حجاب اندارم این دم آخرت را (ص ۲۳۹)
تمامت مست شد خیر اسد حاما ز درد دشت تو می خواہد جاما (ص ۱۸۴)
تو ما را داشت مارا این و ما خوے ہر آن راز یکہ می داری بما گوے (ص ۱۹۱)
زہے حسن تو دادہ ماہ را نور کہ در آفاق او دیدیم مشہور (ص ۲۱۷)

'را' زائدہ کی مثالیں۔

خبر دادم شما را از شما را کہ خواہد بود تان آخر صفا را (ص ۲۳۹)

عین طبیعت، رمز مطلق، دیدار دید، دیدار اعیان، کل دید، نقطۂ دیرگار، کل لقا، ہیلاج جہاں، عیان عقل وغیرہ۔

'ما'، 'مر'، اور 'بے'، جیسے حروف اپنی قدیمی شکل یعنے 'اما'، 'امر'، اور 'ابے'، کی صورت میں ملتے ہیں اور ہم کو حیرت ہے کہ یہ تناہمامہ اور گرشتاسپ نامہ کے دور کے یادگار جواہرالذات اور ہیلاج نامہ میں کیسے نمودار ہو گئے، حالانکہ عطار کی اصلی مثنویات میں نظر نہیں آئے۔ امثال:۔

بسم اللہ و رحمٰن و رحیم ابے صورت یقین حد قدیم (ص ۹۹)
ابے غم ستد ہر آنکو برد فرمان ترا ورد فنا و اوسوے رندان (ص ۳۳)
رہ دور و عجب در پیش داری اما خود بیر پیش اندیش داری (ص ۳۴)
دمے گوید مست دیدار دارم اما تو اندرین سرکار دارم (ص ۳۱)
محمد ما علیؑ دارد بے شک وجود لحمک لحمی امر یک (ص ۳۳)
ابے گشتی امر گرد کمر تو کہ مار این حاری بوے اگر تو (ص ۲۵)

لفظ "حقیقت" بھی درحقیقت مصنف کا تکیہ کلام بن گیا ہے امثال:۔

حقیقت بیرار خود رفت بیرون کہ بیرون بود او از ہفت گردوں
بہ پردہ بود لے شاہ جہاں تاب حقیقت گم شدہ او اندر و یاب
ہمہ در پردہ گم دید و یقین دوست حقیقت مغز گشتہ و درعیان پوست (ص ۳۷)

یہ اشعار میں نے صرف ایک صفحے ہی سے نقل کر دیئے ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت علیؑ کی بشارت کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

دوسرا تکیہ کلام 'جاگہ'، 'جایگہ'، اور 'جاگاہ'، ہے، جو جوہر اور ہیلاج کے طول وعرض میں ہر مقام پر موجود ہے۔ میں کہتا ہوں وہ صفحہ نہایت مدنصیب ہے جہاں یہ الفاظ نہ ہوں، امثال۔

ثنویوں کی مرکزی شخصیت حسین بن منصور حلاج ہے، جس کو مصنف
کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ مثنویاں گویا اس کے اقوال و افعال
ی داستانیں ہیں۔ مخلوق خالق کے لیے اور عبد معبود کے لیے جس
کہا سکتا ہے وہ سب احترام منصور کے لیے دکھایا گیا ہے جو منصور
ہی زبان استعمال کرتا ہے، جو بشریت کی حدود سے گزر کر الوہیت
دم لیتی ہے اور بندے اور خدا میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا
و قصے یہاں ملتے ہیں، عام طور پر معلوم بھی نہیں۔ منصور کی مثنوی
ایت کلیات میں صفحہ ۵۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۶۹ پر ختم ہوتی ہے۔
خلاصہ یہاں درج کرتا ہوں۔
ں کا بیان ہے کہ میں نے اپنے پیر سے سنا ہے کہ چین میں ایک تاجر
ا بے حد شائق تھا۔ اس بوڑھے تاجر کے ایک لڑکا تھا، جیسے
دے ماہتاب، جس قدر حسین و جمیل تھا اسی قدر متقی اور راست باز
ہ ذکر کے سوا کوئی چیز اس کو پسند نہ تھی۔ ایک مرتبہ یہ لڑکا اپنے باپ
ر کو گیا، راستے میں ایک دریا آیا جس کو عبور کرنے کے لیے انھیں کشتی میں
اتنے میں ملاح نے کہا کہ طوفان آگیا ہے۔ لڑکے نے اپنے باپ
و جان! یہ خوفناک مقام ہے، آؤ کشتی چھوڑ دیں، اور کہیں چل کر
ونکہ مجھے الہام ہوا ہے۔ باپ نے کشتی میں ٹھہرنے کے لیے اصرار
اے فرزند! نادانی نہ کر اور طفلی کی حد سے باہر آ، اور بتا کہ
و کس طرح معلوم ہوئی۔ اس نے جواب دیا کہ جب تمہارے پاس
ہے تو پھر کیوں دریا کے سفر سے اپنی جان جوکھوں میں ڈالتے ہو
ب دیا اے فرزند! دنیا ایک عزیز مقام ہے اور انسان ایک زند

گماں بردار اے بیہودہ خود را   نگندہ تہمتے در نیک و بد را (ص ۳۳۹)
می دانی جوا بے دادن اورا   کہ مانند در خور جاناں نکورا (ص ۳۴۴)
ز لعبد خالق کون و مکاں را   ثنا بر خاتم پیغمبراں را (ص ۵۸۸)

حاصل بالمصدر "گفت و گو" وغیرہ کے ٹکڑے کرکے حروف جارہ وغیرہ درمیاں میں لائے جاتے ہیں۔

درم نکشا دہ در گفت و در گوے   مگو اکنوں دگر در جست و در جوے (ص ۶۶۸)
مگوید آں زماں جا کسترا د   انا الحق ہمچناں در گفت و در گوے (ص ۵۸۴)
در اول نستم چوں کردہ بد او   بہر رہ دائم ایں جا گفت با گو (ص ۴۸۵)
ز عقل سعل چہ گفت و چہ گویست   ہمہ صورت نشست جست و جویست (ص ۱۱۷)
من از منوی بیاں کردم ابا او   کہ تا کوتہ شود ایں گفت دیں گو (ص ۵۶۲)

الف زائدہ ۔

ترا ایں جاست ابراہیم درتن   شود در عاقبت ایں جا بت آتش (ص ۵۲۲)

عربی الفاظ میں تصرفات :۔

عام کی جمع عوام ہے، لیکن مصنف "اعوام" لایا ہے ۔

کنوں اے شیخ ایں اعوام مسکیں   بصورت ماندہ ایں شور ند و در کیں (ص ۶۶۵)

دیگر :۔

طلبگار تواند ایں جا محو مات   کجا واشند از سر معلومات (ص ۳۶۸)

معائنہ بروزن مفاعلہ ہے، مصنف نے بروزن مفاعیلہ استعمال کیا ہے۔

معائینہ جمال خود نمود است   کہ با عطار در گفت و شنود است
معائینہ مرا کرد است واصل   حقیقت بود او شد جان و ہم دل
معائینہ دل بد جانم یکے کرد   ز دیدار خود ایں جا نگہ کرد (ص ۵۱۲)

میری رہنما عین ذات ہے، تم لے تک میرے پدر محترم ہو، لیکن میری حقیقت
سے واقف نہیں تم کشتی دیکھتے ہو اور میں دریا کو دیکھتا ہوں، میں اس
بحر میں گوہر الا دیکھتا ہوں۔ اس تاجر کو خیال ہوا کہ لڑکا دیوانہ ہو گیا ہے۔ کہنے
لگا لڑکے! یہ سودا تجھ کو کس سے ہوا ہے کہ تو اپنے آپ کو واصلین میں
شمار کرنے لگا، اگر اب خاموش نہ رہا تو میں تجھے دریا میں پھینک دوں گا میری
عقل حیران ہے کہ تو حدود سے باہر نکلا جا رہا ہے، تجھ کو لازم ہے کہ "عنان عقل" سے
کام لے۔ لڑکے نے جواب دیا: نادان! تمھیں یہ خیال ہے کہ میں کوئی حیث
ہوں، حالانکہ عالم جان میں سب عین جانان ہیں۔ اس کشتی میں میں ایک
بحر اعظم ہوں، اگرچہ تمھارے ساتھ بحر ہستی میں ہوں، لیکن میں اپنی صورت
کا دریگانہ ہوں۔ میں یہ باتیں کیوں نہ کہوں، جب جانتا ہوں کہ راست ہیں۔
تم نے مجھ کو دریا میں پھینک دینے کی دھمکی دی، میں کہتا ہوں تم ضرور اسے
پوری کرو میں اسرار حقیقت کا مالک ہوں اور انوار طریقت میرے دیکھے
بھالے ہیں۔ اگر تم نجات دارین حاصل کرنی چاہتے ہو تو مجھ کو اس بحر ہستی
میں تنہا چھوڑ دو۔ تقلید میری دامنگیر نہیں ہے میں اس دریا سے نکل جاؤں گا
تمھارا خیال ہے کہ میں غرق ہو جاؤں گا لیکن میں کہتا ہوں کہ مجھ کو کون و
مکاں سے باہر اڑ جانا چاہیے۔ میں ذات ہوں، پھر کس لیے کشتی صفات میں
رہوں، مجھ کو خدا کا حکم ہے کہ دفعتاً گم ہو جاؤں۔ اس دریا میں میں مستور ہوں
اور تمام عالم میں مشہور ہوں گو میں میرے اسرار ہیں، لیکن میں نامحرموں کی
آنکھوں سے مخفی ہوں۔ میں اسرار کا دریائے لاہوتی ہوں، جو دریا میں
ناپیدار ہو جائے گا علم و حکمت حق کا دریا ہوں، راز مطلق کو
افشا کروں گا۔ دریائے علم اور بحر تنزیل ہوں اور صورت کو

کے دس گنا کرنے کی حرص سے تمام خطروں کا مقابلہ کرتا ہے۔ دیکھو ابھی ابھی
کشتی میں بڑے بڑے تاجر موجود ہیں اور سب اسی امید میں آئے ہیں کہ نفع
کمائیں۔ لڑکے نے جواب دیا اے پدر محترم! اس سے کیا فائدہ؟ دریا
میں آنے اور فنا ہونے سے حاصل؟ ہمیں ابدی بیک نامی کے استحصال
کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ سب لوگ رُپیہ اور دولت بٹورنے والے ہیں
اسی لیے امید و بیم کی دو عملی میں گرفتار ہیں، محض دنیا کما جانتے ہیں اور
عقبیٰ کا کوئی کام نہیں کرتے، اِن کے درمیان مجھ کو بٹھا کر تم نے خود مجھے
اپنی نگاہوں میں ذلیل بنا دیا۔ افسوس! اس مقام سے میں اور کہیں جا بھی
نہیں سکتا تاجر نے کہا لڑکے! خاموش رہ، یہ بات تھی تو تو آیا نہ ہوتا اور
اب آ گیا ہے تو جھگڑا نہ کر۔ میرے لیے دُنیا میں سب سے عزیز شے تو ہے
اور تیرے ہی لیے یہ تمام صعوبتیں برداشت کرتا ہوں۔ تجھے ساتھ لانے سے
میرا مقصد یہ ہے کہ تو بھی کچھ تجربہ کار ہو جائے۔ لڑکے نے کہا نادان!
میں دُنیا داری کی باتیں سننا نہیں چاہتا، مجھ سے اگر کوئی ذکر کر، تو
شریعت کا کر۔ میں بیم ع بحر لا مکاں ہوں اور نور شرع مصطفےٰ ہوں جس
طرح دریا کے عجائبات لا تعداد ہیں، میرے اسرار بھی غیر متنا ہی ہیں تاجر
نے کہا فرزند! یہ چھوٹا منہ اور بڑی بات! اپنی حد سے قدم نہ بڑھا اور
بے عقلی کی باتیں نہ بنا، اس میں تیری سُبکی ہے۔ تو نے ایک بات پوچھی تھی
ہم نے اس کا جواب دے دیا۔ بھلا حقیقت، کہاں اور تو کہاں، تو تو ابھی
نادان لڑکا ہے۔ لڑکے نے کہا نادان! مجھ کو لڑکا نہ سمجھو، مجھ میں موجود
عشق ربانی ہے۔ اگر تم اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہو تو خیر، مگر مجھ کو گمراہ
کرنے کی کوشش مت کرو، بس سب سے فارغ اور سب سے آزاد ہوں

روا است انی انا الحق گر بگوئی | بوقتے کز خودی خود نگوئی
چو حق دیدم بدر درعین تحقیق | حقیقت حق شدم از سر توفیق

(صفحہ ۵۷، ۵۸)

منصور اس کے بعد حقیقت اعیان وصفات کُل اور دُنیا سے قطع تعلق پر اپنے خیالات سُناتا ہے، اس کے بعد ایک بوڑھا جو واصلین میں سے تھا منصور سے سوالات کرتا ہے اور منصور اس کے جواب دیتا ہے، آخر بوڑھا اُس کا معتقد ہو جاتا ہے۔ منصور زور دیتا ہے کہ جہاں جاں، طلب کرو اور باقی سب قیل وقال چھوڑ دو۔ اپنی خودی سے مرجاؤ اور برقعِ صورت کو اُتار کر پھینک دو۔ دریا سے جواہراتِ معنی رولنا چاہیں کشتی کا کیا کرو گے وہ محض نمود خودی ہے۔ اسی کشتی نے ہفتاد و دو ملت کو غرق کر دیا۔ اللہ ایک اور کشتی ہے اور وہ کشتی حقیقت ہے، اس میں محمد (صلعم) اور علی (کرم) مقیم ہیں، تم اُن کا دم بھرو اور گوہر مُراد حاصل کرو۔[۱]

ز دریا جوے دریاے معانی | ز کشتی جز نمود خود ندانی

(صفحہ ۴۸۶ کا بقیہ حاشیہ)

درحت درمیاں نہ چرا روا باشد کہ ازحسیں انا الحق برآید زحسیں درمیاں نہ" پھر یہی شعر انھوں نے خسرو نامہ (طبع تہران) میں یوں لکھا ہے ۔

روا است انی انا اللہ از درختے | چرا نبود روا از نیک بختے

یہ وہ شعر ہے آذر کے کلیات میں بھی موجود ہے لیکن تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ یہی شعر علامہ محمود شبستری کی مثنوی گلشن راز میں بھی موجود ہے۔ صاحب جواہر الذات عطار کے اشعار کو اکثر مسخ کر دیا کرتا ہے، چنانچہ اس شعر کے مس میں بھی اصلاح کر دی ہے۔

[۱] ٹرالی روایات منصور کو شیعہ بیان کرتی ہیں مجالس المومنین میں بھی شیعہ تسلیم کیا گیا ہے

تبدیل کردوں گا ؎

دریں دریا ہمہ ماہا الٰہی | گواہی می دہدم ماہ وماہی
دریں دریا ہمہ اللہ نگر | نمود دید "الا اللہ" نگر
ہمہ ما با نمودار الا اللہ | دریں دریا ہمہ عین ہو اللہ
ہمہ منصور و ہمایم تراوید | کہ می گوئی امامس عین تقلید

(صفحہ ۵۶-۵۷)

جب یہ جوش بھرے الفاظ کشتی والوں نے سُنے سب دنگ رہ گئے آخر وہ قطب سردار جو ہر احترام کا مستحق تھا، اُٹھا اور کہنے لگا اے تمہارے ساتھ رہنے میں مجھ کو تکلیف ہوتی ہے، اس لیے رخصت ہوتا ہوں۔ اے پدر محترم!

وداعت کردم و خواہم شدن زود | رہ پر شرع از من باش خوشنود (ص ۵۷)

میں جاتا ہوں اور میرا راز اکسٹھ سال کے بعد بغداد میں ظاہر ہوگا۔ کیا تم نے سورۂ طٰہٰ نہیں پڑھی -

درختے دید موسیٰ آں شب از دور | بصد سالہ رہ آں جا گہ پُر از نور
بیک جذبہ شد آں یک تخت او | رہ رفت تا سوئے نور درخت او
ہمی زد آں درخت "انی انا اللہ" | کہ گردد او بمود ستادہ آگاہ
درختی یافت ایں قربت دوست | کہ می داند کہ بود او دلیل او دوست
روا ست "انی انا اللہ" از درختے[۱] | روا نبود این جا گوید نیک بختے

---

[۱] یہ استدلال اگرچہ یہاں بے محل واقع ہوا ہے لیکن صوفیانہ نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت میں کوئی شک نہیں کیونکہ شیخ عطار اپنے تذکرے میں (صفحہ ۱۳۶ جلد دوم) اس کو بیان کرتے ہیں ' مرا عجب آمد از کسے کہ روا دارد کہ از درختے انا اللہ برآید

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸۷ پر ملاحظہ ہو)

حیرت و استعجاب سے اُس پر محویت طاری ہوگئی اور مست نظارہ گیا۔ اہل قافلہ یہ نظارہ دیکھ کر حیران رہ گئے پوچھنے لگے کہ اے منصور تو نے اس پر کیا کر دیا ہی؟ منصور نے کہا کہ میں نے اس کو نور دکھا دیا ہی، وہ تمام باتوں سے بے خبر ہی اور دیدار مولیٰ میں مستغرق ہی۔ اس وقت وہ جسم و جاں سے صاف ہوکر دیدار عین العیاں میں محو ہی، جب ہوش میں آئے گا، تب بولنے لگے گا۔ یہ کہہ کر اس نے اشارہ کیا اور کہا کہ اب ہوش میں آجا۔ وہ مرد ہوش میں آتے ہی اُس کے قدموں میں گر گیا اور رونے لگا بولا کہ مجھ پر تیرا عین العیاں ظاہر ہوگیا، میں تیرا غلام ہوں اور تو سلطان آفاق ہی اور دُنیا میں تیرا ہی شور ہی۔ یہ کہتے کہتے اُس نے ایک نعرہ مارا اور جان دے دی۔ قافلے والوں نے جب یہ ماجرا دیکھا تو ان میں جو صورت پرست تھے، اُنھوں نے ایک شور مچا دیا، کہنے لگے کہ اِس شخص نے جادو سے کام لیا ہی، اس لیے قتل کا مستوجب ہی۔ منصور نے اُن سے کہا اے گمراہو! میں دیدار الٰہی ہوں، مجھ میں یہ طاقت موجود ہی کہ تمھارے شور و غوغا کو فرو کر دوں، لیکن اظہار راز کا یہ وقت نہیں، کیونکہ تمھارے درمیان ایک پیر واصل موجود ہی، جو صاحب درد ہی، مجھ کو اُس کی خاطر منظور ہی، لہذا تم کو معاف کرتا ہوں۔ یہ الفاظ کہے اور قافلے والوں کی آنکھوں سے غائب ہوگیا[۱]۔ (صفحہ ۲۴۹-۲۵۱)۔

جوہر الذات میں حکیم ناصر خسرو کا ذکر بھی احترام کے ساتھ کیا گیا ہی۔ سلسلہ کلام یہ ہی کہ جون کی اصل کیا ہی؟ کہتے ہیں کہ جون کی اصل حیوان اور نبات سے نہیں ہی، بلکہ نبات کی اصل میں ہی اور میں کی اصل نور ذات ہی۔

---

[۱] اس حکایت کے متعلق بھی تذکرہ نگار خاموش ہیں۔

دریں کشتی بسے گشتند غرقہ — دریں بود ند ہفتاد و دو فرقہ
یکے کشتی دیگر ہست دریاب — دراں کشتی حقیقت دو دلشاں
محمد با علی آں جا مقیم است — اراں درات کل مارس ویم ہست
دم ایشاں زن و ہر دو جہاں شو — نمودار زمین و آسماں شو

جب منصور یہ باتیں کر چکا ' اٹھا اور لوگوں کی نظروں سے غائب ہوگیا تماشائی حیران رہ گئے ' بوڑھے باپ نے ایک نعرہ مارا اور بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش میں آیا سمندر میں کود پڑا اور جان دے دی[۱۵]۔

منصور سے ایک مرتبہ کسی نے سوال کیا کہ تم جو ' راز مطلق ' سے کا دعویٰ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ حق کو میں نے عین مطلق دیکھا ہے ' مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم کو غیب کے حالات کس طرح معلوم ہو گئے اور اپنے قتل کے متعلق تم نے کیسے اطلاع حاصل کر لی ؟ منصور نے جواب دیا کہ میں نے اپنے قتل کی ' نمود ' کو دیکھ لیا ہے ' بغداد میں میرا سر برباد ہوگا ' یہ باتیں مجھ پر منکشف ہوگئی ہیں ۔ حج کے راستے میں منصور سے یہ سوال کیا گیا تھا سائل نے دوبارہ کہا غیب کی بات خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اس لیے مجھ کو تمھاری بات پر یقین نہیں آتا ' البتہ اگر کوئی زبردست شہادت (نمود) دو اور کوئی راز دکھاؤ تو مانوں گا ۔ منصور نے جب یہ بات سنی ' اپنی نگاہ اس پر جما دی اور کہا تو میری ' دید دید ' میں اچھی طرح سے دیکھ اکیونکہ میں وہی ہوں جس نے سب کچھ پیدا کیا ہے ۔

نظر بیکو کن اندر دید دیدم — کہ من ہستم کہ جملہ آفریدم (۲۴۹۶)

اب جو سائل نے غور سے دیکھا تو اس کو آسمان ہفتم سے بھی بلند پایا۔

---

[۱۵] منصور کی طفلی کی یہ حکایت کسی تذکرے میں نہیں ملتی ۔

قناعت میں مسکن بنالیتا ہے، تین باتیں اختیار کرلیتا ہے، کم آزاری، کم خوری اور عبادت۔ اصل نہاد اچھی ہونی چاہیے، پھر تو آدمی ناصرخسرو کی طرح اپنے مطلوب تک پہنچ سکتا ہے۔

هر آنکو اندرین قاف قناعت   گزیند پیش گیرد هر سه عادت
کم آزاری و کم خوردن حقیقت   پس آنگه طاعت از عین شریعت
بباید اصل اول نیکو مردان   رسد چون ناصر خسرو بجانان (ص۲۱۹)

جوہرالذات میں منصور اگرچہ ہر وقت مصنف کے پیش نظر ہے تاہم اس مثنوی میں خارجی مضامین بھی دوسری موجود ہیں، لیکن یہ پہلا نامہ ہے جو تمام و کمال منصور کے ذکر اور اس کے کمالات و مقالات سے لبریز ہے۔ اس کتاب میں بڑے بڑے صوفی مثلاً جنید، بایزید، شبلی اور شیخ کبیر عبداللہ حنیف اور عبدالسلام، منصور کے معتقد اور مداح کی حیثیت سے دکھلائے گئے ہیں۔ وہ باری باری منصور سے اسرار و حقائق پر سوالات کرتے ہیں اور منصور ان کے جواب دیتا ہے بعض ان کے متعلق متشکک بھی ہیں، تاہم اس کے سامنے مجال دم زدن نہیں رکھتے۔

شیخ کبیر عبداللہ حنیف شیراز میں رہتے ہیں اور ان کے اور منصور کے درمیان ایک راز ہے منصور کے تعلقات اُن سے قدیم ہیں اور یہ بھی اس کے سرگرم معتقد ہیں۔

عبدالسلام یہ ایک غیر معروف بزرگ ہیں، مگر منصور کے بیحد معتقد ہیں اپنے پیر کے کہنے سے منصور کے عقیدت مند ہیں اور پیر کو منصور کی زبان حضرت خضر کی زبانی معلوم ہوتا ہے۔

جنید کو منصور کے متعلق کچھ شکوک ہیں جو براہ راست منصور کے

اور جان و دل کی اصل قطرۂ خون نہیں ہے[1]۔ لیکن یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہے۔ تم یوں سمجھ لو کہ فیض نور سے نبات ظاہر ہوتی ہے اور حیوان کو زندگی دیتی ہے، اس فیضِ نبات اور وجود حیوانی سے جسم انسان پیدا ہوتا ہے۔ حکمائے اس بارے میں بہت کچھ بحثیں کی ہیں اور اس کی تشریح میں کتابیں بھر دی ہیں' لیکن ناصر (خسرو) نے اس سر کو معلوم کیا' یہ حکیم ایک سر پاک تھا۔

ولیکن کرد ناصر سترا اظہار   باید می نسخش آن نا چار (ص ۳۱۹)

حکمت میں اُس کا کمال عین الیقین کی حد تک تھا' اس لیے وہ مخلوق سے پوشیدہ ہو گیا۔ اور اس طرح چھپ گیا' گویا صورت اور معنے کے پردے ہی سے غائب ہو گیا۔ جس طرح حکمت میں سب پر غالب تھا اسی طرح اسرار میں پیش پیش تھا آخر میں اُس نے عزلت اختیار کر لی اور عین ذات قربت تک پہنچ گیا۔ خدائے پاک نے اُس کی حکمت میں اس قدر ترقی دی کہ اُس کو خدائے بیچوں کا دیدار بھی میسر ہو گیا۔ جب اُسے جمال ربانی حاصل ہو گیا' مخلوق سے متنفر ہو گیا۔ اُس نے دیدار خداوندی کیا اور عین اس کی ذات بن گیا' خدا میں پنہاں ہو گیا اور اس پر تمام راز منکشف ہو گئے۔ اس کا اکثر بیان عقل اور جان کے متعلق تھا کیونکہ اس کی عقل اور جان عین العیان تھی وہ کوہ قناعت کی طرف چلا گیا اور اس قربت میں پابند سلوک رہا اور چھُپ گیا قاف قربت میں پہنچ کر اپنے اوپر دنیا کا دروازہ بند کر دیا۔ اور فنا کا دروازہ کھول لیا۔ اس قاف قناعت میں اس قدر رہا کہ جن و پریاں کو اس کے وجود سے راحت ملی۔ دُنیا کے اور حکیم اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ جو شخص قاف

---

[1] کیا عطار جیسے فاضل طبیب سے خون کی اصلیت پر اسی قسم کی تحقیقات کی توقع کی جا سکتی ہے۔

صید ہی واقف ہیں، کچھ کچھ جانتا ہو کہ محمدؐ (صلعم) ہمارے ہادی ہیں لیکن حقیقت محمدیہ سے کون واقف ہو؟ محمد (صلعم) محمد میں ہیں، درحقیقت وہی میرے رہنما ہیں اور یہ محمدؐ (صلعم) ہیں جو انا الحق کہ رہے ہیں

محمد می زند در ما انا الحق ۔۔۔ ہمی گوید سراسر سرّ مطلق
وصال مصطفےٰ در جان منصور ۔۔۔ چو خورشید است کل نور علیؓ نور (ص۳۴۴)

محمدؐ (صلعم) نے جو یہ راز آشکارا نہیں کیا تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کو دعوت شریعت منظور تھی، اس لیے حقیقت کو آشکارا نہیں کیا اور شریعت ہی بیان کرتے رہے، حقیقت انھوں نے صرف علیؓ کو بتائی ۔ اگر صید میرا عین الیقین حاصل کرلیں تو میں اُنھیں دکھادوں کہ مصطفےٰ مع تمام انبیا یہاں موجود ہیں ۔

اگر اس جا حسید پاک دیم ۔۔۔ بیا مدیک زمان عین الیقینم
کہ ایم مصطفےٰ اورا دریں دم ۔۔۔ تمامت انبیا ما دید آدم (ص۳۴۵)

بایزید منصور کے اس قدر عقیدت مند ہیں کہ اپنے آپ کو اُس کا غلام غلاماں بیان کرتے ہیں ؎

تو دیدی آنچہ این جا کس ندیدست ۔۔۔ غلامے از غلاماں بایزید است (ص۹۷)

خود منصور اپنے لیے ایسے دعوے کرتا ہو، جو ولایت اور نبوت سے گزر کر الوہیت کی حدود میں داخل ہیں ۔

تعالی اللہ منم منصور حلاج ۔۔۔ ہمہ در رحمتت من گشتہ محتاج
تعالی اللہ منم خورشید و اختر ۔۔۔ مرا گویند کل اللہ اکبر
تعالی اللہ منم این جا خداوند ۔۔۔ وجود خویش این جملہ بپیوند
الست اندر ازل گفتم اندرا ۔۔۔ بایم چوں بودم یک وندرا ۔

سامنے بیان کرنے کی جرأت نہیں کرتے اور شیخ کبیر سے کہتے ہیں کہ دیکھیے ہمارے زمانے میں بے شمار اولیا ہیں اور اُن سے پیشتر بھی گزرے ہیں وہ سب واصلین میں سے تھے اور خدا کے نزدیک ان کے بڑے درجے تھے لیکن کسی نے انا الحق نہیں کہا سب کے سب ہو الحق کہتے رہے، خود رسول پاکؐ نے ایسا دعویٰ نہیں کیا رسولؐ نے لوگوں کو شریعت کی دعوت دی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی حدود میں قائم رہے۔ شریعت صرف اسی لیے ہے کہ نیک و بد اور حق و باطل میں تمیز کر دے۔ اب ذرا اس منصور کی کیفیت ملاحظہ کیجیے کہ ہر دم انا الحق کے نعرے لگا رہا ہے روشنی اس سے دور ہو گئی ہے، کیونکہ شرع محمدی سے بھٹک گیا ہے، عوام الناس جاہل ہیں، ان کو ہمارے فرق کی کیا خبر؛ اس لیے ہر کس و ناکس کے سامنے اس راز کا افشا کرنا قرین مصلحت نہیں ہے۔

منصور شیخ کبیر کو خطاب کر کے جواب دیتا ہے:- شیخ کبیر تم نے شاہ جنید نے شرع کے متعلق کہا؛ مجھ کو بایزید نے مان لیا، لیکن یہ نہیں مانتے۔ میں ان کو معذور سمجھتا ہوں، بایزید کے پیر ہوئے تو کیا ہوا؟

اگرچہ شیخ و پیر بایزید است ولیکن بیخۂ ولس بارسید است (ص ۴۳۶)

حالانکہ تم نے میرے وہ تمام خوارق جو میں نے تری و خشکی پر کیے ہیں، جب کہ ڈھائی سال تک میں اور تم ساتھ رہے، بیان کر دیے ہیں اور یہ سب باتیں واقعیت سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن جنید ہیں کہ شرع پیش کرتے ہیں اور مجھے دیوانہ قرار دیتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ میں اپنی 'عین منزل' پر پہنچ گیا ہوں اور تمام حجاب دور ہو چکے ہیں۔ جب میں 'مود ار خدا' ہوں تو انبیا اور اولیا سب کچھ میں ہوں۔ خدا مجھ سے ہم کلام ہے۔ کیا رسول اللہؐ سے صرف

محمدؐ را شناس این جا حدا تو   دگر نہ او فتی اندر بلا تو (ص ۴۱)
علیؑ با مصطفیٰ ہر دو جدا ایند   کہ دم دم راز درجان می نمایند (ص ۱۹۳)
علیؑ با مصطفیٰ ہر دو جدا یند   نمودند دو گرکل می نمایند (ص ۲۵۰)

تمام مورخین کے برخلاف مصنف حضرت اسمٰعیل کی قربانی کا قائل ہونے کے باوجود حضرت اسحٰق کی شہادت میں بھی اعتقاد رکھتا ہے ۔

اگر کشتہ شوی مانند اسحاق   تو باشی بے شکے دیدار آفاق (ص ۲۶۱)
اگر ہم بود اسحاق گزیدہ   ز عشق روے تو شد سر بریدہ (ص ۲۶۹)
گہے در کسوت اسحٰق گردی   بریدہ سر بخود مشتاق گردی (ص ۲۸۱)
جہاں کن خویش را تسلیم مشتاق   کہ سر بریدہ اندر عشق اسحاق (ص ۲۲۴)

جوہرالذات اور ہیلاج نامہ جس قدر مشہور ہیں، معلوم ہوتا ہے اس قدر پڑھی نہیں گئیں، ورنہ اُن کی شہرت اس تک ماند ہو جاتی ۔ کتابیں کیا ہیں، دریاے اعظم ہیں، جن کی گود میں تیس تیس ہزار اشعار موجیں مار رہے ہیں ۔ فارسی ادبیات میں شاید اس قدر تھکا دینے والی، غیر دلچسپ، کُند اور دل اُچاٹ کر دینے والی کوئی کتاب نہ ہوگی جیسی یہ کتابیں، جو عطار کی طرف جا جانے کس گناہ میں دیباے منسوب کی ہیں ۔ علمی و دینی لحاظ سے اُن کا شمار ادنیٰ درجے کی تصنیفات میں ہونا چاہیے ۔ حقیقت یہ ہے کہ باوجود کوشش بلیغ، میں ان مثنویوں کو پورا ختم نہ کر سکا، نہ مجھ میں، حالانکہ مجھ کو اصرار ہے کتابوں کے معاملے میں خاصہ تحمل ہے، اس قدر تاب تھی کہ اُن کو پورا پڑھ سکوں ۔ ممکن ہے کہ کوئی اور صاحب ذوق جن میں مجھ سے زیادہ استقلال ہے، اِن کے نشیب و فراز اور معلومات سے ہم کو اطلاع دیں ۔

ان مثنویوں میں خوارق، اسرار اور کرامات کی فضا پیدا کر دی گئی ہے۔

خدا دیدی مرا دیدہ کہ دایم | تماشا در یقین راز نہانم
ز صبح آفرینش جملہ پیداست | ز نور ذاتم این جاکہ ہویداست
یکے ذاتم منزہ در ہمہ من | نگنجد در تماشا دمدمہا (ص ۱۴۷)
بحر منصور این جاہلیت اللہ | کہ از اسرار رحمٰن شد آگاہ
خدا منصور و منصور است خالق | وصال ایست این جائے خلائق
خلائق من خدایم تا نہ بیند | بموجم می نمایم تا نہ بیند
خلائق من خدایم در نمودار | ز عشق خویش امروزم پدیدار
خلائق من خدایم چند گویم | ہمہ خواہند تا بیوند جویم (ص ۵۴)

خود مصنف منصور کے عشق میں اس قدر سرشار ہو کہ اس کا جذبہ محویت اور فنائیت کی حد تک پہنچا ہوا ہی۔ وہ کہتا ہو کہ جب تک میں زندہ ہوں اُسی کے اسرار بیان کرتا رہوں گا بلکہ یہ منصور ہی ہو جو میری جان میں بول رہا ہی۔

بحر حلّاج چیزے می ندانم | کہ با وے گویم و از وے بخوانم
زنم ہر لحظہ دم از عشق منصور | اگر چہ می نماید در دلم شور
مرا تا جان بود زو راز گویم | از و در قصّہ مردم باز گویم
مرا تا جان بود در دیر فانی | ہمہ گویم از و سِرِّ معانی
ہمہ منصور می بیند درونم | ہمو خواہد در آخر رہنمونم
حقیقت دوست این دم سِرّ گفتار | کہ می گوید درون جان عطار (ص ۶۸۸)

ایک نہایت عجیب امر یہ ہو کہ مصنف نے جہاں منصور کو پچاسوں مقام پر خدا کہا ہی، وہاں متعدد موقعوں پر رسول اللہؐ اور حضرت علیؑ کو بھی خدا کے نام سے یاد کیا ہی۔

ٹھٹک کر اور رُک رُک کر بیان کرتا ہو۔ اس طرح حشو و زوائد نے ایک ممتاز حیثیت اختیار کر لی ہو اور طوالت ان مثنویوں کا عام جوہر بن گئی ہو۔ ان کتابوں کا بدترین پہلو ایک ہی خیال کی بار بار تکرار ہو، جس سے قاری نہ صرف اُکتا جائے گا، بلکہ دق ہو جائے گا۔ وہی ایک بات ایک دفعہ نہیں کہی گئی بلکہ دس مرتبہ۔ اس پر بھی قناعت نہیں، دس مرتبہ اور تکرار کی۔ چند ورق لوٹیے تو بیس مرتبہ پھر وہی خیال دُہرایا گیا ہو۔ اشعار کیا ہیں، پلٹنیں ہیں، جو الگ الگ وردی پہنے کھڑی ہیں۔ مثلاً ۔

رشاگر دان جود آگاہ می باش	ولیکن از دروں با شاہ می باش
رشاگرداں نظر کن زار بیچوں	کہ ایشاں ند نور ہفت گردوں
رشاگرداں نظر کن خویش بنگر	تراسہا دہ سر در پیش بنگر
رشاگرداں نظر کن تا بدانی	کہ از ایشاں حقیقت باز دانی
رشاگرداں نظر کن راز بنگر	ہمی انجام و ہم آغاز بنگر
رشاگرداں نظر کن ہفت گردوں	حقیقت بعد ازاں مز راز بیچوں

(ص ۴۵۹)

میں اسی قدر نمونے پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ "زشاگرداں نظر کن" کی پلٹن کے ابھی سترہ جوان اور باقی ہیں۔ میں ناظرین سے استدعا کرتا ہوں کہ ان اشعار کے معنوں پر غور نہ کی جائے اگر بالفرض ایسا کیا جائے تو غالب مرحوم کا یہ مصرع بھی یاد رہے ۔ع

یہ ہو وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہُوا

کچھ ان اشعار پر حصر نہیں، تمام کتاب اسی صنعت میں لکھی گئی ہو ——

ذرا " ترا ایں جاست " کا رسالہ ملاحظہ ہو۔

جو بہت کچھ عطار کی واقعیت پسند طبیعت کے منافی ہے۔ مصنف خواب دیکھنے اور بشارتیں سننے کا عادی ہے۔ وہی مسائل جن کو شیخ اپنی عقل اور استدلال کے زور سے حل کر دیا کرتے ہیں، اِن مثنویات میں اسرار بن گئے ہیں۔ معمولی سے معمولی مسئلہ ہمارے مصنف کے نزدیک ایک بھید ہے اور یہ بھید بغیر کسی انکشاف کی کوشش کے ایک طویل سمع خراشی کے بعد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر کسی اور بھید کی باری آتی ہے اور اُس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جاتا ہے ہر مضمون اس کی علمی اور دماغی استعداد کی بے بضاعتی کا راز الم نشرح کر رہا ہے۔ عربی اس کو آتی نہیں، مجھ کو اس کی فارسی دانی میں بھی شک ہے۔ ہمارا ناظم صرف الفاظ کو وزن کا جامہ پہنانا جانتا ہے۔ قافیے کا بھی چنداں پابند نہیں، مل گیا تو خیر، نہ ملا تو وزن ہی پر گزارا کر لیا۔ سلسلۂ بیان غیر مسلسل، طویل اور بے ترتیب ہے جیسے کسی مجذوب کی بڑ یا کسی نیم مست کی ہذیاں سرائی۔ جو مطلب اس کو ادا کرنا ہوتا ہے اُس کے لیے الفاظ نہیں ملتے اور جو الفاظ ملتے ہیں وہ مطلب ادا نہیں کرتے۔ اِس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شعر اکثر مبہم اور مہمل بن کر رہ جاتا ہے۔ شاعر کا ذخیرۂ الفاظ بے حد محدود ہے، حالانکہ تیس ہزار اشعار لکھے ہیں، لیکن اِس کثیر ذخیرے سے ہم چند نئے لغت بھی نہیں سیکھتے۔ یہی حالت اس کی معلومات کی ہے۔ عطار اپنی اصلی تصنیفات میں قدم قدم پر جدید اطلاع دیتے ہیں اور ان کی مثنویاں تاریخی دلچسپی کا قابلِ قدر ساماں ہم پہنچاتی ہیں، لیکن اس بے مایہ شاعر کی مثنوی میں جو لحظہ لحظہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ میں عطار ہوں، سوائے منصور کی چند حکایتوں کے جن کو نہ تاریخ جانتی ہے اور نہ روایت پہچانتی ہے، جدید معلومات کے سلسلے میں کچھ بھی نہیں۔ جو مطلب ایک شعر میں کہا جا سکتا ہے، شاعر اسی مطلب کو دس شعر میں ٹھونک

یہ امر موجبِ حیرت تھا کہ وہی شخص جس کی دماغ سوزی بالعموم ایک مبتذل قسم کی تُک بندی پیدا کرنے کی عادی ہو ایسے نفیس اور عمدہ اشعار لکھ سکے، مثلاً ۔

الا ای جان و دل را درد دارو   تو آن نوری که لم تمسسه نارٌ
تو در مشکاتِ تن مصباحِ نوری   ز بر دیگی که هستی دُرِّ دوری
ز روزنهای مشکاتِ مشبک   تیمّم کردهٔ خاکِ مبارک
زجاجه شکل و زیتت درون بر   سوی کوکب دُرّی در آور
ترا با مشرق و مغرب چه کار است   که نور آسمان گردت حصار است
[ز مینای مدان این فرد فرهنگ[1]   که کهتی نه مبدست و سنگ]

(صفحہ ۲۹)

یا یہ اشعار ۔

نگرمی کرد درویشے نگاہے   دریں دریائے پُر دُرِّ الٰہی
کواکب دید چوں دُرِّ شب افروز   کہ شب از نور ایشاں بود چوں روز

[1] خطوط ہلالی میں نے ڈالے ہیں، کیونکہ یہ شعر اشعار گزشتہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، لیکن جوہر الذات کے قلمی نسخوں میں اسی مقام پر ملتا ہے۔ اسرار نامہ میں شیخ عطار نے اس شعر کو مع اسی قسم کے دیگر اشعار کے حیوانات پر انسانی تفوق کے استدلال میں لکھا ہے، چنانچہ ۔

ز آواز خوشش خود سر مفراز   که در ابریشم و نے هست آواز
خوش آوازی بلبل از تو بیش است   که سرمست خود و آواز خویش است
ز شنوائی خود چندان مخروش   که ماکی بشنود ده میل خرگوش
ز بویای خود ز قصه کم گوی   که از یک میل موشی بشنود بوی
تو گر بینی ازین جمله ازانی   کرکس گو ما ولیسم پاکیزه جانی

ترا ایں جاست ال کیتاں بدیدی ... تو از آنساں سحاباں کل رسیدی
ترا ایں جاست وصل و روشنائی ... حقیقت نور دیدار خدائی
ترا ایں جاست نور کل مسلم ... کہ دیدستی ز خود دیدار آدم
ترا ایں جاست آدم آشکارہ ... تو در او، او بتو ایں جا نظارہ
ترا ایں جاست آدم تا کہ دیدی ... کہ در دم دید آدم را ندیدی

(صفحہ ۵۲)

اس رسالے میں اٹھائیس سوار ہیں۔ اس کے بعد "دل آگاہ" کا توپچانہ ہے، جس میں تین اوپر چالیس توپیں ہیں ۔۔

دل آگاہ می باید دریں بار ... کہ دریا بد وصال ایں جائگہ یار
دل آگاہ می باید دریں جا ... کہ ایں دربار یکتا یید دریں جا
دل آگاہ می باید دریں سر ... کہ اسرارش ہمہ آمد بظاہر

(صفحہ ۵۴)

اس کے بعد "ہمہ وصلست" کے بائیس اونچی کھڑے ہیں ۔۔

ہمہ وصلست ہجراں رفت از پیش ... ہمہ حالست ہر حال رفت از پس
ہمہ وصلست و دیدار است ایں جا ... دلت جاناں بہ دیدار است ایں جا
ہمہ وصلست و دیدار است بیچوں ... ولیکن تو شدہ ایں جا دگرگوں

(صفحہ ۵۵)

الغرض کہاں تک لکھا جائے، یہی ایک ایسا ہیبت منظر ہے، جس کو ان جدیوں کا سیاح بقول رستم سے زیادہ دشوار گزار اور ناقابل عبور پاتا ہے۔ جوہر الذات کی پہلی جلد میں (جو نسبتاً میرے مطالعے میں زیادہ آئی ہے) قصے موٹے یہ اعلیٰ درجے کی شاعری کے نمونے ملتے ہیں اور میرے لیے

اسی اسرار نامہ سے لیے گیے ہیں، بخوف طوالت ان کی فہرست پیش کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ ان مثنویوں میں جو بہتر اشعار ہیں، سرقہ ہیں اور اسرار نامہ کا تو اس قدر ناس کیا گیا ہے کہ ناگفتہ بہ ہے۔

جب ہم ان کتابوں کا، عطار کی دیگر تصنیفات سے مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں اس قدر نمایاں اور زبردست فرق دیکھتے ہیں کہ ہمیں ان لوگوں پر تعجب ہوتا ہے، جو انھیں عطار کی تصنیف مانتے ہیں۔ 'اما'، 'زار' اور 'ناب'، عطار نے اپنی تصنیفات میں استعمال نہیں کیے 'جاگہ'، 'حقیقت' وغیرہ عطار کے تکیہ کلام نہیں اسرار نامہ عطار نے ساٹھ سال کی عمر میں لکھا ہے جوہرالذات اور ہیلاج نامہ اگر درحقیقت انہی کی یادگار ہیں تو اسرار نامہ کے بعد لکھے گئے ہوں گے۔ اب ایک شصت سالہ پختہ کار شاعر جو ضرورت سے زیادہ پُرگو ہے اور جس کو مضامین اس افراط کے ساتھ سوجھتے ہیں کہ وہ اُن کی کثرتِ آمد سے نالاں ہے، اس دَور کی تصنیف میں اِس قدر بدل جائے گا کہ بالکل نئی زبان اور نئی روِش اختیار کرلے گا، اس کی شاعری اِس قدر پُھسپُھسی گھٹیل اور کودت پیدا کرنے والی ہوجائے گی، جس سے انسانوں کی طبیعت مکدر ہونے لگے وہی شاعر جس کا خسرو نامہ، نظامی کی "شیریں وخسرو" کے ہم پلہ مانا جاسکتا ہے، بعد میں ایسی مبتذل شاعری اختیار کرسکتا ہے، ہم ماننے کے لیے تیار نہیں۔

شیخ عطار، حسین بن منصور حلاج کے مبسوط حالات اپنے تذکرے میں لکھ چکے ہیں۔ وہ اگرچہ حسین کو عبداللہ خفیف، شبلی اور ابوالقاسم کی شہادت پر کاملین میں شمار کرتے ہیں، تاہم کوئی غیر معمولی عقیدت اس کی نسبت نہیں جتلاتے۔ تذکرے کے علاوہ مثنویات میں بھی کئی موقعوں پر

تو گفتی اختراں استادہ اندے — زباں خاکیاں بکشادہ اندے
کہ ہاں اے غافلاں ہشیار باشید — دریں درگہ شبے بیدار باشید
چرا چندیں سر اندر خواب آرید — کہ تا روز قیامت خواب دارید
ز رخ درویش بیدل زاں نظارہ — ز چشمش در فشاں شد چوں ستارہ
خروشش آمد سپہر کور رفتار — زباں بکشاد چوں بلبل بہ گفتار
کہ یارب بام زندانت چنیں است — کہ گوئی چوں نگارستان چیں است
ندانم بام ایوانت چہ سانست — کہ زندانِ تو بارے بوستانست

(صفحہ ۱۹)

اب ان اشعار اور اُن مہمل اشعار میں، جو ٹھیک اِن سے پہلے درج ہوئے ہیں، رات دن اور زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمیں شروع ہی سے ان کو کالائے دزدیدہ مانے ہوئے تھا آخر اسرار نامۂ عطار میں اُن کا سُراغ مل گیا یہ ابیات اسرار نامۂ عطار طبع ایران کے صفحہ ۳ اور صفحہ ۱۱۱-۱۱۲ پر ملتے ہیں اس کے علاوہ متعدد مقامات[1] اور ہیں جہاں تین تین، چار چار، پانچ پانچ اشعار

[1] ذیل میں بعض ایسی اور مثالیں ہدیۂ ناظرین ہیں، جن میں صرف شمار صفحات و اشعار پر قناعت کی جاتی ہے

جواہر الذات، ص ۴۴، اشعار ۱-۲-۳-۴	اسرار نامہ طبع ایران، ص ۴۵، ابیات ۸ ۹ ۱ ۱۱
" ص ۵، اشعار ۱۳ ۱۴-۱۵	" ص ۱۴۸، ابیات ۱۲ ۱۴ ۱۷
" ص ۵، اشعار ۳۸ ۳۹ ۴ ۴۱ ۴۲	" ص ۸، ابیات ۹ ۱ ۱۱ ۱۳ ۱۴
" ص ۷۱، اشعار ۲۲ ۲۳-۲۵	" ص ۸، ابیات ۶-۷ ۸
" ص ۶۹، اشعار ۲۹ ۳-۳۱	" ص ۱۲۳، ابیات ۱۵ ۱۶ ۱۷
" ص ۱۸، اشعار ۱۷ ۱۸	" ص ۹۵، ابیات ۲-۵

اس پردہ دری کا دائرہ ابھی اور وسیع ہے۔ تلاش سے متعدد مقامات اور نکل آئیں گے

حکیم ناصر خسرو اسماعیلیوں کا داعی ہونے کی بنا پر، نیز سیاسی وجوہ سے ان ایام کے خراسانیوں میں جو اکثر حنفی اور شافعی تھے، نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس لیے بہت کم مصنفوں نے اس کا ذکر کیا ہے محمد عوفی نے شاعر کی حیثیت سے بھی "لباب الالباب" میں اس کا ذکر نہیں، نہ شیخ عطار نے اپنی مثنویات میں اس کا ذکر آنے دیا۔ لیکن جواہر الذات میں اس عظمت کے ساتھ اس کا ذکر آتا ہے کہ ایک طرف حکما کا سرتاج اور دوسری طرف ولی کامل دکھایا گیا ہے دشمنوں کے خوف سے حکیم موصوف یمگان میں آکر پناہ لیتا ہے اس واقعے کو مصنف نے حکیم کے ذوقِ سلوک اور گریز از خلق کے نام سے تعبیر کیا ہے۔

در آخر حکمتش افسرده بیچون خدا را یار دید او بی چه و چون
خدا را یار دید او آخر کار گریزان شد ز خلق او کل به یک بار
خدا را یار دید و ذات او شد که این معنی یقین ذات او بد
در آن غربت که بودش خود و امکان سلوکی کرد و خود را کرد پنهان
سوی قاف قربت او رخت بربست ز دار عالم روی خود فرو بست

(صفحہ ۳۱۹)

حکیم موصوف نے ان ایام میں جس قسم کا سلوک اختیار کیا تھا، اس کی حقیقت ان قصائد سے ظاہر ہوتی ہے، جو اس نے عزلت نشینی کے زمانے میں لکھے ہیں اور بعض تو حمد و مدح مستنصر اسمٰعیلی کی آوازوں سے گونج رہے ہیں، یہ قصیدے آج بھی موجود ہیں اور چھپ چکے ہیں لیکن سب سے زیادہ حیرت میں ڈالنے والا یہ امر ہے کہ جہاں عطار نے جنید کو بایزید کا پیر بنا دیا اور ناصر خسرو کو ولی کامل مان لیا۔ وہاں وہ حسین بن منصور کا نام

اس کی حکایات ملتی ہیں، اُن میں بھی جنہیں کوئی خاص احترام نہیں دیتے لیکن جوہرالذات اور ہیلاج نامے میں، جنہیں ایک ایسے پیرائے میں پیش کیا گیا ہے، جس کے سامنے جنید اور شبلی جیسے درخشاں آفتاب، شمع بے نور معلوم ہوتے ہیں وہ اس طاقت ذہنی سے ادنیٰ ادنیٰ سوالات پوچھتے ہیں اور آخر میں اُس کے معتقد ہو جاتے ہیں۔ منصور کو اپنے خوارق پر ناز ہے اور اُس کے دعاوی اس قدر بلند ہیں کہ استغراق، صحو، اور محویت کے خط حد بندی کو توڑ کر حلول اور اتحاد کی ارضِ ممنوعہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ خود عطار ہمیں اطلاع دے چکے ہیں کہ زنادقہ کا ایک ایسا گروہ بھی ہوا ہے، جو اتحادی اور حلولی ہیں اور جنہوں نے اپنے آپ کو "حلاجی" مشہور کیا ہے۔ وہ اگرچہ اس کے اقوال کو سمجھے نہیں، لیکن اس کے قتل اور جلائے جانے پر فخر کرتے ہیں چنانچہ بلخ میں دو شخصوں کا وہی حشر ہوا جو منصور کا ہوا۔ میرا خیال ہے کہ عطار بحیثیت تذکرہ نگار اہل اللہ کے حالات اور رسالوں سے بخوبی واقف تھے، یہاں تک اگر وہ جوہرالذات اور ہیلاج نامہ لکھتے تو ظاہر تھا کہ ایسے صریح اغلاط مثلاً منصور اور بایزید کی گفتگو کے بے سروپا واقعات نہیں لکھتے، حالانکہ بایزید کی وفات کا واقعہ سنہ ۲۶۱ھ ہجری یا ۲۶۴ھ ہجری میں پیش آتا ہے اور منصور ۳۰۹ھ میں دار پر چڑھایا جاتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ بایزید کو جنید کا مرید بتایا جاتا ہے ان دونوں بزرگوں میں بایزید اقدم ہیں اور شیخ عطار ہم کو اطلاع دیتے ہیں کہ جنید بایزید کے اس قدر معتقد تھے کہ کہا کرتے تھے "بایزید کا ہماری جماعت میں وہی مرتبہ ہے، جو حضرت جبرائیل کا ملائکہ میں ہے۔" یہ اور دوسری صریح غلط بیانیاں جو ان کتابوں کے اوراق میں نظر آتی ہیں، عطار کی طرف منسوب نہیں کی جاسکتیں ؎

ذخیرہ تصنیف ہوتی ہیں اور یہ کوئی تنہا اقدام نہیں ہے، بلکہ اشتر نامہ بھی اسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔ روایت بالا کی تصدیق دیباچۂ ہیلاج نامہ سے ہوتی ہے، جہاں منصور کے پیکر مثالی کی آمد کا مفصل مذکور ملتا ہے۔ چونکہ ان مثنویوں میں عطار کی شہادت کا علی التواتر ذکر آتا ہے، بلکہ خود حضرت علی کرم اللہ وجہہ خواب میں آکر شہادت کی بشارت دیتے ہیں کہ "منصور نے ہمارے اسرار کھولے سزا پائی، جو منصور نے کیا وہی تم نے کیا، اس لیے ہم تم کو جام شہادت پلائیں گے۔" اس بنا پر ضروری ہوا کہ شیخ کی شہادت کے اثبات میں کوئی چیز لکھی جائے، چنانچہ بے سر نامہ[1] مرقوم ہوا۔ یہ یاد رہے کہ جوہر الذات میں منصور کی طرح اہل ظاہر کے ہاتھوں شہید ہونے کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔

بخواہم کشتنت مانند حلاج	ہم بر فرقت ایں جا ہم چو او تاج (ص ۶۹)
ز عشقت آگہم اے برتر از نور	کہ خواہم رفت بر دارت چو منصور (ص ۳۲۶)

اس لیے بے سر نامہ اسی عقیدے کی صدائے بازگشت ہے لیکن موجب حیرت یہ امر ہے کہ اہل ظاہر نے یہ تہمت اپنے سر سے ہٹا کر تاتاری وحشیوں کے سر منڈھ دی، جس سے اہل ظاہر و اہل باطن کی روایات کے اختلاف نے ہمارے نزدیک بالفاظ صاحب جوہر الذات "ایک سر" کی شکل اختیار کر لی ہے، اور میں اکثر سوچتا رہا ہوں کہ اس فرضی عطار کی یہ آرزو ــ

عمریست کہ افسانۂ منصور کہن شد	من جلوہ دہم بار دگر دار و رسن را

کبھی قوہ سے فعل میں بھی آئی یا نہیں ــــ

---

[1] بے سر سے مراد عطار ہیں، چنانچہ ہیلاج نامہ میں بھی ایک موقع پر اسی نام سے پکارا گیا ہے

سزاواری کس اے بے سر در آخر	کہ ایں جا سنت ہم سر در آخر

بھی بھول گئے اور اسی عام غلطی کے شکار ہو گئے، جس میں شعرائے ایران مولانا روم کے زمانے سے مبتلا ہیں۔ جوہرالذات اور ہیلاج نامہ میں حلاج کا نام منصور بتایا گیا ہے جو بالکل غلط ہے۔ اس کا نام حسین ہے اور منصور اس کے باپ کا نام ہے۔ شیخ عطار اپنے تذکرے میں ہمیشہ اس کو حسین کے نام سے یاد کرتے ہیں، یا بعض وقت حلاج کے خطاب سے پکارتے ہیں لیکن کبھی منصور کے لفظ سے یاد نہیں کرتے۔ ان کی مثنویوں میں بھی منصور کی کئی حکایتیں ملتی ہیں، مثلاً منطق الطیر:۔

چوں شد آں حلاج بر دار آں زماں | جز انا الحق می نرفتش بر زباں

(کلیات ص ۱۱۵) اور الٰہی نامہ

چو سر ببرید ناگہ بر سر دار | سر و دو دست حلاج آں جہاں دار

(کلیات ص ۱۲۸) اور الٰہی نامہ

پسر را گفت حلاج نکوکار | بہ چیزے نفس را مشغول میدار

(کلیات ص ۱۱۹) اور اسرار نامہ

بہشت حلاج را دیدند در خواب | بریدہ سر، بکف در جام جلاب

(ص ۴۵، طبع ایران)

یہاں ہر موقعے پر حلاج کے نام سے یاد کیا ہے۔ قصہ مختصر، یہ بعض وجوہ ہیں جن کی بنا پر میں ان دونوں کتابوں کو عطار کی تصنیف ماننے کے لیے تیار نہیں۔

مولانائے روم کے "سمان" کے حوالے سے، جامی، نے ایک روایت لکھی ہے کہ نور منصور ڈیڑھ سو سال بعد شیخ عطار کی روح پر تجلی کر کے ان کا مُرَبّی بن گیا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس روایت کے زیر اثر مثنوی جوہرالذات

تھا اس لیے اسی طرف توجہ کی اور اسی میں کمال پیدا کیا

(شعر العجم جلد دوم صفحہ ۱۶۱ طبع معارف پریس)

ان کے بعض ابیات سے مفہوم ہوتا ہے کہ ان کا شمار بھی علما میں تھا بلکہ اسی حلقے میں ملازم بھی تھے۔ ایک قصیدے میں کہتے ہیں۔

نیست پوشیدہ کہ در عہد صدور ماضی ۔۔۔ بحث در مدرسہ آورد بر دکان پدرم

از کرم عذر چہ خواہی کہ در ایام تو من ۔۔۔ از میان علما بحث بیا زار برم

(ص ۱۵۲، ایضاً کلیات)

(دیگر) عالم و شاعر و فقیہ و ادیب ۔۔۔ از تو دارند راتب و ادرار

من کہ این ہر چہار ام از تو چرا ۔۔۔ حوف و نہند دارم و آزار (صفحہ ۱۸۵)

قولہ - بہارستان میں لکھا ہے کہ جب سلطان سنجر سلجوقی گرجستان کو فتح کر کے اصفہان میں آیا تو کمال نے اس کی مدح میں قصیدہ لکھا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

حجاب ظلم تو بر داشتی، چہرۂ عدل ۔۔۔ نقاب کو تو گشادی از رخ ایمان

(شعر العجم صفحہ ۱۶۱ جلد دوم معارف پریس)

سلطان سنجر سلجوقی کا زمانہ ۵۱۱ھ تا ۵۵۲ھ ہے جو کمال کے زمانے سے صریحاً اقدم ہے، نہ اس نے گرجستان کبھی فتح کیا۔ شعر ا کمال کے اس مشہور قصیدے سے ماخوذ ہے، جس کا مطلع ہے -

بسیط روئے زمین گشت باز آبادان ۔۔۔ ہمیں سایۂ چتر خدایگان جہان

اور جلال الدین منکبرنی کی مدح میں ہے۔ چنانچہ -

خدایگان سلاطین مشرق و مغرب ۔۔۔ کہ آب ناعجۂ سلطنت نہد بہ سان

جلال دنیا و دین منکبرنی آں شاہی ۔۔۔ کہ ایزد حق بسزا کرد در جہان سلطان

کمال اسمٰعیل

قولہ - اس کے والد جمال الدین عبدالرزاق مشہور شاعر تھے اس کے دو بیٹے تھے عبد الکریم اور اسمٰعیل "

(شعرالعجم ص۱۱ جلد دوم، معارف پریس اعظم گڈھ)

لیکن خود کمال کے ایک قصیدے سے جو اس نے اپنے والد جمال الدین کی وفات کے وقت رکن الدین صاعد بن مسعود کی مدح میں لکھا ہی، معلوم ہوتا ہی کہ جمال نے چار بچے اپنے بعد چھوڑے - چنانچہ -

سپہر قدرا اصناکش از طریق کرم حکایت من خستہ روان ز یدہ در بر
چہ شرح شاید داد از حقوق آں مرحوم کہ ہست نزد تو چوں آفتاب ان اظہر
دریغ الحق ازاں گوشہ داعی مخلص کہ نے ہوائے تو جاں را نخواستی در بر
بر آستاں تو کردہ سپید موے سیاہ بر آستان تو کردہ سپید رخ دفتر
ہزار گوہر یتیمند باز ماندہ ازو کہ جز بعقد مدیح تو نیست شاں زیور
چو گرگ مرگ ما گلہ شاں ازیں رمہ برد زمہر ایں رمہ بے شاں توئی عھور
بزرگ حقی اگر گوش بار خواہی داشت بچشم لطف دریں چار طفل خورد نگر

(ص۹۶ کلیات اسمٰعیل، طبع بمبئی)

معلوم ہوتا ہی کہ یہ چار بچے کمال کے علاوہ ہیں جو لطا ہر خلف اکبر ہیں -

قولہ اسمٰعیل نے بھی مذہبی علوم حاصل کیے تھے لیکن شاعری کا مذاق خاندانی

سلہ اوراق آیندہ میں جہاں کہیں صفحات کا حوالہ دیا ہی اسی کلیات طبع بمبئی سے دیا ہی -

اگرچہ شاعر اپنی ارادت کا اظہار کر رہا ہے اور اس کی پیروی میں نجات کا طالب ہے تاہم چنداں جوش عقیدت محسوس نہیں کرتا جو ایک خالص الارادت مرید کو اپنے مرشد و ہادی کے ساتھ ہونا چاہیے۔ کہتا ہے۔

نا مرودی جبیں جو حسنہ توسل کی   مگر رہائی ار آتش سقر یابی
مدد رحمت او خواہ در ریاضت نفس   چو جنگ دیو کنی یاری ار عمر یابی
درہمت بروے دل تو بار کند   گر آستانہ عالیش مستقر یابی
اگر تو بیخ ارادت فرو بری بدرش   رشاخ تربیتش گونہ گوں ثمر یابی
رداس طلبش برمدار دست طلب   کہ ہرچہ آرزوے تست سر بسر یابی
رخاک پایش تاجی بسار و برسر نہ   کہ تا رجیل ملک گرد خود حشر یابی

کمال نہ کبھی شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے نہ ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہ بغداد گئے۔ قصیدۂ ہذا ارادۃً بھیج دیا ہے ۔

کلاہ او نہ بامدارۂ سر چو تو نیست   تو جہد کن کہ بجائے کلہ کمر یابی
چو ایں مساعدت از دولتت میسر نیست   کہ بر ملازمت خدمتش ظفر یابی
بنظم خویش دعائے بداں جناب فرست   بگفتہ گرمش بہرۂ گہر یابی
سعادت ابدی بر سرت نثار کند   اگر قبولی ازاں صدر نامور یابی

(کلیات کمال قلمی)

قولہ ۔ ۶۳۵ھ میں جب اوکتائی قاآن اصفہان میں پہنچا تو قتل عام کا حکم دیا اس زمانے میں ۔ راولپنس ہوچکے تھے اور شہر کے باہر ایک زاویے میں رہتے تھے   گھر میں ایک کنواں تھا وہ ان اماموں کا خزانہ بن گیا شہر کی غارت گری میں ایک ۔ رک اس طرف نکل آیا کنویں میں اترا ۔ ۔ جواہر کا انبار دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں سمجھا کہ

قصیدہ غالباً ۶۲۳ھ کے قریب لکھا گیا ہوگا جب جلال الدین گرجستان کی فتح کے بعد اصفہان آتا ہے۔ شاعر نے اسی قصیدے میں ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جو جلال الدین کی تاریخ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً اُس کا ہندستان آنا، ہندستان سے ایران جانا، تفلیس پہنچنا اور عیسائیوں سے محاربات وغیرہ۔

براق عزم تو گامی که برگرفت از ہند   نہاد گام دگر بر اقاصی ایران
که بود جز تو ز شاہان روزگار که داد   تقصیم اسپ ز تفلیس و آتش از عمان
تو عمر نوح بیابی از آنکه در عالم   عمارت از تو پدید آمد از پس طوفان
تو داد مسند اسلام بستدی ز صلیب   تو برگرفتی ناقوس را ز جای اذان
اگر نبودی سعی تو خلعتے گشتہ   چو لعل ریسم خز نماندہ بود نہان

(ص ۱۶ کلیات)

قولہ : "بالآخر افسردہ ہوکر ترک تعلقات کیا اور حضرت شہاب الدین سہروردی کے ہاتھ پر بیعت کی، دیوان میں ایک قصیدہ بھی ان کی مدح میں موجود ہے۔" (شعر العجم ص ۱۸ جلد دوم، معارف اعظم گڈھ)

اس قصیدے کا مطلع ہے۔

دلا بکوش که باقی عمر دریابی   که عمر باقی ازیں عمر برگر یابی

میرے پیش نظر اس وقت کلیات کمال قلمی مملوکۂ پروفیسر سراج الدین آذر ہے۔ جن اشعار میں شیخ شہاب الدین کا نام آتا ہے یہ ہیں۔

ازیں بزرگان امروز در زمانہ یکی ست   که مثل او نہ ہما نا نہ بحر و بر یابی
شہاب بن عمر سہروردی آں رہ رو   که از مسالک او دیو بر حذر یابی
امام و قدوۂ آفاق ثالث العمرین   که خاک پایش بر جبہت قمر یابی

ہیں جس سے علامہ شبلی شعر بالا نقل فرماتے ہیں عرفی کمال کی نسبت کہتا ہے کہ میرے کمال کی نمود پر کمال کی نظموں کی مقبولیت کو بڑا نقصان، پہنچا جب شیراز میں مجھ جیسا سرمہ ساز موجود ہے تو یقین ہے کہ عقل انسانی سرمۂ صفاہانی کو آنکھوں میں جگہ نہ دے گی ۔

بعہد جلوۂ حسن کلام من اندوخت   قبول شاہد نظم کمال نقصانی
کنوں کہ یافت چو من سرمہ سائے در شیراز   خرد ز دیدہ کشد سرمۂ صفاہانی

اس سے ظاہر ہے کہ دونوں شعروں سے کمال کی بے قدری مقصود ہے نہ اس کی قدر دانی ۔ لیکن مولانا کے نقل کردہ شعر سے عرفی کا مقصد اس مطلب سے جو مولانا اخذ کر رہے ہیں بالکل مختلف ہے۔ اس کے لیے ہمیں اس کی توجہ کمال کی زندگی کے ایک واقعے کی طرف جس کا عرفی نے اشارۃً ذکر کیا ہے، مبذول کرنی چاہیے ۔ ایک قصیدے میں جو عرفی نے عبدالرحیم خانخاناں کی تعریف میں بہ فرمایش حکیم ابوالفتح لکھا ہے شعر زیر بحث سے قبل یہ شعر آتا ہے ۔

بدہ بہ راوی ناحسن نامہ ام کہ مرا   درین قصیدہ نبود کمال ثانی

شاعر اپنے مخاطب سے کہتا ہے کہ میرا قصیدہ کسی غلط خواں راوی کے حوالے نہ کر دینا ورنہ کہیں میرا بھی وہی حشر ہو جو کمال کا ہوا تھا۔ اس شعر کی شرح میں عرفی کے شارحین کہتے ہیں کہ کمال اسمٰعیل نے اپنا قصیدہ دربار میں پڑھنے کے واسطے کسی نالائق راوی کے حوالے کر دیا تھا۔ پڑھتے وقت اس سے ایسی ادائیں سرزد ہوئیں کہ ممدوح نے خفا ہو کر شاعر کے قید کیے جانے کا حکم دے دیا۔

کمال کے حالات میں اس واقعے کا ذکر نہیں آتا مگر اسی بحر و قافیے میں اس کے ہاں ایک قصیدہ موجود ہے، جس میں شعر ذیل آتا ہے ؎

اور بھی حوالے گزرے ہوں گے، کمال اسمٰعیل کو پکڑا، کہ بتا تا، انھوں
نے لاعلمی ظاہر کی، اس نے غصے میں آکر ان کا خاتمہ کر دیا۔"

(شعرالعجم ص ۱۸۰ جلد دوم۔ معارف پریس)

اوکتائی قاآن ۶۲۴ھ و ۶۳۹ھ اصفہان میں کسی وقت نہیں آیا اگرچہ اصفہان کا قتل عام اُس کے زمانے میں ہوا ہے۔ مولانا شبلی کمال کے حالات کے زیر عنوان اس کا سال وفات ۶۲۶ھ بتاتے ہیں۔ اس موقعے پر ۶۳۵ھ تحریر کرتے ہیں اور اس اختلاف کی کوئی وجہ بیان نہیں کرتے۔

قولہ "متوسطین اور متاخرین دونوں اُن کے معترف ہیں عرفی کہتا ہے:۔

مرا نسبت بہمدردی کمال عجم است | اگرچہ شعر چہ عمر دارد از غلط خوانی

(شعرالعجم ص ۱۹۰ جلد دوم)

مشکل سے یقین آسکتا ہے کہ عرفی جیسا خود پسند اور خود فروش کمال کے کمال کا اعتراف کرے گا۔ وہ جب کبھی متقدمین کا ذکر کرتا ہے اپنے اظہار کمال اور افضلیت کے تعلق میں کرتا ہے یا اپنے مقابلے میں ان کو گراتا ہے۔ انوری اور ابوالفرج رونی کے حق میں کہتا ہے۔ ؎

انصاف دہ کہ ابوالفرج و انوری امروز | بہر چہ غنیمت نہ شمارند عدم را

اور سعدی شیرازی کے واسطے لکھتا ہے۔

نازش سعدی بہ مشت خاک شیراز ارچہ بود | گر خود آگہ کہ گردد مولد و ماوائے من

اور خاقانی کے تعلق میں گویا ہے۔

دم عیسیٰ تمنا داشت خاقانی کہ برخیزد | نامرادِ صبا ایک فرستادم بہ شروانش

ان اساتذہ کے مقابلے میں بھلا کمال کو کیا خاطر میں لاتا بلکہ اسی قصیدے

جلال الدین محمد مخدوم جہانیاں ۶۶۵ھ میں انتقال کرتے ہیں۔

محقق طوسی شعر کے کوچے سے نابلد معلوم ہوتے ہیں اگرچہ ان کے مداحوں نے یہ وصف ان کی طرف منسوب کیا ہے۔ خود محقق معیار الاشعار میں شعر سے اپنی بے ذوقی کے اعتراف میں لکھتے ہیں ۔

" اعتقاد من آنست کہ اگر کسی را در مبدا، فطرت ذوق ساشد، ممکن باشد کہ بملکۂ عروض او را اکتساب ذوقی پیدا شود و این معنی در خویشتن مشاہدہ کردہ ام "

(معیار الاشعار صـ)

قولہ - "کمال اور محقق طوسی ہمعصر ہیں، کمال کی بلند پایگی کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو گی کہ محقق طوسی نے عظمت کے لہجے میں کمال کا ذکر اپنی کتاب معیار الاشعار میں کیا ہے" (ص۲ جلد دوم شعر العجم، معارف)

ان بزرگوں کی معاصرت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ کمال ۵۶۰ھ کے گرد و پیش میں پیدا ہو کر محقق طوسی کی ولادت کے وقت جو ۵۹۷ھ میں ہوتی ہے اپنی عمر کے سینتیس سال قریباً ختم کر چکا تھا اور بقول مولانا شبلی ۶۲۶ھ یا ۶۳۵ھ میں انتقال کرتا ہے۔ محقق کمال کی وفات سے چھیالیس یا سینتیس سال بعد ۶۷۲ھ میں وفات پاتے ہیں ۔

علیٰ ہذا محقق کی عظمت کے لہجے میں کمال کے ذکر کی اصلیت بس اتنی ہے کہ معیار الاشعار میں ایک موقعے پر قصیدے میں تغیر ردیف کی بدعت کی مثال میں کمال کا ذکر بدیں الفاظ آیا ہے۔

"مثال تغیر ردیف بطریق بدعت آنست کہ کمال اصفہانی درین روزگار در قصیدۂ کہ بعضی را ردیف 'می آمد' کردہ است و بعضے را 'می آید' آوردہ است

اگرچہ شعرہماں است لیک ادی مد تہ کہ سخن یک را ر ما دانی
اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرفی کی تلمیح کسی اصلی بنیاد پر قائم ہے۔
اس پس منظر کے جاننے کے بعد ہمارے نزدیک شعر زیر بحث کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو کمال سے کے ساتھ محبت ہونے کی بنا پر غلط شعر پڑھے جانے کی صورت میں رنج ہوتا ہے ورنہ غلط خوانی سے شعر کا فی نفسہ کوئی نقصان نہیں۔
اگر یہ کہا جائے کہ کمال سے مراد کمال اسمٰعیل ہے جیسا علامہ شبلی سمجھے ہیں تو یہ ترجمانی ہر حال میں مورد اعتراض ہے۔ کمال اسمٰعیل کے ساتھ ہمدردی کی بنا پر صحیح شعر خوانی کی ضرورت کوئی معنی نہیں رکھتی۔
قولہ "کسی نے کمال کو بُرا کہا تھا اس کے جواب میں کہتے ہیں۔

شخصی بد ما تعلق می گفت ما از بداو نمی خراستیم
ما نیکی او بخلق گفتیم تا ہر دو دروغ گفتہ باشیم

محقق طوسی کا یہ مشہور قطعہ

نظام بی نظام ار کافرم خواند چراغ کذب را نبود فروغی
مسلماں خوانمش زیرا کہ نبود سزا دار دروغی جز دروغی

اسی قطعہ سے ماخوذ ہے۔" (شعر العجم صـ۱۹۲، انوار المطالع)

مخدوم جہانیاں کی ملفوظات جامع الکلام مرتبہ سلسلہ میں جن کو اُن کے مُرید محمد بن محمد حسینی ترتیب دیتے ہیں۔ آخری قطعہ مخدوم جہانیاں کی زبانی حضرت امیر خسرو کی طرف منسوب ہو۔ اس کتاب میں یہ قطعہ حسب ذیل ہے۔

مرا سید اجل گر خواند کافر چراغ کذب را نبود فروغی
مسلماں خوانمش بہر مکافات دروغی را چہ آید جز دروغی

چونکہ یہ شہادت اس سے چھ سو سال قبل کی ہے اس لیے زیادہ مستحق اعتبار ہے۔

ہجو شعرا کا ایک بڑا آلہ تھا' اس لیے وہ اس سے بالکل دست بردار
نہیں ہو سکتے تھے" (شعر العجم ص ۲۲۴' جلد دوم' معارف پریس)

اس سے بیشتر دو مختلف موضوعوں پر حضرت علامہ انوری کی ہجاجات کی' دل کھول کر تعریف کر چکے ہیں۔ ایک موقعے پر ارشاد فرمایا کہ ہجو میں[۵۱] وہ نہایت دل چسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا۔ دوسرے موقعے پر فرمایا کہ 'اگر ہجو گوئی کوئی شریعت ہوتی تو انوری اُس کا پیغمبر ہوتا۔ ہجو میں اس نے نہایت اچھوتے' نادر' باریک اور لطیف مضامین پیدا کیے ہیں[۵۲]۔ لیکن دیکھا جاتا ہے کہ یہاں وہ اس عزت سے بھی محروم کر دیا گیا کہتے ہیں کہ ہجو اور ظرافت انوری اور سوزنی وغیرہ کی وجہ سے لچوں کی زبان بن گئی تھی اور یہ کمال کا احسان ہے جس نے اس کو لطیف اور پُر مزہ کر دیا' ع

بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

قرونِ ماضیہ کے اوضاع و اطوار کو چودھویں صدی کے اخلاقی معیار سے جانچنے اور ایک کو دوسرے پر ایک قیاسی فضیلت دینے میں ہم سخت غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مولانا کا یہ طرزِ معیار غالباً ان کے مغربی دوستوں کی صحبت کا اثر ہو یا در ہے کہ مغربی مصنفین اس قسم کے اعتراض ہمارے ادبیات پر کرتے ہیں۔ ان کو خود اپنی قوم کے ادب ماضی کا تجربہ نہیں عہدِ قدیم میں ہجو کی دست برد سے کوئی قوم محفوظ نہیں تھی۔ یونانی اور لاطینی ادبیات میں ہجو نگاری کو پورا فروغ حاصل تھا۔ خود انگریزی ادب اس بارے میں استثنائیت نہیں کرتا بڑے بڑے شعرا کیپڈی اور ڈرہار' متاسرین میں پوپ

---

[۵۱] شعر العجم' جلد اول ص ۲۷۸' معارف پریس اعظم گڑھ۔

[۵۲] ایضاً' جلد اول ص ۲۸۱-۲۸۲۔

(مطلع قصیدہ ایں است ؎

سپیدہ دم کہ نسیم بہار می آمد نگاہ کردم و دیدم کہ یار می آمد

و در موضع تغیر ایں نوع گفتہ است ؎

ز بہر حال ز ماضی شدم بہ مستقبل کہ ایں ایام[۱] چنیں خوش گوار می آید

ز بہر رسیدہ بجائے کہ میں خاطر تو ہمہ نہاں سپہر آشکار می آید

(ص ۲۸۵، در کامل عیار، رحمۂ معیار الاشعار، نولکشور ۱۲۸۹ء)

اس عبارت سے تو کمال کے واسطے محقق کے احترام کا کوئی پتا نہیں چلتا۔

یہاں بطور جملۂ معترضہ میں اس قدر اور کہنا چاہتا ہوں کہ صفحہ ۲۱-۲۲ پر شعرالعجم میں اس قصیدے کے جو سات شعر نقل ہوئے ہیں۔ ان کی ردیف میں بجائے 'می آید' کے 'می آمد' چاہیے ورنہ کمال کے تغیر ردیف کا مقصد مہمل رہ جائے گا۔ یہ ساتوں شعر تشبیب سے تعلق رکھتے ہیں جو بصیغۂ ماضی 'می آمد' ردیف پر ختم ہوتے ہیں۔ گریز کے وقت اس نے ردیف بدل دی بصیغۂ حال 'می آید' لے آیا اور اشعار ذیل میں اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

ردیف شعر دگر کردم از پے مدحش کہ آمم از پئے چیزے بہ کار می آمد

ز بہر حال ز ماضی شدم بہ مستقبل کہ ایں ایام[۱] چنیں خوش گوار می آید

چنانچہ اس کے بعد تمام اشعار میں 'می آید' ردیف ہے۔

قولہ:- "شاعری پر سب سے بڑا احسان کمال کا یہ ہے کہ شاعری کی ایک صنف یعنی ہجو اور ظرافت جو انوری اور سوزنی وغیرہ کی وجہ سے لوگوں کی زبان میں گئی تھی، کمال نے اس کو نہایت لطیف اور پرمزہ کر دیا اگرچہ بہتر تو یہی تھا کہ یہ صنف بیہودہ صفحۂ دہر سے اڑا دی جاتی لیکن

---

[۱] ایام بجائے نسیم معقول ہے

توحری ور تو حر تر آں باشد — کہ ز تو مردی طمع دارد

(ایضاً کلیات قلمی)

مذمت ریش سے

تو چناں گشتۂ نہاں لیس ریش — کز تو حر چشم ہیچ چشم ندید

بحز از ریش مرد ریک تو کس — سیر گاؤ را ریشم ندید

(ایضاً کلیات قلمی)

ایک نااہل سے خطاب سے

ایں چنیں دوں دید گہر کہ توئی — ہمت التفات چوں باشد

مردماں سوے مردمی یازند — میل دوناں بسوئے دوں باشد

عقل را جائے در دماغ تو نیست — تیر را رہگذار باشد

(ایضاً کلیات قلمی)

بخیل کی ہجو سے

خواجہ در ماہتاب ناں می خورد — در سرائے کہ ہیچ خلق نبود

سایۂ خویش را کسی پنداشت — کاسہ از پیش خویشتن بربود

لے میں ممدوح کے نام سے

ہرچہ گفتم من از مدیح و غزل — لعنی از روے دروغ بد ناچار

ہجو تو اختیار ازاں کردم — کہ ہمہ راست باشدم گفتار

کسی امیر کی روانگی کے وقت سے

بسفر می روی بروکہ شدند — از وجودت ہمہ جہاناں سیر

اہل و گرگ و چاہ در راہند — رو میں رفتے خویش یاراں سیر

کس بہ پہلوے تو نخورد دگر — نخورد شیر در بیاباں سیر

(کلیات قلمی)

وغیرہم کے ہاں یہ صنف نظم موجود ہے۔ جب اس حمام میں سب ہی ننگے نہاتے ہیں اور قرون ماضیہ کا مشرق و مغرب ایک ہی سطح اخلاقیات پر قائم ہے تو پھر انوری اور سوزنی کی تشہیر انصاف سے بعید ہے۔

علامہ شبلی اگر کمال کا کلیات بغور سے ملاحظہ فرماتے تو کمال کے متعلق ان کا حسن ظن زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ دربار صاعدیہ سے چالیس سال برابر تعلقات رہنے کی بنا پر جہاں تو وہ منصب قضا مذہبی رنگ زیادہ غالب تھا اور اس لحاظ سے بھی کہ زمرۂ علما میں اس کا شمار ہوتا تھا، کمال نے اپنی ہجوگوئی کی استعداد کو واضح طور پر بے نقاب نہیں کیا تاہم کلیات میں کافی سے زیادہ شہادت موجود ہے کہ ہجو کے میدان میں وہ اپنے کسی ہم ردیف سے پیچھے رہنا نہیں چاہتا۔ کمال کے ہاں فاحش گیر رنگ بھی آتا ہے۔ اس کا سوگند نامہ اگرچہ اس کی شاعری کا اعلیٰ نمونہ مانا جا سکتا ہے فحش بیانی سے داغ دار ہے۔ ضیاء الدین موش کی ہجو میں تو خوب ہی چھینٹے اڑائے ہیں ہمیں حیرت ہے کہ یہ حیاسوز نظمیں حضرت علامہ کی نگاہ سے کیونکر اوجھل رہیں۔ ذیل میں بعض ایسی ہجویں جو موجودہ مذاق پر گراں نہ گزریں گی بطور نمونہ درج کی جاتی ہیں :-

خواجہ ار کر چوں پلنگ آمد | کہ ہمی با وجود دستیر د
راتق و فاتق یکے موش بہت | کز پلیدیش سگ بپرہیزد
ہرکرا ایں قصہ رحمی برد | حالی آں دیگری بر و میرد
ہرکجا موش گشت جفت پلنگ | اللہ آنکس بود کہ نگریزد

(کلیات کمال قلمی مملوکۂ پروفیسر آذر)

(دیگر) کس براے مردمی ہرگز | ورکسی طمع بو نہ نگزارد

گرگ کہن صباے مصل آنکہ چو کش | اعزار گوسفند سخن شاں کند
خطش ز ریش گندہ تر و لفظش از میاں | پس قدح در ائمہ بسیار داں کند
الفاظ بستہ اش ز زبان شکستہ اش | باشد چو سدہ کو گزر از ناوداں کند
الحق خوش آیدم کہ ریم در دہاں او | خاصہ چو دعوئے نسب خانداں کند
اے بے حفاظ ترم مداری کہ چوں توئی | مر اہل فضل میتی در اصفہاں کند
خر وار کے دو جو بر لودی فلے بہ من | تا ایں ہجا کرائے دو صد زعفراں کند
آں جو خر دگر خورد و شعر من ترا | بر روئے روزگار رنگے داستاں کند

میں نے اس قصیدے کے چند شعر نمونۃً نقل کیے ہیں اصل قصیدے میں بیشتر شعر ہیں جو اسی رنگ میں چل رہے ہیں چنانکہ آخر میں شاعر نے اشارا کیا ہی سارا جھگڑا دو خروار جو کا ہی۔

ایک قصیدے میں ایک مردقانی کی ڈاڑھی پر طبع آزمائی کی گئی ہی۔ چند شعر درج ہیں۔

آں ریش فلاں مردقانی | ریشیست عظیم باستانی
بسیار حوادثات گیتی | ناخوش چو بلاے ناگہانی
در ہم چو دلش ز تنگ عیشی | محکم چو کفش ز سوریانی
اسوہ دگراں و رشتہ او خوش | باشندہ از مہرگانی
بر سینہ او ز دور کوہے | پر حشر بدلیست ترکمانی
از حملۂ زلزلہاے گیتی | آں را شاید کہ ریش خوانی
بس لائق نیست اینکہ گویند | ریش تو زہے ریاستانی
کاں ریش چنیں ہمی نبیند | صاحب طمعاں ایں زبانی
زاں کہ ہیچ کار ناید | الا ز برائے دمہ دانی

ایک بخیل کی مذمت سے

اے ترا جمع گشته در رہ آز   ہمت کوتہ و امید دراز
ہمہ دنداں ز حرص ہمچوں سیر   ہمہ مغز تو پوست ہمچو پیاز
دست تو چوں دہان گرسنگاں   ہرچہ در وی نہی نیابی باز
چوں گلوی فرو بری ہمہ چیز   وز تو ناید بروں مگر آواز

ہجو لکھنے کی دھمکی سے

اے صدر روزگار تو دانی کہ مدتیست   تا انتظار خلعت خاص تو می کنم
دریاب پیش از آنکہ من افکار فکر را   تعلیم قاف و دال حروف ہجی کنم

کسی ممدوح کو تہدید سے

بس کن اے مرد ناخوش احمق   چند و تا چند حیلہ و فن تو
پیش ازیں طمع چو می بود مرا   ثنائے زعفران کن تو
می فتادم چو خاک و می دادم   بوسہ برپائے تو چو دامن تو
بریدم طمع بہ یکبارہ   رستم از پارہ نامہ کردن تو
رستیم ازیں بیش ہمہ جاے   چوں رہ پیرہن مگردن تو
ہرچہ می خواستم بخواہم گفت   عار غم در رن تو

قصیدہ در ہجو ضیاء الدین سے

تیرے کہ مہر چرخ رہا کش فغاں کند   تیرے کہ روزگار بدو امتحاں کند
تیرے کہ بر مروت ہر آنکس کہ بگذرد   خروارہاش حشو شکم در دہاں کند
تیرے کہ گر خر برش آواز بشنود   شرم آیدش کہ بار دگر عاں وعاں کند
تیرے چنیں کہ گفتم و امثال آں ہزار   در ریش آنکہ دشمنی شاعراں کند
ایں اختیار کس نکند پس اگر کند   آں خرس روے خر صفت گاؤباں کند

ہیں، اب اگر ممدوح نے صلہ عنایت کیا تو شکریہ لکھتے ہیں، ورنہ ہجو
میں ان تینوں نظموں سے دو لکھ چکا ہوں، تیسری کی نسبت کیا ارشاد
ہوتا ہے۔" (شعر العجم صفحہ ۲۵ ج ۲)

قریباً انہی الفاظ میں یہ قطعہ انوری کی طرف بھی منسوب ہوا ہے۔ جیسا کہ
فرماتے ہیں —

قولہ ۔ "پہلے ایک شخص کی مدح لکھی، پھر صلے کا تقاضا کیا، اس کے بعد ہجو
کی دھمکی دی، دیکھو کس لطیف طریقے سے ادا کیا ہے ۔

سہ بیت رسم بود شاعران طامع را — یکے مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ورنہ دادہجا — ازیں سہ بیت، دو گفتم، دگر چہ فرمائی

یعنی شاعروں کا قاعدہ ہے کہ تین نظمیں لکھتے ہیں، اوّل مدح پھر قطعۂ
تقاضائی جس میں صلہ کا تقاضا ہوتا ہے، اب ممدوح نے صلہ دیا
تو شکریہ ورنہ ہجو، ان تین نظموں سے میں دو تو لکھ چکا، فرمائیے اب
کیا ارشاد ہوتا ہے۔" (صفحہ ۱۸، شعر العجم، جلد اول، معارف پریس)

مگر انوری پر حضرت مولانا نے جو ستم توڑا ہے وہ یہ ہے کہ انوری کے ذکر میں اسی
قطعے کو انوری کی "فحش سے خالی ہجو" کی مثال میں نقل کیا ہے، اور کمال کے
ہاں کمال کی ظرافت کی مثال ہیں ۔ بالفاظ دیگر وہی چیز انوری کے ہاں ہجو ہے اور
کمال کے ہاں ظرافت ۔

ع ما یار کرا خواہد و میلش بکہ باشد

قولہ ۔ غزل کی نسبت یہ مسلّم ہے کہ سب سے پہلا جاکہ کمال ہی نے قائم کیا ہے،
جس کو شیخ سعدی نے اس قدر ترقی دی کہ موجد بن گئے۔"

(صفحہ ۲۶، شعر العجم جلد دوم، طبع معارف پریس)

ایک مثنوی رئیس لسان کی مذمت میں لکھی ہے۔ اس کے ابتدائی اشعار ہیں۔

تا رہا ام بہ کام عصیاں است در ہجائے رئیس لسان است
چہ رئیس آں خسیس پُرتلبیس مایۂ ظلم و سایۂ ابلیس
آنکہ نامش زشرم پیدا نیست در بدی و ددیش ہمتا نیست
آں کہ او بیتولے دردالست سرو سرخیل زن بمردالست
مرد کے زشت روئے گندہ بغل پائے تا سر ہمہ دروغ و دغل
ناحفاظ و گدائے و قحبہ زنست کیسہ پرداز و درد دولت کشت
طبع او لوم و شکل نامعلوم صحبتش شوم و سیرتش مذموم

میں ان مثالوں سے دست کش ہو کر عرض کرتا ہوں کہ کمال کے نزدیک شاعر کے لیے ہجوگوئی ایک لازمی امر ہے جس سے اس کو کوئی چارہ نہیں۔ اس کی اباحت میں وہ کہتا ہے ؎

ہجا گفتن ارچہ پسندیدہ نبود مبادا کسے کالت آں ندارد
ہر آں شاعرے کو نباشد ہجا گو چو شیرے کہ چنگال و دنداں ندارد
خداوند امساک را ہست دردے کہ الا ہجا ہیچ درماں ندارد
چو لعنت بود بولہب را ز ایزد مرا ہجو گفتن پشیماں ندارد
مر ایں عور نان را کہ از بخل مفرط کس امید خیرے ازیشاں ندارد
اگر ہجو گوئی تو در گردن من کہ ہرگز رہائے بپایاں ندارد

قولہ "ایک رئیس سے صلے کا تقاضا کیا ہے" اور کس قدر لطیف پیرایہ اختیار کیا ہے ؎

سہ شعر رسم بود شاعران طامع را یکے مدیح، دوم قطعۂ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ور بداد ہجا ازیں سہ بیت، دو گفتم، دگر چہ فرمائی

یعنی شعرا پہلے مدح کہتے ہیں، پھر صلے کی یاددہانی کے لیے ایک نظم لکھتے

کمال کے حالات

کمال کے متعلق مزید اطلاع جو اس کے کلیات اور دیگر ذرائع سے حاصل ہوئی، سطور آئندہ میں درج ہوتی ہے۔ اس کا ظہور ایک ایسے دورِ انقلاب میں ہوا ہے جب عراق کی سیاسیات کا مطلع غبار آلود تھا، اصفہان اندرونی اور بیرونی شورش و ہیجان کا شکار تھا، آئے دن نئے نئے فتنے وقوع پذیر ہوتے تھے، خانگی فتنوں میں حنفی و شافعی مذاہب کی باہمی چپقلش تھی جس نے بعض اوقات خطرناک نتائج پیدا کیے ہیں۔ اصفہان کی جامع مسجد ابتدا میں حنفیوں کی ملک تھی جو خواجہ نظام الملک نے جو شافعی المذہب تھے اپنے وقت میں اس پر شافعیوں کا قبضہ کرا دیا۔ سلطان محمد نے اپنے عہد میں حنفیوں کو واپس قبضہ دلا دیا لیکن بڑی خون ریزی کے بعد۔ قاضی رکن الدین نے اس میں پہلا خطبہ[۵۱] پڑھا۔ شہر میں شافعی اور حنفی مساوی تعداد میں آباد تھے۔ اس لیے ان کی عداوت نہایت آسانی سے ایک خون ریز جنگ کی صورت اختیار کر سکتی تھی جس میں ہزاروں اشخاص موت کے گھاٹ اُترتے۔

اصفہان اوّل اوّل سلجوقیوں کے زیر نگیں تھا۔ اُن کے زوال پر اُن کے غلام اور امرا ہر طرف طاقت ور ہو گئے۔ علاء الدین تکش نے آخر کار سلطان طغرل کو قتل کر کے عراق پر قبضہ کر لیا۔ خوارزم شاہیوں کا یہ قبضہ نہ عراقیوں کو منظور تھا نہ بارگاہ خلافت کو۔ اصفہان تکش نے قتلغ اینانج کو دے دیا[۵۲]۔ ۵۹۳ھ میں خلیفہ نے اپنے وزیر کو بغرض جنگ بھیجا۔ جب مردقان میں خوارزم شاہ سے مقابلہ ہوا۔

---

[۵۱] راحت الصدور مرتبہ ڈاکٹر محمد اقبال ص ۱۸ ۔

[۵۲] جہانکشائے جوینی جلد دوم ص ۳۳ ۔

یہ جملہ غالباً کمال کی شہرت اور اُن کے خیال سے لکھ دیا گیا ہے ورنہ اس سے قبل اسی مسئلے کے متعلق حضرت مولانا یوں ارشاد فرما چکے ہیں:

"غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ اس کام کرہ کے آزر نظامی ہی ہیں"

(ص ۲۱ جلد اول، شعر العجم، معارف پریس، اعظم گڑھ)

اس بیان سے یہ عام غلط فہمی پھیل گئی ہے۔ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ کمال غزل کا موجد ہے۔ خود مولانا سید سلیمان بھی اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اس کے متعلق آیندہ صفحے میں کسی قدر تفصیل سے بحث آتی ہے۔ ناظرین اسے ملاحظہ فرمائیں۔

قولہ:- "رباعی کو جس قدر کمال نے ترقی دی، قدما او رمتوسطین میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی"

(ص ۲۷ شعر العجم، جلد دوم)

شعر العجم کی پہلی جلد میں سلمان کی رباعیوں پر اٹھائیس صفحے لکھنے کے بعد حضرت مولانا کے قلم سے یہ جملہ نکلتا ہے۔ اگر کمال واقعی رباعی میں اتنا باکمال ہے تو موجب حیرت ہے کہ اُس کی رباعیوں کی اوصاف نگاری میں مولانا نے چند صفحے نہیں چند سطریں تک لکھنی گوارا نہ کیں۔ قدما و متاخرین کے بیانات کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں یہی کہنا پڑے گا کہ اس کی شہرت صرف قصیدہ نگاری کی بنا پر ہے نہ رباعی گوئی کی وجہ سے۔ تذکرہ نگاروں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملتا جو اس کی رباعیات کا معترف ہو۔ یہ مولانا کی کمال نوازی ہے جو خیام، عطار اور سحابی وغیرہ کے ہوتے ہوئے قدما و متوسطین میں اس کو بے نظیر مانتے ہیں۔

اگر مہابت سلطان عالمت بگرفت — ہمت عواطف او زین مضیق برہاند
سخاوت تو خلاص ترا ضمان کردہ ست — کشادہ دست سخی پای بستہ کے ماند
اساس جاہ تو الحمدللہ آن سداست — کہ ہیچ صورتہا از جایش برجہاند
تن درست تو عذر شکست لشکر خواست — سلامت تو ہمہ نقصہا بپوشاند
تو شادزی و بلطف خدای واثق باش — کہ کارہا بمراد تو زود گرداند

(کلیات ص۲۶، طبع بمبئی)

سنہ ۶۱۹ھ کے ماہ میں سلطان رکن الدین اصفہان آتا ہے۔ عراق اُس کی ولایت تھی۔ تمام فراری امرا اس کے گرد جمع ہو گئے۔ قاضی اصفہان کو اُس کا آنا ناگوار ہوا۔ "قاضی اصفہان نا ایمن گشت خویشتن کشیدہ کرد و احتیاط و احتراز می نمود۔" اس بے اعتمادی کی حالت میں رکن الدین نے شہر میں قیام مصلحت نہ سمجھ کر بیرون شہر خیمے لگا دیے۔ اُس کے سپاہی بضرورت شہر میں آمد و رفت کرتے رہے۔ قاضی کے اشارے سے شہریوں نے ان پر سنگ و تیر برسائے اور ایک ہزار کے قریب فوجی مقتول و مجروح ہوئے۔ فوجیوں نے شہریوں سے بدلا لیا۔ بالآخر رکن الدین اُٹھ کر رے[51] چلا گیا۔

سنہ ۶۲۰ھ میں جلال الدین منکبرنی پہلی مرتبہ اصفہان[52] پہنچا ہے۔ اس موقعے پر کمال اسمٰعیل مع چند احباب کے اس کے منشی نور الدین سے ملاقات کرنے گیا۔ معلوم ہوا کہ ابھی تک سو رہا ہے۔ نور الدین منشی شراب کا عادی تھا۔ کمال نے یہ رباعی[53] لکھ کر بھیجی۔

وصل تو و این بادہ پرستی با ہم — باشد بلند نیست و پستی با ہم
حال تو بہ چشم خوبرویان ماند — کانجاست ہمیشہ نور و مستی با ہم

---

۵۱ جہانکشا جلد دوم ص۱۷۱۔ ۵۲ جہانکشا جلد دوم ص۱۵۲۔ ۵۳ جہانکشا جلد دوم ص۱۵۳

وزیر ناصر طوسی مر گیا۔ فتح کے بعد تکش اصفہان میں آیا اور کچھ دنوں ٹھہرا اسی موقعے پر خاقانی نے وہ مشہور قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے۔ ۹

مژدہ کہ خوارزم شاہ ملک سپاہاں گرفت	ملک عراقین را ہمچو خراسان گرفت

تکش اپنے فرزند زادہ ازبوز خان بن یونان تعدی[۹۱] کو ایالت دیگر اور پیغو سپہ سالار سامانی کو اس کا اتابک بنا کر رخصت ہوتا ہے۔ ۵۹۶ھ میں تکش اپنے فرزند تاج الدین علی شاہ کو عراق کا والی مقرر کرتا ہے اور اصفہان[۹۲] اس کا مستقر بنتا ہے۔

۶۱۳ھ میں سعد بن اتابک زنگی عراق کی تسخیر کے خیال سے آیا۔ علاء الدین خوارزم شاہ سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اتابک اگرچہ بہادری سے لڑا۔ مگر آخر میں گرفتار ہوا۔ کچھ مدت قید رکھنے کے بعد علاء الدین نے معاہدہ کر کے اسے رہا کر دیا کمال کے اتابک سے تعلقات اس عہد سے قدیم ہیں۔ اس اسیری کے زمانے میں اس کی تسلی کے خیال سے شاعر ایک قصیدے میں اتابک سے اس طرح خطاب کرتا ہے۔

جہاں پناہا معلوم رای انور تست	کہ خلق جز رہ تقدیر رفت نتوانند
اگر زکینت ایام تنگ دل نشوی	کہ چرخ گہ بدہد چیز و گاہ بستاند
حطام دنیی فانی ندارد این مقدار	کہ یاد کردن آن خاطری بشوراند
بسا وظیفہ کہ در ضمن نامرادیہاست	خدای مصلحت کار بندہ بہ داند
ترا عنایت سلطان چو پایہ مرد بود	فلک زچنبر حکم تو سر نپیچاند
اسیر خسرو عالم شدن زبونی نیست	کہ سیل چونکہ بدریا رسد فرو ماند

---

۹۱ جہانکشائے جوینی، ج ۲، ص ۳۸ ۔

۹۲ ایضاً جہانکشا، ج ۲، ص ۴۵ ۔

کمال کے والد جمال الدین عبدالرزاق خاقانی اور مجیر بیلقانی کے ہمعصر ہیں
انھوں نے خاقانی سے قصائد بھی بدلے ہیں وہ اصفہان کے قاضیوں
کے خاندان صاعدیہ[1] کے دربار سے تعلق رکھتے تھے اور مدت العمر انھیں کی
مداحی کرتے رہے۔ صاعدیہ کا مداح ہونے سے پیشتر ان کا پیشہ دکانداری تھا۔
کمال کہتے ہیں —

نیست پوشیدہ کہ در عہد صدور ماضی   حضرت ری مدرسہ آورد ز دکان پدرم

جمال الدین ایک خاموش اور قانع زندگی بسر کرنے کے بعد ۵۸۸ھ[2] میں
بوڑھے ہوکر وفات پا گئے۔ باپ کی وفات کے وقت کمال کی عمر اکیس سال
سے زیادہ نہیں تھی۔ لیکن قصیدہ گوئی اس عہد سے قبل شروع کر دی ہو ابتدائی
قصیدوں میں دو جگہ اپنی اکیس سال کی عمر کی طرف اشارہ کرتے ہیں —

فراست از مدد فضل عہدہ چھل ز ہور   میان بودہ و بیست می کنم تکرار
(ص۲۷ کلیات اصل طبع بمبئی)

سالم ز بیست گرچہ فزون نیست از دو   گردون سرا رسی و دو چاکرم

والد کے بعد انھوں نے اپنا آبائی پیشہ یعنی مداحی سنبھالا اور برابر
چالیس سال صاعدیہ کی ثناگستری کرتے رہے۔ سال وفات کے متعلق اختلاف
ہے۔ دولت شاہ کے ہاں ۶۳۵ھ، مرآۃ العالم میں ۶۶۹ھ اور خلاصۃ الافکار —

---

[1] کمال کے ایام میں صاعدیہ خاندان برائے نام سلطان [illegible] سلجوقی کا محکوم تھا۔ شاعر
قاضی ابوالعلا صاعد بن [illegible] متوفی [illegible] کو خطاب کرکے کہتا ہے —

[illegible]   آسودہ دولت [illegible]

[2] یہ سال وفات صرف تقی کاشی نے دیا ہے۔ کوئی ثبوت نہیں۔ اگر انھوں نے
اس سے [illegible] سال قبل انتقال کیا ہو۔

سنہ ۶۲۲ھ میں جلال الدین منکبرنی دوبارہ اصفہان آتا ہے۔ کمال اپنا مشہور قصیدہ اس کی خدمت میں پیش کرتا ہے -

بسیط روے زمیں گشت باز آباداں | ز یمن سایۂ چتر خدایگاں جہاں

سلطان پھر گرجستان چلا جاتا ہے۔ جب بایماس اور تایال افسران مغولی کے عراق پہنچنے کی خبر آتی ہے۔ جلال الدین منکبرنی ایک مرتبہ اور اصفہان آتا ہے۔ اسی مقام پر سلطان اور مغولوں میں جنگ ہوتی ہے۔ عین معرکۂ جنگ میں غیاث الدین اس کا بھائی اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے جلال الدین کے لشکر میں بد دلی پھیل جاتی ہے۔ تاہم بہادر سلطان نے اپنے جوہر شجاعت دکھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ آخر اس کو شکست ہوئی۔ جلال الدین میدان جنگ سے نکل گیا اور کسی کو اطلاع نہ تھی کہ کدھر گیا۔ مغول اصفہان تک آکر ری کو لوٹ گئے۔ سلطان بعد میں اصفہان پہنچ گیا اور سنہ ۶۲۵ھ میں واپس گرجستان چلا گیا۔[1]

یہ چند دھندلے خط و خال ہیں ان پُر آشوب واقعات کے جو اس منحوس زمانے میں اصفہان پر گزر رہے تھے۔۔ خیال کہ کمال کی شاعری کا زمانہ سنہ ۶۰۰ھ ہجری کے قریب میں شروع ہوتا ہے ایک مستحکم اساس پر قائم ہے۔ سنہ ۶۰۰ھ کے طوفان باد کی نسبت اُس کے ہاں بھی صریح تلمیح موجود ہے اور انوری و ظہیر کی طرح کمال بھی اُس کے وجود کا قائل نہیں۔ یہ تلمیح ان اشعار میں آتی ہے۔-

سر فرا را منجماں بدروغ | تہمتے بر ستارگاں بستند

اثر اندر حسود پیدا کرد | ایں سخہا کہ بر قراں بستند

مردماں را کہ بر دلی بد باد | گرد طوفاں بر دگماں بستند

---

[1] جہانکشائے جوینی صفحہ ۱۹۹ جلد دوم طبع یورپ۔

ولی دو عیب بزرگست این دو ناگو را — چه باشد آن؟ کہ صفاہانیست و بیست گدایے

(صفحہ ۱۱۱ کلیات کمال طبع ہندی)

کمال کے نزدیک صفاہانی ہونا گویا عیب میں داخل ہے۔ اس بیان سے ہم کو ایک جدید اطلاع حاصل ہوتی ہے جو یہ ہے کہ اس عہد تک خراسان اور صرف خراسان فارسی زبان اور شاعری کا گہوارہ مانا جاتا تھا' اسی صوبے کی زبان ٹکسالی اور شستہ سمجھی جاتی تھی' باقی علاقوں کی زبان قصباتی شمار ہوتی تھی۔

قطران تبریزی کے متعلق ناصر خسرو کی رائے اس کے سفرنامے میں محفوظ ہے جہاں اُس نے کہا ہے کہ قطران فارسی میں عمدہ شعر کہتا تھا لیکن اس کو فارسی نہ آتی تھی۔ کمال کے والد جمال الدین ایک قصیدے میں خاقانی کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں —

باد تو باری کیئم ز شاعران جہاں — کہ خود کسی نام بار ز یمع الساں برد

وہ کہ حد خندہ زند بر من و تو کو دکاں — گر کسی شعر با سوے خراساں برد

گویا خاقانی کو اس کی تعلّی پر جس میں خراسانیوں کی ہم جنسی کا دعویٰ کیا تھا ملامت کی ہے۔ خاقانی نے ایک موقعے پر اپنی طباعی کی بنا پر عراق کو خراساں کے نام سے یاد کیا ہے —

عراقم جلوہ کرد امسال در لشکر گہ سلطاں — کہ بود بس آفتاب طارم لاف خراسانی

خراساں کی آرزو میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے جس کا پہلا مصرع ہے —

ع — بخراساں شوم انشاء اللہ

اسی طرح دوسرے موقعوں پر بھی خراساں کے متعلق ان کے ہاں اشارے موجود ہیں

چونکہ کمال اسمٰعیل خراسانی نہیں ہے بلکہ اصفہانی اپنے صفاہانی ہونے کو

میں ۵۸۲ھ بیان ہوا ہے ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر آخری سال صحیح ثابت ہو۔
کمال کے ہاں ۵۸۵ھ (۵۹۵ھ) ہجری کی ایک تلمیح قاضی رکن الدین کی مدح میں ملتی ہے۔

بر تو میمون باد و فرخ کاوفتاد در سن خمس و تسعین غرۂ ماہ صیام

۵۹۰ھ میں سلطان علاء الدین تکش اور سلطان طغرل سلجوقی کے درمیان جنگ ہوتی ہے جس میں عراق عجم شاہی سلطنت سے الحاق پاتا ہے۔ تکش کی مدح میں کمال قصیدہ لکھتے ہیں ؎

اے برایت ملک و دیں در مارق و دریر ورس
وے شہنشاہے بدون فر اسکندر منش

مورخین لکھتے ہیں کہ طغرل شراب سے مدمست بھاری گرز لیے شاہنامہ کے اشعار پڑھتا ہوا میدان جنگ میں آیا۔ مخموری اور لستہ جنگ میں جھومتے ہوئے اس نے گرز اپنے ہی گھوڑے کے سر پر مار دیا۔ گھوڑا گرا اور اس کے ساتھ ہی طغرل زمین پر آرہا۔ دشمنوں نے فوراً پہنچ کر اُس کی گردن کاٹ لی۔ کمال غالباً اسی واقعے کو ذہن میں رکھ کر قصیدۂ بالا میں کہتا ہے ؎

گرد بر دل خوش نطاولہائے رحمت لیک گر کہش سخت آید ار گرز گرانش سر ربش

۶۰۰ھ میں قاضی ابوالعلا رکن الدین صاعد بن مسعود کا واقعۂ وفات پیش آتا ہے۔ شاعر اُس کے فرزند رکن الدین مسعود بن صاعد کی مدح میں قصیدہ لکھتا ہے۔

چو سال شش صد در طی انقضا افتاد رسید دور بدین سرفراز عالی رائے
جہاں مکرمت و جود رکن دیں مسعود خدایگان شریعت امام راہ نمائے

اسی قصیدے میں کمال اپنے متعلق کہتے ہیں ۔

بہیش سوزنیت نیک روشنست کہ نیست چو تو مدیح بہوش و حوس مدح سرائے

حقوق من همه بگذار چون نمی شاید ‏ ‏ ‏ ‏ که یار دوست نه امسال آشنا شود
بریز چون من و آبروے من بر بر ‏ ‏ ‏ ‏ کجاں تو که مرا طاقت جفا شود
ذبیح سر مکن آں را که عرض دولت تست ‏ ‏ ‏ ‏ که ایں بر روے کرم لائق شما شود
مرا چو خرج فزوں گشت دخل کم کردی ‏ ‏ ‏ ‏ مکن که اہل مروت چنیں سزا شود
عمل تو خرج کنی سیم دیگراں ببرند ‏ ‏ ‏ ‏ رسوم قطع شد جاے غصہا شود
برد تقدمہ ماری اشارتے فرماے ‏ ‏ ‏ ‏ که عزل و تقدمہ ما بگیر روا شود

(کلیات ص۱۳)

یہ شکایت متعدد قصائد میں دیکھی جاتی ہے۔

قاضی صاحب ایک مرتبہ اور کسی ناگہانی حادثے کی بنا پر اصفہاں کو خیرباد کہتے ہیں۔ کمال اس مرتبہ ساتھ نہیں جاتے۔

سرور امو کب عالیت کہ بادا منصور ‏ ‏ ‏ ‏ دائم آسودہ بدار رحمت داعی ایں با
اگر از جمع نہا حرنشد ایں بار رہی ‏ ‏ ‏ ‏ پاے بیروں نہادست ز حد الصبار

قاضی صاحب کی غیر حاضری میں اصفہاں پر ایک دور قیامت گزرا کمال۔

اراں ہا کہ در غیبت خواجہ رفت ‏ ‏ ‏ ‏ دریں شہر جا ہا بر اصحاب

قتل و غارت گری شروع ہوئی۔ امیروں کو لوٹا، عورتوں کی عصمت دری ہوئی، مساجد کی بے حرمتی کی، مال داروں کو پکڑ کر چارمیخ کیا، شہر کی خندق میں بدوں کو پاٹ دیا، نہ بوڑھوں کو چھوڑا نہ بچوں پر رحم کیا، یہ سب مذہبی تعصب کی بنا پر ہوا۔ ایسی حرکات سے بخاریوں کو بھی شرم آئے گی۔ ان اعمال کے باوجود دعویٰ ہے کہ ہم امت رسول اللہ ہیں۔

تعصب چہ باشد که ایں رسم و راه ‏ ‏ ‏ ‏ ندارند بخاریاں ہم روا
چنیں رسم و آئین و ایں لاف زن ‏ ‏ ‏ ‏ که ہستیم ما امت مصطفیٰ

(کلیات ص۱۴ طبع بمبئی)

وہ عیب شمار کرتا ہے اور اپنی ناقدری کو مدنظر رکھ کر دوسری جگہ کہتا ہے ؎

مدیں حسن لطافت الفاظ و دقت معنی   دریغ و درد اگر بودمی خراسانی

• کمال کے قصائد اور قطعے زیادہ تر اسی قاضی رکن الدین مسعود بن صاعد کی شان میں ہیں۔ بعض سیاسی وجوہ کی بنا پر جن سے ہم تاریکی میں ہیں قاضی اصفہان چھوڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کمال رفاقت کرتے ہیں۔ تین سال تک وطن آنا نصیب نہیں ہوتا۔ غالباً اکثر یا کچھ زمانہ خوارزم میں بسر ہوتا ہے۔ کمال نے یہاں کئی قصیدے خوارزمی امرا کی تعریف میں لکھے۔ منجملہ ایک وہ ہے جس کی ردیف برف ہے۔ لیکن واپسی پر جیسا کہ توقع ہوسکتی تھی قاضی صاحب نے ہمارے شاعر کے حق میں کوئی مراعات نہ کی بلکہ اُلٹی حق تلفی کی ملازمت سے برطرف کر دیا اور دیگر امداد بھی موقوف کر دی ؎

زاں پس کہ ہزار غصہ خوردم   در بندگیت سہ سال آزاد
گفتم شودم عنایت افزوں   چوں ہر کس را زیادتی داد
افزوں نشد ایں و آں کہ خود بود   یکبارگی از قلم بیفتاد
از صورت حال خود دریں شکل   دانی کہ چہ آیدم ہمی یاد
خرمت کہ آورد سروے   نادر دسر و دو گوش بنہاد

دوسرے موقعے پر شکایت کرتے ہیں :-

بحسب کہ روی دولت نیست سوے حال مني   چنیں کہ روے جہاں ہست سوے ویرانی
تو فارغی زمن و من خود از تو محرومم   کہ ذرہ ام من و تو آفتاب رخشانی
روا مدار پراگندگی خاطر من   برائے نظم معیشت ز فرط حیرانی

(کلیات ص ۱۲۲)

اپنے عزل، افلاس اور ناقدری کے متعلق لکھتے ہیں :-

بار بار وہ رحم کی درخواست کرتا ہے، معافیاں مانگتا ہے، دشمنوں کی بدگوئی کی تردید کرتا ہے، یقینی تعلقات کے واسطے دیتا ہے۔ قصیدے سناتا ہے، قطعے پیش کرتا ہے، لیکن ظالم قاضی آخر دم تک صاف نہ ہوا، یہ ہجائیں بعض اقتباس یہاں درج کرتا ہوں۔

زمانہ خود بیے کار مست فارغ باش — ہمین بس است کہ از تو یافت حظ خوار
گرفتم آنکہ مرا نیست ہیچ استحقاق — گرفتم آنکہ بہ ذات رکس بیم ہموار
رمن بصورت تمثیل نکتۂ بشنو — بلفظ مختصر اندر نہایت اختیار
اگر ستوری بر آخور خواں مردی — رسد بدو ستہ سیری بروزگار ورار
بروں براندش از پایگاہ خود نجا — گرش ندارد خوں دیگراں آلت و سار
وگر بیاید او وخدمت رکاب بشرط — ازو علوفۂ معہود ہم نگیرد بار
گرہ ز ابرو نکشا و چشم خشم بہ سد — پس از تو خواہی کارم بساز دخواہ مسار
حقوق سدہ بسی ہست پیش چشم آور — عتاب ختم رحذر رحمت سوی لیست امداز

(کلیات، ص ۱۴۵)

دیگر:

شنیدہ شد کہ بانگ بظلم ہمی زنم — دادم ہمی و ہید کعتارسے ارعتیر
گیرم کہ آب و رونق فضل و ہنر نماند — دیوار قصر شرع چراست چنین قصیر
بسیار خوردہ ام غم این دولت جواں — اکنوں بخور تو ہم غم این ناتواں پیر
در عہد نامرادی با زمرۂ خواص — شبہا سمیر بودہ ام ددر رہا سفیر
واکنوں کہ استقامت ایام دولت است — رطبع تو ثقیلم و در چشم تو حقیر
پشتم دوتا شدہ چو کمانم بخویش کش — گویا وبر کہ دور بیندازیم چو تیر
بمدح تو ہر بیہ شدم عمر نازنین — بر درگہت چو سیر شدم موی ہمچو شیر
نامس بہ نیک بد دو سہ روزی دگر بساز — کیں جائے عاریت نہ نماند بہ مستعیر

(کلیات کمال ص ۱۵۹، طبع بمبئی)

اس رسالے میں قاضی صاحب نے دشمنوں سے بچنے کے لیے ایک پہاڑ پر پناہ لی ہے۔ اس کا فرزند قید ہو گیا تھا، باپ بیٹوں میں پھر ملاقات ہوتی ہے کمال ۔

یوسف رحس آمد و یعقوب ارسر | گستند شادمانہ بدیدار یک دگر
آفاق شرع رونق دیں دگر گرفت | تا بر رود آفتاب لقالیش زکوہ سر
بر تیغ کوہ جائے اگر کرد طرفہ نیست | آرے عجب باشد گوہر بہ تیغ بر
تا سدہ وار جائے شے از شعب جو کند | رلستہ بود کوہ عود ار ابتدا کمر

(کلیات ص ۹۵، طبع مئی)

دیگر | گردن کش است و ثابت و سرسر کوہ ارانک
روزی دو بود حواحشم بادر کبار او (کلیات ص ۹۶)

متعدد قصائد سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی اپنے دشمنوں کے منصوبوں کو شکست دے کر دوبارہ اپنے منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ واپسی پر اپنا محل و دیگر املاک کامل بربادی کی حالت میں دیکھتا ہے۔ شاعر اُسے تسلی دیتا ہے۔

بزرگوارا دل تنگ می ساید بود | ریکیتے کہ بریں دولت جواں آمد
اگر بکند عدو خاک درگہت چہ شود | کہ کاں وصل و کرم درجہاں عیاں آمد
چہ نقص ذات ترا ارحرائی مسکن | خرابہ ہم وطن گنج شائگاں آمد
وارغ بود حسود ترا جہاں گیری | گرفتی تو مگر راستش درگماں آمد

(کلیات ص ۹۳)

کمال کے تعلقات قاضی صاحب کے دربار میں مدت سے مدتوں ہوتے چلے گئے۔ قاضی نے اس کے علم و فضیلت وبیانے شعر میں اس کی شہرت۔ کبرسنی، سعید ریش، افلاس و تنگ دستی، کثیر العیالی کی طرف سے آنکھ پر پٹی باندھ لی۔

کو تو نہیں چھوڑا ۔

گفت یکبار حضرت خواجہ — جمع ناکساں و بے ہنراں
روز بازار فضل بود و گذشت — جائے بازاریاں و مرد گراں
خیمۂ او بہ بارِ دم خراست — کہ درو حاضر اند خراں
بے غلط می کنم کہ حضرت او — خاطر شد ز جمع بے خطراں
مصر جامع شد است زانکہ درو — جمع گشتند جملہ بیہدہ وراں

قاضی کے اہلکاروں کے حق میں کہتے ہیں ۔

دیگر در صدر دیواں و سمیں — خواجگاں نو کہ صف در بستہ اند
سربسر بازاریاں مختلف — جمع گشتہ جملہ در یک ستہ اند
در خور مالش بید اما ہمہ — از پئے ہم شائستہ اند
موی را باز دہ اند الحق چرا آنک — از رسیداں خودش بگسستہ اند
بے خطا گفتم خواہانی ہمہ — شاہد و شائستہ و بائستہ اند
راست بیداری عروساں بوند — بس کہ چیت و شاہد و برجستہ اند
چہرہ شاں در قبای سُرخ و سبز — ہمچو گل با غنچہ در یک دستہ اند

تالی دونوں ہاتھوں سے بجا کرتی ہے، ہم اگرچہ تمام واقعات سے واقف نہیں تاہم کہا جاسکتا ہے کہ کمال بھی اس معاملے میں سراسر بے قصور نہیں تھے ۔

کمال کا پیری کا زمانہ بڑی تلخی کے ساتھ گزرا ہے۔ جس کے لیے اس عہد کے حاکموں کی سختی اور جبر زیادہ ذمہ دار ہے۔ صاحب عادل شہاب الدین نے جس کی مدح میں کمال نے قصائد و قطعات بھی لکھے ہیں، اس پر کچھ جرمانہ کر دیا ہے اور ضیاء الدین جو اس وزیر کا افسر ماتحت ہے اس جرمانے کی وصولی میں بیحد سرگرمی دکھاتا ہے۔ اس سلسلے میں کمال نے کئی قصیدے لکھے۔ صدلے احتیاج ملد کی

آخر تعلق کا سلسلہ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ کمال کے زار ہائے بیکار جاتے ہیں۔ قاضی بوڑھے شاعر کی دل آزاری کے لیے قرض کے بہانے روپیہ مانگتا ہے۔ یہ کہتے ہیں ۔

برمن خستہ بارہائے موحش — ترشی کردۂ و صفرا بیز
وین کہ امسال ہم برین منوال — می کنی زین حدیث سودا بیز
لاجرم نیست از سخات مرا — بہرہ جز زہرۂ تمنا بیز
رحمت حضرت ارچہ کم کردہ است — ہم دران خدمت است ابجا سر
گرتو از بندہ قرض می خواہی — بخطا یا بہ خود بعمدا بیز
ہم عطا اللہ بلطف تو کاخر — در شمارے گرفت مارا بیز
از تو تشریف بود عیب از ماست — کہ نداریم زر و کالا بیز
ورنہ از بندگان مفلس خویش — قرض خواست حق تعالیٰ بیز

وہ اپنی چہل سالہ خدمات اور اپنے کلیات کی جو قاضی اور اس کے والد کی ثناگستری میں تیار ہوا ہے، یاد دلاتے ہیں۔ مگر ہر التجا بے اثر ثابت ہوئی ۔

مگر کہ مدت دہ سال ہست یا افزون — کہ از شماتت اعدا بخوردم آبے خوش
ہزار بار مرا عفو کردۂ بہ ہنوز — نگشت طبع تو با من زہیچ بابے خوش
گرفتم آنکہ نہ من بودم آنکہ ساختہ ام — زمدحت تو و اسلاف تو کتابے خوش
گرفتم آنکہ چہل سال آں نہ من بودم — کہ شب نکردم از اندیشۂ تو خوابے خوش

ہجوم یاس میں کمال اپنا لہجہ بدلتے ہیں اور قاضی کو بد دعا دیتے ہیں ۔

نگشتہ ہیچ مرادے مرا ز تو حاصل — دریغ در سر کار تو رفت ہر دو جہاں
چنانکہ سعی من از خدمت تو ضائع شد — خدائے سعی تو ضائع کناد در دو جہاں

اگر قاضی کی ہجو نہیں لکھی تو یہ ان کا قصور نہیں۔ اس کے حاشیہ نشینوں

خود گرفتم کہ فارۃ المسک است　　　　که بدعا زیستن نیابد عار
ہم نباید شگافتش شکمش　　　　تا برون اوفتد ازو اسرار
سخت آنکہ او ز عطسۂ خوک　　　　موش را کرد در جہاں بیدار
واجب القتل کرد موشاں را　　　　در نبود شاں درون کعبہ قرار
ز رسولے کہ فتوی شرعش　　　　موش را کرد ہم طویلۂ مار
کا چہ گفتند مفسداں بعرض　　　　در ضمیر رسی مکرد گذار
بشنو از بندہ نکتۂ شیریں　　　　کہ خلیدہ است در دلم چوں خار
گرچہ دنداں موش بس تیز است　　　　تیز تر زاں زبان من صد بار
تو بحق نائب سلیمانی　　　　حق ہر یک بجائے خود بگزار
کار موشاں بر آسماں بردی　　　　جانب بلبلاں فرو مگذار

(کلیات صفحہ ۱۸۹)

اسی شہاب الدین کے نام ایک اور قصیدے میں کمال کے طاقتور قلم نے سرہنگوں کا خاکہ یوں کھینچا ہے ۔

حقا کہ عواں شحنہ من سر فرو کنند　　　　ہر صبح دم کہ بار کنم چشم جیرہ سر
مریخ ہیکلے دو کہ گر بر فلک شوند　　　　خالی ز بیم شاں بگریزد ز خانہ تیر
جفتے زمیں شگاف بدنداں چو گاؤ نیرع　　　　سرہنگ نام شاں و لقب منکر و نکیر
قتاں دار ز قاں و علیطاں کہ وصف شاں　　　　آرد برون اہل ہنر گو ہے ز زیر
سرہنگ ہفت رنگ کہ اجرائی و استاں　　　　در ہیچ ملک باشد و شکرے ولقب وقیر
زدییں آمدادہ درختاں زدست شاں　　　　زاں ساں کہ در سیاہی شب صبح مستنیر
گر در خیال دایہ کند شکل شاں گذر　　　　کودک ز بیم شاں نخورد لب سوئے شیر
چشمی چو آبگینہ و پیشانی چو سنگ　　　　قدی چو تیر گشتی و ریش چو ماد گہ

اور وصولی کے واسطے جو سیاہی (سرہنگ) اُس کے گھر پر تعینات ہوئے تھے
اں کے ہٹانے کی استدعا بھی کی ارصیا الدین کی تو (جسے موسش کے نام
سے یاد کیا ہے) اُسی حرلی کہ عبید راکانی کی زد پر آ گئے کہا ہو

سحرا ئیکہ رحسـریئہ ملک یا سال کرد دولت بیدار
کاتبہ گفتند حاسداں تعرض درحق من راندکـ و بسیار
ہمہ کذب صریح و بہتاں است دربہ ارفصل و دانستم بیزار
مصدراں جوو کند تسویلات تو بحود راہ شاں مدہ زیہار
خود حیہ کار حریبہ راست شود از دو سہ کہنہ حبّہ و دستا
نام من درجریدۂ صدشاست در دوادین جواجگاں کبار
چوں نویسد اندریں دیواں در وجوہ مصادرات وقرار
تو برمی حری تنا راہا کہ عیاں مسـد در اشعار
نحزا من برانگاں مارسے وس ریاں را رسود کم مشمار
عوص رز رس گہرلستاں قیمتی تر رگو ہر شہوار

شاعر نے اس سے بعد موش کی ہجو میں ابیات ذیل لکھے ۔

آدم با مدت موش کہ او کرد حست دروں جو داظہار
جو د بیدارم ار نعل گربہ کم ار ماحرلے موش اظہار
گربۂ زورہ دار بود آموش ہم فریبندہ ہم سک طرار
موش یوں منقلب شود تو مست ستومی او اثر کند ناچار
ظلم آں مدکہ سیر مرداں را شکم پیچــم حرد دربیکار
درجیاتم بدکہ خیـرہ مرا قصد موشی چس کند افگار
ہو کجا موش اژدہا گردد عدلیباں شو ند بو تیمار

لطف فرمائی تجدید و امضا سویس | کہ مرا بود جہاں رسم معیشت آنست

دیگر

بصد حیلت چوں دل لعمری کردہ ام حاصل | محقر بالگے ویران وجوہ بیم مالے را
رجوریکدو نامعلوم ایکسانہ دوسال اُفزوں | کہ تا مرز ارتفاع آں نکردم تر دمالے را

دوسرے قاضی کے ہاں جماعت علما میں جیسا کہ اس سے قبل مذکور ہُوا، ملازم بھی تھے۔ اس کے علاوہ سالانہ غلہ بھی ملا کرتا تھا۔ جوڑے دستار وغیرہ بھی ملتے رہتے تھے اور اسی واسطی آدمی اور انعام و اکرام پر ان کی بسر اوقات ہوتی تھی۔ ایک سال گلا ہُوا غلہ ان کے ہاں پہنچا یا گیا۔ بہت بگڑے اور شکایت میں ایک قطعہ لکھا۔

غلہ کامسال خواجہ داد مرا | گرسنہ حملہ بود اکثر خاک
خاک مردم بورد ندانستم | کہ خورد مردم اے برادر خاک
کردم اندیشہ تا چرا فرمود | خواجہ ناگندم برابر خاک
آدمی را چو خاک سیر کند | کردوجہ عدلے مس برخاک

کمال کے ڈاڑھی نہیں تھی۔ صرف ٹھوڑی پر کچھ بال تھے۔

رحم می طرزد ارچہ مرا | ہر یہ مولیت بر زنخداں است

(کلیات صفحہ ۱۱۲)

جمال الدین کی طرح ان کے بھی چار اولادیں تھیں۔

شاعری قانعم خود مشغول | من دستنی عیال وطفل چہار

(صفحہ ۱۸۴ کلیات)

ان میں سے ایک کا نام علی تھا۔ جو قاضی کے ہاں کسی خدمت پر ملازم تھا اس کے سالانہ مرسوم کی طلب میں قاضی کی خدمت میں لکھتے ہیں۔

روئے بساں آتش و موئے بسان دود — رنگی چو رنگ طرون لوئی چو بوی سیر
نقش نگیں ہر دو گراں جان و رن پرو — وصف جمال ہر دو عروس است و تمطیر
رفتارشاں چو آتش و گفتارشاں چو جنگ — دیدارشاں عقوبت و آوازشاں نفیر
ما این چنیں حریف ہا ماکہ بعد ازیں — شاعر درین دیار نشاید ردل بہ تیر

(کلیات ص ۱۹۳)

کسی دوسرے قصیدے میں یہی آوازِ فغاں ایک نئے انداز میں بلند کی جاتی ہے۔ مخاطب وہی شہاب الدین ہے۔

چہ دیدۂ دمن بے تو کہ ہر ساعت — رکوب لطف لبوئے جفا کی آہنگ
گہی بہ تیغ جفائے تو غرص من مجروح — گہی بسنگ عتاب تو پائے عدرم لنگ
گہی حرم ز عوسے پائے پیل برسینہ — گہے رسد بدل من زموتی زخم پلنگ
جہانہ نام کہ بساری مراحر از پئے زخم — بہانہ ام کہ بحوئی مراحر از پئے جنگ
چو حاصرم نہی ہر گرم بحر و شام — چو غائبم نفرستی بمن بحر سرہنگ
چو حلقہ بر درمن زدستے زدرگاہت — شود ز بیم رخ کودکاں من بے رنگ
چناں کہ دیو ز زخم شہاب مگریزد — ہمی گریزم از نام تو بصد فرسنگ

اس کے سلسلۂ معاش کا اب تک ذکر نہیں ہوا۔ ایک ذریعہ تو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جس کا ذکر ان شعروں میں کیا ہے۔

دارم ز راہِ شغل و عمل مختصر دہی — از جور دور کاسۂ گردوں شدہ خراب
در عہد دولت تو کہ بر سنگ می رسد — لالہ ز بیم معدلتت ساغر شراب
چندیں شگفت نیست اگر این خراب را — آرد ظہور عدل تو در باب احتساب

اس گاؤں کا نام غالباً کرم آباد ہے۔ فرماتے ہیں ؎

حصۃ از کرم آباد کہ آں حق منست — بود دو سال است کہ از جور فلک ویرانست

ہو جوانی سر بید شاخ عمر بن مرگ   اگرچہ بیم ہو دست شاخ تر برید
اگرچہ مرا ما ما سفر برابر بود   لیک آنکہ جواں بود زود تر برید

کمال بدی ہیں کہ ان کی ذات میں ستر فضیلتیں جمع ہیں ہم تفصیل سے ناواقف ہیں۔ ان کا بیان ہے ۔ **مصرع** مراست ار بدست فصل معدہ حصل ہور ______
لیکن جن فضائل پر ان کو ناز ہے وہ عربی شعر و ادب فقہ و علوم ہیں۔

گماں غالب ہے کہ وہ بعض دستکاریوں سے بھی واقف تھے۔ ایک قطعے کے ذریعے کسی کو دنداں ماہی کے دستے والی چھری بھیجی ہے ۔

فرستادم بخدمت کارد بے جوب   کہ از رد گوہر او ہر چہ خواہی
سیں دستہ تعیش گر بخواہی   زہاں مار در دنداں ماہی

ایک قطعہ مظہر ہے کہ انھوں نے ایک صندوق جس پر ان کا بہت وقت لگا ہے، تیار کیا ہے۔ کہتے ہیں اور علاء الدین سے خطاب کرتے ہیں ۔

صندوقکے لطیف مراہست در اسمتی   متلق لساحت آنکہ رہ اہل صناعت
بسیار روزگار دراں صرف کردہ ام   پیداست صنعتش کہ چو صندوق ساعت
وزاں صناعتست کہ بدرست و حکم او   ناچار در مقابل سمعاً وطاعتست
لیک از ہمی فرستم چشتم قضائی اوست   ور ہی کنم توقف جائے شناعتست
در حصر تش رساں بکنم را انکہ حضرتش   جائے بضاعتست نہ جائے اضاعتست
درخواست دست خواجہ وگر ایں بدو رسد   گویم مرا بدریا جیب بے بضاعت
دارم بہ جود تو طمع دہ چہل از انکہ   از بحر سود یک دو طریق قناعتست

ایک دفعہ بیمار ہو گئے تھے، حکیم محمد الدین کے علاج سے اچھے ہوئے، تو شکریے یوں لکھتے ہیں ۔

چگونہ عذر کرمہائے او توانم ساخت   کہ من تواں تنِ ناتواں از و دارم

از حیات که هست حالی او هر چه رسم کمال می دارد
بنده زاده علی اسمٰعیل طبع رسم سال می دارد

(ص۲۵ کلیات)

غالباً اسی فرزند کی سفارش میں اسے ملازم کراتے وقت لکھا تھا ۔

توقع است که این بنده زادهٔ خود را که داغ بندگی از حد وار بید دارد
بشرط تربیت از من قبول فرماید به بنده خانهٔ خاصش ز لطف بسپارد

ایک فرزند جو کسی قافلے کے ساتھ سفر کو گیا تھا واپسی کے وقت اتفاقیہ کسی ندی میں ڈوب جاتا ہے اس کا مرثیہ کلیات میں موجود ہے ۔

شرط همراهی نمدکان سایه پرورد مرا بار لیں ماند و خود با شتر و استر بار آمد
ناگهان در همه ره طفل جهان ما دیده را در خطر نگراستند و با نظر یار آمد
گوهری کش جان بها بود اندر آب انداختند در برای حفظ رخت مختصر بار آمد
قرة العین مرا تنها رها کرد استند در بیابانی وجود با یکدگر بار آمد
دوستان و یارکان از بهر استقبال او همچو من بر پای رفتند و بسر بار آمد
آه از آن ساعت که همراهان او نا یتیم تر لے برادر چون جیکان بیش پدر بار آمد
مارمیں خویش را با با رو خبر کردم براه بار ماندم با رهیم بار و خبر بار آمد
بر لب جوی فرو بردند سر تیرے را بحاک مرغ و ماهی از بر این زیر و زبر بار آمد
چون بدید ندآن جوان را زیر آب زیر خاک پس بر ما تعجیه آسا جامه در بار آمد

لڑکوں کے علاوہ دو لڑکیاں تھیں ۔ دوسری لڑکی کی پیدائش کے وقت بڑے رنج و ملال کی حالت میں لکھتے ہیں ۔

رسید دختر دیگر مرا و یکبار ه سر ز رونق عیش و سر زآب حیات

ایک قطعہ جوان بھائی کے مرثیے میں لکھا ہے ۔

(۳) غیاث الدین محمود برادر جلال الدین مذکور (صفحہ ۱۹)۔ (۴) اتابک اعظم سعد بن زنگی، ۵۹۹ھ-۶۲۳ھ (صفحہ ۲۵)۔ (۵) اتابک اعظم مظفر الدین ابوبکر بن سعد زنگی جب شہزادگی کے زمانے میں اصفہان آتا ہے۔ کمال کہتے ہیں:-

خسروا حال سپاہاں واکہ دیدے میرود	از ستمہا سمع اعلیٰ را خبر باشد مگر
ہست مارا بر تو حق خدمت و ہمسایگی	از برائے ایں دو حق اندر حق ماکن نظر
لطف تو گر در نیابد کار ایں بیچارگاں	در دو سہ ماہے دگر ایں جا نیابی جانور

(۶) شہزادہ شرف الملک بن حسام الدولہ اردشیر۔ اس خاندان سے ان کے قدیمی تعلقات ہیں۔ جمال الدین بھی مداح رہے ہیں -

میراث یافتم ز پدر مدحت شما	والحق ازیں شرف سرمن بآسماں رسید
شتواں بصد ہزار زباں گفت شکر آں	تشریفہا کہ مارا ازیں خانداں رسید

(کلیات صفحہ ۳۶)

(۷) سلطان اتابک سلغر۔ (۸) صاحب اعظم شرف الدین معین الاسلام علی بن فضل وزیر جلال الدین منکبرنی۔ اس وزیر کی تعریف میں متعدد قصائد وقطعات موجود ہیں۔ ان میں ایک قصیدہ ایک مدرسے کی تاسیس کے وقت جس کی بنیاد شاہی اصفہان کے بعد ڈالی جاتی ہے، لکھا ہے۔ یہ مدرسہ غالباً جلال الدین منکبرنی کے حکم سے کھولا جاتا ہے۔ کہتے ہیں --

چو حق شہی را الہام داد و شاہی داد	کہ سایہ خیمۂ دولت بدیں مکاں آرد
سرائے علم فراز و اساس خیر نہد	درشت ظلم کند خوف را اماں آرد
صلیب خارج نسور و کلیسا نکند	بنائے مدرسہ بر گنبد کیاں آرد
ز خشت خام یکے جام جم بیار آید	ز آب و خاک یکے خلد جاگہاں آرد
روا بود اگر از بہر اقتباس علوم	فرشتہ رحمت بدیں عالم آشیاں آرد

زمن چہ خدمت شایستہ آید آنکس را — کہ بعد از ایزد خلاق جان ازو دارم

ضیاء الدین احمد ابن ابوبکر بیابانکی کی مدح میں کمال نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع ہے ؎

درست گشت ہمانا شکستگی منش — کہ یک ازاں شکستہ زلف پُرشکنش

(کلیات ص۱۷۹)

قصیدہ پڑھتے وقت کسی نے اعتراض کیا کہ یہ مطلع ظہیر فاریابی کے مطلع سے اڑایا گیا ہے۔ ظہیر کا مطلع ہے ؎

ہزار توبہ شکستست زلف پُرشکنش، — کجا بچشم درآید شکست حال منش

کمال نے اسی وقت ممدوح کو خطاب کرکے جواب میں فی البدیہہ کہا:-

نہ مدح تو شد گفتہ این قصیدہ کہ خواست — بامتحان زمن خستہ جان ممتحنش

توارد ار گر افتادہ بود در مطلع — مدان سبب ز تہی از قصور در مزلش

ظہیر اگرچہ کہ صراف نقد اشعار است — گمان مبر کہ ربودند قلب بر سخنش

یہی معذرت ایک قطعے میں بھی ادا کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

خدائے داند اگر من ز شعر ہیچ کسے — بقصد مظلمہ کردہ ام ما دنی شئ

مرا کہ چون بہ سخن جوان نظم آرایم — بود ہوا کہ اوحدی و سفرہ ریزہ خوری

چگونہ دل دہدم لقمۂ خرد بردن — کہ خاطرے دگرے کردہ باشد آن اقی

مگر توارد خاطر کہ در مجاری فکر — بہ ممکنست کہ کس محترز بود ازوی

دو راہ رو کہ راہے روند بریک سمت — عجب مباشد اگر او فتند پی در پی

(کلیات قلمی مملوکۂ پروفیسر سراج الدین آذر)

کمال کے کلیات میں مفصلۂ ذیل اسما کی مدح میں قصائد ملتے ہیں۔

۱) علاء الدین تکش ۵۸۹-۹۶ھ ہجری (ص۱۶ کلیات)۔ (۲) جلال الدین منکبرنی ۶۲۸ھ (ص۱۶)

کھاتا ہوں پھر بھی وہ مجھ سے وصولی کی توقع کرتے ہیں
مارمانہ آگیا ہے کہ مدح خریدنے والے ممدوح نہیں رہے تو
سرے کی تعریف میں شعر لکھیں کسی، اسے میں لوگ ہجو ست
اس تو وہ بھی بے اثر رہ گئی ۔ سے

ہر افراط طمع — گدایاں مگر ارند گدائی و سوال
رحمت شاں می گویم — پس ہم ایشاں را ازمن طمع اند سال
روسے کہ درو — نیست ممدوحی کرما سحر و مدح کمال
مدحت عدو می گویم — چوں ز ممدوح توقع بود جود و نوال
تاثیرسے بود — ایں رسالش اثری نیست سحر در رو وبال

رالدین (اومالی) ہیں، جو اظہار عقیدت میں ایک قطعہ اس
ے ہیں اور اسے پیغمبر سخن کہتے ہیں اثیر کے قطعے کے پہلے

حدیو کشور فضل — کہ فخر جاں و جہاں شد ترا تما کردن
لہ برحرد وفضل است — نیست سخن جوت اقتدا کردن

کمال لکھتے ہیں ۔

ت بر رماں قلم — پیام روح قدس و مدم ادا کردن

رالدین ہی جس نے کمال کی تعریف میں اشعار لکھے ہیں اور
اکی ہے۔ کمال اس وقت شعر و شاعری کا مشغلہ قریباً ترک کر چکے
ھتے ہیں ۔

ات تو کاں گہر — کاں چہ مانند خود سراسر جوہر است
گوہر راے تو — ار محالت داس دریا ترا است

اگرچہ حکم سلیماں بروزگار کسے ولیک تخت سوئے آصفِ زماں آرد
بہمت شرف الدین علی تمام شود ہر آنچہ خسرو آفاق در گماں آرد

(۹) ملک نصرت الدین (۱۰) صدر نظام الدین نظام الملک محمدؒ (۱۱) فخر الدین ابن نظام الدین (ص۱۴۲) (۱۲) حاجب شمس (ص۱۴۳)۔ (۱۳) شرف الملک تاج الدنیا علی وزیر (ص۱۴۴)۔ (۱۴) قاضی القضاۃ رکن الدین ابو العلا صاعد (ص۱۵۴) (۱۵) رکن الدین مسعود بن صاعد۔ (۱۶) در صلح صدر الدین و قوام الدین (ص۱۶۵) (۱۷) صدر الدین عمر محمدی (ص۱۶۹)۔ (۱۸) عضد الدین حسن (ص۱۷۳) (۱۹) حمید الدین آصف ثانی (ص۱۷۶)۔ (۲۰) احمد بن ابوبکر بیابانکی (ص۱۸۰) (۲۱) بہاء الدین عبدوس؛ (ص۱۸۳) (۲۲) صاحب اعظم شہاب الدین (ص۱۸۶)۔ (۲۳) شمس الدین خوارزمی (ص۱۹۵) (۲۴) نور الدین (ص۱۹۹) (۲۵) رشید الدین وزیر (ص۲) (۲۶) قطب الدین (ص۲۲۰) (۲۷) زین الدین علی السہروردی (ص۲۳۲) (۲۸) عمید الدین پارسی (ص۲۴۵) (۲۹) صدر کبیر ضیاء الدین (ص۲۵۲)۔ (۳۰) نجم الدین (ص۲۵۶)۔ (۳۱) عز الدین (ص۲۵۷)۔ (۳۲) کریم الدین (ص۲۶۱)۔ (۳۳) اسپہسالار ملک عز الدین اصفہانی (۳۴) قوام الدین ابراہیم بنداری (ص۲۶۲) (۳۵) ناصر الدین منگلی (ص۲۶۲)۔

کمال نے بعض شعرائے عصر کے ساتھ قصائد و قطعات کا تبادلہ کیا ہے۔ ان میں پہلا نام فخر الدین ہے۔ اس کے قصیدے کے جواب میں وہ قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے ؎

جز مقدم رکھا یہ سمت لبے باد شمال کش جز امیدی نبونی وجہ داری حوال

دیر میں جواب دینے کی معذرت کے بعد اپنے پیشے کی کساد بازاری کا قصہ لے بیٹھے ہیں۔ کہتے ہیں ان دولت مندوں کی کیا شکایت کروں جنھوں نے فقیروں تک سے ان کا پیشہ (گدائی) چھین لیا۔ میں ان کے مدحیہ قصیدے لکھتا

یکبارگی شدم بیزار کہ از ہمہ مردم زماں بیزارم

ایں خواجگاں کہ می کہ ہیچ کار مرا انتظام می ندہند
آخر چہ در وجود آمد کہ ہیچ گونہ بدیش بہ نام می ندہد
ایں مسماں کہ شاعر را بصد تضیع جواب سلام می ندہند
من رما دشاید رلیست کہ قوت روز بروزم تمام می ندہند
ہد و کرم می ورزند کتاب می بخرند و نوام می ندہند
عت ہمی نرم زیں قوم کہ اہل خانہ خود را طعام می ندہند
ت بسار ما ایہہا کہ ہیچ جائے نشاں کرام می ندہند

ے عہد ہست مرا نگویم و نکنم شعرم بے نیازم گفت
شاں آنچنانکہ میدانم کسی ندانہ دگفتش ولے نیازم گفت
ا ازاں کہ دروغ رحد بہر دم و یک راست می نیازم گفت
ت کاہل ایں ایام سزائے مدح نیند و ہجی نیازم گفت

دیل اس کی انتہائی یاس کا آئینہ دار ہے۔

ساے دہر در ہرفن کرم ملاف زعہد گذشتہ واگوید
ید گریست کریں ما حکایت کرم از روزگار ما گوید



شعری خواہی و جادوم مدتیست | ما ز شعر و شاعری فارغ تر است
شعر را گر بود وقتے رونقے | ایں زماں بارے عجب مستنکر است
بلبل طبعم نوا کم می زند | زانکہ شاخ جود بے برگ و براست
زاں چو سوسن خامشم کیں قوم را | ہمچو نرگس چشم یکسر بر زر است
چوں بدیں صورت بود کار ہنر | وائے آں مسکیں کہ معنی پرور است
ہم فرستادم بخدمت چند بیت | تا بدانی کیں رہی فرماں بر است

کمال نے اپنے عہد میں شعر و شاعری کی بے قدری کا جو بیان مذکورۂ بالا فخر الدین و نور الدین کے خطابیہ ابیات میں دیا ہے یہ کوئی تنہا بیان نہیں ہے بلکہ ایسے جذبات اُس کے ہاں نہایت عام ہیں اس کو اپنی ناکام زندگی پر سخت افسوس ہے بلکہ بعض اوقات اس تاسف اور تلخی پر غصہ غالب آجاتا ہے اور وہ نہایت سخت زبان استعمال کرنے میں بھی تامل نہیں کرتا۔ یہاں بعض صاف اشعار درج ہیں۔

عقد گوہر کجا کنم عرضہ | چوں نہ بینم ہمی خریدارے
نیست در روزگار ممدوحی | کہ ازو نیست بر من انکارے
(دیگر) ہمہ دریائے جود نیست شدند | ہر کجا در زمانہ پُر ہنریست
تا چنیں نکبت ہنر مرداں | وائے او کز ہنر مروا تر نیست
(دیگر) بقحط سالی افتادم از ہنر مرداں | کہ گر بیاں کنم او را بشرح نتوانم
اگر بیابم آں را کہ شعر در یابد | بدو دہم صلتی تا سخن برو خوانم
(دیگر) دریغ روز جوانی کہ در محالاتش | بباد دادم و او نیز داد بر بادم
ز عمر آنچہ گزیں بود رفت و ایں ہمہ عمر | بکام خویش یکے روز نیست در یادم
بعمر ماندہ اگر شاد نیست مردم را | من از زمانہ بعمر گزشتہ بس شادم

اس کے علاوہ سید صاحب بعض چند امور یا نئی تحقیقات بروئے کار لائے ہیں۔ ایک یہ کہ قدما قول غزل اور رباعی میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے بالفاظ دیگر قول و غزل کی اصطلاح کا اطلاق رباعی پر کیا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ابودُلف عجلی اور ابوطلب مراغہ گو ایک ہی شخص ہیں۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ فارسی میں بھی اشعار معقّد لکھے جاتے تھے۔ قدیم رباعی گویوں میں شیخ بایزید بسطامی ابونصر فارابی اور بوعلی سینا کا نام لیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اب وقت آگیا ہے کہ سید صاحب کے اعتراضات کا جواب دوں اور ان کے بیانات کو جو کئی امور میں ہماری فنّی روایات سے منحرف ہیں نقد و نظر کی کسوٹی پر جانچ لوں۔ سب سے پہلے میں ان کے اعتراضات کو لیتا ہوں۔

معیار الاشعار خواجہ نصیر الدین طوسی کے متعلق فرماتے ہیں:-

"تنقید شعر العجم کے فاضل مولف پروفیسر شیرانی نے اپنے مضمون کے پہلے نمبر میں اس کو کسی سند کے بغیر محقق طوسی کی تالیف بتایا ہے۔ معلوم نہیں ان کے سامنے اس کی کیا سند ہے درانحالیکہ مشرق و مغرب کے فضلا اس نسبت کے قبول کرنے میں تردد کرتے ہیں چنانچہ علامہ عبدالوہاب قزوینی (کذا) نے معجم کے دیباچے میں (ط) تصریح کی ہے کہ "کتاب مرغوب معیار الاشعار است در علم عروض و قوافی کہ در ۶۴۹ھ تالیف شد و مصنف آں معلوم نیست وی (مفتی سعد اللہ مراد آبادی شارح المتوفی ۱۲۹۴ھ) ایں این کتاب را بخواجہ نصیر الدین طوسی معروف متوفی ۶۷۲ھ نسبت دادہ است، ولی معلوم نیست از روئے چہ ماخذ"

ڈاکٹر ریوئے برٹش میوزیم لائبریری کی فارسی کتابوں کی

ضمیمہ متعلق رُباعی

بجواب مولانا سیّد سلیمان ندوی

تنقید شعر العجم کی پہلی قسط میں جو اکتوبر ۱۹۲۲ء کے رسالۂ اُردو اورنگ آباد میں شائع ہوئی تھی، میں نے رباعی کے سلسلے میں جو بیان دیا تھا اس پر ہمارے ملک کے فاضل بزرگ علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنی قابل قدر تصنیف خیام میں جو ۱۹۳۳ء میں طبع ہوئی ہے کئی اعتراض کیے ہیں۔ مثلاً میں نے معیار الاشعار کو خواجہ نصیر الدین طوسی کی تصنیف بیان کیا تھا۔ سیّد صاحب نے اس سے انکار کر دیا۔ میں نے لکھا تھا کہ رباعی ایرانی الاصل ہے یعنی اس کے اوزان ایران زاد اور مقامی ہیں۔ سید صاحب کا دعویٰ ہے کہ رباعی کہنے والے " قدما ، عربی کے شاعر تھے "۔ میں نے کہا تھا کہ رباعی ابتدائی مدارج میں چار بیتی کی شکل میں لکھی جاتی تھی جس کے چاروں شعر ہم قافیہ ہوتے تھے سید صاحب اس کو ایک بے سند دعویٰ بیان کرتے ہیں۔ میں نے لکھا تھا سب سے قدیم رباعی اس وقت ابوشکور بلخی کی ملتی ہے۔ سید صاحب کا ارشاد ہے کہ ایسی قدیم رباعیاں دس بارہ سے زیادہ موجود ہیں۔ میں نے فرخی کا ایک شعر اُس کے دیوان سے ابوطلب ترانہ گو سے متعلق نقل کیا تھا۔ سید صاحب نے نادانستہ خود اس کی تصحیح کر کے اس کے وزن کو بدل دیا۔

(۳) علامہ حسین قدر بلگرامی کی قواعد العروض میں تو کثرت کے ساتھ معیار
کا ذکر بار بار آرہا ہے معیار کی اکثر و بیشتر امثال اس تصنیف میں موجود
ہیں صرف چند صفحوں کے حوالے دیتا ہوں۔ ص۱۴۳ ص۱۵۰ ص۱۵۱ ص۱۵۶
ص۱۶۹۔

(۴) واجد علی شاہ بادشاہ اودھ ارشاد خاقانی (حکم اختر) تالیف ۱۲۶۹ھ
میں یہ رقم طراز ہیں:-
"اور خواجہ نصیر الدین طوسی رحمۃ اللہ علیہ نے معیار الاشعار میں کہا ہے"

(۵) روضات الجنات میں (طبع ایران ۱۳۰۶ ہجری) جو محمد باقر خوانساری
نے ۱۲۸۷ھ میں تالیف کی ہے صفحہ ۶۰۶ پر محقق طوسی کی تصنیفات کے ذکر میں معیار
کا بھی اشارہ موجود ہے۔

ممکن ہے کہ سید صاحب کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ مصنفین تو
سعد اللہ کے مقلد اور متبع ہیں ان کی سند چنداں مضبوط نہیں مانی جاسکتی۔
اس لیے ہم بطور دفع دخل مقدر اپنی تحقیقات کو معتی صاحب سے سابق تر
زمانہ میں لے جاتے ہیں۔

(۶) شمس الدین فقیر بارھویں صدی ہجری کے ایک اعلیٰ شاعر اور مشہور
ادیب ہیں۔ ان کی تالیف حدائق البلاغت ہمیشہ درس میں شامل رہی اور
اب بھی شامل ہے۔ موصوف اس تالیف میں حدیقۃ الرابعہ کے شعبۂ اول میں
بیان حروف قافیہ ردف زائد کی تشریح کے موقع پر لکھتے ہیں:-
"بعضے حرف بعد از ردف را داخل ردف شمردہ اند و آں را ردف زائد
نامیدہ و خواجہ نصیر الدین طوسی رحمۃ اللہ علیہ در رسالۂ معیار الاشعار حرف مذکور
داخل روی شمردہ و آں را روے مضاعف خواندہ"۔

فہرست صفحہ ۵۲۵ میں بعینہٖ یہی لکھا ہے اور بتایا ہے کہ محقق طوسی کی تصانیف کی
فہرست میں یہ نام نہیں۔" (خیام۔ حاشیہ صفحہ ۲۲۱)

میں عرض کرتا ہوں کہ ریو فہرست نگار مخطوطات فارسی برٹش میوزیم اور اس کے مقلد مرزا محمد بن عبدالوہاب کے دو نام گنا کر سید صاحب نے حکم لگا دیا کہ فضلائے مشرق و مغرب اس نسبت کے قبول کرنے میں تردد کرتے ہیں۔ گویا ان دو ناموں پر مشرق و مغرب کے فضلا کی فہرست ختم ہو گئی۔ سید صاحب سمجھ رہے ہیں کہ صرف مفتی سعد اللہ کی یہ رائے ہے۔ مگر اس بارے میں ان کو سخت سہو ہوا ہے۔ اکثر و بیشتر عروضی یہ رائے رکھتے ہیں کہ معیار الاشعار خواجہ نصیر الدین طوسی کی تصنیف ہے۔ مثلاً کچھ نام عرض ہیں:۔

(۱) منشی مظفر علیخاں اسیر جو زر کامل عیار ترجمۂ معیار الاشعار (طبع اول ۱۲۸۹ھ نول کشور) کے مالک ہیں اپنے ترجمے کے پہلے صفحے پر لکھتے ہیں۔

"صحیفۂ رشیقہ یعنی کتاب معیار الاشعار تصنیف عالم کامل فخر اماجد و اماثل رئیس الحکما استاد الکملا محقق طوسی علیہ الرحمۃ" الخ،

(۲) مرزا محمد جعفر اوج، اردو میں مقیاس الاشعار کے مصنف ہیں۔ اس تالیف میں صفحہ ۱۴۵ پر یہ عبارت درج ہے۔

"محقق علیہ الرحمۃ نے معیار الاشعار میں چوبیس زحاف لکھے ہیں۔" اور صفحہ ۱۹ پر یہ عبارت ملتی ہے۔

"از خواجہ نصیر الدین طوسی علیہ الرحمۃ   مفاعلتن مفاعلتن دو بار
شعر   ندی چکی بجائے کسی   کہ او بکند بجائے تو بد

ہم سید صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ شعر معیار الاشعار میں ذیل بحر وافر صفحہ ۴۲ پر موجود ہے اور زر کامل عیار میں صفحہ ۱۲۹ پر (نول کشور ۱۳۰۹ھ)۔

فارسی مخطوطات ۔۔۔

(۱) سلطان حسین بایقرا کے عہد میں دیگر علوم کے علاوہ عروض و قافیہ اور معما کا بہت رواج رہا۔ مولانا جامی نے اپنی مصروفیتوں کے باوجود عروض و قافیہ پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے ہیں جامی کے شاگرد میر عطاء اللہ الحسینی مشہدی میں جو کتاب تکمیل الصناعہ میں قافیے پر ایک رسالہ شامل کرتے ہیں۔ رسالۂ ہذا میں میر عطاء اللہ متعدد موقعوں پر معیار الاشعار کا نام لیتے ہیں۔ ان میں سے ایک مثال یہاں پیش کرتا ہوں ۔

"چنانکہ در این بیت کہ در معیار الاشعار خواجہ نصیر الدین طوسی آوردہ بیت

صنم من زرمن سروی دلکش من مری مستوی

(۱۱) جامی کے رسالۂ قافیہ کا نام مختصر وافی فی علم القوافی ہے اس پر ان کے ایک شاگرد نے جس کے نام سے میں ناواقف ہوں ایک شرح لکھی ہے میرے عروضی مجموعے میں اس کا ایک مخطوطہ ۱۰۱۱ھ کا نوشتہ ہے جس پر رسالہ کا نام ان الفاظ درج ہے "رسالۂ عروضیہ مسمیٰ بشرح مختصر وافی فی علم قوافی رمتن حضرت مولوی جامی"۔ رسالہ ہذا میں کئی جگہ معیار الاشعار کے حوالے نظر آتے ہیں ان میں سے ایک یہاں نقل کیا جاتا ہے ۔

"خواجہ نصیر الدین طوسی در کتاب معیار الاشعار حرف مقدم بر روی را منحصر در ردف دانستہ"

(۱۲) بحر الدین محمد ابن شاکر الکتبی متوفی ۷۶۴ھ نے اپنی تصنیف فوات الوفیات کے حصہ ثانی میں صفحہ ۱۵۲ پر محقق طوسی کی تالیفات کے ذکر میں معیار الاشعار کو بالفاظ "العروض بالفارسیہ" یاد کیا ہے۔

(۳) صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی متوفی ۷۶۴ھ کی الوافی بالوفیات

(۷) گیارہویں صدی ہجری میں ہمیں میر ابوالحسن فراہانی شارح انوری کا نام ملتا ہے جو قافیہ شانکاں کے ذکر میں لکھتے ہیں۔
"استاد المحققین خواجہ نصیر الدین محمد طوسی در رسالۂ عروض و قافیہ مسمیٰ بمعیار الاشعار آوردہ"

(۸) عبد الرحمان اور نگ والی توران جلال الدین اکبر کا معاصر ہے۔ اس کے دربار میں ایک زبردست عروضی یا پیدہ محمد بن محمد بن شیخ محمد موجود تھے۔ قصائی تخلص کرتے تھے ۹۹۹ھ میں فن عروض پر ایک تالیف ان کے قلم سے نکلتی ہے جس کا نام جو تاریخی بھی ہے تنقید الدرر ہے۔ اس تالیف کا ایک قریب العہد مخطوطہ نوشتہ ۱۰۱۰ھ راقم کے عروضی مجموعے کی زینت ہے اس اہم تالیف میں کئی موقعوں پر معیار الاشعار کے حوالے آئے ہیں۔ چنانچہ ۔
"وخواجہ نصیر طوسی در معیار الاشعار فاصلہ را از ارکان نکرہ علیحدہ نشمردہ بلکہ فاصلۂ صغریٰ را مرکب از سببِ ثقیل و خفیف و فاصلۂ کبریٰ را مرکب از سبب ثقیل و وتد مجموع داشتہ" ورق ۱۲ الف

(دیگر) "و شیخ نصیر طوسی کہ صاحب معیار الاشعار است پس از روی بیش از یک حرف را از حروف قافیہ اعتبار نکردہ است" ورق ۱۲۶ ب

(۹) صنائع الحسن ایک اور عروضی تالیف ہے جو دسویں صدی ہجری میں مشہور بخاری مصنف تذکرۂ جواہر العجائب کے قلم کی یادگار ہے۔ یہ تالیف فخری ایسے سرپرست شاہ حسن (حسین؟) ۹۲۸ھ/۱۵۲۲ء ۹۶۲ھ/۱۵۵۲ء والی سندھ کے لیے لکھی ہے۔ یہ مخطوطہ بانکی پور لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کتب خانے کے فہرست نگار خان بہادر عبدالمقتدر خان کہتے ہیں کہ ورق ۵ ب پر مصنف نے معیار الاشعار کو خواجہ نصیر الدین طوسی کی تصنیف بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو جلد نہم

شاعری بعد از اسلام کے موضوع سے تعلق رکھتی ہے اور جو عربی شاعری کی تقلید میں شروع ہوئی ہے۔ فارسی شاعری اور رُباعی تو ایسی فضا ہے جس میں ایام ظہورِ اسلام سے قبل کا تصور بھی ذہن میں نہیں آتا۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کیا ہم الفاظ 'قدیم'، 'قدما'، 'قدیم الایام'، زمانۂ مابعد اسلام کے لیے استعمال نہیں کرسکتے۔ ان الفاظ سے میرا مقصد وہی ہے جو دُنیا لیتی ہے۔ قدیم جدید کے مقابلے میں۔ قدما متاخرین کے مقابلے میں اور قدیم الایام زمانۂ حال کے مقابلے میں آتا ہے۔

اب مجھے دو باتیں ثابت کرنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ عہد قدیم میں ایران میں چار بیتی کا رواج تھا۔ دوسرے یہ کہ چہار بیتی کے اوزان عربی سے مستخرج نہیں بلکہ ایران زاد اور بومی ہیں۔

پہلی شق کے لیے محقق طوسی کا بیان جو میں مع ترجمہ اپنی تمہید میں نقل کر آیا ہوں دھیان میں رکھنا نہایت ضروری ہے لیکن معیار الاشعار پر سیّد صاحب کا اضطراری اعتماد محقق طوسی کے بیانات کی اصل وقعت و اہمیت کے احساس سے انھیں باز رکھتا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ رباعی کسی شخصی ایجاد کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ ارتقا یافتہ شکل ہے قدیم چہار بیتی کی جو ہزج مربع اخرم و اخرب میں لکھی جاتی تھی۔ ان ایام میں صدر و ابتدا میں اخرب و مکفوف۔ اخرب و موفور کا اختلاف جائز سمجھا جاتا تھا جو چہار بیتی کے ہر مصرع میں کارفرما ہے۔ جس کی بنا پر پہلے مصرع کے شروع میں مفعول کے مقابلے میں دوسرے مصرع کے شروع میں مفاعیل یا مفاعیلن آجاتا ہے۔ مگر ہزج عربی میں مربع الارکان مستعمل ہے جب عربی عروض فارسی میں اختیار کی گئی تو ضروری ہے کہ ابتداءً اشعار ہزج کے مربع میں لکھے جاتے ہوں۔ چنانچہ رباعی بھی مربع میں لکھی گئی۔ چونکہ اس میں چار شعر ہوا کرتے

کے جزو اوّل میں ص۱۸۱ پر محقق کی تصنیفات کے ضمن میں "العروض بالفارسیہ" یعنی معیار الاشعار کا بھی ذکر آیا ہے۔

جب گزشتہ صدی سے لگا کر آٹھویں صدی تک کے تمام علما معیار کو محقق کی تصنیف مانتے آئے ہیں تو میرا کیا قصور ہے اگر میں نے اسے خواجہ نصیر کی تالیف مان لیا۔

ایک موقعے پر سیّد صاحب نے فرمایا ہے۔

"مسئلہ شعر العجم کے وسیع النظر ناقد پروفیسر شیرانی نے سعید کے پہلے نمبر (رسالۂ اُردو، اورنگ آباد دکن) میں رباعی کی بحث پر دو صفحے لکھے ہیں اور معیار الاشعار کی مذکورۂ بالا عبارت کے لفظ 'قدما' سے اتنی وسعت پیدا کر لی کہ یہ دعویٰ کر دیا ہے کہ قدیم الایام میں ایران میں ایک خاص قسم کی نظم جس کو چار بیتی کہا جاتا تھا رائج تھی اس کے اوزان عربی اوزان سے غالباً مستخرج نہیں ہیں بلکہ ایران زاد اور مقامی معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ ان میں سے ہر دعویٰ ثبوت کا محتاج ہے۔ اہل عروض و اہل موسیقی کی روایات (قابوس نامہ کا حوالہ آتا ہے) کا جہاں تک تعلق ہے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ارباب فن کے یہاں یہ چیز نو پیدا تھی اور اسلام کے بعد اہل فن کے استعمال میں آئی ہے۔" (خیام ص۲۲۲)

میں یہاں سردست ہی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ محترم سید اپنے اعتراض میں ایسے فقرات کے استعمال سے کہ 'لفظ قدما سے اتنی وسعت پیدا کر لی ہے'۔ 'ارباب فن کے یہاں یہ چیز نو پیدا تھی' اور اسلام کے بعد استعمال میں آئی' وغیرہ میرے خلاف مدعا یہ امر ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ میں رباعی کو اسلام سے قبل کی پیداوار مانتا ہوں۔ حالانکہ میرے زیر نظر شعر العجم تھی جو خالصتاً فارسی

تعجب ہے کہ ہمارے سلیمان اعظم نے جہاں رباعی کے مختلف ناموں کی فہرست دی۔ مثلاً ترانہ۔ دوبیتی۔ قول غزل۔ بیت وغیرہ۔ اس میں انھوں نے اس کے سب سے قدیم نام چہار بیتی کو شامل نہیں کیا اور محقق طوسی کا بیان بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ حالانکہ عروضی چہار بیتی کا برابر ذکر کرتے ہیں۔

مقیاس الاشعار میں مرزا آوج کہتے ہیں "ترانے کو قدما نے چار بیت قیاس کیا ہے اور اس کو 'چہار بیتی' کہا ہے۔ یعنی اس میں ہر مصرع ایک بیت ہے اور تازی میں اس کو رباعی کہتے ہیں اور چاروں مصرعوں میں قافیہ لانا واجب جانتے ہیں لیکن نزدیک متاخرین جو مربعات اس وزن اخرب کے مستعمل ہیں یہ وزن بھی متروک ہے۔" (ص۲۱۷ مقیاس الاشعار)

غلام حسین قدر بلگرامی کا قول ہے "اور اس کو اسی وجہ سے چہار بیتی اور رباعی کہنے لگے۔ لیکن متاخرین نے چار مصرعوں کو دو شعر فرض کیا اور اس کا نام دوبیتی رکھا۔"

"قدمائے فارس ترانہ را کہ از بحر مربع اختراع کردہ اند چہار بیتی و رباعی می گفتند و ہر دو و چہار رکنی را قافیہ لازم می شمردند۔ اما متاخرین شاں چوں ابیات مربع بحر بر وایشاں متروک است ترانہ از مثمن قرار می دہند و ہر دو و چہار رکنی را مصراعی می شمرند و مجموع را دوبیتی۔" (ص۶ رسالہ کیف۔ اتحاد رباعی از مفتی سعد اللہ)

شق دوم۔ یہ کہ چہار بیتی یا رباعی کے اوزان عربی سے مستخرج نہیں ہیں بلکہ ایران زاد اور مقامی ہیں۔ میں حیران ہوں کہ سید صاحب کو ایسے بدیہی واقعے کا ثبوت مانگنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ہم عروض کی جس قدیم و جدید کتاب کو اٹھا کر دیکھتے ہیں ہر مصنف یہی راگ الاپ رہا ہے کہ رباعی فارسی الاصل ہے۔ میں بعض عروضیوں کے بیان یہاں نقل کرتا ہوں۔

تھے اس بنا پر اس کا نام چہار بیتی رکھا گیا۔ ایک عرصہ دراز کے بعد حسب اصول مثمنات کی دریافت نے اہل ایران کو زیادہ خوش آیند اور شگفتہ اوزان سے آشنا کر دیا۔ مربعات ترک کر دیے گئے اور مثمنات کو اختیار کر لیا گیا۔ اور ترانہ جو چار بیت مربع پر شامل تھا دو بیت مثمن کے قالب میں ڈھل گیا اور دو بیتی کہلایا۔ یہی اصول یعنی مربع کا مثمن کر دینا، صرف رباعی میں بلکہ دیگر اوزان میں بھی کام کر رہا ہے۔ مثال میں ہزج مربع کا یہ شعر پیش ہے۔

من سے تو چیں زار تو از دور ہی حسد

اس کا وزن ہے مفعول مفاعیل مصرع اول، مفاعیل مفاعیل مصرع دوم۔ یہ رباعی کا وزن نہیں ہے۔ یہاں ابتدا میں صدر کے مقابلے میں مفاعیلُ بجائے مفعولُ لایا گیا ہے۔ ایران کی بعد کی خوش مذاقی کے دیکھتے ہوئے ایسا اختلاف نا قابل معافی ہے۔ مگر جب اسی وزن مربع کو مثمن بنا لیا یعنے پورے شعر کا مصرع کر لیا تو وزن مفعول مفاعیلُ مفاعیلُ مفاعیل۔ تو ایک نہایت خوش آیند وزن حاصل ہو گیا۔ چنانچہ

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

ایک اور مثال دی جاتی ہے۔

ای یار دل ربائے یکے بارہی بساز

جو بحر مضارع مربع اخرب موور مقصور ہے۔ یعنی مفعول فاعلات مصرع اوّل اور مفاعیل فاعلات مصرع دوم۔ یہاں صدر و ابتدا میں اخرب وموور کا اجتماع ہے لیکن ان دونوں مصرعوں کو ایک مثمن مصرع بنا لینے سے ایک نیا شگفتہ وزن ہاتھ آ گیا۔ مثال۔

گر مرد ہمتی ز مروت نشاں مخواہ صد جا بہید تو دیت از دشمناں مخواہ

(۷) "اور حال تو کہ رباعی نکالی ہوئی فصحائے عجم کی ہے اور بحر ہزج سے خصوصیت رکھتی ہے۔" (تقویت الشعرا از امام الدین طالب۔ سلطان المطابع لکھنؤ)

(۸) "و رباعی از مخترعات اہل عجم است و بہ بحر ہزج اختصاص دارد۔" (ص۵۶ تحفۃ العروض از منشی مظفر علی اسیر نول کشور ۱۸۷۴ء)

یہاں ایک سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر رباعی ایرانی الاصل نہیں ہے تو پھر اس کی ایجاد کی توضیح کرنے والے قصے جن میں صرف ایرانی حصہ لیتے نظر آتے ہیں اور جنھیں سید صاحب نے اپنی معزز تالیف میں نقل بھی کیا ہے کیوں شہرت پاتے مثلاً رودکی کا ایک طفل خورد سال کو عید کے مرغزار میں جوش مسرت میں مصرع آیندہ پڑھتے سنا یا بقول دولت شاہ یعقوب بن لیث کے فرزند کا جو کھیلتے ہوئے ایک نشاط آمیز لہجے میں کہا کہ

غلطاں غلطاں ہمی رود تا بن گو

خیام کے ص۲۲۳ پر سید صاحب نے گزشتہ اعتراض سے ملتا جلتا یہ اعتراض کیا ہے۔

"ناقد شعر العجم نے اپنے اسی پہلے سلسلے میں یہ بے سند دعویٰ کیا ہے جس کا مدار ساتویں صدی کی معیار الاشعار پر ہے کہ قدما (کس عہد تک کے قدما ؟) تمام تر چہار بیتی کہتے تھے، جس کے چاروں مصرع ہم قافیہ ہوتے تھے" اور اس سے نادرتر دعویٰ یہ ہے کہ چہار بیتی کی اب کوئی مثال نہیں پائی جاتی، حالانکہ ایسی رباعیاں جن کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں، عوفی کی لباب الالباب کے قدما کے حالات میں دس بارہ سے زیادہ ہیں اور بعد کے شعرا کے یہاں ایسی رباعیاں ملتی ہیں۔"

میں سید صاحب کی خدمت میں بصد ادب عرض کرتا ہوں کہ جب ان کو

(۱) بدانکہ وزن رباعی کہ آں را دوبیتی و ترانہ نیز گویند از بحر ہزج بیروں می آید و آں را عجم پیدا کردہ اند و بر بیست و چہار نوع آوردہ۔

(عروض سیفی تالیف ۸۹۶ھ صفحہ ۵۹ طبع ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۷۲ء)

(۲) باید دانست کہ وزن دوبیتی را کہ رباعی و ترانہ نیز می گویند آں را شعرائے عجم از وزن اخرم و اخرب ہزج مثمن برآوردہ اند۔"

(ص ۵۳ تنقید الدرر از قصائی تالیف ۹۹۹ھ)

(۳) باید دانست کہ رباعی را شعرائے عجم اختراع نمودہ اند و آں را ترانہ و دوبیتی نیز نامند۔" (ص ۱۱۶ حدائق البلاغت مطبع کریمی۔ لاہور سنہ ۱۹۲ء)

(۴) کرامت علی ابن رحمت علی جیبی جونپوری نے مسٹر شلر فرانسیسی کے لیے اپنے قیام تبریز کے زمانے میں ایک رسالہ قواعد عروض و قوافی پارسی لکھا ہے جس میں مرزا ابوالقاسم قائم مقام کی طرف بھی خطاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ ٹائپ میں طبع شدہ میرے پاس ہے جس پر تاریخ طباعت درج نہیں۔ اس رسالے کے صفحہ ۸۲ پر عبارت ذیل ملتی ہے۔

"فصل شانزدہم در بحر رباعی و آں را دوبیتی و ترانہ نیز گویند و آں پیدا کردۂ عجم است۔"

(۵) وزن رباعی کہ آں را دوبیتی و ترانہ گویند اہل عجم از بحر ہزج برآوردہ اند۔" (مخزن الفوائد ص ۱۶۶ سنہ ۱۸۸۲ء مطبع احمدی بہار)

(۵ ب) "وزن ترانہ کے مخترع شعرائے عجم ہیں۔" (قواعد العروض از قدر بلگرامی)

(۶) "اور یہ رجحان کہ اس وزن میں مستقل شعرائے عجم ہیں اشعار عرب میں نہیں اور یہ وزن رباعی اشعار عرب میں نہ تھا۔"

(ص ۲۱ مقیاس الاشعار سنہ ۱۲۹۲ھ)

آگے بڑھ کر سید صاحب ارشاد کرتے ہیں " اور اس سے نادر تر دعوے یہ ہے کہ چہاربیتی کی اب کوئی مثال نہیں پائی جاتی۔ حالانکہ ایسی رباعیاں جن کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں عوفی کی لباب الالباب کے قدما کے حالات میں دس بارہ سے زیادہ ہیں "

مجھے افسوس ہے کہ سید صاحب میرا مطلب بالکل نہیں سمجھے اور نہ انھوں نے محقق طوسی کے بیان پر جو میرے دعوے کی سند ہے کافی غور کیا۔ جن چار مصرعوں والی رباعیوں کو سید صاحب چاربیتیاں کہتے ہیں وہ تو دوبیتیاں ہیں۔ کیونکہ دو مثمن شعروں کی شکل میں لکھی جاتی ہیں۔ بحالیکہ چاربیتی چار مربع شعروں کی صورت میں لکھی جاتی تھی جس طرح کہ میں نے تنقید شعر العجم میں سمجھانے کے واسطے ابوشکور کی رباعی کو لکھا ہے۔ یا جس طرح خود سید صاحب نے میری تنقید میں ص۲۲۲ پر رودکی کی مفروضہ رباعی کو اور صفحہ ۲۲۳ تا ۲۲۵ عربی رباعیوں کو نقل کیا ہے۔ یہ ہے صحیح شکل چہاربیتی کی۔ اور جب چاربیتیاں اس طرح لکھی ہوئی نہیں ملتیں تو میں نے کیا غلط کہا جب یہ کہا کہ قدیم چہاربیتی کے اصلی نمونے ہم تک نہیں پہنچے۔ چار قافیوں والی رباعیاں مصرّع[۵] دوبیتیاں ہیں جس طرح تین قافیوں والی حشوی رباعیاں ہیں۔

سید صاحب دعویٰ کرتے ہیں کہ چاروں مصرعوں میں قافیوں والی رباعیاں لباب الالباب میں قدما کے حالات میں دس بارہ سے زیادہ ہیں۔ میں نے بھی قدما کے ذکر ہی میں کہا تھا کہ سب سے قدیم رباعی مجھ کو ابوشکور بلخی کی

---

[۵] مصرّع بیتی را گویند کہ ہر دو مصراع قافیت نگاہ داشتہ آید چنانکہ ابیات سرہای قصیدہ بود و حشوی دو بیتی را گویند کہ مصراع سوم او را قافیت نباشد۔ (ص۵۵، حدائق السحر رشید الدین وطواط۔ مرتبۂ عباس اقبال)

یہ مسلّم ہے کہ میرے دعوے کا مدار ساتویں صدی کی معیار الاشعار پر ہے تو پھر میرا دعویٰ بے سند کیوں گردانا گیا۔ سیّد صاحب مجھ پر سخت ظلم کر رہے ہیں کہ معیار الاشعار جیسی کتاب کی سند کے باوجود میرے دعوے کو بے سند کہتے ہیں۔ میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ عروضی لٹریچر میں یہ تالیف آج بھی زبردست اہمیت کی مالک ہے۔ گزشتہ سات صدیوں میں جس قدر کتابیں اس فن پر لکھی گئی ہیں ان سب پر اس کتاب کی افادی وقعت و افضلیت مسلّم ہے۔ ہر عہد میں اہلِ عروض اس کو مستند سمجھتے رہے ہیں اور اس کے حوالے دیتے آئے ہیں۔ اس کی شرح تیار ہوئی ہے، ترجمہ کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ عروضی مسائل پر قولِ فیصل مانی جاتی ہے اور یہ فن سے ہماری بیگانگی کا ثبوت ہوگا اگر ہم اس تصنیف کو قرار واقعی عزّت نہ دیں۔

اس کے بعد سوال کیا ہے (کس عہد تک کے قدما) تمام تر چہار بیتی کہتے تھے جس کے چاروں مصرع ہم قافیہ ہوتے تھے، یہاں بیت کی جگہ مصرع لکھنا سید صاحب کا سہوِ قلم ہے۔ عہد کا تعین کرنا بڑا دشوار ہے۔ اتنا کہا جا سکتا ہے جب اصول مسمّطات کا عام رواج ہوگیا اور مربعات متروک ہوگئے۔ چہار بیتی کو بیرماد کہہ دیا گیا اور دو بیتی نے اس کی جگہ لے لی۔ میں قدما کے متعلق اس سے قبل کچھ اشارہ کر آیا ہوں۔ یہاں اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ ان قدما کا زمانہ بھی وہی ہے جو ان قدما کا ہے جن کا ذکر خود سید صاحب نے اپنی تالیف میں کیا ہے۔ جب فرمایا ہے —

(۱) "عوفی کی لباب الالباب کے قدما کے حالات میں وغیرہ (خیام ص۲۲۳ حاشیہ)

(۲) "یہ رباعی (چہار بیتی) کہنے والے قدمائے عرب کے شاعر تھے" الخ (خیام ص۲۲۲)

(۳) قدما کے کلام میں غزل و ترانہ کا لفظ ساتھ ساتھ آتا ہے" (خیام ص۲۲۷)

مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات۔ یعنی مضارع اخرب مکفوف مقصور جو رباعی کے وزن سے کوسوں دُور ہے۔

سید صاحب کی جلد بازی ملاحظہ ہو کہ حنظلہ کی اس مفروضہ رباعی کو دیکھ کر فوراً یہ نظریہ پیش کر دیا "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رباعی کی تاریخ رودکی بلکہ ابو دُلف اور ابن المعتز سے بھی پہلے شروع ہوتی ہے اور سامانی بلکہ صفاری کے بجائے طاہری دربار کو اس کی اولیت کا فخر پہنچتا ہے۔" (ص ۲۲۳ خیام)

اب جب یہ ثابت ہو گیا کہ حنظلہ کی رباعی سچی رباعی نہیں تو یہ اولیت کا فخر کس دربار کی طرف منتقل کیا جائے گا؟ سلیمان اعظم ارشاد فرمائیں۔

تنقید شعر العجم (ص ۲۹ اُردو) میں ایک موقعے پر میں نے فرخی کا ایک شعر بوطلب شاعر کی شہرت بحیثیت رباعی گو دکھانے کے لیے نقل کر دیا تھا۔ جو حسب ذیل تھا۔

ار دلآرامی و نغزی چون غزلہائے شہید   ور دلآویزی و خوبی چون ترانۂ بوطلب

اس کے تعلق میں سید صاحب ارشاد کرتے ہیں:۔

"پروفیسر شیرانی نے تنقید شعر العجم کے پہلے نمبر میں اس شعر کو کہیں سے نقل کیا ہے۔ مگر اپنے متن کا ماخذ نہیں بتایا ہے جو اسدی کے متن سے بہت کچھ مختلف ہے شیرانی صاحب لکھتے ہیں۔

ار دلآویزی و نغزی چون غزلہائے شہید   ور دلآویزی و خوبی چون ترانۂ بوطلب

لہٰذا ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب نے کسی متاخر ماخذ کو سامنے رکھا ہے جس نے فرخی کے قدیم الفاظ میں متاخرین کے محاوروں کے مطابق تصرف کر دیا ہے۔" (خیام ص ۲۲۹)

کسی شاعر کا شعر نقل کرتے وقت ہمارے ہاں یہی دستور رہا ہے کہ شعر

صمم

ملی ہے۔ لباب الالباب موجود ہے اور میں سید صاحب کو دعوت دیتا ہوں اگر وہ اس میں سے دس بارہ درکنار ایک رباعی بھی ابوشکور کے عہد سے قبل کی نکال کر بتا دیں گے۔ مگر دشواری یہ ہے کہ ہمارے محترم ہر چار مصرعوں کو عام اس سے کہ وہ رباعی کے وزن میں ہوں یا نہ ہوں رباعی کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ ایسی رباعیاں بے شک دس بارہ کیا درجنوں نکل آئیں گی، لیکن ادبی و عروضی نقطۂ نظر سے بلکہ رواجاً بھی رباعی وہی ہے جو بحر ہزج کے اخرب و اخرم شجروں کے چوبیس اوزان مقررہ میں سے ہو۔ مگر سید صاحب جو خیام کی رباعیوں پر مقدمہ لکھ رہے ہیں ابھی اس فروگذاشت کا مطلق احساس نہیں کرتے ایک موقعے پر رقم پرداز ہیں۔

"لباب الالباب عوفی میں حنظلہ بادغیسی کی حسب ذیل دو بیتیں ملتی ہیں جو رباعی کے وزن پر ہیں۔

یارم سپند اگرچہ بر آتش ہمی فگند — از بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند
او را سپند و آتش ناید ہمی بکار — با روی ہمچو آتش و با خال چو(ن)[۱] سپند"

(خیام ص ۲۳)

ان دو شعروں کو خود عوفی دو بیتی نہیں مانتا۔ چنانچہ اس نے "این دو بیت" (ص ۲/۲ لباب الالباب) لکھا تھا سید صاحب نے دو بیتیں تو عوفی کی تقلید میں لکھ دیا۔ لیکن الفاظ "جو رباعی کے وزن پر ہیں" اپنی طرف سے اضافہ کر دیے حالانکہ یہ شعر رباعی کے وزن پر ہرگز ہرگز نہیں۔ رباعی کے اوزان بحر ہزج سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ ابیات بحر مضارع میں واقع ہوتے ہیں۔ ان کا وزن ہے۔

---

۱ ملاوں میں 'نون' میرا اضافہ ہے۔ اس کے بغیر وزن غلط ہو جاتا ہے۔

فرخی کا مقولہ بالا شعر بھی ضرور ہے کہ اسی وزن میں ہو چنانچہ تقطیع -

از دلارا فاعلاتن، می ئےُ لعزی فاعلاتن، تو ن عرلبا فاعلاتن، لے سہید فاعلات
وز دلآوے فاعلاتن، ری ئےُ حوری فاعلاتن، چہ ترا با فاعلاتن، لو طلب فاعلن

یعنی وہی رمل مثمن مقصور یا محذوف، اب سیّد صاحب کے روایت کردہ شعر کی تقطیع ملاحظہ ہو -

ر دلا و ے فعلاتن، رئےُ تزری فعلاتن، ح عرلبا فعلاتن، ع سہید فعلات،
وز عمحا فاعلاتن، م ئےُ حوستی فعلاتن، چ ترا با فعلاتن، لو طلب فعلات،

اور وزن ہے بحر رمل مثمن مخبون مقصور - بالفاظ دیگر وزن ہی بدل گیا ہے یعنی سالم سے مخبون ہوگیا یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ حتویات تمام قصیدے میں جس کے پچاس سے زیادہ شعر ہیں سالم آئیں اور ایک شعر میں مخبون ہوجائیں - لہذا میں تو سید صاحب کے روایت کردہ شعر کو غلط اور بے سند کہوں گا -

قولہ - "عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ چوں کہ یہ چار مصرعوں سے مرکب ہوتی ہے اس لیے اس کو رباعی کہتے ہیں لیکن محمد بن قیس رازی نے رباعی کی ایجاد و پیدائیس کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اہل عرب اس کو رباعی اس لیے کہتے ہیں کہ بحر ہزج جس میں رباعی کہی جاتی ہے چار اجزا سے مرکب ہوتی ہے اور اس لیے اس وزن کا ایک مصرع عربی میں دو بحر کا ایک شعر ہوجاتا ہے اور اس طرح چار مصرعوں میں چار شعر ہوجاتے ہیں - رازی کے اس بیان کی تائید معیار الاشعار فارسی عروض کی ایک قدیم کتاب ۶۴۹ھ سے ہوتی ہے" ص ۲۲۳

اس موقعے پر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ محمد بن قیس کا کیا بیان ہے - وہ کہتا ہے -

"و مستعربہ آں را رباعی خواندند از بہر آنکہ بحر ہزج در اشعار عرب - مربع الاجزا

نقل کرنے سے قبل اس شاعر کا نام دے دیا جائے۔ چنانچہ میں نے بھی ایسا ہی کیا اور شاعر کا نام فرخی دے دیا۔ سید صاحب کو اعتراض ہے کہ اس شعر کو کہیں سے نقل کر دیا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ کہیں سے تو کیا نقل کیا ہوگا، شاعر کے دیوان ہی سے نقل کیا ہوگا اور دیوان سے بہتر ماخذ ہوگا بھی کیا۔ متاخرین کے محاوروں کے مطابق اگر کوئی تصرف ہوا تو خود سید اس کے ذمہ دار ہیں میرے ہاں جہاں پہلے مصرع میں 'دلآرامی' تھا سید صاحب نے اس کی جگہ 'دلآویزی' بنا دیا۔ یہ تصرف کیوں کیا گیا۔ مجھے معلوم نہیں۔ مگر یہ تصرف ہر حال میں صحیح نہیں۔ کیونکہ دونوں مصرعوں میں 'دلآویزی' مکرر ہو جاتا ہے۔

سید صاحب نے حسب روایت لغت فرس اس شعر کو یوں لکھا ہے ۔

زدلآویزی و تری چو غزلہائے شہید وزغم انجامی و خوشی چو ترانۂ بوطلب

میرا نقل کردہ شعر اگر اسدی کے متن سے نہیں ملتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے میرے لیے ضروری نہیں کہ فرخی کے شعر کے لیے اسدی کے لغت کی ورق گردانی کروں جس حال میں کہ دیوان موجود ہے اور چھپ چکا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جس شعر کو سید صاحب صحیح اور مستند سمجھ رہے ہیں۔ وہ یقیناً غلط ہے۔ اس غلطی کے دستے دار خواہ ہمارے سید ہوں یا پال ہورن لغت فرس کا مرتب یا خود اسدی لغت فرس کا مصنف۔ شعر ہذا کوئی تنہا شعر نہیں ہے بلکہ فرخی[1] کے قصیدے میں آتا ہے یہ قصیدہ بحر رمل مثمن محذوف میں ہے، جس کا وزن ہے فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن، اور مطلع ہے ۔

دوست دارم کودک سیمیں بر بیجادہ لب ہر کجا ریشان بکی بینی مرا آنجا طلب،

---

[1] دیوان فرخی مرتبہ عبد الرسولی، ۱۳۱۱ھ۔ مطبوعہ مجلس (ایران) ص ۶۱ و دیوان حکیم فرخی ص ۶۱ طبع بمبئی۔

قولہ - سوال یہ ہے کہ دو دو شعر کا اس طرح ایک ایک شعر ہوجانا آیا فارسی میں تھا اور اس لیے اس کو کبھی چہار بیتی کہتے تھے۔ یا عربی میں اور اس لیے اس کو رباعی کہتے تھے مؤلف معیار الاشعار نے صرف قدما یعنی پہلے لوگ لکھا ہے جس سے فارسی و عربی کی تخصیص نہیں نکلتی"۔

(خیام صلا ۲۲۲)

مؤلف معیار الاشعار کے بیانات تو ہمیشہ ٹھیک ٹھیک راست ملائم و کاست مبنی بر حقیقت ہوتے ہیں لیکن سید صاحب کی اس کتاب کے ساتھ عدم واقفیت نے بے تنگ انہیں غیر حقیقی الجھنوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ محقق طوسی کی یہ تالیف فارسی کے ساتھ ساتھ عربی عروض کی بھی جداگانہ توضیح کر رہی ہے چنانچہ دیباچے کی عبارت ہے -

"ایں مختصریست در علم عروض شعر تازی و فارسی کہ بالتماس بعضی دوستاں مرتب کردہ شد"۔

مصنف کا قاعدہ ہے کہ پہلے ہر بحر کے عربی ضوابط و اوزان و امثال بیان کرتا ہے اس کے بعد فارسی اوزان اور امثال دیتا ہے۔ سید صاحب اس کو محض فارسی عروض کی کتاب (صلا ۲۲ خیام) بیان کرتے ہیں - اسی لیے سید والا مرتبت کا یہ قول کہ" مولف معیار الاشعار نے صرف قدما یعنی پہلے لوگ لکھا ہے جس سے فارسی و عربی کی تخصیص نہیں نکلتی"۔ فاضل موصوف اس سے زیادہ اور کیا تخصیص کرتے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ الگ دکھا دیا ہے ہر بحر کے عربی اوزان میں انھوں نے رباعی کا مطلق ذکر نہیں کیا اور فارسی کے ذکر میں لکھا جس سے پڑھنے والے پر صاف روشن ہے کہ رباعی فارسی الاصل ہے اور عربی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں سید صاحب اس سے زیادہ اور کیا تخصیص چاہتے ہیں۔

آمدہ است۔ پس ہر بیت ازیں وزن دو بیت عربی باشد۔" (ص ۹ المعجم)

اس کا ترجمہ۔ اور عربی خواں اسے رباعی کہتے ہیں کیونکہ بحر ہزج عربی اشعار میں مربع الاجزا (مربع الارکان) آتی ہے پس ہر بیت اس وزن (رباعی فارسی) کا عربی کے دو بیت کے برابر ہوگا۔

رازی کا یہ بیان سید صاحب کے بیان سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا مدعا تو یہ ہے کہ چونکہ بحر ہزج عربی میں مربع الارکان آتی ہے اس لیے اس کا نام رباعی رکھ دیا۔

لیکن میں یہ توجیہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ چونکہ ہزج عربی میں مربع الارکان آتی ہے۔ اس بنا پر اس کو رباعی کہنے لگے۔ ہزج دائرے میں مسدس ہے۔ اگرچہ عربی شاعری میں مجزو ہے۔ دوسرے عربی میں ایک یہی بحر نو نہیں ہے جو مربع آتی ہے بلکہ عربی میں تو اکثر بحریں مربع استعمال ہوتی ہیں پھر ہزج کی کیا خصوصیت رہی۔ اس کے علاوہ رباعی کی ابتدا فارسی سے ہوتی ہے نہ عربی سے۔ اس لیے اس کا نام رباعی رکھنے میں عربی خوانوں نے چار بیتی کی تقلید کی ہے۔

محقق طوسی کی تالیف معیار الاشعار سید صاحب کے خیال کی تائید نہیں کرتی اس میں مذکور ہے۔

"ترانہ را قدما چار بیتی می گرفتند و آن را چہار بیتی خواندہ و تازی رباعی"۔

یعنی قدما کے نزدیک رباعی چار بیتوں پر شامل تھی۔ اس لیے اس کا نام چہار بیتی رکھ دیا اور عربی میں رباعی۔ لہذا سید صاحب کا یہ بیان کہ رباعی کا نام رباعی چار مصرعوں کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ چار مصرعوں کے چار شعر ہونے کی وجہ سے بالکل بے بنیاد ہے۔ صحیح وہی ہے جو محقق طوسی کے بیان سے مستنبط ہوتا ہے کہ ایرانیوں نے اس کا نام چہار بیتی رکھا اور عربی والوں نے تقلیداً رباعی کہا

ورں میں اشعار نہیں لکھے۔ البتہ عہد حاضر کے ارباب ذوق نے اس کی طرف اقدام کیا ہی۔ چنانچہ عربی رباعیاں تمام ممالک عرب میں رائج اور مشتہر ہوگئیں۔ ایسے صاف اور صریح بیان کے باوجود سید صاحب کس طرح یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ یہ رباعی گو قدماء عربی کے شاعر تھے۔

شمس قیس کا دوسرا بیان یہ ہی

" وتحقیقت ہیچ وزن ازاوزان مبتدع واشعار مخترع کہ بعد از خلیل احداث کردہ اند بدل نزدیک تر و در طبع آویزندہ تر ازیں نیست۔ (صـ۹ـ المعجم)

یہ بیان بھی سید صاحب کے دعوے کے خلاف ہی۔

شمس قیس کا تیسرا بیان رباعی کی ایجاد شاعر مشہور رودکی کی طرف منسوب کرتا ہی۔ جو ان الفاظ سے شروع ہوتا ہی:۔

"ویکی از متقدماں شعرائے عجم و پندارم رودکی واللہ اعلم از نوع احرم واخرب این بحر وزنی تخریج کردہ است کہ آں را وزن رباعی خوانند" (صـ۸۸ـ المعجم)

جب رباعی کی ایجاد بروایت شمس قیس رودکی کی طرف منسوب ہی تو پھر ہمارے سید محترم کس طرح قدماء عربی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اور لطف یہ ہی کہ خود محمدؐ ابن قیس کو اپنے اس دعوے کا مدار علیہ قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ محمدؐ ابن قیس رازی نے تصریح کی ہی کہ یہ رباعی (چہار بیتی) کہنے والے قدماء عربی کے شاعر تھے اگر رازی نے کوئی ایسی تصریح کی تھی تو سید صاحب کو چاہیے تھا کہ اس کی اصل عبارت نقل کر دیتے۔

عربی کی طرح فارسی اہل عروض بھی ایک لفظ کے ٹکڑوں کو توڑ کر کبھی دو مصرعوں میں بانٹتے تھے اس سے میں سمجھتا ہوں سید صاحب کا مطلب اشعار متقدمہ سے ہی۔ ایسے اشعار عربی کی تقلید میں قدماء فارسی میں رائج تھے زیادہ تر

قول ۔ مگر محمد اس ہیں رازی نے تصریح کی ہے کہ یہ رباعی (بہار بیتی) کہنے والے
قدماء عربی کے شاعر تھے۔ کیونکہ اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ عربی کی طرح دارئی
اہل عروض بھی ایک لفظ کے حرفوں کو توڑ کر کبھی دو مصرعوں میں بانٹتے
تھے۔" (ص ۲۲۲ خیام)

عروض کے میدان میں یوں تو کئی چیزیں عجمیوں کی دماغی پیداوار اور ذہنی یادگار کی حیثیت سے شمار کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً بحور قریب و جدید و مشاکل نیز ان کی نو ایجاد الٹی بحریں جو دوائر معکسہ و معلقہ و معطلہ سے تعلق رکھتی ہیں لیکن ان کی افادی وقعت قابل ذکر نہیں ۔ لے دے کر کوئی کام کی چیز جو ایرانی اضافے کے طور سے تسلیم کی جاسکتی ہے مثنوی اور رباعی ہے مگر دیکھا جاتا ہے کہ ہمارے سید والاشان نے ایک جنبش قلم رباعی کی ایجاد کی عزت سے انھیں محروم کر دیا۔ اور یہ ارشاد کر دیا کہ رباعی کہنے والے قدماء عربی کے شاعر تھے۔ خوش قسمتی سے سید صاحب اس عقیدے میں بالکل تنہا ہیں حتیٰ کہ محمد ابن قیس بھی جس کی مثبتہ تصریح پر سید صاحب یہ رائے قائم کرتے ہیں اس کے بالکل برخلاف ہے۔ ذیل میں مصنف موصوف کے تین مختلف بیان جن میں سے ہر ایک سید صاحب کے مزعومہ دعوے کے مخالف ہے۔ نقل کیے جاتے ہیں ۔

"لیکن بحکم آنکہ زحافی کہ دریں وزن مستعمل است در اشعار عرب نبودہ است در قدیم ترین وزن شعر تازی نگفتہ اند جاکنون محدثان از راہ طبع بر آں اقبالی تمام کردہ اند و رباعیات تازی در ہمہ بلاد عرب شائع و متداول گشتہ است۔"

(ص ۹ المعجم فی معاییر اشعار العجم)

اس کا ترجمہ ۔ لیکن چونکہ ایسے زحاف جو اس وزن (رباعی) میں استعمال ہوتے ہیں ۔ اشعار عرب میں نہیں آتے ۔ عہد قدیم میں تازی گویوں سے اس

یعنی میم ضمیر متکلم شامل مصرع دوم ہے۔

مثال دیگر — ہر کہ ببر خواند ترا   از مردمی ہست او بری

اس شعر میں "از" بغرض تقطیع شامل مصرع اوّل ہے

مثال شعر مثلث — ؎ نو شد جہان زین نو بہار و سال نو

یہ تین رکن کا پورا شعر ہے جس کا نصف میں نہیں۔ عربی تقلید میں بدیع بلخی نے یہ قصیدہ لکھا تھا۔

قول:- چوتھی یا پانچویں صدی کے شعرائے فارسی پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں کے ساتھ تیسرے کو بھی اکثر ہم قافیہ لایا کرتے تھے مگر اس کا قطعی لزوم ان کے ہاں بھی نہ تھا چنانچہ رودکی، فردوسی، عنصری وغیرہ کی رباعیوں میں کبھی تیسرے مصرع میں قافیہ ہے اور کبھی نہیں ہے۔"

اس بارے میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال فارسی پروفیسر پنجاب یونیورسٹی کی رائے میرے خیال میں زیادہ وزنی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک رباعی جتنی زیادہ قدیم ہوگی گمان غالب ہے کہ وہ مصرّع ہوگی۔ جس قدر متأخر ہوگی اسی قدر خصی ہوگی۔ میں غیر خصی کو مصرّع اور خصی کو غیر مصرّع کہوں گا۔ چوتھی اور پانچویں صدی میں بالعموم مصرّع رباعیاں رائج تھیں مثلاً شعرائے عہد غزنہ کے دواوین میں سے عنصری کی ۳۶ رباعیوں میں سے ۳۴۔ فرخی کی ۲۷ میں سے ۲۶ ناصر خسرو کے ہاں ایک میں سے ایک۔ ابوالفرج رونی کے ہاں [illegible] میں سے [illegible] قطران تبریزی کے ہاں ۱۵ میں سے گیارہ۔ اور مسعود سعد سلمان کے ہاں ۲۲۰ میں سے ۲۱۹ رباعیاں مصرّع ہیں۔ اس سے ہم یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ چوتھی اور پانچویں صدی میں مصرّع رباعیاں کہنے کا دستور لزوم کی حد تک عام تھا۔ ان میں غیر مصرّع رباعیوں کا تمول حالی از اعتنا نہیں۔ جلد دوم لباب الالباب میں شعرا سے

انہی ایام میں جب شعرگوئی کا مدار اکثر و بیشتر مربعات پر تھا۔ اشعار معقّد میں مصرع اول مصرع دوم سے لفظاً و معناً وابستہ ہوتا ہے۔ ہر مصرع مرکب غیر مفید کا حکم رکھتا ہے جب تک دوسرا مصرع ساتھ نہ پڑھا جائے بات نا تمام رہتی ہے۔ اس لیے کئی موقعوں پر ضروری ہے کہ دونوں مصرعوں کو ساتھ ملا کر مثل ایک مصرع متمم کے پڑھیں۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار معقّد ہیں جو فارسی میں اصول متممات کی دریافت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ جب متممات کی دریافت نے فارسی عروض میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اور ان مربع کا رواج متروک ہو گیا ان کے ساتھ ہی اشعار معقّد بھی جو مثنیٰ و مربع و مثلث ہوتے تھے غائب ہو گئے۔ محقق طوسی نے ان کی بعض مثالیں اپنی تالیف میں محفوظ رکھی ہیں جن میں سے کچھ اس سے پیشتر اسی مضمون میں نقل ہو چکی ہیں بعض یہاں درج کی جاتی ہیں۔

مثال بحر مربع سالم۔

بیار آں مے کہ پنداری   رواں یاقوت نابستے
و یا چوں برکشیدہ تیغ   پیش آفتاب استے

آخری شعر میں تیغ کا 'یں' وزن کی رو سے دوسرے مصرع میں شامل ہے رودکی کا یہ قطعہ بالعموم مثمن شکل میں لکھا جاتا ہے جس سے تمام قطعہ مصرّع ہو گیا ہے حتیٰ کہ حدائق السحر میں بھی اس کو مثمن ہی درج کیا ہے۔ لیکن محقق طوسی نے مذکورۂ بالا شعر مربع کی مثال میں نقل کیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطعہ اصل میں مربع تھا۔ اور متممات کے رواج کے بعد اس کو بھی مثمن بنا لیا گیا۔

مثال دیگر۔ رہ شادیم   پستی

یہ دو رکنی شعر ہے جس کی تقطیع ہے رہ شادی فعلاتن، م پستی فعلاتن،

وزن رباعی میں ہے غیر مصرع ہے جو شعر ۱ پر شبلی کی تشریح میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ ۔

ترسم کاں دہم تیر حیرت دوری　　دہم ہمہ ہدواں بسوز دلسوں

یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ شعر کسی رباعی سے لیا گیا ہے بلکہ فردیات سے تعلق رکھتا ہے اور اس رباعی میں مفرد اشعار بھی لکھے جاتے رہے ہیں۔ میں ایک مثال رودکی کے ہاں سے دیتا ہوں ۔

اندر غم ریحان ستان کر چو توئے　　جان شد وار حال تو شرم داشت[1]

گلستان سعدی میں ایسے فردیات کی مثالیں بکثرت موجود ہیں ۔

علیٰ ہذا دمیۃ القصر میں باخرزی نے جو عربی اور فارسی رباعیاں درج کی ہیں تمام و کمال مصرع ہیں۔ ملاحظہ ہوں صفحات ص۱۷۴ ۔ ص۱۵۸ ، ص۲۰۲ ، ص۲۶۱ ص۲۶۹ ۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ رودکی و فردوسی و عنصری وغیرہم کے ہاں غیر مصرع رباعیوں کا موجود ہونا اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ وہ ان شعرا کی اصلی رباعیاں نہیں بلکہ متاخرین نے سہواً ان کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ رودکی کی جس قدر رباعیاں سعید صاحب نے نقل کی ہیں یقیناً مشتبہ ہیں اور یہ انھیں خود بھی تسلیم ہے۔ اسی قسم کی ایک رباعی شمس قیس نے المعجم میں حسب ذیل دی ہے ۔

واجب بود کس بر افضال و کرم　　واجب باشد ہر آئینہ شکر نعم
تقصیر نہ کرد خواجہ در ناواجب　　من در واجب چگونہ تقصیر کنم

(المعجم ص۲۳۳)

---

[1] احوال و اشعار ابو عبد اللہ جعفر بن محمد رودکی جلد دوم ص۹۳۲ از سعید نفیسی طہران سنہ ۱۳۱۰ھ۔

فرخی نے ایک قصیدہ وزن رباعی میں لکھا ہے۔ اس کا پہلا مصرع ہے ع سڑی گرسنہ ماہ داد ہر سر

آل سامان وشعرائے آل ناصر کی رباعیاں جو تفصیل ذیل ہیں سب کی سب بلا استثنا مصرع ہیں۔ چنانچہ --

ابوشکور بلخی، یک۔ ص۲۱۔ عنصری، یک ص۳۲۔ ابوعبداللہ محمد المعروف بروزبہ البلخی کے ہاں پانچ مختلف مصرع شعر بوزن رباعی ص۴۲۔ فرخی، ۴ ص۵۔ ابوعبداللہ عبدالرحمٰن بن محمد العطاردی، ۲ ص۵۷، ابوالحرث حمد بن محمد الحقوری الہروی، یک ص۴۱۔ ابوالمنصور عبدالرشید بن احمد بن ابی یوسف الہروی، یک، ص۶۱۔ مسعود الرازی، یک ص۶۳۔ ناصر لغوی، یک، ص۶۶۔ یہ رباعی سنہ ۴۲۱ھ میں امیر محمد بن محمود کے قید کیے جانے کے موقعے پر لکھی گئی ہی۔ محسن قرذیبی، یک، ص۶۷۔ بن احمد البدری الغزنوی، یک ص۶۷۔

لغت فرس میں تین رباعیاں میری نظر سے گزریں اور تینوں مصرع ہیں پہلی لست کی شرح میں ص۴۶ پر لبیبی کی۔ دوسری 'روستیدن' کی تشریح میں ص۵۲ پر عسجدیؔ کی۔ اور تیسری ابوالموید کی 'ملک' کی تشریح میں جو حسب ذیل ہی

صفرای مرا سود ندارد ملکا در دسر من کجاست با سد علکا
سوگند خورم بہر چہ ہستم ملکا کز عشق تو بگداختہ ام چون کلکا (ص۶۸)

لغت فرس میں تو یہ رباعی سب سے قدیم پائی جاسکتی ہی۔

رباعی کے وزن پر بعض شعر بھی اسی فرہنگ میں ملتے ہیں۔ مثلاً 'شعارہ' کے ذکر میں ص۳۷ پر عمارہ کا شعر مصرع اور ص۳۹ پر 'حیز' کے بیان میں ابوالفتح بستی کا مصرع بیت۔

ہر چند کہ درویش بسر فرو باید در چشم توانگران ہمہ حیز آید

اور ص۵۵ پر 'بالہ' کے ذکر میں عمارہ کا شعر۔ لیکن دقیقی کا ایک شعر جو اگرچہ

ذکر کیا ہے کہ "میں نے اس سے پہلے اس طریقے پر رباعی نہیں سنی تھی" "لم اکن سمعت هذه الطريقة" یہاں تک کہ میرے والد نے ابو العباس ماحوزی کی چند رباعیاں اسی طرز کی سنائیں"

(ص ۲۲۴ خیام)

"لم اکن سمعت هذه الطريقة" کا ترجمہ سید محترم نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ "میں نے اس سے پہلے اس طریقے پر رباعی نہیں سنی تھی"۔ لیکن یہ ترجمہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ عربی عبارت میں رباعی کا لفظ مذکور نہیں۔ میرے نزدیک اس کا ترجمہ یوں ہونا چاہیے کہ "میں نے اب تک اس قسم کی نظم نہیں سنی تھی"۔ اور مصنف کا مقصد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لیے عربی میں رباعی سننے کا عمر میں یہ پہلا موقع تھا جب اس کے والد نے ابو العباس ماحوزی کی اس طرح کی رباعیاں سنائیں۔ ماحوزی کی عبارت ہے۔

"ولم اکن سمعت هذه الطريقة حتى انشدني والدي لابي العباس الماحوزي رباعيات على هذا النمط"۔ (ص ۱۲۴)

اگر میرا یہ اختلافی ترجمہ قابل قبول ہے تو ظاہر ہے کہ رباعی کا تعارف اگرچہ عربی میں ہو چکا تھا مگر اس کا علم خواص تک محدود تھا اور عام رواج میں نہیں آئی تھی کیونکہ ماحوزی جیسا فاضل شخص اس کے وجود سے بے خبر تھا۔ ماحوزی کا یہ بیان بجائے سید صاحب کی تائید کے ان کے اس قول کی کہ "رباعی کہنے والے مدار عربی کے شاعر ہیں" واضح تردید کرتا ہے۔ بلکہ دمیۃ القصر میں اور موقعوں پر بھی فارسی کے ساتھ رباعی کے مربوط ہونے کی نسبت اشارے موجود ہیں۔ چنانچہ ابو النصر تمیم بن احمد العرلوی کے حالات میں مذکور ہے۔ "والغالب علیہ لسان العجم و رباعیۃ" ص ۱۲۸ ٥

مگر یہ رباعی غیر مصرّع ہونے کے علاوہ پچاس فیصدی عربی الفاظ پر شامل ہے جو یقیناً رودکی کے عہد کی زبان نہیں۔ جلد دوم احوال و اشعار رودکی میں سعید نفیسی نے رودکی کی ہجویات کی مثال میں یہ رباعی نقل کی ہے۔ جو شبہ سے خالی نہیں ۔

آں خر پدرت بدشت خاشاک زدی | مامات دف دو روی چالاک زدی
آں بر سر گور با تبارک خواندی | ویں بر در خانہا تبوراک زدی

۳۵۲ھ میں امیر ابوجعفر والی سیستان کی وفات پر صالح ملجی یہ رباعی لکھتا ہے

جان غم تو نیست شده ویراں باد | جان طرب تو ہمیشہ آباداں باد
ہموارہ سر کار تو با یکاں باد | تو میر شہید و دشمنت ماکاں باد[1]

قولہ ۔ "عربی کی رباعیوں میں چاروں مصرعوں کا ہم قافیہ لانا اس لیے ضروری تھا کہ اس کا ہر مصرع شعر ہوتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ بعض جدت پسندوں نے قافیہ کے ساتھ ردیف کی بھی شرط کر لی تھی" (ص ۲۲۳ خیام)

رباعی کے معاملے میں عربی والے ہمیشہ فارسی کے مقلد رہے اس لیے جب رباعی چار شعروں کی صورت میں لکھی جاتی تھی۔ یا جب دو شعروں کی صورت میں مرقوم ہوتی تھی، عربی خواں ہر حال میں تقلید شعرائے فارسی کرتے رہے ہیں یہی کیفیت ردیف کی ہے جو فارسی الاصل ہے اور عربی والوں نے تقلیداً اختیار کر لی ہے۔ محقق طوسی کتاب معیار الاشعار میں رقمطراز ہیں ۔

"ردیف در اصل خاص بود بزبان پارسی و متاخران شعرائے عرب از پارسی گویان فرا گرفتہ اند و بکار می دارند" (معیار الاشعار در میزان الافکار ۱۲۶۲ھ مطبع علوی)

قولہ ۔ ابوالحسن باخرزی المتوفی ۴۶۷ھ نے اپنی کتاب دمیۃ القصر میں

---

[1] ص ۳۲۳ تاریخ سیستان تالیف در حدود ۴۴۵ ـ ۷۲۵، تصحیح ملک الشعراء بہار۔ طہران ۱۳۱۴ شمسی۔

اوزان رباعی کہلاتے ہیں اور رباعی کا اطلاق انہی اوزان پر محدود ہے۔ عمارہ مروزی کے اشعار بحر مضارع میں ہیں۔ ان کی تقطیع ہے :-

اا مرت مفعولُ ، دست اا ءُ فاعلاتُ ، ست سیمیں مفاعیلُ ، من نگر فاعلن ، گوئی ک مفعولُ ، اا فتاب فاعلاتُ ، ب یبوست مفاعیلُ ، ماقمر فاعلن ، اوزون مضارع مثمن مکفوف و محذوف ہے۔

رباعی کے مختلف ناموں کے ذکر میں ہمارے سید والا شان قابوس نامہ عنصر المعالی امیر کیکاؤس سے مثالیں دے کر غزل و ترانہ کو ایک ہی اصطلاح منوانے کی کوشش میں مصروف ہیں چنانچہ

قولہ — "تاسی ویحیم اندرآئین ورسم شاعری" میں مختلف اصناف سخن کے سلسلے میں "غزل و ترانہ" کہا ہے "اگر غزل و ترانہ گوئی سہل و لطیف تر گوئی و بمعانی معروف گوئی"۔ پھر آگے چل کر ہے۔ "وغزل و ترانہ رو آبدار گوئی"

(ص ۱۴۴ مئی)

ع یہ ایسی دھری ہے کہ اٹھائی نہیں جاتی — میں کسی حالت میں بھی سید صاحب کے ساتھ اتفاق نہیں کر سکتا کہ امیر کیکاؤس نے ان فقروں میں غزل کو ترانے کا مرادف سمجھا ہے۔ غزل و ترانہ میں خلط کر دینا اور یہ سمجھنا کہ چونکہ دونوں معطوف و معطوف علیہ ہیں۔ اس لیے معنوں میں مشترک ہیں صریح مسلمات سے انکار کرنا ہے۔ غزل و ترانہ سے عنصر المعالی کی مراد یہی مشہور دو اقسام نظم ہیں جو غزل اور رباعی کے نام سے یاد کی جاتی ہیں۔ یہاں سید صاحب ایک شدید قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اسی سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں —

قولہ "محمد بن قیس رازی نے معجم (۶۱۴ھ سنہ ۶۲ھ) میں دو بار رباعی

محاسن ابی نصر کے ذکر میں مرقوم ہے۔ "وله رباعیات فی الفارسیة رفیقه و اختراعات فیها دقیقة" ص ۲۶۵ اسی طرح صفحات ۲۲، ۱۶۱ و ۲۶۲، ۲۶۵ و ۲۹۶ پر فارسی کی متعدد رباعیاں اور ان کے عربی ترجمے منقول ہیں۔

اس کے بعد فاضل سید دمیتہ القصر سے عربی کی پانچ مصرع رباعیاں نقل کرکے فرماتے ہیں ۔

"آپ دیکھیں کہ ان سب رباعیات کے چاروں مصرعوں میں قافیے ہیں، حالانکہ اسی عہد کی بلکہ اس سے پیشتر کی فارسی رباعیوں میں اس کی پابندی مطلق نہیں ہے۔ عمارہ مروزی جو چوتھی صدی کے اواسط میں تھا، کہ اس نے سامانی و غزنوی دونوں درباروں میں رسوخ پایا تھا، کہتا ہے ۔

آں می بدست آں بت سیمیں بین نگر ۔۔۔ گوئی کہ آفتاب برید ست ماہ بر
واں ساغری کہ سادہ سعگندری برد ۔۔۔ رنگ گل سپید است گوئی ملالہ بر

تیسرا مصرع قافیے سے خالی ہے۔" (ص ۲۲۵ خیام)

چاروں مصرعوں میں قافیہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس عہد میں تقلید چہار بیتی دو بیتی یا مصرع رباعیاں کہنے کا دستور تھا۔ فارسی شعرا بھی ایسی دو بیتیوں میں چار قافیے ہی لاتے تھے جیسا کہ اس سے قبل گزارش ہو چکا ہے۔ سید صاحب کے ذہن میں جو تین قافیوں والی غیر مصرع رباعیاں ہیں وہ درحقیقت زمانہ مابعد کی پیداوار ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اوزان غیر رباعی کو اوزان رباعی کے ساتھ خلط ملط کر رہے ہیں۔ چنانچہ عمارہ مروزی کے تین قافیوں والے اشعار بالا کو رباعی تصور کر رہے ہیں۔ حالانکہ رباعی کو ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اصل میں بحر ہزج کے مارہ اخرب اور مارہ اخرم اوزان جن کی میزان چوبیں ہوتی ہے،

ائی ہیں (اس کے بعد بطور جملۂ معترضہ کہتے ہیں) اور دستور یوں چلا
س جنس (لحنوں) سے جو کچھ عربی اشعار میں بٹھایا جائے، اسے قول
۔ گویا مصنف کے نزدیک قول اس راگ یا سرود کا نام ہے جو عربی
ں بٹھایا جاتا ہے۔ اس بارے میں اہل لغت بھی مصنف کے ساتھ متفق
، کے نزدیک قول ایسا سرود ہے جس میں عربی عبارت شامل ہوتی ہے۔
صطلاح موسیقیاں نوعے از سرود کہ دراں عبارت عربی نیز داخل
اسی لیے قول گانے والا قوال کہلاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قول
، مصنف کے نزدیک ترانہ یا رباعی سے بالکل مختلف چیز ہے۔
آگے شمس قیس کا بیان ہے کہ جو "لحین فارسی مقطعات یعنی اشعار
ئی جائیں انھیں غزل کہتے ہیں"۔ اس سے مطابق شعرا کی غزل نہیں بلکہ
ی۔ اس جملے میں مقطعات کی اصطلاح تشریح طلب ہے فارسی لغات
ہے "مقطعات شعرہائے سک دریں و اشعار بحر رجز"۔ اس جاسے کے
ے کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ فارسی کے سک اور ان اشعار میں
ا ہے اُسے غزل کہتے ہیں شیخ بہار الدین برناوی متوفی ۱۰۳۸ھ جو موسیقی
خسرو کے بعد امام فن کا رتبہ رکھتے ہیں۔ غزل کی تشریح یوں کرتے ہیں
ہ قسم ہے جس میں ایک غزل یا اس کے انتخابی ابیات سادہ راگ اور
ں بغیر تا بالی کے باندھ دیں۔ اس قسم میں پردۂ ولایتی ملوس کر دیتے ہیں
ں اقسام میں نہیں لاتے۔ اس کو جکری اور تشبیہ سے زیادہ مشابہت
صـ۲۲ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۲۷ء)۔
اس کے بعد مصنف ممدوح کہتے ہیں کہ "اہل دانش نے اس ذرن
زن رباعی کی لحنوں کا نام ترانہ رکھا ہے۔ جسے بمناسبت شعر فارسی دو

فرق سے اس کے (یعنی رباعی کے) حسب ذیل نام بتائے ہیں ۔

قول ہر چہ ازاں جنس بر ابیات تازی (عربی) سازند آنرا قول گویند

غزل - و ہر چہ بر مقطعات پارسی باشد آنرا غزل خوانند۔

ترانہ :- اہل دانش ملحونات این وزن را ترانہ نام کردند۔

دوبیتی - و شعر مجرد آنرا دوبیتی خوانند برائے آنکہ بنای آن بر دو بیت بیش نیست۔

رباعی - و مستعمرہ آن را رباعی خوانند از بہر آنکہ بحر ہزج در اشعار عرب مربع الاجزا آمدہ است، پس ہر بیت از این وزن دو بیت عربی باشد۔ (صفحہ ۹)

قدما کے کلام میں غزل و ترانہ کا لفظ ساتھ ساتھ آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد تک غزل کی موجودہ اصطلاح پختہ نہیں ہوئی تھی (بحوالہ خیام)

سید صاحب قول و غزل و ترانہ کو مرادف شمار کر رہے ہیں۔ حالانکہ ایسی غلط فہمی نہ قدما میں تھی نہ متاخرین میں۔ یہ اصطلاحیں ہمیشہ جدا جدا مانی گئی ہیں، مانی جاتی ہیں اور مانی جاتی رہیں گی۔ ہمیں یقین ہے کہ سید والا مناقب کو ایک شخص بھی ان کی رائے کا مؤید نہیں ملے گا۔ اسی طرح میرے مخدوم شمس قیس کا اصل مطلب سمجھنے میں قاصر رہے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ان اصطلاحات میں شمس قیس نے جدا جدا فرق سے رباعی کے نام دیے ہیں۔ حالانکہ شمس قیس کی مُراد بالکل مختلف ہے۔ مصنف موصوف رباعی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۔

درحقیقت ان تمام نو ایجاد اوزان میں سے جو خلیل کے بعد ایجاد ہوئے ہیں کوئی وزن وزنِ رباعی سے زیادہ دل آویز اور مرغوب طبع عوام نہیں کیونکہ موسیقی کے فن کاروں نے اس وزن میں بعض بعض لحنیں اور لطیف لطیف

لب رباعی گوئی کی نسبت جس کا ذکر فرخی کے مسبوق الذکر شعر میں آتا ہے۔
ب رقمطراز ہیں :-

دطلب نام کسی شاعر کا بیانہم کو نہیں چلتا فرخی جس کا یہ شعر ہے اس
ے ۴۲۹ھ میں وفات پائی ہے۔ اس لیے ابوطلب ترانہ گو کا زمانہ اس
سے تو بہرحال پہلے تھا۔ ایک خیال ہوتا ہے کہ ابوطلب ابودُلف تو نہیں
ر یہ امر سراپا محض طلب ہے اور اگر یہ صحیح ہو تو ترانہ گوئی کا زمانہ تیسری
مدی ہجری کے اوائل میں پہنچ جائے گا۔" (ص ۲۲۹ خیام)

ں اللہ ابھی تحقیقات شروع بھی نہیں ہوئی لیکن سید والا مرتبت
ی یہ حکم لگا دیا کہ "اگر یہ صحیح ہو تو ترانہ گوئی کا زمانہ تیسری صدی میں پہنچ جائے
گر یہ غلط ثابت ہوا تو پھر کون سی صدی میں پہنچ جائے گا؟ یہاں ہم سید
ں تحقیقات سے اعراض کر کے اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ جیسا اس سے
ہو چکا ہے شعر بالا جس میں ابوطلب کا نام مذکور ہے۔ فرخی کے۔ مائیہ قصیدے
رکھتا ہے جس میں "بے" ردی، اور قافیہ عصب۔ رجب۔ عجب۔ ادب
یرہ ہے۔ ان مراتب کو جانتے ہوئے بوطلب کی جگہ بودُلف کو قبول
ں جس کے سید صاحب محرک ہیں ہمیں بے شمار مشکلات سے سابقہ
لیونکہ نہ صرف بوطلب کو بودلف میں تبدیل کرنا کفایت کرے گا بلکہ
، کے تمام قافیوں کی "بے" کو جن کی تعداد پچاس ہے "فے" کے ساتھ
ا پڑے گا جس سے نہایت مضحک صورت حال پیدا ہو جائے گی۔
معاملہ پیش آئے گا جو سعدی کے مصرع ع شاید کہ پلنگ خفتہ باشد"
ھے سے پیش آیا تھا۔ یعنی اس کے پہلے شعر سے

تا مرد سخن نگفتہ باشد عیبش ہنرش نہفتہ باشد

بیتی کہتے ہیں اور عربی خواں رباعی" بالفاظ دیگر رباعی بحیثیت اصطلاح موسیقی ترانہ کہلاتی ہے۔ باعتبار شعر دو بیتی اور عربی خوانوں میں رباعی کہلاتی ہے۔ اس سے پیشتر مصنف نے قول۔ غزل اور ترانے کا فرق موسیقی کے اعتبار سے دکھایا تھا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے کے مرادف ہیں۔ اس کا ثبوت ہمارے پاس یہ ہے کہ شمس قیس نے اپنی اسی تصنیف میں کسی دوسرے مقام پر غزل و رباعی کی جنھیں سید صاحب ایک سمجھ رہے ہیں جدا جدا صراحت کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف مذکور کے نزدیک غزل و رباعی نظم کی دو مختلف اقسام ہیں۔ غزل کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"غزل در اصل لغت حدیث زنان و صفت عشقبازی با ایشان و تہالک در دوستی ایشان است و مغازلت عشقبازی و ملاعبت است با زنان و بیشتر شعرائے مطلق ذکر جمال معشوق و وصف احوال عشق و تصابی را غزل خوانند و بحکم آنکہ مقصود از غزل ترویح خاطر و خوش آمد نفس است باید کہ بنائے آن بر وزنے خوش مطبوع و الفاظی عذب سلس و معانی رائق مروق نہند و در نظم آن از کلمات مستکرہ و سخنانِ خشن محترز باشد" (ص ۳۸۷ المعجم)

اور رباعی کے متعلق کہتے ہیں :۔

"ہمچنین رباعی کہ بیتی از ین در قسم عروض شرح آن گفتہ آمدہ است بحکم آنکہ بناء آن بر دو بیت بیش نیست باید کہ ترکیب اجزاء آن درست و قوافی متمکن و الفاظ عذب و معانی لطیف باشد و از کلمات حشو و تجنیسات متکرر و تقدیم و تاخیرات ناخوش خالی بود و اگر با آن چیزے از صناعات مستحسن و مستبدعات مطبوع چون مطابقۂ لطیف و تشبیہی درست و استعارتی لطیف و تقابلی موزون و ایہامی شیرین یار بود نیکوتر آید" (ص ۳۸۸ المعجم)

علی سنہ ۲۲۶ھ میں وفات پاکر بروئے تناسخ دوبارہ جنم لے کر یعقوب بن لیث کے دربار میں بحیثیت شاعر نمودار ہوتا ہے اگرچہ مولانا ابو دلف کو یعقوب صفار سے اقدم بھی مان رہے ہیں۔ ایک لطف یہ ہے کہ جب جناب سیّد کو دولت شاہ کا مقتبسہ ابن الکعب نہ مل سکا تو بنت الکعب پر قناعت کر لی جس کا زمانہ عہد آل عرب بیان کرتے ہیں۔

سید صاحب کا خیال ہے کہ رودکی کے زمانے میں غزنی کوئی آباد شہر نہ تھا اسی بنا پر شمس قیس کا روایت کردہ قصہ جو رباعی کی ایجاد پر روشنی ڈالتا ہے اور جس میں رودکی شاعر غزنین کے مرغزار میں عید کے روز سیر و گشت میں مصروف دکھایا گیا ہے۔ ان کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ کیونکہ جب شہر ہی آباد نہ تھا تو شاعر وہاں کیوں جاتا (دیکھو ص ۲۳ خیام)

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ غزنین قدیم شہروں میں سے ہے۔ بروایت تاریخ کامل عبدالرحمٰن بن سمرہ بخلافت حضرت عثمانؓ غزنین کو فتح کرتا ہے۔ (ج ۳ ص ۵) تاریخ سیستان میں مذکور ہے "و غزنین یعقوب بن اللیث ملک الدنیا کرد"[1] (ص ۲۲۳) سنہ ۲۸۶ھ کے قریب یعقوب کے بھائی عمرو لیث کے زمانے میں ناصر ہندی و الیاس ہندی متحد ہو کر غزنین پر چڑھ آتے ہیں اور عمرو کے عامل بردعالی کو شکست دیتے ہیں (ص ۲۵۵ تاریخ سیستان)۔ اسی خاندان کے ایک اور فرد لیث بن علی کے عہد میں اس کا سالار معدل سنہ ۲۹۶ھ میں غالب کو قید کر کے لیث کے پاس سیستان بھیجتا ہے اور پھر غزنین پہنچ کر سبحک کو قتل کرتا ہے سبحک کی فوج معدل کی تلاش کرتی ہے لیکن معدل غزنین میں نہیں ملتا (ص ۲۸۷ تاریخ سیستان) سنہ ۲۹۸ھ کی ذیل میں آتا ہے۔ "خطبہ سیستان و بست و کابل و غزنین

---

[1] یعنی آباد کرد۔

کے قافیوں گفتہ و نہفتہ کو نئی ترمیم کی خاطر گفتہ و نہفتہ پڑھنے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ یہ ابوطلب کا بدل ابودلف جو بقول دولت شاہ یعقوب صفار متوفی ۲۶۵ھ کے دربار میں ابن الکعب ایک اور شاعر کے ساتھ رباعی کا موجد مانا گیا ہے۔ اور موجودہ تحقیقات جس کا کوئی پتا نشان نہیں دیتی ہیں تو صرف دولت شاہ کے تخیل کی ایک مخلوق معلوم ہوتا ہے۔ مگر ہمارے محترم نے اس غیر حقیقی شخصیت کو حقیقی شخصیت دینے کے لیے مامون و معتصم کے عہد کے ایک امیر ابودلف عجلی متوفی ۲۲۶ھ کے ساتھ شناخت کر لیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں —

قولہ دولت شاہ نے اپنی روایت میں یعقوب صفار کے دربار کے جن دو شاعروں کے نام لیے ہیں۔ ان میں سے ابن الکعب سے ہم واقف نہیں البتہ رابعہ بنت الکعب (دختر کعب) کا ذکر ملتا ہے۔ جو عہد سلاطین غزنین (پانچویں صدی) میں تھی (عوفی ۲-۶۱) دوسرے شاعر ابودلف عجلی کا تذکرہ سیاسی و ادبی کتابوں میں ملتا ہے۔ یہ شخص نسلاً عرب اور مامون و معتصم کے عہد میں ایران کا سپہ سالار تھا قاسم بن عیسیٰ نام تھا۔ ابن خلکان نے اسی نام کے تحت میں اس کا پورا حال لکھا ہے۔ ۲۲۶ھ میں اس نے وفات پائی" وغیرہ وغیرہ۔ اور آخر میں اضافہ ہوا ہے۔ "اس کا زمانہ امیر یعقوب صفار سے پہلے تھا۔ یعقوب صفار کے عہد میں اس کے بیٹے عبدالعزیز بن ابی دلف کا نام اصفہان کی سیاسیات کے سلسلے میں آتا ہے۔"

(صفحہ ۳-۲۲۱ خیام)

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ حضرت مولانا نے اِن دونوں اشخاص میں اسمی اشتراک کے سوا کیا وجہ مماثلت دیکھی کہ دونوں کو ایک مان لیا۔ گویا امیر ابودُلف

آتا ہے جس کی سات رباعیاں درج کی ہیں۔ اور آخر میں اضافہ کیا ہے کہ "ان رباعیوں پر بھی یقین نہیں کہ وہ واقعی اسی کی ہیں"۔ ——— فاضل سید نے فارابی کا تو اس انداز سے اعلان کیا ہے جس سے گمان گزرتا ہے کہ رباعی گوئی مدت العمر اس کا پیشہ رہا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں "رباعی گو حکیموں میں پہلا نام اور مطلق رباعی گویوں میں تیسرا نام معلم ثانی ابو النصر فارابی المتوفی ۳۳۹ھ ہجری کا ملتا ہے"۔ (ص ۲۳۴ خیام) تین غیر مصرع رباعیاں اس کے نام پر نقل کی ہیں جو اوروں کی طرف بھی منسوب ہیں۔ سید صاحب کے نزدیک فارابی کی رباعی گوئی کے یہ قرائن ہیں کہ "گو نسلاً وہ ترک تھا مگر اس زمانے میں عجم و ترکستان کی عام زبان فارسی ہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ متعدد زبانوں سے واقف تھا اس لیے اس کی طرف فارسی رباعیات کا انتساب غیر متوقع نہیں ہے۔ شہر زوری کی تاریخ الحکما میں ہے۔ اصلہ فارسی"۔ میں کہتا ہوں ایسے غیر متعلق قرائن تیں رباعی تو بہت ہوتی ہیں فارابی کے حصے میں ایک رباعی دینے کو بھی ہیں آمادہ نہیں کر سکتے۔ آگے جا کر خود ہمارے مخدوم یقین اور بے یقینی کے سیلاب میں بہہ گئے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں "مگر ان قرائن کے باوجود کوئی قدیم اور غیر مشکوک دلیل اس کے رباعی گو شاعر ہونے پر ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے بجز اس کے کہ شہر زوری نے تاریخ الحکما میں اس کے حال میں لکھا ہے "وله اشعار حسنة حِكمِيّة" اور اس کے اچھے حکیمانہ اشعار ہیں اور اس کے عربی حکیمانہ اشعار دو صفحوں میں نقل کیے ہیں"۔

یہاں ایک سوال ہو سکتا ہے کہ ان دو صفحے عربی اشعار کی بنا پر ہم کیا فارابی کو فارسی کے میدان میں رباعی گو شاعر اور رباعی گو حکیم کہنے میں الفاظ کا بیجا اور بے معنی استعمال نہیں کر رہے ہیں؟ —

محمد بن علی اللیث را ہی کردند (ص۱۹)۔

امیر نصر بن احمد سامانی ۳۳۱ھ کے سال جلوس کے ذکر میں یہ عبارت ملتی ہے۔ "و عبیداللہ بن احمد بن جیہانی در دست وزیر بود و سعید طالقانی را گرفت و بہ بغداد فرستاد و فضل و خالد بن عمرو بہ و دست یافتند"

(ص۲۷ احوال و اشعار رودکی جلد اوّل)

ان مثالوں سے تو عربیں رودکی کے رسالے میں ایک اہم اور آباد شہر معلوم ہوتا ہے۔ ایک امر دلچسپی کا موجب یہ ہے کہ بنت الکعب جسے ہمارے سیّد روایت عوفی آل عرب کے رسالے میں جگہ دیتے ہیں شیخ فریدالدین عطار جو عوفی سے بھی اقدم ہیں۔ رودکی کی معاصر بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُس نے رودکی کے ساتھ مشاعرے کیے ہیں جن دنوں رودکی اس شاعرہ کے وطن میں آیا تھا۔ وہ اس کا نام زین العرب بتاتے ہیں[۵۱]۔

میں نے ابوشکور بلخی کی ایک رباعی کو جس کا آفرین نامہ ۳۳۶ھ میں ختم ہوتا ہے سب سے قدیم رباعی بتایا تھا اس پر سید صاحب نے اعتراض کیا اور کہا کہ ایسی رباعیاں عوفی کے ہاں دس بارہ سے زیادہ ہیں۔ یہاں میں یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ سید صاحب کے نزدیک سب سے قدیم رباعی کون سی ہے۔ انھوں نے سرفہرست حنظلہ بادغیسی متوفی ۲۱۹ھ کی رباعی کو جگہ دی ہے مگر جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کرچکا ہوں وہ رباعی دو بیت ہیں اور دوبیتی نہیں ہے۔ — آگے سیّد صاحب نے بایزید بسطامی متوفی ۲۳۴ھ کے نام پر تین غیر مصرّع رباعیاں دی ہیں اور زبان کی صفائی اور والہ داغستانی کی تائید مزید کی بنا پر ان رباعیوں کو بایزید کی ٹکسال کا نہیں مانا۔ ان کے بعد رودکی کا نمبر

---

۵۱ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اورینٹل کالج میگزین۔ مئی ۱۹۲۵ء۔

دقیقی کی دو غزلیں تو لباب الالباب عوفی میں موجود ہیں میں صرف ان کے مطلعوں پر قناعت کرتا ہوں ؎

کاشکے اندر جہاں شب نیستی   تا مرا ہجران آن لب نیستی

اور یہ ؎

ای ابر بہمنی نہ بچشم من اندری   دم زن رمانکی و برآسای و کم گری

شمس قیس دقیقی کی ایک اور غزل نقل کرتے ہیں اور رائے دیتے ہیں۔

"و دقیقی غزل مشکول[1] گفتہ است و لعلت سلب انتظام ارکان را استلذاذ احرار در قبول طبع بدین بیت لستی ندارد۔ و غزل اینست۔

شب سیاہ بدان زلفکان تو ماند   سپید روز بپاکی رخان تو ماند
عقیق را چو بسایند نیک سودہ گران   کہ آبدار بود با لبان تو ماند
بوستان ملوکان ہزار گشتم بیش   گل شگفتہ برخسارگان تو ماند
دو چشم آہوی و دو نرگس شگفتہ بیار   درست راست بدان چشمکان تو ماند
کمان بابلیان دیدم و طرازی تیر   کہ برکشیدہ شود با بروان تو ماند
ترا بسروبن بالا قیاس نتوان کرد   کی سرو را قد و بالا بدان تو ماند

(صفحہ ۱۳۰، المعجم)

رابعہ بنت کعب القزداری کی غزل کی نسبت عوفی رقم کرتا ہے۔

"و این غزل از کعب الغزال در حلاوت زیادہ است" (صفحہ ۶۲ لباب) میں صرف مطلع درج کرتا ہوں۔

مرا بعشق ہمی محتمل کنی بحیل   چہ حجت آری پیش خدای عزوجل

---

[1] اس وزن کو مشکول کہنا سراسر تکلف ہے۔ اگر مخبون مان لیا جائے تو سلب انتظام ارکان کی شکایت خود بخود رفع ہو جاتی ہے۔

ایک موقعے پر ہمارے مکرم شیخ احمد بدیلی سرداری جو ۵۸۲ھ میں موجود تھے اور شیخ فریدالدین عطار المتوفی ۶۲۷ھ کے ذکر کے بعد رقمطراز ہیں۔

"اس وقت تک شاعری کے جو اصناف رواج پر پر تھے وہ قصیدہ مثنوی اور قطعہ تھے" (ص۲۴۹)

پھر فرماتے ہیں۔ "اور غزل بحیثیت ایک مستقل صنف سخن کے اس تک پیدا نہیں ہوئی تھی جس میں معنی کے لحاظ سے ہر شعر بجائے خود مستقل ہوتا ہو کمال اسمٰعیل متوفی ۶۳۵ھ ہجری نے اس طرز کا آغاز کیا اور شیخ سعدی المتوفی ۶۹۱ھ ہجری نے اس کو کمال کو پہنچا یا ۔ اس لیے فلسفہ و حکمت کے مختصر متفرق خیالات کے لیے رباعی کے سوا کوئی چیز اس وقت موجود نہ تھی" (ص۲۵۰ خیام)

اس عہد سے پیشتر قول و غزل و ترانہ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں شعری تثلیث بنے ہوئے تھے مگر کمال اسمٰعیل کے دور میں غزل قوام میں آکر پختہ ہوگئی، معلوم نہیں سید والا جاہ ان لوگوں کو کیا کہیں گے جو غزل کے علیحدہ وجود کے رودکی کے عہد سے قائل ہیں۔ مثلاً محمود کے دربار کا ملک الشعرا عنصری رودکی کی غزلیات پر رشک کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں رودکی کی طرح غزلیں نہیں لکھ سکتا۔ سہ

غزل رودکی وار نیکو بود   غزلہائے من رودکی وار نیست

میں یہاں رودکی کی غزل کا ایک مطلع بھی درج کر دیتا ہوں۔ ے

کس فرستاد بسر آں بت عیار مرا
کہ مکن یاد بشعر اندر بسیار مرا

لاف آں بہتر کہ در میداں سرباراں زنیم
شرطِ دعویٰ نیست تنہا گوی و چوگاں داشتن

حال ہی میں جب میں نے رباعی کی تقطیع کے آسان طریقے پر قلم اٹھانا چاہا اس کی تاریخ کے سلسلے میں مخدومی پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال ۔۔ سید صاحب کی تالیف کا بھی ذکر کیا جس میں رباعی پر ایک طویل الذیل مضمون موجود ہے اس طرح سید صاحب کے اعتراضات سے مجھے دیر میں اطلاع ملی اور یہ میرا قصور نہیں اگر جواب دیر میں دیا گیا۔

مطبع عام پریس لاہور میں باہتمام لالہ موتی رام مینجر چھپی۔
اور سید صلاح الدین جمالی مینجر انجمن ترقی اُردو (ہند) نے دہلی سے شائع کی +

شعرائے غزنہ میں سے عنصری اور فرخی کی غزلیات ان شاعروں کے دیوانوں میں موجود ہیں۔ عسجدی کی غزل کے نمونے عوفی نے لباب الالباب میں ص۲۔۵۲ پر اور ابو اللیث طبری کے ص۲۔۲۶ پر۔ امیر معزی کے ص۲۔۷۵ پر عبد الواسع جبلی کے ص۲۔۱۰۷ پر۔ خالد بن الربیع کے ص۲۔۱۴۴ پر اور سنائی غزنوی کے ص۲۔۱۴۷ پر مرقوم کیے ہیں۔ انوری و خاقانی کے تو مستقل دیوان موجود ہیں جو ان کے کلیات میں شامل ہیں۔ بلکہ سنائی المتوفی ۵۴۵ھ کے ہاں غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ مقطع میں تخلص کا استعمال باقاعدہ شروع ہو جاتا ہے۔ واردات حقیقت کو مجاز کی زبان میں ادا کرنا یہیں سے شروع ہوتا ہے اور صومعہ کو خیرباد کہہ کر خرابات نشینی اختیار کی جاتی ہے۔ عطار اور مولانا روم سنائی کی بنیادوں پر قصر و ایوان کھڑے کرتے ہیں۔

سامانیوں، غزنویوں اور سلجوقیوں کے عہد میں غزل کے وجود سے انکار کرنا تاریخ کے مسلمہ واقعات کو نظر انداز کر دینا ہے۔

یہاں میں اس بحث کو ختم کر کے عرض کرتا ہوں کہ سید صاحب ممدوح کی آرا رباعی کی قدامت اور دیگر امورِ متعلقہ کی بابت نہ صرف ہماری ہی روایات سے متبائن و متفاوت ہیں بلکہ اُن سے عام غلط فہمی پیدا ہونے کا بھی احتمال ہے۔ اسی لیے مجھے ان بیانات کی تردید کی جرأت ہوئی۔

مجھے شکایت ہے کہ سید صاحب نے باوجودیکہ کئی موقعوں پر مجھے اپنی قابلِ قدر تالیف خیام میں ملزم ٹھیرایا ہے۔ لیکن اس کا کوئی نسخہ میری اطلاع کے واسطے حسب رواجِ زمانہ مجھے نہیں بھیجا۔ اور مجھ کو بے خبر رکھ کر لائقِ تعزیر قرار دیا۔ میں اس یک طرفہ کارروائی کے خلاف احتجاج کرتا ہوں۔ یہ حصہ تیر اندازی نامناسب ہے ــــ

اشاریہ[1]

فہرست اوّل، اشخاص ومقامات

ا

---

[1] انجمن ترقی اردو اس اشاریہ کی تیاری کے لیے شیخ محمد داؤد صاحب خلف الرسید ... صاحب ... مشکور ہے

غ

ف